تاریخ
دارالعلوم دیوبند
برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ
اسلامی تعلیم و ثقافت اور ملت کی نشاۃ ثانیہ کا سرچشمہ
دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی و ملی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ
مقدمہ
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب
مصنف
سید محبوب رضوی
المیزان

تاریخ دارالعلوم دیوبند

برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی ادارہ

اسلامی تعلیم و ثقافت اور تحریک آزادی کا مرکز

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی، دینی، ملی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ

اوّل

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

مصنف

سید محبوب رضوی

المیزان ناشران و تاجران کتب

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان فون: ۷۲۳۵۳۷۲، ۷۱۲۲۹۸۱-۰۴۲

سلسلہ مطبوعات — ۱۰۰

سن اشاعت [illegible]ء
محمد عبد العادل نے
حاجی حنیف پرنٹرز سے چھپوا کر
المیزان اردو بازار لاہور سے شائع کی۔

فہرست مضامین

×

باب دوم

باب سوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

الہامی مدرسہ اور اس کا الہامی مکتب فکر

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

آج جبکہ دارالعلوم کی تاریخ اور اس کے کارناموں کی تفصیل آپ کے سامنے آ رہی ہے ضرورت ہے کہ اس کی معنویت اور حقیقت پر بھی ایک مختصر روشنی ڈالی جائے کہ اس کے بغیر اس کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ گو فن تاریخ کے لحاظ سے اس قسم کے کشفی اور الہامی واقعات کو اہمیت نہ دیا جائے، اور انہیں محض خوش اعتقادی کا ثمرہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے لیکن جبکہ اس کی بنیادوں ہی میں یہ معنوی حقیقت اساسی حیثیت لئے ہوئے ہے بلکہ اس کی پوری تاریخ کے دوران بھی حقائق ہیں جس سے اس کی امتیازی شان کا نشو ونما ہوا ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی حقیقی تاریخ ہی ان خصوصیات میں منحصر ہے اور ان کا ذکر نہ کیا جانا اس کی امتیازی شان کو پس پردہ ڈال دینا ہے اس لئے ضروری تھا کہ اس کی ظاہری تاریخ کے ساتھ اس کی باطنی تاریخ بھی سامنے آ جائے کہ یہ ادارہ اول سے لے کر آخر تک کس معنوی اساس پر قائم ہے اور کن حقائق سے اس کی روز افزوں مقبولیت کا نشو ونما ہو رہا ہے۔

اس سلسلہ میں بنیادی طور پر دو ہی چیزیں اس کا مکتب فکر ہے جس کے واضح کئے بغیر اس کی معنویت پر روشنی نہیں پڑ سکتی، اور یہاں اس کا دینی رخ واضح ہو سکتا ہے۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ اس کا مرکزی فکر کیا ہے جس سے اس کے قیام کا نصب العین متعین ہو، اس

دو مرکزی فکر کے اثر سے متاثر ہو گئی ہیں؟ جس سے اس کے گوشہ ہائے فکر متعین ہوں، اس فکر کا نتیجہ کیا ہے جو سارے بکھرے ہوئے زمانے کے پیچیدہ کار سے نکلا ہو جس سے ان کا استقلال اور قلبی اطمینان ہونا نمایاں ہو، یہی وہ سوالات ہیں جس کے حل کے بغیر اس کی مرکزیت درحقیقت پوری روشنی نہیں پڑ سکتی

سو اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ دارالعلوم کا سلسلہ اسناد و حدیث بتوسط حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے چلتا ہے، جس کی سند متصل ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا علم اور ذوق و فکر شاہ عبدالعزیز پھر شاہ محمد اسحاق اور شاہ عبدالغنی کے واسطوں سے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہما تک پہنچا، اور انھوں نے اس ذوق کو مستقل طور پر دارالعلوم دیوبند کے ذریعے سے عام فرمایا اور جا بجا کتاب و سنت کی تعلیم و توجیہ و رسالت کی عظمت و توقیر کی وضاحت و بیان میں حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک مخصوص رنگ اور ممتاز انداز تفہیم ہے، جس کا اولین جوہری وہ حکمی فکر اور ذوق ہی کا نقشہ ہے، یہ ان کا اساسی فکر ہے، پھر تعلیم و تفہیم کے دائرے میں اس کی وہ نوعیت بیان ہے جو ہر دور کی نفسیات کو جذب کرتی ہے جس کے مختلف اجزا ترکیبی ہیں، جو حسب نفسیات زمانہ اس میں کارفرما ہوتے رہتے ہیں۔ پھر یہ انداز فکر محض کسی منطقی سوچ بچار یا ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ الہامی ہے، جس کی الہامی نوعیت کو خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ظاہر کر دیا ہے فرمایا کہ —

وبینا انا جالس ذات یوم بعد صلوٰۃ العصر	ایک دن میں نماز عصر کے بعد سر جھکائے اللہ کی طرف متوجہ بیٹھا ہوا
متوجہاً الی اللہ اذ ظہرت روح	تھا، یکایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک
النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلانی من	ظاہر ہوئی اور سر کے اوپر سے مجھے ڈھانپ لیا، مجھے یوں
فوق رأسی بشیء احسبہ ثوبا القی علیّ	محسوس ہوا کہ کوئی کپڑا مجھ پر ڈال دیا گیا ہے اور

عقل و وحی پر حاکم نہیں معیار معتبر سمجھے ہوئے ہیں بلکہ وحی عقل پر حاکم اور عقل کی صحت و سقم کا معیار ہے یہی عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنیاد وحی پر قائم کی جائے گی نہ کہ اپنی عقل سمجھ کی پیدا کیونکہ وحی خداوندی کا نقل صحیح پر نقل ہے جو بتدریج ہو کر ہم تک پہنچا ہے، عقلی اختراعات پر نہیں جو ہم دوسرے ہی خود سے بھرتے ہیں اس لئے دراصل آئینہ ہوتے ہیں، یہ عقلی مصالح محض دو قسم کے لوگوں یعنی مخصوص و مخالفین کو انہی کی زبان میں دین سمجھانے کے لئے یا بطور خود ذاتی اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہیں نہ کہ ایمان لانے یا دین بنانے کے لئے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ نقلی اور روایتی دین کو عقلی دلائل، طبعی مصالح اور شرعی معانی و اسرار و حکم کے جامہ میں پیش کیا جانا اور دین کو دین فطرت دکھلا کر اس دور کی عقل زدہ طبیعتوں کے لئے قابل قبول بنا دینا اس الہامی کتب فکر کا پہلا جزو ہے جو حضرت شاہ صاحب کے قلب میں منجانب اللہ القا ہوا۔ لیکن حجۃ اللہ البالغہ کے اسلوب بیان اور طرز تفہیم سے جس میں عقائد و مسائل کے اثبات کے لئے یہ عقلی حکمتیں اور مصلحتیں پیش فرمائی ہیں یہ بھی نمایاں ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ان حکمتوں کو متعلقہ آیات و روایات کی طرف منسوب فرما کر انہیں زیادہ تر کشفی اور ذوقی رنگ میں پیش فرمایا ہے، اس لئے قدرتی طور پر اس سے صرف وہی عقل پسند طبیعتیں مطمئن ہو سکتی ہیں جو کسی نہ کسی حد تک ان روایات کو مانتے ہوئے اس ذوق اور اس وجدان کی کوئی لذت ذہن میں لئے ہوئے ہوں، اور جن کا روحانی احساس بالکل معدوم نہ ہو چکا ہو ورنہ جو لوگ سرے سے اس اعتقاد اور ذوق سے ہی کورے ہیں وہ تو نا بلد اسے ذوق محض ہو کر اسے علم و حکمت سمجھنے کے بجائے تخیل آفرینی کا عنوان دے کر ٹال دیتے اور بے التفاتی کی نذر کر کے دین سے بدستور محروم رہ جاتے چہ جائیکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھاتے، چنانچہ اس عقل پسندی کے ابتدائی دور میں جو انگریزوں کی درآمد فلسفیوں اور سائنسدانوں اور ان کے ملحدانہ نظریات کا بھی ابتدائی ہی دور تھا اس عقل و نقل کی آمیزش سے وہ لوگ روحانیت پا کر آتے رہے جنہیں عقل بھی سے دین سے بیچیدگی تھی لیکن پھر بھی وہ اس دور کے عرفی ماحول اور دینی رنگ کے

گو بعد میں گراں ہو گیا۔ اس کے فارغ التحصیل ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب نے اُن سے فرمایا کہ میاں نور الدین کتابیں تو تم نے ختم کر لیں اب کچھ اللہ اللہ کرنا سیکھو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت قرآن پڑھ لیا، حدیث پڑھ لی اس کے سوا اللہ اللہ کیا ہے؟ فرمایا کہ میاں نور الدین تم نے میرے درسِ حدیث سے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیتا ہوں، اللہ اللہ کرنے سے یہ معقول محسوس بن جائے گا۔ منشا یہ تھا کہ کثرتِ ذکر سے ہی اشراقِ قلبی پیدا ہوتا ہے جس کے لئے عالم معنویات کے ساتھ عالم حسیات کے حقائق و معارف بھی کھل جاتے ہیں۔ اشارہ اس طرف تھا کہ اب دین کو صرف نظری طور پر عقلی رنگ میں پیش کر دینا کافی نہ ہوگا۔ جب تک اُسے حسی انداز کے دلائل سے محسوس شدہ ہو کے دنیا کے آگے نہ رکھا جائے، جس کا راستہ ریاضت و مجاہدہ اور کثرتِ ذکر کے سوا دوسرا نہیں کہ اس سے قلب میں معرفت و بصیرت ابھرتی اور اس سے انکشافِ حقائق کی شان پیدا ہوتی ہے اور نظریاتی مسائل محسوسات بن کر نظر آنے لگتے ہیں۔

پس اسی بنا پر دین میں حضرت الامام ولی اللہ نے تو عقلی مصالح و اسرار کی شان کو ابھارا تھا اور ان کے اس طبقہ چہارم کے تلمیذ خاص امام حضرت شاہ عبد الغنیؒ نے اسی کے ساتھ حسی و مشاہداتی دلائل و شواہد کو بھی شامل کر دیا ہے جو اسی ایمانِ باطنی اور اذواقِ عرفانی کے ذریعہ کا ثمرہ تھا، لیکن تھا بہرحال یہ بھی وہبی، ذوقی اور وجدانی انداز جو آیات و روایات کی حکمت کے طور پر پہنچ یا ذہنی قرب کے افراد ہی کے لئے مؤثر اور اُنہی کے جذبات کو اپیل کر سکتا تھا، یہی استدلالی شان کا ذوق تھا کہ ایک منکرِ حسن یا ورودِ حقائق کو بھی جو کتاب و سنت اور وحی الٰہی کا اعتراف دل میں چھپائے ہوئے ہو اور دوسرے سے وجودِ صانع کا منکر، نبوت ہی کی ضرورت سے منحرف ہو کر حشر و نشر ہی کا سرے سے قائل نہ ہو اور ان عقائد کو محض ایک دل خوش کن داستانِ پارینہ سمجھے ہوئے ہو تو آیت و روایت یا اس کی نسبت سے پیدا شدہ حکمت و بصیرت اس پر کیا اثر انداز ہو سکتی تھی جو آیت و روایت کا نام سنتے ہی بدک جاتا ہو۔ اس لئے ضرورت تھی کہ آیات و روایات کا ابتدائی ذکر کئے بغیر دین کو اس کے سامنے محض سائنٹفک اصول سے فلسفیانہ پیرایوں اور موجودہ دور کے حسیاتی انداز کے

اور اسے اس طرح پیش کیا جائے کہ قطع نظر نقد و روایت کے اور قطع نظر ان کے عقلی و ذاتی اور محسوس براہین کے اسلام اس کے سامنے مستقلاً ایک فلسفہ و نظام کی صورت سے نمایاں ہو۔ حتیٰ کہ یہ محسوس ہی نہ ہو کہ یہ کوئی آسمانی دین پیش کیا جا رہا ہے بلکہ احساس یہ ہو کہ یہ ایک مستقل فطری اور طبعی فلسفہ و دستور زندگی ہے جس کے بجائے بغیر دل کی ایک زندگی کبھی بھی خوشگواری کے ساتھ نہیں گذر سکتی، اور جب اسی کی عقل کی مانگ تائید میں اس روپ سے اٹھ کھڑا ہو جائے تو آخر میں کہا جائے کہ یہی تو وہ اسلام ہے جس سے تم بدکے ہوئے تھے۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اگر آج کے دور کو دیکھا جائے تو یہ صورت حال اس میں اپنی انتہائی منزل تک پہنچ چکی ہے۔ آج کی جنگ عقائد و افکار کی نہیں بلکہ نظریات کی ہے درحقیقت نظریات کی بھی نہیں بلکہ زیادہ تر عنوانات اور اسالیب بیان کی ہے۔ آج اگر ایک حقیقت کو خدا و رسول کا نام لے کر پیش کیا جائے تو قومیں اس سے راہ فرار اختیار کر لیتی ہیں، اور وہی حقیقت اگر تمدن و معاشرت اور دنیوی مفادات کے عنوان سے پیش کی جائے تو اسے قابل توجہ ہی نہیں بلکہ لائق تبرک سمجھتی ہیں جس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اصل دشمنی خدا و رسول کے نام سے ہے، ان کے پیغامات سے نہیں ہے بشرطیکہ وہ ان کے نام سے پیش نہ کیا جائے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ آج کے سطحیت پسند دور میں ساری مذہبی جنگیں حقائق و وقائع کی نہیں صرف عنوانات کی ہیں یعنی سطحیت پسندی اس حد پر آ چکی ہے کہ معانی اور حقائق تو بجائے خود رہے صرف تعبیر اور تعبیری تنزل پر حق و باطل کا مدار ٹھہر گیا ہے، مثلاً اگر ایک مذہبی تلقین عقیدہ کسی دینی روایت یا مذہب کے نام سے سامنے آئے خواہ کتنی ہی حکمتیں کھول دی جائیں وہ دستور وحشت و فرار کی نذر ہوتی رہے گی، اور اسی کو اگر سائنس، فلسفہ، معاشیات اور تمدنی مصالح کے عنوان سے کسی ازم کی صورت میں پیش کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ وحشت و فرار کا ذریعہ ثابت نہیں ہوتی بلکہ لائق توجہ اور قابل قبول ہو جاتی ہے گویا دنیا غلط پسند اور

سمعی بیزار ہو چکی ہے، اس لئے محسوسات اور عقلی مسلّمات ہی سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے،
بشرطیکہ وہ منطق ہی معانی کے ہوں جنہیں دلوں میں پیوست کرنا منظور ہو، اس لئے اس دور کے
مریضانِ رُوح کے علاج کے لئے اس دور میں ولی اللّٰہی خاندان کی پانچویں پشت میں ایک فرد اُٹھا
جس نے اس مذکورہ ہمہ گیر دین و مذہب، دینی عقائد، دینی اصول و کلیات کو اسی الہامِ ربانی
کی تحریک سے اجتہادی رنگ میں قرآن و حدیث یا مذہب و سنت کا نام لئے بغیر معانیِ قرآن و حدیث کو
ایسے استدلالی اور منطقی طریقِ پر زمانہ کے سامنے پیش کیا جیسے وہ اس زمانہ کے حسبِ
حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے جس کا ظاہری عنوان اشتراکیت یا انقلابِ مذہب ہے
نہ اصلاح مذہب مگر نتیجۃً وہی مذہب اور عقیدۂ مذہب ہے، مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص
ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے
چل سکتی ہے نہ سیاست و مدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی سنوار اور کامیاب ہو سکتی
ہے، اس لئے اس نے ایک نئے حسیاتی فلسفہ و حکمت کی بنیاد ڈالی، ہم اسی شخصیت کو حضرت
قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو شاہ ولی اللہ
شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحٰق اور شاہ عبدالغنی کے علوم کا نچوڑ اور ان کے دینی تفقہ کا خلاصہ
تھا، اور اس نے دینی امانت جو ولی اللّٰہی دور سے ملی تھی اس دور کے مناسب حال حکیمانہ انداز
سے دنیا کے سامنے رکھ دی، چنانچہ اس دور کے ذہن کے پیش نظر حضرت قاسم العلوم کی تحریرات
اور تصنیفات میں سطح پر آیات و روایات یا دینی اصطلاحات کا ابتداءً کہیں ذکر نہیں آتا، مگر وہ معنیً
آیات و روایات ہی ہوتی ہیں بلکہ نمایاں طریق پر تعبیری حد تک بجائے صورت استدلالی شکلوں،
برہانی تجربات اور حسی شواہد و نظائر کی صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اندرونی حد تک بجائے معانی
و مدلولات ایمانی حقیقتوں، عرفانی ذوقیوں اور کشفی و حشر کی کیفیتوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس لئے
حضرت قاسم العلوم نے اس دور کے مسلّمات اور محسوسات کے آئینہ میں آیات و روایات کا
جلوہ نمایاں کیا ہے، مگر فلسفیانہ استدلال اور منطقیانہ طرزِ اثبات سے اس طرح جیسے ایک

مستقل فلسفۂ حیات پیش بنا جا رہا ہے، مگر آخر میں کھلتا یہ ہے کہ یہ تو وہ اسلام ہے جس سے تم
دنیا کو وحشت زدہ کر دیا گیا تھا، اس طرح ان پر یہ کھل جاتا ہے کہ وہ صرف ناموں اور عنوانوں
پر لڑ رہے تھے، حقیقت حال کی اسمیں ہوا بھی نہیں لگی تھی، درحالیکہ فطرۃً وہ حقیقت سے دور
نہ تھے لیکن جب اس حکیمانہ طرز سے ان پر حقیقت کھل جاتی تو بالآخر کار وہی صورت اس پر آگئی جو
اس حقیقت کے لئے اللہ رب العزت نے وضع فرمایا تھا یعنی اسلام جیسے شاہ ولی اللہؒ اور
ان کے مفسروں نے پیش کیا تھا۔

اسی لئے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہؒ کی
حکمت کے لئے نزدیک صرف حکمت قاسمیہ ہے جس سے گذرے بغیر آدمی ولی اللّٰہی مدارک تک
کی حد نہیں پہنچ سکتا، پس شاہ ولی اللہؒ جن علوم کو ذوق اور کشفی رنگ سے پیش کرتے ہیں،
حضرت قاسم العلومؒ انہی علوم کو استدلالی رنگ سے سامنے لاتے ہیں، وہ فی الجملہ مانوس مگر
شکوک میں پڑے ہوئے لوگوں کو منکر نہیں ہونے دیتے اور یہ منکر و مستغنی طبقوں کو قائل
کرتے ہیں، وہ آیات و روایات کے ذیل میں ان کی حکیمانہ تشریح کرتے ہیں اور یہ اپنی حکمت سے
منکروں کو آیات و روایات کے دروازے پر لا کھڑا کرتے ہیں تاکہ تعمیر مذہب میں وہ بآسانی
داخل ہو جائیں، بشرطیکہ یہ حکمت ان تک پہنچ جائے یا پہنچا دی جائے اور جیسے حکمت ولی اللّٰہی
الہامی ہے ویسے ہی حکمت قاسمیہ بھی الہامی اور علم لدنی کا خزانہ ہے اور جیسے حکمت ولی اللّٰہی
کے بارے میں خود صاحب حکمت نے اپنے کلام میں صراحت کی ہے کہ وہ الہامی ہے، تو انہی
کاوشوں کا ثمرہ ہیں، جس کی وضاحت اور صراحت ان کے کلام سے گذر چکی ہے، ایسے ہی
حکمت قاسمیہ کے بارے میں بھی صاحب حکمت کی تصریحات ان کے کلام میں موجود ہیں جیسے
مصابیح التراویح میں خود فرماتے ہیں کہ:

> مجھ بے تمیز کا طرز تحریر بر نظر کرم، جو کچھ میرے مضمون پر آتے ہیں سو
> اسے سپرد قلم کر دیتا ہوں یا جیسے "تقریر دلپذیر" میں مسئلہ تقدیر کی تقریر

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے فلاں مقام پر پہنچ کر قلم رک گیا اور
طبیعت بند ہو گئی تو میں نے اس بارگاہِ عزت کی طرف رجوع کر کے عرض کیا کہ

قطرۂ دانش کہ دادی ز پیش　　　متصل گرداں بدریائے خویش

سو الحمد للہ کہ باب مفتوح ہو گیا اور اب جو کچھ کہ دل میں ڈالا سب بیان ہی ہے مصنف
فرماتے ہیں پہلا سوال ہمیں ادراک کا قائل اسی طرح دو مواقع میں بھی تصریحات ہیں۔ اسی طرح شاہ
عبد الغنیؒ کے کلام میں بھی صراحۃً نہیں تو کنایتاً موجود ہے کہ اُن کی حکمتِ تفہیم بھی القائی ہے
جیسا کہ نور الدین کو انشاء اللہ کرنے کی تلقین سے مقتدیوں کے محسوس بن جانے کی اطلاع کثرتِ ذکر
کے عنوان سے دی گئی جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اس ورد کا وارد القائی تھیں
ہے جو اُن پر کھلا اور انہوں نے خود دیکھ کر دوسرے کو دکھانا چاہا۔

بہر حال ایک ہی حکمتِ لدنی ہے جو شاہ ولی اللہؒ پر بالہامِ الٰہی گزری تو اس نے جامع
دین میں عقلی رنگ کا جامہ پہنا، شاہ عبد الغنیؒ پر گزری تو اُس نے محسوسات کا پیرایہ ڈالنے کی
نشاندہی کی، اور قاسم العلومؒ پر گزری تو اس نے ذوقیات کے بجائے حسیات اور عقلیات میں بھی
برہانی استدلال کا لباس اختیار کیا، اور جیسے جیسے زمانہ کی ذہنیت رنگ بدلتی گئی ویسے ہی
ویسے یہ حکمتِ لدنی مختلف لباس اختیار کرتی رہی، جس کا قدرِ مشترک الہام اور القاءِ ربانی
ہے، وہی القاء ربانی انعامِ خداوندی تھا ان بزرگوں کا ذہن بنا گیا مگر حضرت نانوتویؒ چونکہ
ان سب سے مستفید اور ان کے تربیت یافتہ تھے اس لئے وہ ان سب بزرگوں کے علوم و
حکمت کا نچوڑ ثابت ہوئے، اس لئے وہ اہل السنۃ والجماعت کے مسلک کے مکمل شارح
بنے اور انہوں نے موقعہ بموقعہ اس مسلک کے علوم کو کہیں عقلی رنگ سے کہیں حسی رنگ سے
کہیں برہانی طرزِ استدلال کے رنگ سے اپنی تعلیم و تلقین اور کتاب و خطاب سے مدلل کر دیا،
جس سے یہ مسلک جامع انداز سے دنیا کے سامنے آیا، اور اس کی جامعیت نمایاں ہو گئی کہ
وہ نقل کے ساتھ عقل اور عقل کے ساتھ حس اور حس کے ساتھ استدلالی رنگ کا جامع ہے

اس لئے قاسم العلوم کے علم میں علم کے ساتھ معرفت، حکم کے ساتھ حکمت، نقل کے ساتھ عقل معقول کے ساتھ محسوس، قانون کے ساتھ مصالح، شریعت کے ساتھ طریقت، ایمان کے ساتھ احسان، اثبات کے ساتھ دفاع یعنی دین کے ساتھ شوکت دین کے جذبات جمع کر کے اسے ایک معجون مرکب کی صورت سے حیات آفریں تریاقی رنگ میں پیش فرمایا، جو خالص الہام کے سرچشمہ سے نکلی ہوئی حقیقتیں تھیں، اور حق تعالیٰ نے اپنے لامحدود جود و کرم سے ان کا طبعی مزاج ہی یہ بنا دیا کہ اگر وہ ایک جزوی مسئلہ کو بھی ثابت کرتے ہیں تو وہ بھی اصول کلیہ کے چولے میں نمایاں ہوتا ہے جس سے ایک جزئی ہی کا نہیں سینکڑوں جزئیات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اپنے دور میں جب حضرت قاسم العلوم ہی دارالعلوم دیوبند کے بنیادی فکر کے سربراہ تھے جیسا کہ ان کے تلامذہ ان کے رفقاء اور ان کے بزرگوں تک کی تصریحات ہیں تو دارالعلوم کے مسلک میں بھی یہ الہامی شان نمایاں ہوئی، گو تدریجی ہوئی، اور واضح ہو گیا کہ اس کا مسلک اور مرکزی فکر اور دینی رُخ کسی سوچ بچار کا کوئی نتیجہ نہیں بلکہ الہام الٰہی کے بحرِ ذخار کا ایک قطرہ ہے، پس اگر یہ کہہ دیا جائے تو بالکل خوب درست کہا جا سکتا ہے کہ دیوبندیت اخلاص اولی النیت اور شانِ قاسمیت کا نام ہے، محض پڑھنے پڑھانے کا نام نہیں، اور اس میں ان علمی نسبتوں کے اجتماع کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض مدرسہ نہیں بلکہ مدرسۂ فکر اور آج کل کی اصطلاح میں ایک مستقل مکتبِ خیال ہے۔

اس سے واضح ہے کہ دیوبندیت کوئی مذہب یا فرقہ نہیں جیسے معاندین سے ایک مذہب یا فرقہ کا نام دے کر عوام کو مشتعل کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مسلکِ اہل سنت والجماعت کا ایک جامع مرقع اور مکمل ایڈیشن ہے جس میں اہل سنت والجماعت کی ساری شاخیں اپنی اصل سے جڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس دیوبندیت کے بارے میں کیا خوب جامع جملہ استعمال فرمایا تھا جو انہیں کو زیب دیتا تھا

ہو چکا تھا۔ وہ تفاوت مشرب فرقہ بندی کی صورت اختیار کر چکا تھا جس سے امت میں تشتت اور
انتشار کے جراثیم پیدا ہو گئے تھے۔ وہ ہر ایک دوسرے کے حال کی تکفیر تک پر آمادہ تھا۔ لیکن
قاسم العلوم اور ان کے دار العلوم نے اپنے جامع مسلک میں حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام
تصوف، حقیقت و معرفت جملہ دینی علوم و معارف کے مختلف الالوان پھولوں کا ایک گلدستہ
بنا کر (جس میں ہر ہر پھول اپنی اپنی کیاری میں کھلا ہوا ہے اپنے مقام پر چسپاں تھا) ایسے جامع
انداز سے پیش کیا کہ ان تمام مسلکی طبقات کے لئے ایک نقطہ پر جمع ہونے کی صورت پیدا ہو گئی
اس لئے یہ فکر جس پر دار العلوم کی بنیاد قائم ہے، اہل حق کے لئے جامع، اور اہل باطل کے لئے قاطع
ثابت ہوا، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دار العلوم کی تعلیم کے تحت اس کے مسلک کے دو بنیادی عنصر
ہیں، ایک فقہی اور کلامی یا بالفاظ مختصر علمی مسلک ہے، دوسرا تربیتی و تہذیبی یا بالفاظ مختصر اخلاقی
مسلک ہے اور یہ دونوں علمی اور اخلاقی مسلک کامل الاعتدال ہونے کی وجہ سے تمام مسالک کے
مغز کو لئے ہوئے ہیں، گویا تمام مسالک کی خوبیوں کا خلاصہ ہیں، اس لئے ان پر سارے
علمی اور اخلاقی طبقات جمع ہو سکتے ہیں اور وہ ان کا مرکز اجتماع قرار پا سکتا ہے۔

سو جہاں تک علمی مسلک کا تعلق ہے اس کا مرجع الامام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی
ذات گرامی ہے جن پر جناب اقدس سے علمی مسلک الہامی طور پر وارد شدہ ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے
اور وہ سارے علمی طبقات کے لئے بے کمال اعتدال اور جامعیت کی وجہ سے جیسے طبعاً مرکز
کل ہے ایسے ہی سارے اہل مسالک اگر انصاف سے کام لیں تو اس پر جمع ہو سکتے ہیں یا کم سے کم
اسے اپنا مرکز تسلیم کر کے اس سے قریب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں تک فقہائے امت، وائمہ مجتہدین
کے مختلف فقہی مذاہب کا تعلق ہے وہ احادیث کے ظاہری تعارض یا اختلاف سے پیدا شدہ اور کسی
نہ کسی روایت حدیث پر مبنی ہیں۔

دار العلوم کے فقہی مسلک کا دلیلی محور یہ ہے کہ اَلْاِعْمَالُ اَوْلٰی مِنَ الْاِهْمَالِ (کسی
چیز کو کام میں لے آنا اس کے بیکار چھوڑ دینے سے بہتر ہے) دنیا کی خسیس سے خسیس چیز کو بھی

دانستہ بیکار و ضائع نہیں جانے دیتے چہ جائے کہ کسی اصلی چیز کو بالکل چھوڑ کر ضائع کر دیں اور تمام اصلی
چیزیں جو ہیں حق ترین سے کلام نبوت اور کلام صحابہ و تابعین ہے تو اس کے کسی بھی پہلو کو بیکار و ناقابل
عمل بنا دینا بلاشبہ اس مسلک کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ احادیث مختلفہ
میں جو حدیث مختار شارع علیہ السلام سے زیادہ واثق ہو اور اس سے اقرب ہوتی ہے اسے بہ پیروی
امام ابو حنیفہؒ اصل مذہب قرار دے کر بقیہ تمام روایات کو اس کی ساتھ لے کر اپنے محل پر جوڑتے
چلے جاتے ہیں جس سے کوئی حدیث بھی خارج از عمل نہیں ہوتی بالخصوص دیگر ائمہ کے یہاں جمع بین
الروایات اصل ہے جس سے تطبیق و توفیق کا راستہ پیدا ہوتا ہے، مخالف روایات کو ترک کے
بغیر معقول و منقول توجیہ سے اصل روایت کے تابع بنا کر عمل کے دائرے میں لے آتے ہیں
بیکار بنا کر ضائع نہیں ہونے دیتے تاکہ کلام پیغمبر کا کوئی بھی پہلو خارج از عمل نہ رہنے پائے
حتی کہ حدیث مرسل کو بھی ترک کرنے کے بجائے اس کی حجیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے ائمہ
ہدایت کے نقشے سے پیدا شدہ کوئی بھی پہلو کسی بھی روایت کا مسلک سے باہر نہیں ہو جاتا جسے ہم
یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ تمام ائمہ کے فقہی مراتب بحیثیت مجموعی اس مسلک میں آجاتے ہیں زیادہ سے
زیادہ مطلب یا درجہ یا افضل و مفضول یا اصل و فرع یا عزیمت و رخصت کا فرق نکل سکتا ہے البتہ کہیں کہیں
جائز و ناجائز کا بھی جزوی سا پیدا ہوتا ہے مگر قلیل ہے تو اس سے فقہ حنفی کی جامعیت اور دوسرے فقہوں کے برحق ہونے میں
کوئی فرق نہیں پڑتا، علاوہ ازیں منصوص یا مستنبط جب ایک ہی نص کے دو پہلو نکل آئیں تو ان میں اجتہادی کو
جو مشتبہ ہوتا ہے مگر خلاف منصوص کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوتی کہ کسی فقہی مسلک سے انحراف یا گریز کی تہمت آئے
اس لئے ائمہ اجتہاد کی حقانیت و عظمت بھی ان کی شان کے مناسب قائم رہتی ہے اور
ان کے فقہی مسلک کی صداقت و عظمت اور تعظیم و توقیر میں بھی فرق نہیں آتا۔ پھر یہ اختلاف
بھی حق و باطل کا نہیں ہوتا کہ باعث کشمکش ہو بلکہ محض خطا و صواب کا ہوتا ہے جن میں سے
کوئی بھی پہلو اجر سے خالی نہیں اور ظاہر ہے کہ جب سارے فقہوں اور فقیہوں کے اجتہادات
اس طرح ایک مرکز پر جمع ہو کر وہ بھی اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مناسب قائم رہتے ہیں

تو نہ صرف یہ کہ تنوع وجدل کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں بلکہ قدرِ مشترک کے طور پر یک ماہیہ
الاتحاد بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کے تحت یہ سارے متعدد اور مختلف مراتب نہ صرف مختصر ہی ہو جاتے ہیں
بلکہ ایک مرکز پر سمٹ آتے ہیں جو اس مسلک کی جامعیت کی کھلی دلیل ہے۔

رہے فرق حقہ اسلامیہ جو اصول دیانات میں متحد رہ کر فروعی عقائد کے معانی میں متفاوت
ہو جو شریعت کے منشا ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا بھی اجتہادی تعدد فکر ہی ہے جس سے متفاوت
اجتہاد، متفاوت نظریات قائم ہو کر عقیدے کی صورت اختیار کر لیں، وہ دو فرقے سمجھے جانے لگیں
درحالیکہ وہ فرقے نہیں ہوتے جبکہ تمام اصول اور مبانی اسلام میں متحد ہیں، لیکن حضرت شاہ
صاحب رحمہ اللہ کا مسلک جبکہ جامع نص و اجتہاد ہے تو ان فروعی عقائد کا بھی کوئی اجتہادی
پہلو جب تک کہ شریعت کے بنیادی اصول اور اس کی قواعد و ضوابط سے متصادم نہ ہو ناقابل قبول
نہیں رہتا بجز اس کے کہ اس پہلو کو مسئلہ کا بنیادی مقام دینے کے بجائے اُسے ضمنی اور فرعی مقام پر
رکھ دیا جائے ترک نہیں کیا جاتا۔ اس طرح سے کوئی بھی حقانی فرقہ اور اس کا کوئی بھی اعتقادی
مسئلہ جبکہ تھوڑی سی توجیہ کے بعد اس مسلک سے باہر نکلنے نہیں پاتا، صرف مقصودی اور غیر مقصودی
درجہ کا فرق باقی رہ جاتا ہے تو اُسے بھی کلیۃً متروک کر دینے کی صورت پیدا نہیں ہوتی جبکہ وہ کسی
نص کے محتملات یا کسی شرعی اصول کی فرعیات کے دائرہ میں ہے، اس لئے اس جامع مسلک
میں یہ اسلامی فرقے بھی اصل فرقۂ حقہ سے کلیۃً جدا نہیں ہوتے بلکہ اس سے قریب تر ہو جاتے
ہیں، صرف فرق اتنا ہی ہے کہ وہ رہ جاتے ہیں جو حق کے دائرہ میں داخل ہی ہونا نہیں چاہتے، اسی
وہ طبقات جو اسلامی حلقوں میں محض اپنے عقلی تنگ دائرے سے شبہات کا شکار ہو کر جمہور کے
مسلک سے جدا نظر آئیں وہ اور جدید طبقے جو زمانہ سازی کر کے غیب کو بھی شاہد ہی کی ترازو میں تولنے
کی سعی میں لگے ہوئے ہیں تو یہ ولی اللہی مسلک چونکہ جامع عقل و نقل اور جامع معقول و محسوس ہے
اور اس میں تمام اعتقادات اور اصول کلیہ کو عقلی براہین اور فطری مصالح کے لباس میں پیش
کیا گیا ہے جو اس قسم کے عقلی شبہات کے لئے دافع اور عقلی الجھنوں میں پھنسے ہوئے طبقات

کے لئے عقلی تشفی و تسکین کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے تو مسلکِ حق سے ان طبقات کے نکل بھاگنے کا سوال بھی باقی نہیں رہتا جو مزید و مترقیات کے ان عقلی براہین کو کانوں میں جگہ دیں اور دل کو مطمئن کرلیں، چنانچہ تجربات شاہد ہیں کہ اس قسم کے عقل پسند لوگوں نے جب بھی اس شرعی مسلک کو عقلی سانچوں اور فطرتِ صحیحہ کے محسوسات میں جلوہ گر دیکھا ہے تو سارے شکوک زائل بھی ہو گئے ہیں اور وہ بصد شوق نہ صرف یہی کہ قطعی یا بے توجہی کا اقرار کر کے اس مسلک سے قریب ہو گئے یا اس کے حامی بن کر اسی کا ایک فرد بن گئے ہیں، تاہم اس کے بعد سیاسی طبقے رہ جاتے ہیں جو دین و ملک کو الگ الگ سمجھنے کے عادی ہیں اور ہر وقت جنہیں دین کے نام سے اپنے سیاسی مقاصد کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے تو اس مسلک اعتدال میں شرعی سیاست کے وہ اصول تو مع بھی کتاب و سنت سے اخذ کر کے پیش کر دیئے گئے ہیں جو ان تمام خطرات کا جواب ہی نہیں بلکہ سیاسی مقاصد کی تحصیل کا فطری راستہ بھی ہیں۔

بہرحال اس مسلک اعتدال کا دائرہ اصولاً اس حد تک جامع، وسیع اور صدودی ہے کہ نہ اس سے اجتہادی طبقات جدا رہ سکتے ہیں نہ کلامی گروہ اور نہ عقلی اور فلسفی حلقے کٹ سکتے ہیں جبکہ ان کے مسلمات سب اس میں لپٹے ہوئے ہیں، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہیں کہ ولی اللّٰہی مسلک نے تمام فرقوں، تمام حلقوں اور تمام طبقات کو اصولاً اپنے اندر سمیٹ کر کے جمع کر لیا ہے، جس میں مرکزیت کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی بھی معقول پسند علمی طبقہ کو اپنے سے باہر نہیں رہنے دے سکتیں، اور جب بھی انہیں حالات اور حق پسندی سے کام میں لایا جائے گا، وہ ان سب کے لئے ایک تشفی بخش مستقل اور جامع مرکز تو ثابت ہوں گی ورنہ باہمی نزاعات یا قومی تفرقے کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں گی۔ چنانچہ حجۃ اللّٰہ کا ایک مستقل بحث، سیاسیات، عمرانیات، مدنیات اور معاشرت پر مشتمل ہے، جس کا لقب آ کے یہاں ارتفاقات ہے اور اس میں سیاسی شعبے کی شرعی حیثیں اور شرعی نقاط فطری دلائل سے کھول کر رکھ دیئے گئے ہیں، جس سے آج کی سیاست کا بھی کوئی معقول نظریہ خارج نہیں

اس لیے سیاسی تبلیغات کے لیے بھی یہ مسلک ایک جامع مرکز کی حیثیت رکھتا ہے جس پر یہ حلقے جمع ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اسے دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

دیوبند دارالعلوم کے اس مسلک کا دوسرا پہلو روحانی تربیت، اخلاق اور تزکیہ نفس ہے جو ریاضات و مجاہدات اور سلاسل تصوف سے وجود پذیر ہوتا ہے، اس مسلک کے تحت جماعت دیوبند کے اکابر کثرت سے بیشتر سلسلہ چشتیہ سے اور بہت سے اکابر سلسلہ نقشبندیہ سے وابستہ ہیں نقشبندیہ خاندان کا قریبی مرجع و ملجا مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی ہیں، مشائخ چشتیہ خاندان کے ملجا و ماویٰ حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی ہیں، دونوں ہم عصر ہیں اور ایک ہی دور میں ہمہ گیر انداز سے فیض رساں رہے ہیں اس لئے اس ملک میں یہی دو سلسلے زیادہ معروف اور زیادہ رائج ہیں، چشتیت میں قلندرانہ رنگ غالب ہے جس کی خاص کیفیات شورش، ذوق و شوق، وجد و طرب وغیرہ ہیں، جس کے تحت یادِ حق کا حال و قال اُن پر زیادہ طاری ہوتا ہے اور اس سے ان کی زندگی کا عنوان افروختگی و سوختگی رہا ہے، اور نقشبندیہ میں اخفا اور تستر، سکوت و صمت اور ضبط و تحمل کا غلبہ ہے جس سے وہ اس شعر کے سچے مصداق ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند — کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

بظاہر دونوں سلسلوں میں تضاد کی نسبت نظر آتی ہے، گو منزلِ مقصود ایک ہے، لیکن ان دونوں سلسلوں کے مذکورہ بزرگوں حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ عبدالرحیم میں غیر معمولی طریقہ پر جانبین سے تاثیر و تأثر کی صورت پیدا ہوئی اور صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق جانبین کی نسبتوں میں تبادلہ کیفیت کی شکل نمایاں ہوئی، واقعہ طویل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ پر بسط و انبساط اور شگفتگی کی کیفیت رہتی تھی اور حضرت شاہ عبدالرحیم پر خوف و خشیت، لرزہ و براندامی، حزن و فکر اور گریہ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

حضرت سید صاحب کے سفر جہاد کے موقع پر دونوں بزرگ پھلت کی مسجد میں جمع ہو گئے اور باہمی جذب و کشش سے ایک بند کمرے میں یکجا ہو گئے، باہر آئے تو سید صاحب رو رہے تھے

اور شاہ صاحب رنگِ چشتیت میں تھے یعنی ہر ایک کی نسبت دوسرے پر اثر انداز ہوئی، جسے یوں
تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ چشتیت اور نقشبندیت میں باہمی آمیزش ہوئی اور دونوں بزرگوں کے
پاکیزہ آثار و کیفیات ایک دوسرے میں پہنچ کر مخلوط ہو گئے، جس سے سید صاحب کی نقشبندیت
میں تو قدرے شور و فغاں اور گریہ و بکا کے اثرات نمایاں ہو گئے اور شاہ صاحب کی چشتیت میں
ضبط و سکوت علم و آداب شریعت کے تحت اتباعِ سنت کے وقار و تمکنت نے غلبہ پا لیا جس سے
حضرت شاہ عبدالرحیم کی یہ نقشبندیت آمیز چشتیت ان کے ارشد خلفاء حضرت میاں جی نور محمد
جھنجھانوی قدس سرہ میں جلوہ گر ہوئی جس میں باطنی سوز و گداز کے ساتھ ادبِ شریعت و اتباع
سنت کا رنگ غالب ہو گیا، جسے حضرت میاں جی صاحب نے ان الفاظ میں ادا فرمایا جیسا کہ مجھ
سے محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند نے بارہا
سنایا کہ "فقیر نے ایک ایسی ہنڈیا پکائی ہے کہ نہ سو برس پہلے پکی تھی نہ سو برس بعد میں پکے گی"۔
اس پر حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ قیامِ دارالعلوم کے دور کے رمز شناس اہل اللہ کا
نظریہ یہ تھا کہ حضرت میاں جی صاحب کی وہ سو برس والی ہنڈیا یہ دارالعلوم دیوبند ہے جس میں شریعت
کے ساتھ طریقت اور سوختہ جانی کے ساتھ ادب دانی اور احوال و کیفیات کے ساتھ اتباعِ سنت
جمع ہے اور اسی لئے اس سلسلے کے سوز و گداز اور عالی و فغاں والے لوگ محض سوختہ جان نہیں
ادب دان بھی ہیں، یعنی باطنی سوز و گداز کے ساتھ ظاہری ادبِ شریعت اور اتباعِ سنت
کا ہے سوزشِ باطنی چشتیت کی ہے اور ادب دانی اور پیروی سنت کی علامت نقشبندیت کی
ہے اس لئے یہ سلسلہ جو حضرت میاں جی اور ان کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ سے ہوتا ہوا
حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی تک آیا تو ان بزرگوں کے فیضان سے اس کا مظہر یہی
دارالعلوم بنا جسے ہر دو سلسلوں کے اکابر کی نسبتوں کا مجموعہ کہنا چاہئے اور اسی کی شان
یہ نمایاں ہوئی کہ

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

سلاسل کے مطابق کی جاتی تھی، کتنے ہی اکابر کی تربیت ان بزرگوں سے نقشبندیہ طریق پر کی گئی ہے جو چشتیت میں نہیں چل سکے، خود حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ بھی یہ حال فرماتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں بیعت کے بعد جب میں چشتیت کے طریقہ پر نہ چل سکا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ تمہارا حصہ نقشبندیت میں ہے، چشتیت میں نہیں ہے اور پھر اسی نقشبندیت پر انہیں چلایا تو وہ آگے بڑھے اور حق تعالیٰ نے انہیں اسی میں کامیاب اور واصل فرمایا۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مسلک میں سلاسل علمیہ اور سلاسل فقہیہ کے ساتھ سلاسل صوفیہ کو بھی جمع کر دیا گیا ہے جس سے کوئی سچا نقشبندی اور سہروردی اور قادری اُن سے الگ نہیں ہو سکتے۔

یہی جامع مسلک کا نقش راسخ ہے جو شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہؒ کے فیضان سے جب حضرت قاسم العلوم پر پڑا اور وہ بشہادت شیخ اپنے شیخ کی زبان قرار پائے جیسے شمس تبریزؒ کی زبان عارف رومی ہے تو یہ جامعیت ہر وقت ان کی نگاہوں میں رہی اور اس کا عمومی ظہور دارالعلوم سے ہوا اور بالآخر یہی دارالعلوم کا مسلک قرار پایا۔ ایک کے مرجع الامر شاہ ولی اللہؒ تھے اور دوسرے کے مرجع الامر حضرت [illegible] کے خلیفۂ اعظم حضرت حاجی امداد اللہؒ تھے جن سے حقیقت تو بیعت بھی اور وہ جیسا کہ اس دارالعلوم میں امام حدیث تھے ورنہ جو استاد تھے وہ ان کے صاف معنی یہی ہوتے ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ قاسم العلوم اور دارالعلوم کا نقطۂ نظر تمام سلاسل اور اہل سلاسل کا اتحاد و یکجائی مسلک میں ان کا مطمح نظر تمام ہی مسلکوں اور حلقوں کو جمع کرنا تھا کہ صوفی اور متکلم، محدث و فقیہ اور اصولی و عارف سب ان ذرائع سے ایک جگہ جمع ہوں اور ان کے مزاج بھی باہم ممزوج اور مخلوط ہو کر مضمون واحد کی صورت سے نمایاں ہوں۔

ادھر ترتیبی سلسلوں میں سلاسل اولیا کو جمع کر رکھا تھا کہ جو چشتی ہو وہی نقشبندی بھی ہو اور جو نقشبندی یا قادری ہو وہی سہروردی اور چشتی بھی ہو تا کہ سلسلے ہی نہیں اہل سلاسل بھی قوت یکجہتی کا اعلان کریں۔ اس لئے اگر دارالعلوم کو مرکز اتحاد امت تسلیم کیا جائے تو [illegible]

بھی پیدا ہوگی اور ساتھ ہی اتحاد و طبقات کے ساتھ ان طبقات کے مراتب و درجات کا فرق بھی نمایاں
ہوگیا، اور پھر ان خواص کے اجتماع سے منتشر عوام کے جمع ہونے کی صورت بھی خود بخود پیدا ہوگئی
یہ الگ بات ہے کہ بھی لوگوں کو اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر ست کا اختصار ہی مطلوب ہو اور وہ اس
اجتماع کے قصر کے دروازے کے قریب تک بھی نہ آسکیں، بلکہ اس سے دور بھاگنا ہی اپنا مطمح نظر
بنا چکے ہوں اور انہیں نظریات تو درکنار مشاہدات کے مطالعہ کی بھی فرصت نہ ہو تو اس سے مسلک
کی جامعیت، معقولیت اور عمومیت پر کیا حرف آسکتا ہے؟ وہ اپنا خود فکر کریں۔ ارشاد فرمایا
فانما هم فی شقاق فسیکفیکهم الله وهو السمیع العلیم

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ اس مدرسہ کی روالی بنیاد ہو یا منطقی نتیجہ، دونوں ہی چیزیں ان اکابر و
اسلاف کے مکشوفات ہی سے تعلق رکھتی ہیں جو امور غیبیہ میں سے ہے، کسی عقلی سوچ بچار یا ذہنی
کاوش کا ثمرہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان بنیادوں کا مصداق یہ دارالعلوم ہے تو نتیجہ واضح ہے
کہ اس ادارہ کی حقیقت کا تعلق غیبی طاقتوں اور بشارات و اشارات غیب سے ہے، محض رسمی
مشورہ سے نہیں، بلکہ مشورے بھی خود ان اشارات ہی پر مبنی اور مرتب ہوئے ہیں، اس لئے
اس ادارہ کو رسمی اسلامی مدرسہ کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ کی
چلانے والی قوت چونکہ غیبی طاقت ہے اس لئے رفتار کی مشکلات اور موانع میں بھی اس کے لئے
غیبی غلغلہ پیدا کرنے والی طاقت آتی ہے یعنی وہی غیبی قوت ہے جس نے ابتداء ہی سے اس عالم شاہد
میں اس کو پیدا کیا اور اسی کی کارفرمائی اس درجہ نمایاں ہے کہ ہم جیسے کم ترین خدام دارالعلوم
تک بھی اس کا ہر وقت مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور کرتے آرہے ہیں، اسی طاقت کا اثر ہے کہ
اس کا کام محض توکل کے طریق پر بلا اسباب، مسبب عالمگیری کے ذریعہ جاری ہے، کارکنوں کا کام صرف
حسن نیت اور خلوص سے اسے چلانا۔

اسی طرح حضرت قاسم العلوم کا یہ خواب کہ میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں
اور میرے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں سے نہریں جاری ہیں جو اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں، جس کی

تعبیر اس دور کے بزرگوں نے یہ دی تھی کہ آپ سے علوم نبوت کا فیضان تمام دنیا میں جاری ہوگا اور قیام دارالعلوم کے بعد اہل اللہ کا یہ فرمانا کہ ان کے خواب کی مجسّم تعبیر دارالعلوم ہے یا حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نقشبندی مجاہد دیوبندی و مہتمم ثانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ علوم دینیہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں جس سے مراد دارالعلوم ہی لیا گیا تھا، درحقیقت اُسی منشاء کی تعبیر ہے جو حضرت محمد نوری اور حضرت نانوتوی کو دکھلائی گئی تھی جس سے صاف واضح ہے کہ یہ دارالعلوم اپنی حقیقت و معنویت اور اپنی ہیئت و صورت دونوں ہی کے لحاظ سے غیبی بشارات کا مظہر اور مصداق ہے، غیبی طاقتیں ہی اس کی تشکیل میں کارفرما ہیں، بہرحال اس ادارہ کے فکر میں جس پر دارالعلوم کی معنوی عمارت کھڑی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، عملی، عقلی اور سیاسی اوصاف کی ساتھ جامعیت، اجتماعیت اور عدل و اعتدال کا وصف بھی مسلک کا جوہری جز ثابت ہوا ہے، اس لئے سب مقامات اکابر وقت کے اہل اللہ کے طبقوں میں یہ مدرسہ من حیث الجماعت بلند و ستارہ کیا گیا جس نے اپنے فکر اور معرفت مزاج افراد کے ذریعہ دین کے تمام شعبوں کی تجدید کا فرض انجام دیا اور وقت کے اولیاء اللہ کی نسبتوں کا مجموعہ ثابت ہوا۔

ظاہر ہے کہ جب اس مدرسہ کی حقیقت و معنویت یعنی اس کے مرکزی فکر اور اس کے اجزائے ترکیبی کا وجود ہی الہام ربانی سے ہوا ہے تو قدرتی طور پر اس کی صورت اور تشکیل و تعمیر میں بھی الہامات الٰہیہ کا دخل طبعی تھا، کیونکہ صورت کا وجود فطرتاً اپنی حقیقت ہی کے تابع اور اس کا ظل بلکہ اسی کا مظہر ہوتا ہے جس میں وہ حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے، اس لئے اس کی معنویت ہی کے مناسب اس کی تاسیس، اس کا اجراء، اس کی تعمیر، اس کے نظم کا ڈھانچہ حتیٰ کہ اس کی بنیادی اور کلیدی شخصیات کا انتخاب تک محض عام مروجہ رسمی طریقوں سے عمل میں نہیں آیا کہ چند ذی رائے افراد نے بیٹھ کر مشورہ کر لیا ہو کہ ایک مدرسہ قائم کرنا ہے اور بحث و تمحیص کے بعد جب ایک رائے پر سب جمع ہو گئے تو اُسے عمل کا جامہ پہنا دیا ہو بلکہ اس کے مرکزی فکر کی طرح اس کے تمام تشکیلی امور بھی کچھ الہامات اور واردات غیبیہ ہی کے تابع دکھائی دیتے ہیں،

چنانچہ وہ مرکزی طاقت جو دنیائے روحانی خاندان سے تھی کہ حضرت قاسم و رشید تک پہنچا تھا صاحب الہام کو
کے قیام کے وقت میں کہ ذہنی تشکیل ہوئی تو وہ مجلسات سب اولیٰ وقت کے دلوں میں بالہام ربانی ہی
وارد ہوا اور بیک وقت ظاہری بیکلام ... کا رواج اس دور میں کیے ... ہو گئیں گویا اجماع سکوت
ہوئی اور باقتضائے آیت ... افتراء شعریہ و مشتارہ کی صورت بھی ... گئی لیکن مع
ثبوت اس میں ہی کوئی کمی نہ آئی، چنانچہ جب بھی یہ حضرات مقدسین یکجا ہوتے تو اپنے اپنے مکاشفے
ہی ایک دوسرے کے سامنے رکھتے تھے، مگر ایک بزرگ فرماتے کہ میرے دل میں یہ القا ہوا ہے کہ اب
ہندوستان میں تعلیم دین قائم کرنے کے لئے قیام مدرسہ کی ضرورت ہے تو دوسرے بزرگ کہتے کہ
یہی میرے دل میں بھی آرہا ہے، ایک کہتے کہ مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو تو دوسرے کہتے
کہ یہی میرے قلب میں بھی وارد ہو رہا ہے، چوتھے اگر یہ فرماتے کہ مجھے خواب میں دکھلایا گیا ہے کہ اب
قیام مدرسہ کی ضرورت ہے تو دوسرے فرماتے کہ یہی انکشاف میرے قلب میں بھی ہوا ہے۔ غرض
یہ ایک ہی آواز تھی جو ان تمام ارباب قلوب کے قلوب میں یکساں طور پر گونج رہی تھی جس کا خلاصہ
انہی کے تذکروں کے مطابق یہ تھا کہ اب جبکہ ہندوستان میں مسلم اقتدار ختم ہو چکا ہے جو علم دین اور
علم کی سرپرستی کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا ہے اور کوئی رہ بھی گیا ہے تو حالات کی ناسازگاری کی وجہ
سے وہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکتا جس سے علوم نبوت کا یہ ورثہ ہی کہیں گم ہو جانے کا راستہ
ہموار ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی نسل کہیں جہالت کا شکار ہو کر غیروں کے ہاتھوں نذر ہو جائے
اور اس ملک سے مسلم قوم اور دین کا خاتمہ ہو جائے، اس سے قیام مدرسہ لازمی ہے جس کے
ذریعہ قوم کو تعلیم و تربیت سے سنبھالا جائے، اگر مسلمانوں میں دینی شعور، دینی تعلیم اور دینی ضروریات
باقی رہیں گے تو دین باقی رہے گا اور ان کی دنیا بھی سنور سکے گی، لیکن اگر قوم کی بیداری ختم ہو گئی تو
تعمیر نو کا کوئی امر بھی باقی نہ رہے گا، اس لئے اب حفاظت دین کی صورت بجز قیام مدرسہ کے
دوسری نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بزرگوں کے انکشافات سامنے آئے تو یہ وحدت کسی رسمی شوریٰ کی
نہیں بلکہ الہامات ... حضرت غیب کے تب دلوں کی تھی جو باطنی اور روحانی اجماع منعقد ہو گیا

اور انھوں نے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ دیوبند کے آغاز کی صورت اختیار کر لی، جس سے واضح ہے کہ
اس مدرسہ کے قیام کا مسئلہ بھی اس کے مرکزی فکر کی طرح الہامی تھا جو منامات غیب سے وقوع
پذیر ہوا، بلکہ ان مؤسسین کے دور سے بھی کافی پہلے اسعد ولی اللّٰہی خاندان کے علاوہ ہندوستان کے
دوسرے اہل اللہ نے بھی اس مدرسے کے قیام کو اور نہ صرف قیام کو بلکہ اس کے محل وقوع کو بھی
اشارات غیب ہی سے محسوس کیا اور لطیف اشاروں میں اس کا اظہار فرمایا۔

میں نے اپنے بزرگوں سے بارہا سنا اور خاندان کے حلقوں میں یہ ایک معروف اور عام زبان زد بات
تھی اور پھر اس کی مستند تاریخی اوراق سے بھی ملتی ہے کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ
جہاد کے سلسلہ سے صوبہ سرحد جاتے ہوئے جب دیوبند سے گذرے تو اس جگہ پہنچ کر جہاں آج
مدرسہ واقع ہے فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آرہی ہے۔ حالانکہ اس وقت اس جگہ شہر کی
کوڑیاں پڑتی تھیں، مگر مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں کوڑیوں کے دن بھی پھر آتے ہیں، بالآخر
یہاں سے علم کی خوشبوئیں پھوٹ نکلیں جیسا کہ حضرت شہید کا اشارہ تھا، جس سے واضح ہے کہ اس مدرسہ
کا محل وقوع بھی پہلے اشارات غیب ہی سے متعین ہوا ہے پھر ظاہری اسباب کے تحت وقت کے ان
بندگان امت کے قلوب کے دواعی کے لئے محرک ثابت ہوا، جس سے انھوں نے بھی اپنے واجد
قلب سے اسی جگہ کا انتخاب کیا جو غیب در غیب ہوتا ہوا ان کے قلوب تک پہنچا ہوا تھا اور بالآخر
۱۲۸۳ھ میں منصۂ شہود پر بصورت مدرسہ جلوہ گر ہوگیا، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اپنے روشن ضمیر
رفقاء کے ساتھ اس اجرائے مدرسہ کے لئے مستعد ہوئے اور جب حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ
علیہ نے حضرت نانوتوی کو میرٹھ خط بھیجا کہ چندہ کی ایک مقدار بھی جمع ہوگئی ہے، اب آپ تشریف
لے آویں تو حضرت نے اسی وقت ملا محمود صاحب دیوبندی کو جو میرٹھ میں مدرس تھے وہیں بلا کر
فرمایا کہ ملا جی آپ کو یہاں کیا تنخواہ ملتی ہے؟ فرمایا دس روپے، تو حضرت نے فرمایا کہ اگر آپ
کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار ہو جائے اور قیام دیوبند ہی میں ہو جو آپ کا وطن ہے تو کیسا ہے؟
فرمایا حضرت اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے، تب حضرت نے میرٹھ ہی میں ان کا تقرر فرما کر

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے اندر بھرا اور ان سے منتقل ہو کر ان کی جماعت میں منتقل ہوا
یہ سب ہی حضرات ارباب باطن تھے اس لئے ہر ایک کے باطن میں قیام مدرسہ کا یہ جذبہ جاگزیں
ہو گیا جسے ہم نے سابقہ سطور میں الہامی اجتماعی تقاضے سے تعبیر کیا ہے مگر ظاہری طور پر ان سب اکابر
میں یہ تخیل قیام مدرسہ ہی کی حد تک تھا جس کا حاصل تعلیم دین اور اس راستے سے اس ملک میں
مسلمانوں کا تحفظ اور بقا پیش نظر تھا لیکن جہاں تک مدرسہ کے ساتھ اس کے مرکزی نکات اور اس
کے ہمہ گیر نصب العین نیز انگریزوں کے لائے ہوئے الحاد اور دنیا پرستانہ نظریات کا ایک ہمہ گیر
علمی تحریک کی صورت سے مقابلہ اور ساتھ ہی بکھری ہوئی قوم کی شیرازہ بندی اور بالخصوص اس
ملک میں شوکت رفتہ کی بازیافت یکسر اور خود اختیاری کے جذبہ کے ساتھ پورے عالم اسلامی تک
اس کے اثرات پھیلا دینے وغیرہ کے ہمہ گیر جذبات اور نظام ہائے عمل صرف ان ہی میں موجزن
تھا جو جہاد شاملی میں امام جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کی سرکردگی میں شریک معرکہ ہو کر
مسلمانوں کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، اور ان میں بھی
بالخصوص حضرت حاجی صاحب کے دست راست حضرت قاسم و رشید تھے جن میں صرف مدرسہ ہی
کا نہیں بلکہ اس کی اجتماعیت کے تصورات بھی سامنے تھے، ان فقط اجتماعیت کے معیار سے
ان جذبات میں حضرت قاسم العلوم سب سے آگے تھے، جنہیں خود ان کے شیخ طریقت حضرت
حاجی امداد اللہ ہی اپنے مکنونات قلبی کا ترجمان فرما چکے تھے جیسا کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت
قاسم العلوم کو مولانا روم سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مولانا روم شمس تبریز کی زبان تھے
جن کے ذریعہ ان کے علوم و معارف اور مکنونات قلبی ظاہر ہوئے اور ایسے ہی مولوی محمد قاسم زبان
بنا کر دئے گئے ہیں یعنی میرے علوم و معارف اور قلبی واردات ان کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں اس
لئے یہ امداد الٰہی کیفیات خاص طور سے حضرت نانوتوی میں سب سے زیادہ ابھریں، اور جب بھی حضرت
حاجی صاحب نے علم جہاد بلند کیا تو سب سے پہلے اس جھنڈے کے نیچے حضرت قاسم العلوم
ہی موجود تھے اور انہوں نے ہی حضرت گنگوہی کو بھی پانچ چھ ماہ کی گفت و شنید سے آمادہ جہاد کیا

اسی طرح اس مدرسۂ زیر تجویز اور اس کے فکری مقاصد میں بھی جو امداد کی جوہر تھا جیسا کہ واقعۂ ذیل سے
ظاہر ہوا دینی رنگ آ سکتے تھے جو خود شیخ ہی کے اعلان کے مطابق ان کے باطنی ترجمان تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم سادس دارالعلوم کی روایت
کے مطابق جب دارالعلوم کی عمارت بنائے جانے کا مسئلہ اٹھا اور حضرت قاسم العلوم نے اس کی
ضرورت ظاہر فرمائی تو حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا شمار بانیان مدرسہ میں
ہوتا ہے، مدرسہ کی مستقل عمارت سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب شہر میں وسیع جامع مسجد
موجود ہے اس کے ہر سہ جانب نئے کمرے بن رہے ہیں جن میں بہت سے طلبہ بآسانی رہ سکتے ہیں اور
جامع مسجد کا وسیع مسقف حصہ درس و تدریس کے لیے کافی ہو سکتا ہے تو پھر مدرسہ کی مستقل عمارت
میں مسلمانوں کا پیسہ کیوں ضائع کیا جائے، لیکن حضرت قاسم العلوم نے ضرورت عمارت بیان کرتے
ہوئے آخر میں فرمایا کہ حاجی صاحب اس مدرسہ کے بارہ میں آپ وہ چیزیں نہیں دیکھ رہے ہیں جو
مجھے نظر آ رہی ہے۔ یہ مدرسہ ایک جگہ رہنے والا نہیں ہے آگے بڑھنے والا ہے، مدرسہ کی مستقل
عمارت ہی سے اس کے بنیادی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ کچھ دیر تک گفت و شنید کے بعد سب کا
اتفاق طے ہو گیا اور اس موقعہ پر بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ حضرت حاجی صاحب بھی اس پر راضی
ہو گئے اور سب حضرات نے مل کر سنگ بنیاد رکھا۔

اس سے واضح ہے کہ حضرات مؤسسین اکابر مدرسہ کا تصور صرف تعلیم و تعلم ہی کی حد
تک تھا، حتیٰ کہ عمارت مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھے جانے تک بھی یہی رہا۔ جب کہ مدرسہ کے اجراء کو آٹھ دس
سال بھی گزر چکے تھے، یہ وسیع اور عالمگیر تصور صرف ان کے سامنے نہ تھا جو حضرت قاسم العلوم
اور ان کے رفقاء جہاد شاملی یا اشارات غیب اور وجدان ولی اللہی ہونے کی بنا پر اپنے اندر لیے
ہوئے تھے اور جہاد شاملی کے ختم ہو جانے سے اور بھی زیادہ قوت و عزیمت کے ساتھ ابھر آئے
جس کا سرچشمہ حضرت حاجی امداد اللہ اور سرحلقہ حضرت قاسم العلوم تھے۔

اس دور میں بھی وہ امداد اللہی تصور ہی اوپر تعلیم کا پردہ تھا اور جب اسی تعلیمی ادارے سے

کے بعد اُن کے علمی جانشین شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ نے ان ملی مقاصد کو آگے بڑھایا اور پھر ان کے تلامذہ نے بھی تعلیمی لائنوں کو مضبوط کیا مگر اجتماعی مہمات سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ آزادی کی تمام تحریکات میں قائدانہ حصہ لیا اور ان کے سرخیل اگر انگریزوں کے مقابلہ میں میدانِ شاملی میں سربکف تھے تو اُن کی ذریت بھی انگریز کے مقابلہ میں قید و بند اور جیلوں میں سربکف رہی، اور آج بھی کلمۂ حق کہنے میں آگے ہی آگے ہے۔

دارالعلوم کے اسی وسیع اور ہمہ گیر تصور کے پیشِ نظر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ مدرسہ تکوینی طور پر اس ملک کے تمام معاملات میں قطب (مرکزی کیلی) کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے اردگرد یہاں کے اجتماعی معاملات شعوری و غیر شعوری طور پر گھومتے ہیں اور تشریعی طور پر وہ ایک مجدد کی حیثیت رکھتا ہے جس نے دین کے مختلف گوشوں کی تجدید کی ہے اور خلافِ شرع رسوم و بدعات کو مٹا کر اتباعِ سنت کا راستہ ہموار کیا ہے، یہی وہ ہمہ گیر تصور تھا جس پر مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی اور اسی ہمہ گیری اور اجتماعیت کے جذبات سے بھرے ہوئے وہ ہشت گانہ اصولِ اساسی حضرت قاسم العلوم نے مرتب فرمائے جن پر اس مدرسہ کی اساس قائم ہے اور وہ تاحال رواں دواں ہے، اسی اجتماعی تصور پر اس کی تعلیم کا نظم اور اسی پر اُس کے انتظامی سلسلے کا ڈھانچہ وضع ہوا، اسی پر اس کی وہ تعلیمی خصوصیات منصۂ ظہور پر آئیں جو شاہ ولی اللہ سے سلسلہ وار نسبتِ قاسمی پر وارد ہوئیں اور وہی نسبت کے ساتھ اس مدرسہ میں علمِ حدیث اور سند و متن کا ظہور ہے جس کے تحت آج تک اس کے تربیت یافتہ فضلاء یہاں پرورش پا رہے ہیں، اسی بنا پر کہا گیا ہے اور غور سے دیکھا جائے تو بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت درحقیقت قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے جس کی وجہ سے فضلاء دیوبند اپنے کو قاسمی لکھتے اور کہلاتے ہیں۔ میرے ماموں دیوان محمد یٰسین صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ سے جو بات ارشاد فرمائی اُس سے واضح ہے کہ اس مدرسہ کا بنیادی فکر امدادی الہام سے مستفاد ہے اور مجاہدینِ شاملی کے مصفّٰی قلوب ہیں۔

پس وہاں چھتہ صاحب لاتعداد تو ہم پایہ اہل اللہ کے قلوب سے چل کر اس کی صورت حقانی مدرسہ دیوبند کی ہو گئی۔ اس سب کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ قیام مدرسہ کے سلسلہ میں سعی و کوشش کا محور ان بزرگوں کے یہاں اسباب ظاہری نہ تھے بلکہ اسباب غیبیہ تھے اور انہی پر ان کا مدار تھا۔ دوسرے یہ کہ ظاہری اسباب اگر قیام مدرسہ کے محل وقوع کے لئے کسی کا کوئی خیال بھی قائم ہوتا تھا تو غیبی اشارہ عمل میں پھر وہی غیبی سلسلہ کشف و انکشاف غالب آ جاتا تھا جو غیبی حرکات سے واضح ہی اور پھر خارج میں وقوع پذیر ہونے والا ہوتا تھا۔ بہر حال جیسے اس مدرسہ کا مرکزی فکر الہامی تھا ایسے ہی اس کے قیام کے دواعی بھی الہامی تھے اور ایسے ہی اس کے محل وقوع کی تشخیص بھی الہامی تھی۔

اسی محل وقوع پر جب تعمیر کا مسئلہ سامنے آیا اور اہل اہتمام نے مدرسہ کی عمارت کے لئے ایک خاکہ تجویز کر کے بنیاد بھی کھدوا دی اور ابھی بھری نہیں گئی تھی کہ شب میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ دیوبندی مہتمم ثانی دارالعلوم نے جو نقشبندیہ خاندان کے اکابر اولیاء میں سے تھے خواب میں دیکھا کہ اسی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف ارزانی فرمائی۔ دست مبارک میں عصا ہے آپ نے فرمایا کہ شمال کی جانب جو یہ بنیاد کھودی گئی ہے اس سے صحن مدرسہ چھوٹا اور تنگ رہے گا یہ فرما کر آپ نے اس جگہ سے جانب شمال دس بیس گز آگے بڑھ کر عصائے مبارک سے نشان لگایا اور ایک لمبی لکیر کھینچ دی کہ اس جگہ بنیاد کھودی جائے۔ بیدار ہونے پر علی الصباح مولانا ممدوح اس جگہ پر پہنچے تو لکیر کا نشان اسی طرح موجود پایا جس طرح حضور نے عصائے مبارک سے لگایا تھا۔ مولانا نے پھر نہ ممبران سے پوچھا نہ کسی سے مشورہ کیا بلکہ نئی بنیاد اسی جگہ کھدوائی۔ اس سے واضح ہے کہ اس مدرسہ کی تعمیر کا آغاز اور اس کے رقبہ و صحن کی حد بندی بھی مبشرات غیب ہی سے ہوئی ہے ورنہ مشورے تو پہلے ہو ہی چکے تھے جن کی رو سے بنیاد بھی کھودی جا چکی تھی مگر مشوروں پر اس غیبی بشارت اور ایمائے نبوی کو بہر حال مقدم رکھا گیا جیسا کہ اس کا یہی حق تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خواب رویائے صادقہ بلکہ ایک گونہ

کشف کا ... مرحلے ہو سکے تھے جس کے واقعی ہونے میں مولانا رفیع الدین صاحب کو ادنیٰ شک و شبہ نہ تھا اور محض حسب وعدہ نبی کے پورے ہونے پر حق جو اعتقادی نذر دکھلا سکے ورنہ پوری جماعت کی متفقہ تجویز کو محض مراقبہ و خیال پر اس آسانی سے قربان نہ کر دیتے، پھر اسی کے ساتھ پوری جماعت کا اس پر متفق ہو جانا، اپنی تجویز کا عدم کر دینا اور مولانا کے اس قدم پر کسی درجہ میں بھی چون و چرا نہ کرنا بلکہ بطور رغبت راضی ہو جانا اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ یہ سب اسباب باطن بھی اسی الہام ہی کے درجہ کا خواب بھی رہے تھے۔ جس سے اس مدرسہ کی بنیاد و اساس اور تعمیرِ امور کا بھی بشارتِ غیبی ہی سے تعلق واضح ہوتا ہے۔

پھر مدرسہ کے اساسی اصول ہشتگانہ جو حضرت بانی مدرسہ نے بطور یادگار بالاہتمام تحریر فرمائے وہ بھی الہامی ہی سمجھے گئے ہیں کیونکہ ان میں اصول عقلی و تجربی کی ساتھ بعض پیشین گوئیاں بھی شامل ہیں جو سوائے الہام کے محض عقل و دانش سے نہیں کی جا سکتیں، جیسے ان ہی اصول ہشتگانہ میں مدرسہ کی آمدنی کا مدار توکل اور ایک گونہ بے سروسامانی پر رکھتے ہوئے حضرت نے بطور پیشین گوئی کے فرمایا کہ "ایسا نہ ہونے کی صورت میں یوں نظر آتا ہے کہ امداد غیبی منقطع ہو جائے گی" اس سے اول تو سرمایۂ مدرسہ کا امداد غیبی ہونا واضح ہوتا ہے اور پھر مستقبل کے بارہ میں یہ کہ "یوں نظر آتا ہے" صاف غیبی اطلاع کی طرف مشیر ہے جسے غیبی الہام کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو بانیانِ مدرسہ میں شامل رہے اسی عنوان سے اپنی نظم "ارتقاء مدرسہ" میں ظاہر فرمایا ہے ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جیسے اس کے لئے
کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا

اسی طرح ان اساسی اصول کی بعض اور دفعات میں بھی اسی قسم کے الفاظ ملتے ہیں کہ اگر

اسی پر عمل نہ کیا گیا تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں وغیرہ وغیرہ

اسی لئے مدرسہ میں آنے والے مفکر اور دانشور قسم کے واردین و صادرین نے بھی جب ان اصول کو دیکھا تو انہیں الہامی ہی بتایا، چنانچہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم تحریک خلافت کے زمانہ میں جب دار العلوم میں تشریف لائے اور انہیں ان اصول کے بارہ میں حضرت ہی کی خود نوشتہ اصل تحریر دکھلائی گئی تو مولانا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بے ساختہ فرمایا کہ ان اصول کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو الہامی ہیں، پھر فرمایا کہ حیرت ہے کہ سو برس پہلے کہا گیا کہ ہم آج جس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اپنے اجتماعی اداروں کو انگریز کی کسی امداد پر ہرگز معلق نہ رکھیں بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہی ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں، حیرت ہے کہ یہ بزرگ سو برس پہلے اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے جس سے یہ حقیقت صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ اس مدرسہ کے اصول و معاملات کی تہ ہی سے جو آئندہ دور یہی محسوس کرتا تھا کہ یہ کارخانہ بلاشبہ الہامی اور اشارات غیبیہ کا رچا بسا ہے جس سے اس کا الہامی مدرسہ ہونا معروف عام ہو چکا تھا، نیز اس سے یہ بھی نمایاں ہے کہ ایک مدرسہ ہی نہیں بلکہ اس کے سرمایہ کی صورتیں بھی کچھ الہام ہی سے تعلق رکھتی ہیں، پھر اس مدرسہ کے انتظامی امور اور اہتمام مدرسہ کی جزوی تجاویز تک میں بھی کچھ اشارات غیبی ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ اس کا شاہد عدل ہے کہ مدرسہ کا اہتمام میں نہیں کرتا بلکہ حضرت نانوتویؒ کرتے ہیں حالانکہ حضرت نے باوجود مدرسہ کی ساری مساعی اور اپنی پوری سرپرستی و نگرانی کے مدرسہ کے نظم حتی کہ عمل مدرسی سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا اور مولانا فرماتے ہیں کہ مدرسہ کا پورا نظم و نسق حضرت نانوتوی ہی فرماتے ہیں، اس کی تفصیل مولانا نے یہ فرمائی کہ نظام مدرسہ کے بارہ میں جو چیز بھی حضرت کے قلب پر وارد ہوتی ہے وہی بعینہٖ میرے قلب میں منعکس ہو جاتی ہے اور میں کر گزرتا ہوں، اور یوں میں حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ مولانا! اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، یہی میرے دل میں بھی آیا تھا اس کے معنی بجز توافق غیبی یا اشارۂ غیبی کے اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اسے ایک الہام ہی نہیں بلکہ

تو اسے الہام بھی کہا جائے گا، جس سے اس مدرسہ کے نظم و نسق میں بھی الہامات و مبشرات کا کافی
دخل ثابت ہوتا ہے۔ واقعات پر نظر کی جائے تو انتخاب طلبہ کا معاملہ بھی عام تدبیری ہی کے علاوہ
جس سے باہر کوئی چیز بھی نہیں جا سکتی خصوصی طور پر بطرز الہام و مبشرات ان صدور منیر پر گوشہ پر
کچھ غیبی ہی انداز سے منکشف ہوتا تھا اور جس کے اشارات کا ذکر فرماتے تھے، جن پر یہ واقعہ دارالعلوم
کے تحریری اوراق میں مرقوم ہے اور اس احقر نے بلا واسطہ بھی اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک
دن مولانا رفیع الدین صاحبؒ اپنے عہد اہتمام میں احاطہ مولسری میں زیر چبوترہ عمارت موجودہ کھڑے
ہوئے تھے، چند طلبہ بھی حاضر تھے کہ دورۂ حدیث کا ایک طالب علم مدرسہ کے مطبخ سے کھانا لے کر
جھنجھلایا ہوا آیا اور اس نے نہایت گستاخانہ انداز سے شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے زمین پر پٹخ کر
کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام اور نظم کہ اس پانی جیسے شوربے میں دیکھئے ہے نہ مسالہ اور نہ گھی اور الفاظ
بھی سخت سست کہے، طلبہ کو غصہ بھی آیا مگر مولانا کے ادب اور ان کی خاموشی کی وجہ سے وہ بول
نہ سکے، مولانا نے نہایت تحمل اور بردباری سے اس طالب علم پر سر سے لے کر پیر تک ایک نظر ڈالی
اور اس کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ کیا یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ مدرسہ کا
طالب علم نہیں۔ طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت اس کا نام تو باقاعدہ دفتر مطبخ میں درج ہے اور باقاعدگی
کے ساتھ برابر مطبخ سے کھانا لے رہا ہے۔ فرمایا کچھ بھی ہو یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ جب چھان
بین ہوئی تو چند دن کے بعد حقیقت کھلی کہ یہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں بلکہ اس کا ہم نام ایک
دوسرا طالب علم ہے جس کا باقاعدہ مطبخ سے کھانا جاری ہوا تھا اور رجسٹروں میں اسی کے نام کا
اندراج بھی تھا مگر اشتراک نام سے اس گستاخ طالب علم نے قبضہ کر لیا اور دھوکہ سے خود کھانا
لینا شروع کر دیا جس سے اصل مستحق بیچارہ محروم رہ گیا۔ بات کھل جانے پر طلبہ نے مولانا کی خدمت
میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت بات وہی نکلی جو آپ نے فرمائی تھی کہ یہ مدرسہ دیوبند کا
طالب علم نہیں، مگر باوجود ان اندراجات کے حضرت نے اسے وثوق اور یقین سے کیسے فرما دیا
تھا کہ یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں؟

فرمایا کہ ابتداء اہتمام میں، میں اہتمام سے گھبراتا تھا، چھوڑنے کا ارادہ کرتا تو حضرت نانوتوی تشریف لائے (کیونکہ انہی کے امر پر مولانا نے اہتمام قبول فرمایا تھا) اسی دوران میں نے خواب دیکھا کہ دارالعلوم کا یہ کنواں (جو احاطہ مولسری میں واقع ہے) دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اوپر کی منڈیر تک دودھ آیا ہوا ہے کہ ہاتھ سے دودھ لے سکتے ہیں، اس کی منڈیر پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تشریف فرما ہیں، اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں لوگ دودھ لے کر جا رہے ہیں، کوئی مشک بھر کر لے جا رہا ہے، کوئی بالٹی بھر کر، کوئی لوٹا بھر کر، کوئی پیالہ بھر کر، اور جس کے ہاتھ میں کوئی برتن نہیں وہ چلو ہی بھر کر لئے چلا جا رہا ہے، غرض اپنے اپنے ظرف کے بقدر لوگ دودھ لے کر جا رہے ہیں۔

خواب دیکھ کر میں اس کا مطلب اور تعبیر سمجھنے کے لئے مراقب ہوا تو منکشف ہوا کہ کنواں تو مدرسہ دیوبند کی صورت مثالی ہے، دودھ علم کی صورت مثالی ہے، ذات اقدس نبوی قاسم العلوم والعلم کی تقسیم کنندہ) ہے اور دودھ لینے والے لوگ مدرسہ دیوبند کے طلباء ہیں جنہیں خواب میں متشکل کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں عجیب بات مولانا نے یہ ارشاد فرمائی کہ جب تعلیم کا سال شروع ہوتا ہے (یعنی شوال) اور داخلہ کے لئے طلبہ آتے ہیں تو داخلہ لینے والوں میں سے میں ہر ایک کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی ان دودھ لینے والوں میں تھا اور یہ بھی۔ میں نے اس گستاخ طالب علم پر سر سے لے کر پیر تک تین بار نگاہ ڈالی یہ اس مجمع میں تھا ہی نہیں، اس لئے میں نے فراست سے کہہ دیا کہ یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم نہیں ہے۔ اور الحمدللہ کہ داخلہ رجسٹروں سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس مقبول درسگاہ کے طلبہ کا انتخاب بھی کچھ غیبی تحریکات ہی سے متعلق ہے جو غیب میں پیدا ہوتا ہے، محض ظاہری اسباب ہی کار فرما نہیں ہیں، باوجودیکہ اختیار بھی کئے جاتے ہیں اور اختیار کیا جانا ضروری بھی ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ میں انہی روشن ضمیر بزرگوں کے فیضان اور تصرف کا ثمرہ ہے آج بھی یہ دیکھا جا رہا ہے کہ خاص حالات اور کسی فتنے کے موقع پر اس نوع کے طلبہ کارگزار

کے عزل و نصب کے بارہ میں ذمہ دار کتب میں وہ چیز ضرور سانح ہو جاتے ہیں جو بظاہر اسباب
تدابیر کے بر خلاف کیے جاتے ہیں مگر نتیجہ خدا ساز طریقہ پر بہتر ظاہر ہوتا ہے جسکے تحت بہت سے واقعات
ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غیبی اشارات کی رو سے جو ورثہ اکابر سے آج تک یہی اس ادارہ
میں کارفرما ہے اور ابھی تک اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ انشاء اللہ۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس
دارالعلوم کے تقرر اہتمام کے موقع پر مشاورت کے دوران میں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے مختلف رائیں سامنے
آئیں لیکن حسب روایت مولوی محمود صاحب رامپوری ممبر شوریٰ دارالعلوم دیوبند، حضرت
گنگوہی رحمۃ اللہ نے جب یہ فرمایا کہ میں نے تین بار اس مسئلہ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تینوں
دفعہ حافظ احمد صاحب ہی کا نام آیا ہے کہ انہی کے ہاتھ پر اس مدرسہ کی ترقی ہے۔ تو سوائے
غیبی اشارہ کے اور کیا کہا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خوش خانہ اعتقاد کی چیزیں ہیں لیکن اس
دارالعلوم کی تاریخ کو ان وجدانیات سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا جبکہ اس کی بنیاد ہی میں
یہ اعتقادی روح کھپی ہوئی ہے۔ اس لئے اس میں علمائے ربانی عظمت کے ساتھ قرب کی حیثیت
کا سلسلہ بھی قائم ہے جسے اس کی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر یہ بزرگ کورے
دانشور ہوتے تو گنجائش تھی کہ ان کے بارہ میں یہ امور کچھ بے محل کہے جاتے لیکن ان کے عارف باللہ
اور صاحب کشف و کرامت ہونے کی صورت میں یہ امور بلاشبہ تاریخ میں تقدم کا درجہ رکھتے
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کے فیض یافتہ زمانوں میں جنہیں فضلاء دیوبند کہا جاتا ہے اپنے ادارہ
کے ساتھ کسی رسمی تنظیم کا سلسلہ قائم نہیں، لیکن پھر بھی خوب سے خوب اور دور دراز سے دور میں
اس درجہ وابستہ ہیں کہ کسی رسمی تنظیم سے ما فوق ایسی وابستگی ممکن نہیں ہوتی۔ تنظیم کا سلسلہ اگر
قائم کیا جائے جو عموماً زبانوں پر آتا ہے تو اس کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن اس الہامی
ادارہ میں اس روح کے بغیر یہ بھی کارآمد و موثر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا اصل مراد روح ہے
رسم نہیں، حقیقت ہے نمائش نہیں، اعتقاد ہے تشہیر نہیں، اور معنویت ہے محض ظاہرداری نہیں

گو تنہا صورت سے انکار بھی نہیں۔

یہ چند واقعات اس لئے سپردِ قلم کئے گئے کہ دارالعلوم کی تاریخ کے ساتھ اس کی اصلیت معنویت اور حقیقت بھی سامنے آ جائے اور واضح ہو جائے کہ دارالعلوم صرف یہی نہیں ہے کہ ایک وسیع اور طویل و عریض رقبہ میں اس کی عمارات پھیلی ہوئی ہیں، یا سینکڑوں شعبوں پر اس کا نظامِ عمل منقسم ہے، یا سینکڑوں سے متجاوز اس کا عملہ ہے یا اس میں بہت سے دفاتر ہیں یا اس میں سینکڑوں طلبہ کا ہجوم ہے اور وہ اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کا مرکز ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب چیزیں اگر ہیں اور ضرور ہیں تو اس کی صورت سے متعلق ہیں، حقیقت سے نہیں۔ حقیقت و ماہیت وہی باطنی قوتیں اور اس کی وہ معنوی حقیقتیں ہیں جو اس کے مرکزی فکر، بنیادی نصب العین دینی مزاج اور منشاءِ تعمیر و تاسیس میں سموئی ہوئی ہیں اور اربابِ قلوب اور اصحابِ روحانیت سے مسلسل اور متصل نسبتوں کے ساتھ اس میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور جو درجہ بدرجہ قلب بہ قلب باطنی رشتوں سے منتقل ہوتی آرہی ہیں، جس سے یہ ادارہ ایک بڑا اہل اللہ کی نسبتوں اور روحانیتوں کے انوار کا محور ثابت ہوا ہے اور ایک ایسا مرکزی دائرہ بن گیا جس میں علم و اخلاق کی یہ مختلف الانواع شاخیں محض کتابوں کے کالے نقوش سے جمع نہیں ہو گئیں بلکہ ان میں کتنے ہی اربابِ قلوب کی ہمتیں اور کتنے ہی سلف و خلفِ صالحین کے تصرفات جڑ کر آئے اور وہ مجموعۂ انوار و برکات بنا۔ اس لئے خلاصہ کے طور پر اگر نسبتوں کی اس جامعیت کو لفظوں میں لایا جائے تو اس کے مسلک و مسالکین کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس ادارہ کا مسلک جیسے جامعِ علم و معرفت، جامعِ عشق و مستی، جامعِ عمل و اخلاق، جامعِ دیانت و سیاست، جامعِ روایت و درایت، جامعِ خلوت و جلوت، جامعِ عبادت و مدنیت، جامعِ اسرار و حکمت، جامعِ صبر و شکر، جامعِ جذب و سلوک، جامعِ حال و قال اور جامعِ ظاہر و باطن ہے۔ اسی طرح اس مسلک کے سالک بھی درجہ بدرجہ ان نسبتوں کے جامع ہیں جو اُس کے ماحول سے یقین کرتے رہے ہیں اور ان مسلکی نسبتوں کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے

ہیں کہ وہ اصل کے لحاظ سے مسلم، فرقے کے لحاظ سے اہل سنت والجماعت، مذہب کے لحاظ سے حنفی، مشرب کے لحاظ سے صوفی، کلام کے لحاظ سے اشعری، سلوک کے لحاظ سے چشتی نقشبندی، فکر کے لحاظ سے ولی اللہی، برہان و بیان اور حکمت پسندی کے لحاظ سے قاسمی، تفقہ اور فقہ شناسی کے لحاظ سے رشیدی، اجتماعیت کے لحاظ سے محمودی اور مرکزی نسبت کے لحاظ سے دیوبندی ہیں، جو صرف مدرسہ کے احاطے سے مختص نہیں بلکہ اس میں تمام وہ مدارس اور ان کے وہ تمام علمی و عملی ادارے اور حلقے شامل ہیں جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مختلف رنگوں سے دین کی اشاعت و ترویج اور تعلیم و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ مختصر یہ کہ ان گوناگوں نسبتوں کے تحت اس جماعت کا طرۂ امتیاز علم و اخلاق کی جامعیت، وسعت نظری، روشن ضمیری اور سوادِ اعظم کے ساتھ دین و ملت، اور قوم و وطن کی خدمت، اس کا مخصوص شعار رہا ہے، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم ہی کو حاصل رہی ہے، جبکہ یہ تمام شعبہ ہائے زندگی علم ہی کی روشنی میں صحیح طور پر بروئے کار آ سکتے تھے، اور اسی پہلو کو اس نے آج تک نمایاں رکھا ہے، جس سے اس میں مذکورہ جامعیتیں نمایاں ہوئی ہیں، اور ان کے حقائق و تعبیر مختلف صورتوں میں متشکل ہو ہو کر دنیا کے سامنے آتے رہے ہیں۔ اور انہی حقائق نے یہ مختلف مظاہر اختیار کر لئے ہیں جنہیں ہم تاریخ دارالعلوم کے نام سے پیش کر رہے ہیں، اس لئے جہاں تک دارالعلوم کی اس تاریخ کا سوال ہے اس کی روح یہی ضروری و ناگزیر تھی کیونکہ اس دنیا میں روح کا قیام جسم کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے جسم اور اس کے احوال و عوارض سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، بلکہ بہر دو مصالح کے لحاظ سے وہ ضروری اور ناگزیر ہے ورنہ گر یہ تاریخی حقائق اور وصف کے رنگ میں نتیجہ خیز و عبرت آموز اور ہدایت و رحمت ہو سکتے تو نہ فرمایا جاتا کہ

لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب ما كان حديثا يفترى ولكن تصديق الذي بين يديه وتفصيل كل شيء وهدى وبشرى للمسلمين ط

نکلتا تھا، جس میں سنوی رنگ کم، تاریخی حالات کا عنصر زیادہ آتا تھا، اس سے اخلاقی نتائج کے
علاوہ مالی نتائج چندوں کے اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوا، جس کے بارہ میں خود روداد ہائے
چندہ شاہد ہیں۔ اس کے بعد ۱۳۸۲ھ میں دار العلوم کے عمومی نظم و تعلیم اور متعلقہ حالات
کے سلسلہ سے کچھ اوراق اصولی دور کی اندر ہی مرتب کئے گئے جو کتابی صورت میں شائع
ہوئے، دفتر نے اُسے تاریخ دار العلوم کے نام سے شائع کر دیا، حالانکہ وہ دار العلوم
کی تاریخ نہ تھی بلکہ تعارف تھا، مگر سنوی حالات سے الگ ہو کر اصولی اور مجموعی صورت میں تھا،
جس میں اصولی عنوانات کے تحت کچھ مثالیں پیش کی گئی تھیں، استقصاء اور احاطہ پیش نظر نہ
تھا، بہر حال یہ سب کچھ ہوا مگر تاریخ دار العلوم کا خانہ بدستور خالی تھا اور اس کی شدید ضرورت
تھی، مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ آیا تو اس کی ضرورت متفقہ طریق پر محسوس کی گئی، اور اس کی
جامع تدوین اور اہمیت کے پیش نظر تاریخ نویسی کے لئے ہمارے محترم بھائی سید محبوب
صاحب رضوی ناظم کتب خانہ دار العلوم کا انتخاب عمل میں آیا، جنہیں طبعی طور پر تاریخ سے
لگاؤ اور اس فن سے مناسبت ہے اور واقعہ نگاری کا فطری سلیقہ ہے، دار العلوم میں
جب کبھی تاریخی سوالات آتے ہیں تو انہی سے اس بارہ میں مدد لی جاتی ہے اور وہ انہیں
اسلوب سے اس کام کو بڑے سلیقہ سے انجام دے دیتے ہیں، اس لئے تاریخ دار العلوم کے
سلسلہ میں یہ انتخاب نہایت موزوں اور برمحل ثابت ہوا، برادر موصوف نے اپنا پورا وقت
لگا کر تاریخ دار العلوم کی تدوین کا کام انجام دیا، اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ انہوں نے تاریخ کی تدوین میں بہترین حسن ترتیب، ضروری معلومات کی فراہمی اور حسن
کی ساتھ مؤرخانہ انداز سے مستند حوالجات و استناد جامع عنوانات کے تحت واقعات
اور معاملات کا تجزیہ، تفصیل کی جگہ تفصیل اور اجمال کی جگہ جامع اجمال کا قابل قدر
ثبوت دیا ہے۔

واقعات کی ترتیب بہترین انداز پر کی گئی ہے، عبارت سلیس اور شگفتہ ہے، واقعات

کے بیان میں حوالے دیئے گئے ہیں جو تاریخی حیثیت سے ضروری ہوتے ہیں اور جو اطمینان بخشتے ہیں، جو ہر مؤرخ کی تحسین و تبریک ہے۔ جزاہ اللہ عنا خیراً۔

میں خود بھی اس تاریخ سے مستفید ہوا، سے پڑھا اور شاد و منشرح ہوتا رہا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بھی بطور مقدمہ اس کے بارہ میں کچھ سطور قلمبند کروں، لیکن تاریخ بیانی میں انہوں نے اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ کوئی دوسرا اس پر قلم اٹھائے۔

البتہ دارالعلوم کی اس صورت کشی اور ہیئت نمائی کے ساتھ اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دارالعلوم کی حقیقت اور معنویت بھی سامنے آجائے تاکہ صورت نمائی کے ساتھ حقیقت نمائی بھی صفحۂ ورق پر آجائے، اس لئے جو امور جناب محترم سید صاحب نے بطور مقاصد تاریخ کے پیش فرمائے ہیں میں نے انہیں امور کو بطور مصادر تاریخ کے پیش کردیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ معنویات کی ان سطروں کے ساتھ تاریخ دارالعلوم کی صورت نگاری سے اس کی صورت اور حقیقت دونوں بیک وقت سامنے آجائیں گی، اور دارالعلوم اپنے ظاہر و باطن کے ساتھ نمایاں ہوجائے گا۔ وباللہ التوفیق

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۲ رجب ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) پنجشنبہ کا دن ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں وہ مبارک و مسعود دن تھا جس میں دیوبند کی سرزمین میں علوم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جس سادہ اور معمولی طریقے سے یہ آغاز ہوا تھا اُس کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ جس مکتب کا آغاز ایسی بے سروسامانی سے ہو رہا ہے چند ہی سال کے بعد وہ علوم اسلامیہ کا ایشیا میں سب سے بڑا مرکز بننے والا ہے، چنانچہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ برصغیر سے گزر کر افغانستان، ایران، مصر، سمرقند و بخارا، [illegible] انڈونیشیا، ملائیشیا، ترکی اور براعظم افریقہ کے دور دراز خطوں سے کتاب و سنت اور شریعت و طریقت کے طالبین یہاں جوق در جوق آنے شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے علم و دانش کی کرنوں نے برِ اعظم ایشیا کے مسلمانوں کے دل و دماغ کو قرآنی اور تہذیبِ اسلامی سے منور کر دیا۔

جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا اس وقت ہندوستان بھر میں قدیم مدارس قریب قریب ختم ہو چکے تھے، اور کہیں کہیں جو دو چار باقی رہ گئے تھے اُن کی حالت کرمکِ شب تاب سے زیادہ نہ تھی، اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی علوم ہندوستان سے رختِ سفر

فکری سرگرمیوں نے اسے دنیائے اسلام کی آنکھوں کا مرکز بنا دیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے
کہ دارالعلوم نے یہ تمام ترقیاں حکومت سے بے نیاز ہو کر کی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی برکات
اسلام کیسی خدمات بجا لا رہا ہے کہ دور دور سے یہاں آ کر علم نبوی کی ایک تشنگی طالب کے دل کو
بے چین اور مضطرب کر کے اپنی جانب جذب کرتی رہتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے کیا اور کتنے علمی کام
انجام دیے اور کیسی کیسی نامور شخصیتیں پیدا کیں جو قرآن و حدیث و فقہ کے ہر میدان میں کس طرح اپنی
خدمت اور افادیت کے نقوش قائم کیے۔ یہ سب باتیں آپ کو تاریخ دارالعلوم دیوبند کے
مطالعے سے معلوم ہوں گی۔

دارالعلوم دیوبند کے وجود پر برصغیر کے مسلمان جس قدر بھی فخر و مسرت کا اظہار کریں
اس کے درست اور حق بجانب ہونے میں کوئی تامل نہیں کیا جا سکتا۔ دارالعلوم کی تاریخ ہمیں
جیسا کہ ملک کی تاریخ جدوجہد کا روشن باب ہے۔ اشاعتِ دین اور تربیتِ فکری، علمی میں جو
کام اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دارالعلوم دیوبند حقیقت میں ایک
بحر بیکراں ہے، جس سے برصغیر کے علاوہ پورے ایشیا کے تشنگانِ علوم بھی سیراب ہوئے
ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صاف طور پر
نظر آتی ہے کہ یہ قدیم طرز کی صرف ایک درسگاہ ہی نہیں ہے، بلکہ حقیقتاً احیائے اسلام
اور قیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک ہے۔

دیوبند کی سرزمین میں اس دینی درسگاہ کا قیام اور اس کا استحکام برصغیر کے مسلمانوں
کی ایک مشترکہ دینی و اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہے۔ دین کی خدمت، اسلام کی تائید، اسلامی علوم و فنون
کا احیاء اور ان کی نشر و اشاعت، علومِ دین کے شائق طلباء کی دستگیری دارالعلوم دیوبند کے
مخصوص اور عظیم الشان کارنامے ہیں۔ یہ ایک سو چودہ سال سے سلف صالحین کے مسلک کے
مطابق مسلمانوں کی صحیح علمی اور روحانی تربیت کر رہا ہے۔ زوالِ بغداد کے بعد جس طرح قاہرہ
اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا، ٹھیک اسی طرح دہلی کے زوال کے بعد علمی مرکزیت دیوبند کے

حضرت میں آئی۔ ہمہ گیر اور بڑی بڑی نامور شخصیتیں اس درس گاہ سے فیضیاب، بے شمار علماء، فضلاء نے
اس کی آغوش میں پرورش پائی، یہاں سے ہزاروں علماء، مشائخ، محدثین، فقہاء، مصنفین اور
دوسرے علوم و فنون کے ماہرین پیدا ہوئے اور آسمانِ علم و عمل کی زینت بنے، جنھوں نے
مختلف اعتبار سے دین کی خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس برصغیر کے گوشے گوشے میں
انجام دے رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ، اسلام کی تاریخ میں ایک عہد آفریں دور
کا تابناک باب ہے۔ مختصر یہ ہے کہ علوم و فنون کا یہ بحرِ زخار تشنگانِ علم کی بہت بڑی
تعداد کو اب تک سیراب کر چکا ہے، جنھوں نے نسیمِ بہاراں کر اس کی علمی خوشبو کو چہار دانگِ
عالم میں پھیلا دیا ہے۔ دارالعلوم کے فیض یافتگان ایک ایسے گھنے درخت کے مثل ہیں
جس کی سرسبز و شاداب شاخوں اور پتوں کا شمار کرنا آسان نہیں ہے۔

دارالعلوم دیوبند اپنے یومِ تاسیس سے شریعت و طریقت دونوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں
شریعت و طریقت، اور علم و عمل کے چشمے بھی اور ایسے نجوم اس وقت برصغیر میں چمک رہے ہیں، جن
میں سے بیشتر اسی چشمۂ آبِ زندگی سے مستفیض ہیں اور اسی سرچشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہو کر
نکلے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ برصغیر کے اکثر و بیشتر بڑے بڑے علماء نے اسی درس گاہ میں
زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ اور بہت سے ایشیائی ملکوں سے طلبہ جو دارالعلوم کے زیرِ سایہ مستفید ہیں
جنھوں نے برصغیر اور اس کے باہر بہت سے ملکوں میں کتاب و سنت کے چراغ روشن کیے ہیں
اور بے شمار انسانوں نے اُن کے ذریعے سے رشد و ہدایت کا فیض پایا ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کی فکر و نظر کو تازگی و پاکیزگی بخشی، قلب و روح کو حوصلہ اور
جسم کو قوت و توانائی بخشنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس کا فیضان عام ہے۔ اس سے ایسے بے شمار
لوگوں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی ہے جن کے علمی شوق کو پورا کرنے کے لیے اسباب مہیا نہ
تھے۔ اس کے ساتھ دارالعلوم کے نقشِ قدم پر بہت سے علمی اور دینی چشمے جاری ہو گئے جن
میں سے ہر چشمہ اپنے افادہ و فیضان کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ یہ سب اسی انعام خشی کے

ستارے ہیں جن کی روشنی سے برصغیر میں مسلمانوں کی علمی اور دینی زندگی کا گوشہ گوشہ روشن ہے۔

ان دینی مدارس کے اس فیض کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ ان کی بدولت لاکھوں مسلمان گھرانوں کی دولت ضبط ہو گئی مسلمانوں کا احساس کمتری دور ہوا اور ان کی بدولت ملت کو بے شمار فرزند میسر آگئے جنھوں نے حالات و وقت کے مطابق زندگی کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ انھوں نے احیائے اسلام کی عظیم خدمات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں سیاسی شعور کو بیدار کیا اور آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا جس کے نتیجے میں برصغیر کے ملک کو آزادی حاصل ہوئی۔

ماضی میں دارالعلوم دیوبند نے جس طرح اسلام، دینی علوم اور مسلمانوں کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں توقع ہے کہ مستقبل میں بھی مسلمانوں میں ذوقِ عمل کو ابھارنے، دینی بنیادوں کو تقویت پہنچانے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ اسی طرح انجام دیتا رہے گا۔

اگرچہ دارالعلوم دیوبند کا ابرِ گوہر بار تیرھویں صدی ہجری کے اواخر سے عالمِ اسلام پر معروف ہو چکا ہے مگر دارالعلوم کے حالات سے اب تک بہت کم لوگ واقف ہیں۔ دارالعلوم کا طریق کار ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے اپنے کام کو شہرت دینے کے بجائے کام کی نوعیت کو پیش نظر رکھا ہے، جس کے لئے صرف سالانہ روداد کی اشاعت کو کافی سمجھا گیا اور وہ بھی محض اس لئے کہ اس کے ذریعے سے معطیانِ دارالعلوم کو اُن کے چندے کا مصرف معلوم ہوتا رہے اور یہ کہ قوم نے اپنے جن ہونہاروں کو دارالعلوم کی آغوش میں دیا ہے اُن کے تعلیمی نتائج سے وہ باخبر رہیں۔ اس لئے روداد میں چندے کے آمد و صرف اور طلباء کے تعلیمی نتائج ہی پیش کر دیے جانے کی نوبت رہتی ہے۔ البتہ ختم سال کے اہم واقعات بھی درج کر دیے جاتے ہیں۔ دارالعلوم کی طویل زندگی کے یہ نقوش روداد و لٹریچر اس قدر منتشر ہیں کہ اُن سے استفادہ آسان نہیں ہے۔

تاریخ دارالعلوم کے سلسلے میں سب سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم نے [illegible] میں "دارالعلوم کی صد سالہ زندگی" کے عنوان سے ایک مختصر کتاب تحریر فرمائی جس میں دارالعلوم کی تاسیس اور اس کے تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی امور کے احوال و کوائف کا مختصر جامع مرقع پیش فرمایا ہے۔ مگر ضرورت تھی کہ دارالعلوم کی تاریخ کے اہم واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ملی تاریخ کے لئے مواد مہیا ہو سکے لیکن اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ تاریخ دارالعلوم کی تدوین کا کام چند چیدہ اور مصنفین کی جماعت اپنے ہاتھوں میں لیتی اور منتشر وسائل کو اپنی کاوش و تحقیق کے بعد پیش کرتی۔ اور ہوا یہ کہ مجلس شوریٰ دارالعلوم نے شعبان [illegible] میں اتفاق سے اس کے لئے انتخاب کیا ایک کم علم، بے سواد اور مجھ جیسے ایک بے دل شخص کا۔ اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ تحقیقی ادب ہے، اس لئے خامیوں اور غلطیوں کا پایا جانا لازمی ہے

کوئی انسانی کام نقائص، خامیوں اور فروگذاشتوں سے پاک نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے تاریخ دارالعلوم کے مکمل یا حرف آخر ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا، اور [illegible]۔ بہرحال میں نے تو دارالعلوم کے منتشر اور بکھرے ہوئے حالات کو اپنی بساط کے مطابق ایک جگہ جمع کر دیا ہے، یہ واقعات کسی کتاب کے بکھرے ہوئے اوراق کی طرح منتشر تھے، مگر اب یہ ایک شیرازہ بند کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں، یہ عظیم کام جو کسی ایک شخص کے بس کا نہیں ہے، بلکہ درحقیقت مصنفین کے ایک بورڈ کے کرنے کا تھا، اس لئے نقائص و خامیوں کا پایا جانا ناگزیر ہے، جس کے لئے راقم سطور معذرت خواہ ہے، لیکن یہ بات میرے لئے وجہ اطمینان ہے کہ ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

جو باتیں یہاں بیان ہونے سے رہ گئی ہیں، یا جو سرسری و نا تمام درج ہوئی ہیں

اُن کی تکمیل کے لیے دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔

یہ بات بھی عرض کر دینی ضروری ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو اپنی طویل تاریخ میں بہت سی تحریکوں اور ادوار سے واسطہ پڑا ہے۔ اس قدر، کہ ظاہر ہے سب کے تاثرات و خیالات اس کی نسبت یکساں نہیں ہو سکتے۔ ایسے مواقع پر مصنف کی کوشش یہی ہو سکتی ہے کہ انصاف کے دامن کو حتی الامکان ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا جائے۔ اس لئے نزاعی واقعات پر نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے۔ اور ایسے مقامات سے جلد از جلد گزرنے کی کوشش کی گئی ہے، وقت گزر جانے کے بعد اب اُن کی جزئیات اور تفصیلات بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایسے مقامات پر مختصر طور سے محض واقعہ بیان کر دیا گیا ہے۔

تاریخ دارالعلوم میں پیش کئے گئے حالات کا ماخذ سالانہ شائع ہونے والی روداد ہے جس میں ہر سال مدرسہ کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں دوسرے ماخذ سے مدد لی گئی ہے وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ حوالے سے قاری کا ذہن اس واقعے کے بارے میں بڑی حد تک مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ روایت کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کا بھی ہر شخص کو موقع مل جاتا ہے۔ اور وہ یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ قابلِ اعتماد ہے بھی یا نہیں۔ اس کے علاوہ ماخذ کے حوالے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی پیش نظر رہا ہے کہ اس موضوع سے متعلق قاری کو بہت سی کتابوں کا علم ہو جائے گا۔ اور بعد میں اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس سے سہولت حاصل ہو جائے گی گویا ایک راستہ کھل گیا ہے اور دیا گیا ہے جس کا جی چاہے اس راستے سے گزر جائے۔

حالات کے ضمن میں روداد کی عبارتیں کہیں بجنسہٖ نقل کی گئی ہیں، اور کہیں اُن کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ فرق موقع و محل کے لحاظ سے برتا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ خیال ہے کہ قاری کے ذہن کو اصل عبارت اور اُس کے اسلوب نگارش سے بہر حال قریب تر رہنا چاہیئے، تاکہ وہ مصنف کے طرزِ فکر و نگارش اور طرزِ ادا کو سمجھ سکے، اور مکانی حدود میں اس

استفادہ کر سکے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی نئے موضوع پر لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، راقم سطور نے اس کوہ بے ستون میں کوہ کنی کی جرأت کی ہے۔ کامیابی و کامرانی تو صرف خدائے بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے۔ تاریخ دارالعلوم کی تدوین میں جن مشکلات اور دشواریوں سے راقم سطور کو گزرنا پڑا ہے، اہل نظر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو سکا وہ آپ کے سامنے ہے، تاہم یہ توقع ضرور ہے کہ میری یہ کوشش اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کے لئے ایک گونہ سہولت کا باعث ہو گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگر توفیق عطا فرمائی تو نظرِ ثانی میں اس سے بہتر ہو سکے گا۔

تاریخ دارالعلوم کو متعدد ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کو اس طرح مرتب کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے اپنے ماقبل و مابعد ابواب سے علیٰحدہ کر کے ایک مستقل کتاب بنایا جا سکے اس لئے بعض مقامات پر قارئین تکرار محسوس کریں گے، مگر مذکورہ بالا التزام کے ساتھ ایسا کیا جانا ناگزیر تھا۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ راقم سطور کی یہ سعی کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے، تاہم میری کوشش یہی رہی ہے کہ دارالعلوم کے حالات و واقعات کا ایک ایسا مرقع تیار ہو جائے جس سے دارالعلوم کی تحریک کا مقصد سامنے آ جائے اور یہ معلوم ہو سکے کہ دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کے لئے جن مقاصد کو لے کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا ان مقاصد کو کس حد تک پورا کر سکا ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ؏

دارالعلوم دیوبند میں شروع سے اب تک سن ہجری کا رواج رہا ہے، ہماری قدیم تاریخوں میں بھی یہی طریقہ رائج تھا، مگر بیسویں صدی عیسوی سے سن عیسوی کا رواج عام ہو گیا ہے اس لئے سنین کے سلسلے میں راقم سطور نے ہجری اور عیسوی دونوں سن لکھے ہیں۔ مگر ان کے لکھنے میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ متن میں سن ہجری کو اصل قرار دے کر اوپر لکھا گیا ہے اور نیچے اس کی مطابقت

واقعات کی ترتیب سنہ وار کردی گئی ہے۔ تاہم چند مقامات پر ترتیب میں ردو بدل ہوا ہے، مگر کسی
جگہ میں بھی سن وار ہی لکھا گیا ہے۔ اس التزام سے قاری کو بسہولت یہ معلوم ہوسکتا
ہے کہ کون واقعہ کس سن میں ہوا ہے، اور دیگر زیادہ قابل غور ہے۔

راقم سطور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم
دیوبند، حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب
اکبرآبادی رکن مجلس شوریٰ کا تہہ دل سے ممنون اور سپاس گزار ہے، اگر ان حضرات کی رہنمائی
اور گراں قدر مشورے مجھے حاصل نہ ہوتے تو تاریخ دارالعلوم دیوبند کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا مشکل
تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر اور اجر جزیل عطا کرے، اور راقم سطور کو
آئندہ بھی حضرات ممدوحین سے استفادہ کا موقع میسر فرمائے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم نے پیرانہ سالی اور
ضعف کے باوجود تاریخ دارالعلوم دیوبند پر گراں قدر مقدمہ لکھنے کی جو زحمت فرمائی ہے وہ
ایک ایسی بزرگانہ شفقت اور حوصلہ افزائی ہے جو راقم سطور کے شکریے سے بہت بالاتر ہے۔

سید محبوب رضوی

دارالعلوم دیوبند

۱۳ رجب ۱۳۹۳ھ، ۲۲ جولائی ۱۹۷۳ء

❋

باب اوّل

اسلام میں مدارس کا آغاز مسجد سے ہوا ہے۔ مسجد نبوی سے ملحق وہ مشہور چبوترہ تھا جو تاریخ میں "صُفّہ" کے نام سے موسوم ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے یہاں وہ حضرات فروکش ہوتے تھے وہ اصحاب صُفّہ کہلاتے تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے معلم مقرر تھے۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ کیلئے جب کہیں مبلغ بھیجنا ہوتا تو یہیں سے لوگ بھیجے جاتے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تعلیم و تدریس کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ نے وہاں صحابہ کرامؓ کے دو حلقے دیکھے، ایک حلقے میں لوگ تلاوت و دعا میں مشغول تھے۔ اور دوسرے حلقے میں قرآن مجید کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا[۲] میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں

یہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے حلقۂ درس میں تشریف فرما ہو گئے۔

چوتھی صدی ہجری تک تعلیم و تدریس کا کام اسی طرح مساجد سے لیا جاتا رہا، اس زمانے

۱۔ سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۱۵ طبع دہلی نامی پریس دیکھو

۲۔ سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء۔

سلطان کی اس مثال سے امراء اور ارکانِ دولت میں بھی مدارس قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں غزنی کے اطراف و اکناف میں بے شمار مدرسے قائم ہو گئے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ:۔

بمقتضائے الناس علیٰ دین ملوکہم ہر یکے از امراء دولت بنائے مسجد و مدرسہ و رباط نہادند و در لوازم عبادت کوشیدند[1]	بادشاہ کی تقلید میں بمظہر الناس علیٰ دین ملوکہم لوگ اپنے بادشاہ کی روش پر چلتے ہیں چنانچہ امرائے سلطنت مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے لگے۔

٭ ٭ ٭ ٭

غزنی اس زمانے میں اپنی آبادی کی کثرت، دولت اور ترقی میں عالم اسلام کے سب سے بڑے مرکز اور خلافتِ عباسیہ کے پایۂ تخت بغداد کا مقابلہ کر رہا تھا، پوری دنیا سے اہلِ فضل و کمال، متبحر علماء اور باکمال شعراء اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی کے فرزند سلطان مسعود (۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ) نے بھی اپنے نامور باپ کی روایات کو برقرار رکھا چنانچہ اس نے اپنی حدودِ مملکت میں بکثرت مدارس قائم کئے۔ فرشتہ کا بیان ہے:۔

در راہِ خیر سعی داشت، و در ممالکِ محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہاد کہ زبانِ بیان از تعداد آں عاجز و قاصر است۔	اپنے عہدِ حکومت کے قلمرو میں اس نے اتنے کثیر تعداد میں مدرسے اور مسجدیں بنوائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز و قاصر ہے

ابوریحان بیرونی کی مشہور کتاب قانونِ مسعودی اسی سلطان مسعود کی جانب منسوب ہے۔

اسلام ہندوستان میں

اسلام کے ابرِ کرم کے چھینٹے اگرچہ ہندوستان کے ساحلوں کے کنارے اور پنجاب کے پہاڑ و صحرا کے دامنوں پر پہنچ چکے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۰ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ طبع ۔۔۔ ص ۳۴

علاوہ ازیں اس کا اندازہ ضیاء برنی کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ دہلی کا مدرسہ فیروز شاہی اپنی شوکت، خوبی عمارت، محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مصارف کے لئے شاہی اوقاف مقرر ہیں۔ پایۂ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور موقع محل کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مدرسہ کی عمارت بہت وسیع اور ایک بڑے باغ میں تالاب کے کنارے پر واقع ہے۔ ہر وقت سیکڑوں طلباء اور علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے ہیں۔ طلباء اور اساتذہ کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر جمعیت آزادی کے ساتھ اپنے علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں[1]

فیروز شاہ نے جہاں نئے مدارس جاری کئے وہیں اس نے پرانے مدرسوں کی بحالی کی، علماء و طلباء کے لئے خزانہ شاہی سے وظائف جاری کئے اور بڑی بڑی جاگیریں مدارس کے لئے وقف کیں[2]

فیروز شاہ کی تعلیمی خدمات میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس نے غلاموں اور انکے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ کی۔ غلاموں کو حفظ قرآن مجید کے علاوہ دینی علوم کی تحصیل کا بھی موقع فراہم کیا جاتا تھا۔ تعلیم کے علاوہ غلاموں کو صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی تھی۔ شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق عہد فیروزی کے ۔ ۔ ۔ ۔ غلاموں نے علوم و فنون اور صنائع کی تعلیم حاصل کی[3]

اسی فیروز شاہ نے لڑکیوں کے لئے بھی جداگانہ مدارس قائم کئے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے جنوبی ہند کے ایک مقام ہنور[4] کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں کی عورتیں حافظ قرآن مجید

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۴ [2] تذکرۂ رشتہ جلد اول ص ۱۰ [3] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف ص ۱۴۰، ۱۴۲ [4] ہنور کا موجودہ نام ہنور ہے، یہ بہار شمر کی ایک تحصیل ہے۔

بجا خیال کرتے ہیں اور ان کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ سمجھتے ہیں۔ اس سے شاہجہاں، دو شاہ کیا کرتے تھے: "پادشاہِ علم دوست"[1]

شاہجہاں ([illegible]) کے عہد میں دہلی، لاہور، سیالکوٹ، احمد آباد اور جونپور علم و فن کے لحاظ سے ایسے مقامات تھے جہاں ہندوستان کے علاوہ ایران اور بدخشاں تک سے طالبانِ علم کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے۔ سیالکوٹ میں ملا کمال کشمیری کا مسند درس قائم تھا۔ معقولات کے مشہور فاضل ملا عبدالحکیم سیالکوٹی انہی ملا کمال کے دامنِ فیض کے تربیت یافتہ تھے۔

شاہجہاں کے عہد میں مسجد فتح پوری اور مسجد اکبرآبادی تعمیر ہوئی تھی۔ مسجد فتح پوری کا تو اس دور کے باقیات الصالحات میں سے ہے۔ مسجد اکبرآبادی حوادثِ روزگار کی نذر ہو چکی ہے۔ یہی وہ مسجد تھی جس میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا قیام رہا ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہید ([illegible]) اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی (وفات [illegible]) نے اسی مسجد میں تحصیلِ علم کی تھی ([illegible]) میں شاہجہاں نے جامع مسجد کے قریب جنوبی سمت میں ایک عظیم الشان مدرسہ دارالبقا کے نام سے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مدرسہ تیرھویں صدی کے اوائل میں ختم ہو گیا تھا مفتی صدرالدین آزردہ (وفات [illegible]) نے اپنے زمانے میں اسے دوبارہ زندہ کیا، اور اس کے اخراجات بھی اپنے ہی ذمے رکھے، ہمارے بعض اکابر کا اس مدرسے سے تعلق رہا ہے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی اس مدرسے میں مقیم رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز میں مفتی صاحب کی جائیداد انگریزی حکومت نے ضبط کی تو مدرسہ دارالبقا ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سو گیا۔

---

[1] مآثر الکرام جلد اول ص [illegible]۔

[2] سوانح قاسمی ص [illegible] اور واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص [illegible]

دہلی میں غازی الدین خان فیروز جنگ اول (وفات ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء) نے جو نظام الملک آصف جاہ اول کے والد تھے ایک مدرسہ اجمیری دروازے کے قریب قائم کیا تھا۔ یہی مدرسہ بعد میں دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ مولانا رشید الدین خاں دہلوی (وفات ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور مولانا مملوک علی نانوتوی (وفات ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) اسی کالج کے صدر مدرس رہے ہیں۔ [illegible] اس مدرسہ میں ہمارے بہت سے اکابر نے تکمیل علم کی ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (وفات ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (وفات ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی (وفات ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء) حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (وفات ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) حضرت مولانا فضل الرحمن دیوبندی (وفات ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) اور دوسرے بہت سے علماء اس مدرسے کے دامن فیض سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ مدرسہ دہلی کا ایک مشہور دار العلوم تھا۔ غازی الدین خاں فیروز جنگ کا یہ مدرسہ اس دور کے مدارس کی ایک زندہ یادگار ہے۔ اس کی عظیم الشان اور وسیع عمارت سے ہمارے امراء کے علمی ذوق اور ان کی ہمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مدرسے کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی۔ غازی الدین فیروز جنگ اول اسی مدرسے کے صحن میں آسودۂ خواب ہیں۔[1]

رام پور میں مدرسہ عالیہ قائم تھا جو اب تک موجود ہے۔ والی رام پور نواب فیض اللہ خاں نے بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی (وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کو بلا کر مدرس مقرر کیا تھا۔ فرنگی محل ہی کے ایک دوسرے عالم ملا حسن بھی کچھ دن رام پور میں مدرس رہے۔ ان لوگوں کے فیض تعلیم سے رام پور میں مدتوں تک علوم کی گرم بازاری رہی۔[2]

۱؎ یہ مدرسہ غازی الدین نے جنگ انقلاب کی ۱۸۵۷ء [illegible] کا مدرسہ کہلاتا رہا۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں شروع ہوا اور ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔

۲؎ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ص ۴۴

عہد مغلیہ کے ہندوستان میں پہلے سے قدیم فارسی مورخین کی توجہ زیادہ تر بادشاہوں کی
جنگوں اور سیاسی کارناموں ہی پر مرکوز رہی ہے۔ علمی و ثقافتی کارناموں کا ذکر کہیں کہیں ضمناً آگیا
ہے۔ اس زمانے کے تاریخی مذاق کا دلچسپ موضوع بادشاہوں اور امرائے سلطنت کے
جنگی اور سیاسی کارنامے ہوتے تھے۔ اس لئے ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی کارناموں کا
ذکر بہت کم ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں"
کے مصنف نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ قدیم فارسی تاریخوں میں ہندوستان کے گزشتہ
مدارس کے متعلق کوئی تصریح ایسی نہیں ہے جو لکھا جا سکے۔

مسلمان اپنے مذہبی مذاق کی بنا پر ہمیشہ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کو مذہبی خدمت اور
کار ثواب خیال کرتے رہے۔ وہ طلباء کی امداد، تعلیم کی اشاعت، کتب و رسائل، درس و تعلیم کے لئے
وقف، مدارس کی بنا رکھنا، مساجد و مدارس کی خدمت و اعانت وغیرہ کو ایک مذہبی عمل، برکت اور ثواب کا
ذریعہ اور نجات کا باعث سمجھتے رہے۔ اس بنا پر یہ چیزیں ایسی ہی ضروریات زندگی کی طرح ان کی زندگی کا
لازمی اور ضروری جز ہو گئی تھیں اور یہاں تک کہ ایک شخص کے روزمرہ حالات زندگی اس کی تاریخ یا
میں اہمیت کے ساتھ قابل ذکر نہیں سمجھے جاتے بلکہ صرف ضمناً دوسری ضروریات زندگی یا
سرسری طور پر مذکور ہو سکتی ہیں۔ اس لئے قدیم ایام میں مسلمانوں نے تعلیمی سلسلے میں جو
کارہائے نمایاں کئے ہیں ان کو قدیم مورخین مخصوص اور الگ عنوانات کے تحت نہیں بیان کرتے۔

پھر آگے چل کر ایک اور وجہ بیان کی ہے کہ:-

قدیم زمانے میں تعلیم کے لئے علیحدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر یہ کام مسجد سے
لیا جاتا تھا۔ اس زمانے کی تمام مسجدیں مدرسوں کا کام دیتی تھیں۔ اس لئے ہر قدیم مسجد
ایک چھوٹی درسگاہ بھی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم
قدم پر عالی شان مسجدیں ملیں گی۔ دہلی، آگرہ، لاہور، جونپور، احمد آباد، گجرات وغیرہ تمام
قدیم اسلامی سلطنتوں میں جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں ان میں اکثر اب تک باقی ہیں۔

ان کی حیثیت کتنا فی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ تعلیم کا بچوں کے کام میں آتا تھا۔ ان مسجدوں میں اب تک حجرہ صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجروں کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہ درحقیقت طلباء اور مدرسین کے رہنے کے مقامات تھے۔ ان میں سے بعض اب تک اسی کام آتے ہیں مثلاً دہلی کی مسجد فتحپوری و اکبرآبادی جو شاہجہاں کے عہد میں تیار ہوئی تھیں ان کے وسیع صحن کے گرد اگرد حجرے موجود ہیں جو خصوصی طور پر طلباء کی اقامت گاہ تھے۔ قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم کا بڑا کے مصرف میں آتی تھیں۔ متصوفین اور گوشہ نشین مشائخ ان دنوں اپنا وقت صرف عبادت و نفس کشی ہی کو عبادت نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن دونوں کی تعلیم و تدریس کو اپنا حقیقی منصب انہیں خیال کرتے تھے۔ بعض خانقاہیں تو خاص طور پر تصوف و علوم باطن کی درسگاہیں علوم ظاہر کی جماعت کثیر بھی پائی جاتی تھی۔ خانقاہوں کے لئے حکومت کی طرف سے جو وظیفے یا جو اوقاف ہوتے تھے ان کا بڑا حصہ طلباء پر صرف ہوتا تھا۔ اس بناء پر قدیم خانقاہوں کو بھی مدارس اور مکاتب کے سلسلہ میں شمار کرنا چاہئے۔

سلاطین اور بزرگان کرام کی قبروں پر جو مقبرے تعمیر ہوتے تھے ان کے ساتھ اکثر اور بہت سے حجرے اور کمرے اس غرض سے بنائے جاتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام آئیں۔ چنانچہ مقبرہ علاؤالدین خلجی اور مقبرہ ہمایوں وغیرہ اس وقت بھی دہلی، آگرہ، احمدآباد اور بیجاپور وغیرہ میں قائم ہیں ان کی حیثیت خود ان کی تاریخ بتا رہی ہے[1]

خوشحالوں کی سرپرستی کے علاوہ خود مسلمانوں کا ذوقِ علم جو انہیں آباء و اجداد سے وراثت میں ملا تھا حکومتوں کے خزانے کا بہت کم مرہونِ احسان رہا ہے۔ ہماری قدیم تعلیم کا ایک بڑا حصہ بے مستقل عمارتوں کی محتاج نہ تھیں۔ مسجدوں، خانقاہوں اور علماء و امراء کے مکانات سے لیکر میدانوں تک تعلیم و تعلم کی بزم آراستہ رہتی تھی۔ عام طور پر نامور علماء اپنے گھروں اور مسجدوں

---

[1] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ص ۱۰ ۱۲

وہ مسجد انہی میں قائم کیا گیا تھا۔ درس کی عمر کے ابتدائی دس سال مسجد ہی میں گزرے ہیں۔

اس زمانے میں طلباء کے قیام و طعام کا جو عمومی طریقہ رائج تھا اس کی نسبت مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے۔

صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبا علم را کفالت می نمایند	صاحب استطاعت ہر آبادی میں طالبانِ علم
و خدمت ایں جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند[1]	پر خرچ کرتے تھے، وہ طلباء کی ضروریات
۔ ۔ ۔ ۔	پورے کرنے کو بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں بارھویں صدی ہجری کا زمانہ وہ پُر آشوب دور ہے جس میں اسلامی سطوت و عظمت کے ساتھ مسلمانوں کی علمی سرگرمیاں بھی سرد پڑنے لگی تھیں۔ اسی زمانے میں دہلی کے تخت پر محمد شاہ (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) متمکن تھا جو اپنے لاابالی پن اور کثرتِ عیاشی کے سبب سے عرف "رنگیلا بادشاہ" مشہور ہو کر رہ گیا ہے، مگر یہی ہم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مدرسہ جس کے علمی فیضان سے آج برصغیر کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے، اسی رنگیلے بادشاہ کی علمی فیاضی کا مرہونِ احسان ہے۔ واقعات دارالحکومت دہلی کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا اور مشہور سمجھا جاتا تھا۔[2]

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم (وفات ۱۱۳۱ھ) کے زمانے میں یہ مدرسہ پہلے اُس جگہ تھا جہاں اب انہی حضرات کے مزارات ہیں۔ یہ جگہ مہندیان کے نام سے موسوم ہے۔ جب شاہ ولی اللہ کے زمانے میں طلباء کی کثرت کے باعث یہ جگہ تنگ ہو گئی تو محمد شاہ نے اس کے لیے ایک بڑی حویلی عنایت کی۔ یہ جگہ کوچہ چیلان میں تھی۔ واقعات دارالحکومت دہلی کے مصنف نے لکھا ہے کہ غدر کے ہنگامے میں یہ مدرسہ برباد ہو گیا۔ اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے

---

۱ مآثر الکرام ص ۲۲۰ جلد ۱ مطبع عام آگرہ ۱۹۱۰ء۔

۲ واقعات دارالحکومت دہلی جلد ۲ ص ۱۶۴۔

اسی سرچشمے سے ملتا ہے۔ موجودہ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جاری کی ہوئی یہ
سلسلہ ایک نہر کی شکل اختیار کر چکا ہے اور پچھلی ایک صدی میں اس کی شاخیں بڑے بڑے علاقوں میں
پھیل کر ہر طرف علوم نبویہ کے تشنہ کاموں کو سیراب کر رہی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں علوم دینیہ کے تعلیمی سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ایک
عظیم مرکزی مقام اور بے نظیر عظمت حاصل ہے۔ وہ اپنے دور میں علوم دینیہ کے دیدہ ور عالم،
عظیم مفکر اور مخلص داعی تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم کے حقائق و معارف کو ایک مستقل فن کی
حیثیت دے کر ہندوستان میں اسلام کی حفاظت و مدافعت کا زبردست سامان مہیا کیا تھا۔ شاہ
صاحبؒ نے ہندوستان کے علمی اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان جدوجہد کی وہ ہماری تاریخ
کا ایک درخشاں اور روشن باب ہے۔

سلطنت مغلیہ کے دور زوال میں مختلف قوتوں کی کش مکش اور پیہم یورشوں نے ملکی نظم
نسق کو برباد کر دیا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو زبردست کارنامہ انجام دیا، اس کی تفصیل
کا یہ موقع نہیں ہے، یہاں شاہ صاحبؒ کی صرف اُن مساعی کا ذکر کرنا مقصود ہے جو انھوں نے
دینی علوم کے بقا اور تحفظ کے لئے سرانجام دی ہیں۔ مغلوں کے سیاسی زوال نے مسلمانوں میں
روحانی اور اخلاقی زبوں حالی کے ساتھ علمی ذہنی اور فکری پستی بھی پیدا کر دی تھی۔ شاہ صاحبؒ
نے دانش مندانہ اور دور رس نگاہی کے ساتھ حالات کا گہرا جائزہ لے کر مسلمانوں کو
متنبہ کیا۔ اُن کی مساعی جمیلہ ہی کے طفیل سے دریا بہہ نکلے اور ایک گروہ کو علم حدیث سے سیراب
کیا۔ آج برصغیر میں دینی علوم کا جو چرچا، دینی بیداری اور تحریک و دعوت سے جتنا بھی انقلاب نظر آتا ہے
یہ سب حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے تجدیدی کارنامہ کا اثر ہے۔ اُن کی کوششوں میں اللہ
نے برکت عظیم عطا فرمائی۔ چنانچہ اُن کے شاگردوں اور ان کے تلامذہ کی وجہ سے پورے برصغیر میں
ایک ایسا دائرہ حدیث بن گیا جس کی مثال اس عہد کے دوسرے اسلامی ملکوں میں مشکل سے ملے گی۔
شاہ صاحبؒ نے اپنے حالات و سوانح میں ایک مختصر رسالہ بنام الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

لکھا ہے، جس سے ملک کے مروجہ نصاب کا بھی کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لکھا ہے کہ:

۴ شوال ۱۱۱۴ھ روز چہار شنبہ طلوع آفتاب کے وقت یہ فقیر پیدا ہوا۔ تاریخی نام عظیم الدین رکھا گیا[1]۔ ولادت سے پہلے والدین اور صلحاء نے میرے بارے میں بہت سی بشارتیں خواب دیکھیں جن کو حضرت والد ماجد نے رسالہ انفاس العارفین میں جمع کر دیا ہے۔ عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھایا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرا دیا۔ اسی سال رسم ختنہ عمل میں آئی۔ اور اسی ساتویں سال قرآن شریف ختم ہو کر فارسی تعلیم شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملا جامی پڑھ لی۔ اور مطالعۂ کتب کی استعداد پیدا ہو گئی۔ چودھویں برس میں شادی ہو گئی۔ پندرھویں سال کی عمر میں والد ماجد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور مشائخ صوفیاء بالخصوص حضرات نقشبندیہ کے اشغال میں لگ گیا۔ اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا اس دیار کے مروجہ نصاب تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانے پر تمام خواص و عوام کی دعوت کی۔ اور مجھے درس کی اجازت دی۔ جن علوم و فنون کا اس ملک میں رواج ہے ان میں حسب ذیل کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ حدیث میں مشکوٰۃ شریف سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک تھوڑے سے حصے کے، بخاری کتاب الطہارۃ تک، شمائل ترمذی کامل۔ تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ۔ حق تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت مجھ پر یہ ہوئی کہ کامل غور و فکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعے کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے تحقیق سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں بابِ فتح عظیم کا باعث ہوا۔ والحمد للہ علی ذالک۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری سوائے تھوڑے سے حصے کے۔ اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ اور منطق میں شرح شمسیہ پوری اور شرح مطالع کا کچھ حصہ۔ کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور

---

[1] عظیم الدین کے اعداد ۱۱۱۴ نکلتے ہیں

ان کی پوری عمارت تیار کی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام و ترغیبات و تعلیمات
کے اسرار و مصالح کو اس طرح مستنبط کیا گیا کہ اس حقیر سے پہلے کسی نے علم اس طور پر نہیں لکھا تھا۔
ایک کام یہ ہے کہ میں نے اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل و براہین سے
ثابت کیا اور معقولیوں کے شکوک و شبہات کے خس و خاشاک سے ان کو قطعی پاک کر دیا
اور ان کی تحقیق بھی ایسی کی ہے جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔
حکمت عملی بھی مجھے بھرپور دی گئی ہے اور کتاب و سنت و آثار صحابہ سے اس کی
تطبیق و تفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی۔ ان سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا ہے جس کے
ذریعے سے میں یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے اور کون کون سی باتیں بعد میں اس میں اضافہ ہوئی ہیں جو کسی بدعت
پسند فرقے کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔[۱]

شاہ صاحبؒ نے مندرجہ بالا سطور میں جن علمی کارناموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان کی
تفصیل و حقیقت جاننے کے لئے ان کی تصانیف سے مراجعت کی ضرورت ہے۔

ان کمالات و خصائص سے آراستہ ہو کر شاہ صاحبؒ نے جب تجدید کے میدان میں
قدم رکھا تو کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے نہایت عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ شاہ صاحبؒ نے جس
فضا میں آنکھ کھولی تھی وہ اخلاقی اور روحانی پستی کے لحاظ سے نہایت افسوسناک دور تھا،
بدعات و مشرکانہ اعمال و رسوم گھر گھر رواج پذیر تھے، امراء اور اہل ثروت عیش و
عشرت میں غرق ہو کر دین سے غافل ہو چکے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے گرد و پیش کے تمام احوال
کا جائزہ لے کر اپنا عملی تجدیدی کام شروع کیا۔ علم حدیث کی ترویج و اشاعت میں کمر ہمت باندھی
اور بے مثال علمی اور فکری کردار ادا کیا۔ انہوں نے مدرسہ رحیمیہ میں قرآن و حدیث کا درس

---

[۱] مقالات یوم [illegible] لطیف مشہور رسالہ [illegible] ص ۲۲ ـ ۲۸ مطبوعہ [illegible]

جاری کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ اس کا افادہ عام ہو سکے اس کے ساتھ انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور تقلید و اجتہاد پر گراں قدر کتابیں لکھ کر اس بات کی سعی کی کہ اسلامی طریقے پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ انھوں نے اپنے بعد ایسے جانشین چھوڑے جنھوں نے علوم و فنون کی حفاظت اور اُن کی نشر و اشاعت میں جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ نواب صدیق حسن خاں نے اس خاندان کی نسبت لکھا ہے۔

ہر یکے از ایشان بے نظیر وقت و فرید دہر و وحید عصر در علم و عمل و عقل و فہم و قرأت و تقریر و فصاحت و تحریر و تقویٰ و دیانت و امانت و مراتب و ولایت گذشتہ۔ اولاد و اولاد آن خاندان حکم آفتاب است۔۔ این سلسلہ از طلائے ناب است[1]

---

[1] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین ص ۲۹۶ مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ۔

دارالعلوم کے اکابرِ علم کا

سلسلۂ اسناد

اکابر دارالعلوم کے سلسلے میں سرِ فہرست جو شخصیت آتی ہے وہ ہیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ
ہیں۔ برصغیر میں اس وقت علوم دینیہ اور بالخصوص علم حدیث کے جس قدر سلسلے مروج اور موجود
ہیں تقریباً ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہوتا ہے۔ پشاور سے راس کماری تک
دینی علوم کا جو کچھ ذوق موجود ہے وہ سب اس گھرانے کا فیض ہے۔ ایک غیر ہندوستانی عالم
کا بیان ہے کہ آج سارے ہندوستان کی سرحدوں میں علم حدیث کا کوئی بھی ایسا عالم نہیں جو حضرت
شاہ عبدالعزیزؒ کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شاگرد نہ ہو۔ [1]

شاہ صاحبؒ کا خاندان اپنے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے دہلی میں بہت ممتاز
سمجھا جاتا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ فتاویٰ عالمگیری کے مصححین میں سے
تھے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے شروع سے اپنے والد ماجد سے تحصیل علم کی اور پندرہ سال کی عمر میں
علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ سند اپنے والد ماجد کے واسطے سے

---

[1] شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک، از مولانا سندھی ص ۲۰۔

علامہ جلال الدین محقق دوانی (وفات ۹۰۸ھ) لکھتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے خطۂ عظیم میں معقولات کا عنصر غالب تھا۔ اس لئے علم حدیث کی تکمیل اور سند روایت حاصل کرنے کی غرض سے شاہ صاحبؒ نے حرمین شریفین کا سفر اختیار فرمایا۔ مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر مدنیؒ اور دوسرے اساتذہ شیوخ سے صحاح کی قرات و روایت حدیث کی سند حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ کی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کی نسبت آپ کے استاد حدیث شیخ ابو طاہر مدنی کا یہ قول اوپر گزر چکا ہے کہ "ولی اللہ الفاظ روایت کی سند مجھ سے حاصل کرتے ہیں اور میں اُن کے ذریعے سے حدیثوں کے معانی کی تصحیح کرتا ہوں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جس میں علم حدیث پوری دنیائے اسلام میں ضعف و انحطاط کی آخری حدوں سے گزر رہا تھا۔ ایسی حالت میں علم حدیث کی اشاعت و ترویج شاہ صاحبؒ کا ایک ایسا زبردست کارنامہ ہے جس کا مصر کے ایک جلیل القدر عالم سید رشید رضا کو ان الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا:۔

"اگر ہمارے ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں علم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک یہ علم ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔"[1]

پھر مصر کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"میں نے جب ۱۳۱۵ھ میں مصر ہجرت کی تو جامع ازہر اور دوسری مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا کتب حدیث میں کہیں پتہ نہیں۔ ان میں ضعیف، منکر اور موضوع و جعلی روایتیں ہوتی تھیں۔ یہی حال واعظوں، مفتیوں اور مدرسوں کا تھا۔"[2]

شاہ صاحبؒ کی علمی خدمات صرف درس و تدریس تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے

---

[1] [2] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ ص م طبع مصر۔

مختلف علوم میں ایسی جلیل القدر کتابیں تصنیف فرمائیں جن کی نظیر بارھویں صدی ہجری کے بعد
بہت کم ملتی ہے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی علمی زندگی کے اور بھی متعدد عظیم الشان کارنامے
ہیں۔ یہاں اجمالاً بھی ان کا تذکرہ ممکن نہیں ہے یہ ایک مستقل مضمون ہے۔

شاہ صاحبؒ کے چار فرزند تھے جن میں ہر ایک آسمان علم کا درخشندہ ستارہ ہے ان میں
سب سے بڑے حضرت شاہ عبدالعزیز تھے۔

شاہ عبدالعزیزؒ

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۵۹ھ - ۱۲۳۹ھ) اپنے زمانے کے سب سے زیادہ متبحر اور جلیل القدر عالم تھے۔ حدیث و
قرآن کے علوم کی جو اشاعت ان کے زمانے میں ہوئی اس سے پہلے اسلامی ہند کی تاریخ میں
اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد
پائے نہ جاتے ہوں۔ ایک غیر ہندوستانی عالم کا بیان اوپر گذر چکا ہے جسے سارے ہندوستان
کی سیاحت میں علم حدیث کا کوئی بھی ایسا عالم نہیں ملا تھا جو شاہ صاحبؒ کا شاگرد نہ ہو۔ مولانا
عبیداللہ سندھیؒ کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے خواص کے گروہ سے سو آدمیوں نے استفادہ کیا تو
شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوسکتے ہیں[1]

غرض کہ شاہ ولی اللہؒ نے علوم دینیہ کی جس نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالی تھی، شاہ عبدالعزیزؒ نے
اس کو ایسی فروغ دی اور علم کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس سے علوم دینیہ کی ایک خاص عزت اور
وقار قائم ہو گیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ۶۰ سال کی طویل مدت
تک دہلی میں علوم دینیہ کی خدمات انجام دیں۔ درس و تدریس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے متعدد
کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ جن میں تفسیر فتح العزیز تفسیر قرآن میں، بستان المحدثین محدثین کے طبقات
اور ان کی مصنفات کی تاریخ میں اور تحفہ اثنا عشریہ تشیع کی حقیقت میں بہت مشہور ہیں

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۹۴۔

آخرالذکر کتاب تو شاہ صاحب کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی کوئی مثال اس موضوع پر اسلامی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔

شاہ محمد اسحاقؒ

حضرت شاہ محمد اسحاقؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور مستند شاگرد تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے بیس سال تک طلباء کو حدیث کا درس دیا۔ ۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیزؒ نے انتقال سے پہلے مدرسہ رحیمیہ شاہ محمد اسحاقؒ کو سپرد فرما کر اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ ۱۲۵۸ھ تک انھوں نے علم حدیث کی نشر و اشاعت کی خدمات انجام دیں۔ اُن کے علمی فیوض سے تقریباً سارا ہندوستان مستفیض ہوا۔ مشکوٰۃ المصابیح کا اردو میں ترجمہ فرمایا جس کو ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا قطب الدین خاں صاحب نے شرح کی صورت میں منتقل کر دیا ہے جو مظاہر حق کے نام سے موسوم ہے۔ مأۃ مسائل اور مسائل اربعین بھی ان کی قابل ذکر تصنیف ہیں۔ شاہ محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۸ھ میں ہندوستان سے ہجرت فرما کر حرم محترم میں اقامت اختیار فرمائی اور وہیں چند سال بعد انتقال فرمایا۔

تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ: "یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے اکثر شاگردوں نے بحیثیت علماء کے اس تحریک میں حصہ لیا جن میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، صدر الدین بریلوی، مولانا عبدالجلیل کوئلی (علی گڑھی) مفتی صدر الدین آزردہ، شاہ ابوسعید مجددی (والد ماجد شاہ عبدالغنی مجددی) اور ان کے شاگرد کے شاگرد بعض علمائے دیوبند مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔[1]

شاہ عبدالغنیؒ

حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کی جانشینی کا فخر حضرت شاہ عبدالغنی مجددی (۱۲۳۵ھ – ۱۲۹۶ھ) کو حاصل ہوا۔ شاہ عبدالغنیؒ نے حدیث کی کچھ کتابیں اپنے والد شاہ ابوسعیدؒ سے پڑھیں جو شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے اور کچھ کتابوں کی سند شاہ محمد اسحاقؒ سے حاصل کی تھی۔ پھر انھوں نے [illegible] کے

---

[1] تذکرہ علمائے ہند مطبوعہ کراچی ص ۵۰۔

ماہر علم حدیث کے یگانہ روزگار عالم تھے ملک کے گوشے گوشے سے علماء اور طلبہ آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ ان کی خوشہ چینی کو فخر سمجھتے تھے ان کی درسگاہ ہندوستان میں علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز تھی ابن ماجہ پر حاشیہ تحریر فرمایا جو انجاح الحاجہ کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے چشمہ تعلیم سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے یگانہ روزگار علماء پیدا ہوئے جنھوں نے علم کی دنیا میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں علم حدیث کی یہ سب سے بڑی درسگاہ حوادث روزگار کی نذر ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ شاہ عبدالغنی نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور وہیں محرم ۱۲۹۶ھ میں انتقال فرمایا۔

متذکرہ صدر حضرت کی سند روایت کی تفصیل الیانع الجنی میں تفصیل مذکور ہے

حضرت شاہ عبدالغنی کی نسبت مولانا حکیم عبدالحی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں۔

"علم و عمل، زہد، علم، صدق، امانت، عفت، حمیت، حسن نیت، اخلاص، رجوع الی اللہ، خوف خدا، سنت نبوی کی پابندی، حسن اخلاق، ہر چھوٹے بڑے اور مخلوق کو نفع پہنچانے، دنیا اور اسباب دنیا سے بے رغبتی ان کی ذات پر ختم تھی۔ ان کی مجلس سے اللہ تعالیٰ کے انفاس کی برکت سے بہت سے علماء و مشائخ مستفیض ہوئے، ان کی بزرگی اور ولایت پر ہند و عرب کے سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ بروز چہار شنبہ ۶ محرم ۱۲۹۶ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔" [1]

علماء دیوبند کا دوسرا سلسلۂ تلمذ حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی اور مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے واسطے سے حضرت شاہ عبدالعزیز تک پہنچتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۲۹۰، ۲۹۱۔

مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اپنے دور کے مشاہیر علمائے دہلی میں سے تھے اور اپنے معاصرین علماء میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ درسیات اور متداولہ علوم سے متعلق جس قدر مجموعہ تھا اکثر کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں۔ حافظے کا یہ عالم تھا۔ سر سید مرحوم لکھتے ہیں کہ: "علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کر دیں ان تمام کتب سے گنجینۂ علم خالی ہو جائے تو ان کی املا حافظے سے پھر اُن کی نقل ممکن ہے۔ ان سب کمال و فضیلت پر خلق و حلم عادات حمیدہ سے خوشنما"[1]

مولانا رشید الدین خاںؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ فن تعلیم کا ملکہ نہایت درجہ کا تھا آپ کے فیض تعلیم نے بے شمار علماء پیدا کئے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے لکھا ہے کہ:۔

"مولانا مملوک علیؒ جنہوں نے درسیات کا اکثر حصہ جناب حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے ارشد تلامذہ حضرت مولانا رشید الدین سے پڑھا تھا، منتخب علم کے ذریعہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا محمد مظہر صدر المدرسین مظاہر علوم حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر المدرسین دار العلوم جیسی مقدس و مشہور ہستیوں کے استاذ تھے ان سب حضرات نے علوم دینیہ و فنون ادبیہ کا دریا بہایا کہ ہزاروں تشنگان علم جو پیاس سے پریشان ہو رہے تھے اسی نے پر شوق تسکین پائی تھی۔"[2]

مولوی کریم الدین پانی پتی کا بیان ہے کہ:۔

"نیا مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے بخوبی ان زبانوں میں عبارت بنانی ان کو حاصل ہے، اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے

۱؎ آثار الصنادید حصہ چہارم ص

۲؎ تذکرۃ الخلیل ص ۹

طبقات الشعرا۔ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ۔ مولانا عالم علی مراد آبادی، مولوی کریم الدین دہلوی، مولانا احمد، رحمٰن پانی پتی وغیرہ کے اسمائے گرامی اس طور سے قابل ذکر ہیں۔

سوانح مولانا محمد احسن نانوتوی میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا مملوک علیؒ نے تحریر اقلیدس کے اول کے چھ مقالوں کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ مصنف مقالوں کا عربی سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ترمذی اور تاریخ یمینی کے ترجمے کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ [1]

استاذ العلماء دہلی کالج میں علوم عربیہ کے صدر رہے۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو انتقال ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قبرستان مہندیان میں مسجد کے سامنے مدفون ہیں۔ قبر کا نشان موجود نہیں رہا۔

مولانا رشید الدین خاں

مولانا رشید الدین خاں حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے شاگرد رشید تھے۔ معقول و منقول خصوصاً علم کلام میں یگانۂ عصر تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ان کی تعلیم و تربیت بیٹے کی طرح کی تھی۔ ہر وقت ان کی اصلاح و ترقی کی فکر رہتی تھی۔ شاہ رفیع الدین کے بعد شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ عبد القادرؒ نے ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت فرمائی۔

مولانا رشید الدین خاں ہر فن میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں ان کو ایسی مہارت تھی کہ اس زمانے میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ مناظرے میں بھی ان کو زبردست کمال حاصل تھا۔ عربی زبان کے بڑے اعلیٰ ادیب تھے۔

علم و فضل کے ساتھ مولانا رشید الدین صاحبؒ کا زہد و تقویٰ بھی مسلم تھا۔ قناعت کی زندگی

---

[1] سوانح مولانا محمد احسن نانوتوی ص [illegible]۔

بہت لوگ ہندوستان میں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو بہت کم عمر لڑکا دلی میں تعلیم
پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے علم کی تحصیل کی تھی
ابتدا ہی سے آثار تقوی اور صلاحیت اور نیکی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں
تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا

بالائے سرش ز ہوشمندی ٭ می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور
تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین
صاحب کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت
نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی رتبہ کا درویش بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت و سنت تھے اور
لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں از حد کوشش کرتے تھے۔ اپنے ہم مذہب مسلمانوں
کی بہبودی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انھی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ
دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی
سعی اور کوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیری و مرشدی کی نہیں کرتے تھے
لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور
ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں
تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم صاحب کے کسی شخص کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے
خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفسانی یا عناد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام انسان
جس قدر کہ تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور
سچا سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے
تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی

حضرت نانوتوی کی کسی سوانح میں اس کی صراحت موجود نہیں ہے کہ انھوں نے تعلیم سے کب فراغت حاصل کی؟ اور بخاری کی تصحیح اور تحشیہ کا واقعہ کس سن میں پیش آیا؟

سوانح قاسمی سے اجمالی طور پر صرف اتنی بات کا پتہ چلتا ہے کہ مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد انھوں نے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کا کام شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران (۱۲۶۷ھ) کے اواخر میں حضرت مولانا مملوک علی کا انتقال ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں۔

"اسی عرصے میں والد مرحوم کا ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو انتقال ہو گیا۔ بعد انتقال والد مرحوم حضرت اپنے مکان مملوک میں بیمار رہے، مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسم) بھی سب کو چھوڑ کر کے کوچہ چیلان پر ایک جگہ پڑا ہوا تھا اس میں رہتے تھے۔ ایک سال کے قریب بعد انتقال والد مرحوم حضرت والد صاحب سہارنپوری کی نوکری کے سبب دہلی آ گئے۔ مولوی صاحب چند روز جناب اس مکان میں رہے پھر چھاپہ خانہ میں، پھر دار البقاء میں چند روز رہے۔ اس زمانہ میں جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کر پانچ چھ سپارے آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیے۔"[1]

حاشیہ بخاری کا زمانۂ تحریر

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے بیان و نقل کی ترتیب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۲۶۷ھ سے قبل حضرت نانوتوی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کے بعد ایک سال کے قریب انھوں نے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے ساتھ مکان پر گزارا۔ ۱۲۶۸ھ کے آخر میں جب وہ ملازمت پر اجمیر چلے گئے تو کچھ دن دوسرے مقامات میں رہے۔ اسی زمانے میں تحشیہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ حضرت نانوتوی کے رفیق درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق یقینی طور پر معلوم

---

[1] سوانح قاسمی ص [illegible] مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی رو سے ۱۲۶۹ھ کی مدت ہو سکتا ہے جس میں حضرت نانوتوی نے صحیح بخاری کے آخری پانچ یا چھ پاروں کی تصحیح کی اور تحشیہ لکھا ہے۔

حضرت نانوتوی کا سال ولادت ۱۲۴۸ھ ہے اس لئے تصحیح اور حاشیے کی تحریر کے وقت اُن کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس سال ہوتی ہے۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بھی بطور تخمینہ تیئیس سال کی عمر بتائی ہے لہٰذا غالباً بائیس تئیس سال سے زیادہ حضرت والا کی عمر نہ ہوگی۔ [1]

جو لوگ حضرت نانوتوی کی عبقریت سے واقف نہ تھے ان کو بخاری کی تصحیح و تحشیہ کا جیسا اہم اور عظیم الشان علمی کام ایک نو عمر کے سپرد کئے جانے پر تعجب ہونا ہی چاہیے تھا مگر حضرت مولانا احمد علی کی بالغ نظر نے اپنے اس شاگرد کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور تبحر علمی کو کما حقہ پہچان لیا تھا۔

درسِ حدیث کا طریقہ

درسِ حدیث میں مذہب حنفیہ کے اثبات و ترجیح کا طریقہ اور تحقیقات و تشریحات کا سلسلہ آغاز دارالعلوم ہی سے جن کا نتیجہ ہے اور کم و بیش دارالعلوم کے طریقۂ درس حدیث میں روایت و درایت سے فروغ دیا جس میں حضرت نانوتوی کا بڑا حصہ ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک درس حدیث میں صرف حدیث کا ترجمہ اور مذاہب ائمہ کا بیان کر دینا کافی سمجھا جاتا تھا، مگر جب اہلحدیث کی جانب سے احناف پر شدومد کے ساتھ یہ الزام لگایا گیا کہ ان کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے تو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب اور ان کے بعض تلامذہ نے مذہب حنفی کے اثبات و ترجیح پر توجہ فرمائی دارالعلوم میں حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند اور دوسرے حضرات نے اس کو یہاں تک فروغ دیا کہ آج حدیث کی کوئی معروف درسگاہ اس سے خالی نظر نہیں آتی۔

---

[1] سوانح قاسمی جلد اول ص ۱۰۳ مطبوعہ [illegible] پریس دیوبند

حضرت نانوتویؒ کے درس سے کما حقہ استفادہ صرف وہی طلبہ کر سکتے تھے جو غیر معمولی استعداد اور ذہین و ذکی ہوں نیز پہلے سے کتاب کا بغور مطالعہ کر چکے ہوں۔ حضرت نانوتویؒ کی ذہانت ذکاوت، وسعت نظری اور قوت استدلال کا کچھ اندازہ آپ کی تصانیف سے کیا جا سکتا ہے آپ کا یہ قول مشہور ہے کہ اسلام کے تمام احکام سراسر عقلی ہیں یعنی ہر شخص کی عقل وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ حکیم منصور علی خاں مراد آبادی جو حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اپنی تصنیف مذہب منصور میں حضرتؒ کے درس و تقریر کی خصوصیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ جب کبھی کوئی اہم اور مشکل مسئلہ کو جمہور کے تصورات کے خلاف ثابت فرماتے تو بڑے بڑے ارباب علم و فضل حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے تھے جو حکم ظاہر میں قطعاً بے دلیل اور بے جا معلوم ہوتا وہ تقریر کے بعد عقل کے عین مطابق معلوم ہونے لگتا تھا۔ آپ کے پیش کردہ دلائل کے خلاف بڑے بڑے ارباب علم و فضل کو جرأت نہ ہوتی تھی۔"[۱]

مدارج العلماء میں حضرت شیخ الہند کا یہ بیان مذکور ہے فرماتے ہیں:-

"میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات دیکھ کر حضرت نانوتویؒ کے درس میں حاضر ہوتا تھا اور وہ باتیں پوچھتا تھا جو شاہ صاحبؒ کی تصنیفات میں نہایت مشکل ہوتی تھیں۔ شاہ صاحبؒ کے بیان جو آخری جواب ہوتا تھا وہ حضرت اول ہی مرتبہ فرما دیتے تھے، میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔"[۲]

دارالعلوم کے ابتدائی زمانے میں چند دن چھتہ کی مسجد میں اقلیدس کا درس دیا ہے، درس دیتے وقت جب طلباء کو کسی شکل کے سمجھنے کی ضرورت پیش آئی تو بغیر آلات کی مدد کے ہاتھ سے تختہ پر شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے۔ حالانکہ ریاضی اور اقلیدس کا مطالعہ آپ نے وہیں کا کیا تھا

---

[۱] مذہب منصور جلد دوم ص ۱۰۰ [۲] مدارج العلماء حکایت نمبر ۱۳۰

ہندوستان کی رہنمائی کے لئے وجود کیا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کا درس بالعموم صحاح ستہ ہی کی چار دیواری
میں ہوتا تھا جس میں صرف خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے۔ آپ کے فیض تعلیم سے حضرت
شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا احمد حسن امروہویؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ وغیرہ جیسے
باکمال نامور علماء کی ایسی جماعت پیدا کی جس کی نظیر حضرت شاہ عبد الغنیؒ کے بعد نظر نہیں آتی، اور
پھر دار العلوم جیسے مرکزی تعلیمی ادارے کے ذریعہ سے علوم دینیہ کا انتظام قائم کیا جو تب ہی
گوناگوں نوعیت کے لحاظ سے ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ ہے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کی تعلیم و تدریس کی چند خصوصیات نہایت اہم ہیں، ایک بڑی خصوصیت
تو یہ تھی کہ حضرت نے درس و تدریس کو کبھی حصول معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ضرورت مند ہونے
کے سبب سے مجبوراً حصول معاش کے لئے ملازمت اختیار کی، مگر تعلیمی کے بجائے مطبع میں
تصحیح کتب کی، اور پھر تنخواہ میں بھی عام روش کے برخلاف اضافے کے بجائے تخفیف پر اصرار
فرماتے تھے اور اس قدر کم تنخواہ پر قناعت فرماتے جس میں بدقت اہل و عیال گذر کیا جا سکے،
دس پندرہ روپے سے زیادہ کبھی تنخواہ لینا قبول نہ کیا، وقت کا بڑے سے بڑا عہدہ جو کسی
ہندوستانی کو دیا جا سکتا تھا وہ بقول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ آپ کی چشم و ابرو کے
ادنیٰ اشارہ پر مل سکتا تھا، چنانچہ آپ کے تعلیمی زمانے کے معاصرین جو علمی استعداد میں آپ
سے کہیں فروتر تھے محکمہ تعلیم کے بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو گئے، مگر آپ نے
تعلیمی ملازمت قبول کرنا پسند نہیں فرمایا۔ آپ کے والد مشرقی ذہن رکھتے تھے اور یہ امید
لگائے بیٹھے تھے کہ بیٹا لکھ پڑھ کر جب عالم بن جائے گا تو مستقل تنخواہ کی کوئی ملازمت ہو گی
مولانا کے معاصرین جب اچھے عہدوں پر فائز ہو گئے اور مولانا نے ملازمت کی جانب
التفات نہ فرمایا تو والد کو بہت افسوس ہوا اور بسبیل شکایت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ
سے عرض کیا کہ میرے یہی تو ایک بیٹا تھا اور اس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں کہ
کماتا، وہ نوکری کرتا تو ہمارا افلاس دور ہو جاتا، حضرت آپ نے کیا کر دیا کہ نوکری کے لئے

پیدا نہیں ہوتا، حضرت حاجی صاحب، اس وقت تو سُن کر چپ ہو رہے، مگر دوسرے وقت کہلا بھیجا کہ تم تنگی کی شکایت کرتے ہو حق تعالیٰ ان کو وزارت کے قریب ہی اتنا کچھ عنایت فرمائیگا کہ وزارت سے پیچھے رہ گئے، اور بڑے بڑے عہدہ دار اُن کی خدمت پر فخر کیا کریں گے۔

علوم عربیہ کی تعلیم و تعلم مدارس اور جماعت بندی کا جو طریقہ آج کل مروج و متداول ہے، علمائے سلف کا طریق اس سے مختلف تھا، عام طور پر علماء اپنے مکانوں اور مساجد میں بیٹھ کر طلبہ کو بوجہ اللہ تعلیم دیتے تھے، حصولِ معیشت کے لئے تجارتی کاروبار کرتے یا مستقلاً زندگی گذارتے تھے، اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ایسے علماء جو بغیر کسی کاروبار معیشت کے مستقلاً تعلیم و تدریس میں مشغول رہتے تھے حکومت کی جانب سے ان کے لئے معقول وظائف مقرر کئے جاتے تھے، حضرت نانوتوی سے دوبات کی ہمت استعداد کے باوجود سلف کی اس عادت کو عزیز رکھا جس ہمت و استقلال اور استغنا سے قلب کے ساتھ برقرار رکھا وہ آپ ہی کا حصہ تھا، حضرت حاجی صاحب آپ کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے میں کبھی ایسے لوگ ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد حضرت نانوتوی نے ذریعہ معاش کے لئے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار فرمایا اور بہت عرصہ تک یہی ذریعہ معاش رہا، تصحیح کتب کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا، صحاح ستہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم اور دوسری کتابیں بھی پڑھاتے تھے، مگر درس کسی مدرسہ کے بجائے مطبع کی چہار دیواری، مسجد یا مکان پر ہوتا اور جہاں موقع ہوتا تھا تلامذہ زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔

تواضع اور استغنا

مرنجاں مرنج، منکسر المزاج اور بے حد منکسر اس حد کا تھا کہ علماء کی مخصوص وضع قطع، دستار و جبہ تک بھی استعمال نہیں کیا، تعظیم سے بہت گھبراتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "اس نام کے علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسی خاک میں

مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ

حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ نے بھی دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علیؒ سے تعلیم پائی تھی۔ دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ مجلس شوریٰ کے تاعمر رکن رہے۔ فارسی و اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ متعدد نظمیں، قصیدے اور مرثیے وغیرہ ان کے ذوقِ شعری کے نمونے ہیں۔ دیوبند میں ۱۲۷۴ھ میں ایک بار وبائے چیچک پھیلا تھا۔ اس چیچک کی روداد کو انھوں نے فارسی زبان میں نظم کیا ہے اس نظم کا تاریخی نام "قصۂ مجدری" (۱۲۷۸ھ) ہے۔ دیوبند کے حالات میں یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ حضرت مولانا فضل الرحمنؒ کو مادۂ تاریخ کے نکالنے میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ دارالعلوم کی رودادوں میں ان کی بہت سی نظمیں اور تاریخی قطعات درج ہیں۔ محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے۔ بریلی، بجنور اور سہارنپور وغیرہ اضلاع میں تعینات رہے۔ ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ اس ہنگامے میں جب مولانا محمد احسن نانوتوی کو بریلی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تو اپنے بعض معاملات انہی کے سپرد کر گئے تھے۔[1]

حضرت مولانا فضل الرحمن نے ۱۳۲۵ھ میں رحلت پائی۔ انھوں نے اپنے بعد اپنے فرزندوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسے مشاہیر اور یادگار روزگار صاحبزادے چھوڑے۔ ندوۃ المصنفین دہلی کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ انہی کے پوتے ہیں۔ حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ کے اخلاف سے تعلیمی اور دینی خدمت انجام دہی کا سلسلہ بحمداللہ اب تک جاری ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

دارالعلوم سے حضرت گنگوہیؒ کے رسمی تعلق کا آغاز اگرچہ ۱۲۸۳ھ سے پہلے نہیں

---

[1] مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۵۰۔

کی نہایت جامع شرح ہے۔ ۱۳۱۴ھ تک آپ کا درس جاری رہا جس میں سے زائد حضرات نے
آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، دورۂ حدیث میں آپ کے آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث
مولانا محمد زکریا کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ تھے آخر میں نزولِ ماء کی وجہ
سے درس کا سلسلہ بند ہو گیا تھا مگر ارشاد و تلقین اور فتاویٰ کا سلسلہ برابر جاری تھا، ذکر اللہ کی
تحریک و ترغیب پر بڑی توجہ تھی، جو لوگ خدمت میں حاضر ہوتے رغبتِ آخرت کا کچھ نہ کچھ حصہ
ضرور لے کر جاتے، اتباعِ سنت کا خاص اہتمام فرماتے تھے

۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دار العلوم دیوبند کے سرپرست
بنے، مشکل حالات میں دار العلوم کی کشتیوں کو سنبھالا دینا ان کی ایک بڑی خصوصیت تھی، ۱۳۱۴ھ
سے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی سرپرستی بھی قبول فرمائی تھی۔

فقہ اور تصوف میں تقریباً ۱۳ کتابیں تصنیف فرمائیں۔

باختلافِ روایت ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ اذانِ جمعہ کے بعد
۷۸ سال کی عمر میں وفات پائی، آپ کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ ہے، جس میں بڑے بڑے
نامور علماء شامل ہیں، اسی طرح آپ کے مسترشدین کی بھی ایک طویل فہرست ہے آپ کے تفصیلی
حالات تذکرۃ الرشید مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی میں مذکور ہیں، یہ کتاب دو جلدوں
پر مشتمل ہے۔

دیوبند، سرزمینِ دار العلوم

دیوبند اور دار العلوم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دار العلوم کا دیوبند سے گہرا تعلق اور رابطہ ہے، دیوبند
کی تاریخ دار العلوم کے بعد شرف کا ایک حصہ ہے، دیوبند ایک بہت پرانی آبادی ہے، یہ
نام دیوی کا "بن" سے مرکب ہو کر بنا ہے، پہلے دیوی بن کہا جاتا تھا، پھر کثرتِ استعمال
سے دیبن بولا جانے لگا پھر اس سے بگڑ کر یہ دیوبند نام ہو گیا

دیوبند شمالی ہند دہلی سے ۹۰ میل کے فاصلہ پر [illegible] عرض البلد [illegible] پر واقع تھی

کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ قدیم علمی ذخیروں کی دریافت، مفید اور بیش قیمتی شرحیں و حواشی وغیرہ بے شمار کتابوں کے ترجمے سب شامل ہیں

اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند مسلمانان ہند کی سیاسی رہبری کا بھی مرکز رہا ہے اس کے فضلاء نے نہ صرف مختلف تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہو کر کام کیا ہے بلکہ متعدد تحریکوں کے عالم وجود میں آنے کا ذریعہ بنے اسی طرح وہ برابر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کو آزاد کرا لیا۔[1]

دارالعلوم نے بے شمار طالبان علم دین کو اپنی آغوش میں لے کر اس قابل بنایا ہے کہ وہ علمی حیثیت سے برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ باحسن وجوہ انجام دے سکیں چنانچہ آج ہند و پاک وغیرہ میں جو دینی بیداری پائی جاتی ہے اس میں علمائے دیوبند کی جد و جہد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

دارالعلوم کے قیام اور اس کی بقا و ترقی میں اہل دیوبند نے جس طرح خوش سلیقگی، فیاضی اور علم دوستی کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، دیوبند کے اہالیان شہر نے طلباء کے قیام و طعام اور دوسری ضروریات میں جس طرح حصہ لیا اور دارالعلوم کو ترقی کرنے کے مواقع بہم پہنچائے وہ اہل دیوبند کا بہت بڑا کارنامہ ہے حضرت نانوتویؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ[2]

۱؎ مظاہر علوم العربی ۲ء ۔۔ ۱۹ء، ص ۱۰۱

۲؎ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں اہل دیوبند کی جانب سے ۹۰۴ طلبہ کے کھانے کے انتظام کی تفصیل دی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ ان طلباء کے علاوہ جو قیام وغیرہ کا صرف کمی کے سبب جگہ نہیں لوگوں کے ذمہ ہے جتنے یہاں ان کا کھانا مقرر ہے۔

(روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۳ھ ص ۳۶ و ۳۷)

۱۲۸۷ھ کے چندہ دہندگان کی تعداد ۲۲۵ ہے جس میں اہل دیوبند کی تعداد ۱۴۰ ہے[1]
اہل دیوبند کی جانب سے نقد چندے کے علاوہ طلبہ کے خورد و نوش کا انتظام
بھی تھا۔ اگر اس زمانے کی ارزانی کے پیش نظر ایک شخص کے ماہانہ کھانے کی قیمت کم از
کم ۵ روپے لگائی جائے تو ۶۰ طلباء کے سال بھر کے کھانے کی قیمت ۳۶۰۰ روپے
ہوتی ہے، اس میں ۱۹۹۷ روپے چندے کی رقم شامل کر لی جائے تو مجموعی ۵۵۹۷ روپے ہو جاتی ہے
جو گویا پوری آمدنی کے لحاظ سے نصف کے قریب ہے۔

طلباء کے ساتھ اہل دیوبند کا یہ معاملہ بدستور اب تک جاری ہے، بیشتر طلباء کی
معتد بہ تعداد شہر کی مساجد میں مقیم رہتی ہے اور وہیں ان کے خورد و نوش کا بندوبست ہوتا
چلا آ رہا ہے۔

آج مدارس کا قیام معمولی بات معلوم ہوتا ہے لیکن اگر سوا سو برس پہلے کے حالات
کا خیال کیا جائے جب اس طرح کے مدارس قائم کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ لوگ اس
طریق کار سے واقف تھے اور نہ کوئی نمونہ موجود تھا، تو بلا شبہ اس وقت کے اکابر علیہم الرحمۃ
کا یہ ایک غیر معمولی کارنامہ معلوم ہوتا ہے

۱؎ روداد ۱۲۸۷ھ ص ۲۶

نصب العین

اسلام میں علم سے مراد وہ علم ہے جو نبوت سے مستفاد ہو اور انسان کی دینی و دنیوی
اور مادی و روحانی دونوں زندگیوں کے لئے مفید ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے طلب علم ایک
فرض ہے، جس کو پورا کر کے مسلمان دنیوی بھلائی اور اخروی نجات حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ
اسی مقصد کے پیش نظر دارالعلوم دیوبند کی تعلیم کی بنیاد دینی عقائد و اعمال کی اصلاح پر رکھی
گئی ہے، علم برائے حصول منصب کبھی اس کا مقصد نہیں رہا ہے! تاریخ شاہد ہے کہ
دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے ان کے ذوق علم نے چپے چپے پر مدرسوں اور
تعلیم گاہوں کا جال بچھا دیا تھا، اسلامی آبادی کا کوئی قابل ذکر گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی
سرگرمیوں سے خالی رہا ہو، یہی کیفیت ہندوستان کی بھی تھی، مسلمانوں کے دور حکومت
کا کوئی دور ایسا نہ تھا جس کی ممتاز ترین خصوصیت علم و فضل کی اشاعت نہ رہی ہو، مسلمانوں
کا ایک ایک امیر اپنی علمی فیاضی سے ملک کے گوشے گوشے میں فضل و کمال کی ردا پھیلاتا
رہتا تھا، سلاطین و امراء علمی فیاضی اور علماء نوازی کا اور طلبہ پروری میں ایک دوسرے سے
سبقت لے جانا اپنے لئے فخر و مباہات کا باعث اور نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے، مگر
سلطنت کا ہاتھ سے نکلنا تھا کہ علم کی وہ شمع جو چھ سو سال سے ہندوستان میں روشن تھی
رفتہ رفتہ گل ہو گئی، اور ملک پر انگریزوں کا تسلط مکمل ہو گیا، اس طرح انگریزی حکومت کے ساتھ
ہی انگریزی تہذیب، مذہب اور مغربی علوم و فنون رائج ہونے لگے، انگریز یہ چاہتے تھے

کی جنگ آزادی کا مسلمانوں کو ذمہ دار سمجھتے تھے اس لئے انہیں مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ
دشمنی تھی۔ انگریز حکمراں اپنے ساتھ جدید علوم وفنون لے کر آئے تھے۔ انہوں نے جو نیا نظام
تعلیم جاری کیا اس میں قدیم علوم کے بجائے دنیوی فنون سے زیادہ جدید علوم کو جگہ دی تھی اس کا
نتیجہ ایک بالکل نئی شکل میں نمودار ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی کا یہ زمانہ مسلمانوں کی زندگی
کا نہایت پرآشوب دور تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو
تیز و تند بادہائے مخالف کے تھپیڑوں سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ہندوستان میں مغل سلطنت
کے زوال اور طوائف الملوکی نے سیاست کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے عقائد اور فکر و نظر
کی بنیادیں ہلادی تھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے زمانے کے حکمرانوں اور
خواص و عوام کو اپنی تصانیف میں سخت تنبیہ کی ہے اور خبردار کیا ہے کہ وہ زوال کے آخری سرے
پر پہنچ چکے ہیں اور جس راہ پر گامزن ہیں اس سے بچنا سخت ضروری ہے۔ تفہیمات
میں لکھتے ہیں۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے علماء کو
ارباب من دون اللہ بنا لیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ
بنا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو شارع کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں اور گنہگار
میرے لئے۔ یہ اس قسم کی بات ہے جیسے یہودی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا
مَعْدُودَةً (ہم دوزخ میں جائیں گے اور گئے تو بس چند روز کے لئے) اگر پوچھو تو
آج ہر گروہ میں ایسی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیا کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال و بیانات
رواج پا گئے جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ خصوصاً مسئلہ توحید میں ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ شریعت کی انہیں مطلق پرواہ ہی نہیں ہے۔ فقہا کو دیکھو تو ان میں اکثر ایسی باتیں ملتی
ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی نہیں ہے اور یہی حال اصحاب معقول اور شعراء اور اصحاب ثروت

ملک کا تعلیمی نظام مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھا۔[1]

انگریزوں کے لائے ہوئے کسی تعلیمی نظام کا شکار کی حد تک ہندوستان میں خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو اس زمانے میں دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ کے میر منشی رہ چکے تھے اور جنہیں جنگ آزادی کی بغاوت کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی جزیرہ میں رہنے کے زمانے کی تصنیف الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں۔

"انگریزوں نے تمام ہندوستان کو نصرانی بنانے کی سکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا اس لئے انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے یہ بھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر ملک کے باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضے کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اس لئے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے، اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔"[2]

غرض کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے مسلمان سنگین ترین حالات سے دوچار تھے۔ ایک طرف حکومت کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی نظام برباد ہو چکا تھا اور دوسری طرف ان کے ذرائع معاش مسدود ہو رہے تھے، ان پر مستزاد یہ کہ انگریزی حکومت ان کو عیسائی بنانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔ انگریزوں سے قبل ہند میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۲ ۔

[2] الثورۃ الہندیہ ص ۳۵ و ۳۶ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور

بڑے سے بڑے ملکی اور دینی منصب کے لئے بھی طلباء تیار کرتا تھا جس کی اس دور کی مدارس کے تعلیم یافتہ طلباء، وزارت و حکمرانی تک کے فرائض نہایت کامیابی، خوش اسلوبی اور قابلیت کے ساتھ، سرانجام دیتے تھے۔ اور وہی شخص جو علوم دینیہ پر دسترس رکھتا تھا بڑے سے بڑے ملکی اور انتظامی منصب کے لئے وہی منتخب ہوتا تھا چنانچہ شیر شاہ سوری ([illegible] - [illegible]) نے جونپور کے مدرسہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ شیر شاہ کا مختصر سا دور حکومت اپنی سیاسی اور تمدنی اصلاحات کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک ممتاز دور سمجھا گیا ہے اکبر ([illegible] - [illegible]) کے عہد حکومت کی بہت سی انتظامی اصلاحات کا آغاز درحقیقت شیر شاہ سوری ہی کے عہد میں ہو چکا تھا۔

جدید نظام تعلیم کے جاری ہونے سے مسلمانوں کا علمی اور عملی شیرازہ منتشر اور پراگندہ ہو گیا۔ عقائد اور فکر ونظر سے لے کر عمل و کردار تک ان کی زندگی کا ہر ہر گوشہ متاثر ہو گیا۔ نئے تعلیمی نظام کے جاری ہونے پر مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ اس وقت مسلمان سخت ترین اقتصادی اور معاشی بدحالی کا شکار ہو چکے تھے۔ اس سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضرورت تھی کہ بڑے پیمانے پر کوئی تحریک چلائی جائے تاکہ مسلمانوں کی زندگی میں جو خطرناک رخنے پڑ گئے ہیں ان کا فی الجملہ انسداد ہو سکے۔

دار العلوم دیوبند محض ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت ایک موثر اور فعال تحریک ہے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کے خس و خاشاک کو دور کر کے ان کو صاف اور بے میل اسلام سے روشناس کیا، شرک اور توہمات سے انہیں نجات دی، مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کر کے سیاسی اعتبار سے انہیں اس راہ حق طلبی میں مدد بہم پہنچائی تاکہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر

حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کر سکیں۔ تعلیمی، اصلاحی و سیاسی زندگی
کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں علماء نے اپنی عظیم الشان خدمات کا نقش قائم کیا
ہو۔ اس تحریک کی اثر اندازی صرف اندرون ملک تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ رفتہ رفتہ
اس کے حلقۂ اثر کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اس نے صرف برصغیر ہی کا نہیں بلکہ ایشیا کا بھی
دارالعلوم دیوبند ایک انقلاب آفریں مرکز بن گیا۔

تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے دو اہم مسئلے تھے۔
ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا تھا اور دوسرے کی نوعیت سیاسی تھی، جس کا مقصد
ہندوستان کو سامراجی اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہندوستان میں
مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی زندگی کی قدریں بھی تباہ ہو گئی تھیں۔ اسلام
کے سیدھے سادے فطری اصولوں کی جگہ شرک و بدعت اور رسوم و رواج نے لے لی تھی۔
توحید کا وہ خالص عقیدہ جو اسلامی عقیدے کی جان ہے، اسلامی تعلیم کی یہ روح شرک و
بدعت کے پیہم حملوں سے مضمحل ہو گئی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ نے اسلام کی روح کی
حفاظت کی اور تحریک کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ حضرت نانوتوی نے اعتقادی
اور معاشرتی اصلاح کے لئے زبردست جدوجہد کی۔ حضرت نے اسلامی مسائل کو عقلی دلائل سے
مستحکم کیا۔ غلط رسم و رواج کی مخالفت کی۔ بیواؤں کے نکاح، عورتوں کے حق وراثت
اور معاشرتی اونچ نیچ کے خاتمے کی بھرپور کوشش کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی مساعی
کا ہندوستان کے ہر گوشے پر اثر پڑا۔ اور مسلمانوں کی بڑی تعداد اس سے متاثر ہوئی۔ یہ
حالات تھے جن میں دارالعلوم نے اسلامی عقائد، اسلامی علوم، دینی تعلیم و تربیت
و سیاسی جدوجہد کے لئے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے دینی مدارس کے

کے قیام کو ضروری قرار دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند منظرِ شہود پر جلوہ گر ہوا جس نے دارالعلوم کی تحریک کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ ملک کے طول و عرض میں ہر طبقہ کے لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ اوہام و رسوم اور شرک و بدعت کے جو گہرے بادل ہندوستان کی فضاؤں میں چھائے ہوئے تھے رفتہ رفتہ چھٹنے شروع ہو گئے اور ان کی جگہ کتاب و سنت کے احکام پر عمل کیا جانے لگا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کے لئے عمل میں لایا گیا، ان کی تفصیل دارالعلوم کے قدیم دستورِ اساسی میں حسبِ ذیل بیان کی گئی ہے۔

۱۔ قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان کے علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنونِ آلیہ کی تعلیم دینا، اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲۔ اعمال و اخلاقِ اسلامیہ کی تربیت اور طلباء کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعتِ اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجا لانا اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے خیر القرون اور سلفِ صالحین جیسے اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

۴۔ حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵۔ علومِ دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارسِ عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

یہ وہ مقاصد ہیں جو اگرچہ اسلامی روایات و تاریخ کے دورِ اول سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں، مگر اس وقت ان کے احیاء و تجدید کی ضرورت اس لئے درپیش تھی کہ تیرھویں صدی ہجری کے نصفِ آخر میں حکومت کی تبدیلی اور محرومی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علم و عمل اور فکر و نظر میں جو خلا اور رخنہ پیدا ہو گیا تھا اس کے انسداد کے لئے ناگزیر تھا کہ ان

کے لئے ایسے وسائل اختیار کئے جائیں جن کے ذریعہ سے اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی
تہذیب و معاشرت کی حفاظت کی جا سکے۔ دارالعلوم کا سب سے اہم مقصد انہی مقاصد کا
احیاء اور ان کی تجدید ہے۔ دارالعلوم کے مقاصد اور اس زمانے کے مسلمانوں کی پراگندہ
حالی کی تصویر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے ۱۲۸۳ھ کے جلسہ انعام میں تحریر
کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اس مدرسہ کی ابتدا محض علوم دین کے احیاء کے لئے ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جس میں
جملہ اہل ہندوستان نے تھوڑا وقت گذار دیا تھا اور موجودہ حال کے دیکھنے سے یوں نظر
آتا تھا کہ اب علم دین کا خاتمہ ہے، نہ کوئی پڑھ سکے گا نہ پڑھا سکے گا، بڑے بڑے شہر کہ
مرکز اس دائرہ کے تھے خراب ہو گئے تھے، علماء پریشان، کتب مفقود، جمعیت غائب۔
اگر کسی طالب میں شوق علم اور طلب کی ہمت ہوئی تو کہاں جائے اور کس سے سیکھے
اور یوں نظر آتا تھا کہ بیس تیس برس میں جو علماء بقید حیات ہیں اپنے وطن اصلی جنت
کو سدھار جائیں گے، تب کوئی اتنا سمجھنے والا بھی نہ رہے گا کہ وضو کے کتنے فرض اور
نماز میں کیا واجب ہے۔ ایسی پریشانی اور مایوسی اور ناامیدی میں فضل الٰہی نے جوش مارا
اور رحمت خداوندی کا دریا امڈ آیا اور ابر فیض قدرت کاملہ کا موسلا دھار برسا اور اپنے
بندگان مقبول کو اس کام کی طرف متوجہ فرمایا اور اپنا کرم اس مدرسہ کی بنا میں ظاہر
فرمایا۔ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں — مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند[1]

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے الفاظ میں دارالعلوم
کے سبب قیام کی ضرورت یہ ہے :-

---

[1] روداد مدرسہ دیوبند ۱۲۸۳ھ ص ۱

اوّل مذہبیت ۔ دارالعلوم مذہبی قوت کا سرچشمہ ہے اور اول سے آخر تک
اسلام کے دستور و آئین کا پابند ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر فرد اسلام کا نمونۂ
کامل ہے۔

دوم آزادی ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دارالعلوم مکمل طور پر بیرونی غلامی کے
خلاف ہے، اس کا نظام تعلیم و تربیت، اس کا انتظام مالیات اور اس کا نظام اجتماعی
سرتاسر آزاد ہے ۔ دنیا میں یہی جامعہ ہے جس کے سامنے حکومت نے بارہا پیش
کش کی مگر اس نے لاکھوں روپے کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سوم سادگی اور محنت پسندی ۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے علماء اور طلباء
سب زندگی میں بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کرنے کے عادی ہیں۔

چہارم کردار بلند اخلاق، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے طلباء اخلاق کردار
بلند کا نمونۂ کامل ہیں جبکہ، نفوس نے اپنے اکابر سے پایا ہے، یہ کردار سرتاسر
روحانی ہے ۔

پنجم علمی اور تعلیمی وابستگی ۔ یہ وہ خصوصیت ہے جسے دارالعلوم کو دیکھنے والا
اولین لمحات میں محسوس کر سکتا ہے، یہ نہ کہنے کی بات ہے نہ سننے سے متعلق ہے
دارالعلوم کی یہ خصوصیت کہ اس کی زندگی کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے، یہی وجہ
ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں دنیا کے ہر حصے کے طلبہ موجود ہیں، دارالعلوم کے اساتذہ
و منتسبین کے بہترین اساتذہ ہیں اور دارالعلوم کے خدام ایثار و قربانی کا زندہ نمونہ
ہیں، مسلمانوں کو ان لوگوں پر اعتماد ہے اور دنیا کے ہر حصے سے اس دارالعلوم کیلئے
مالی امدادیں وصول ہوتی ہیں ۔

دارالعلوم کی تاریخ میں اُن علمائے ربانین نے ڈالی تھی جو سرمایہ خلوص و للہیت
تھے، ان کا دستور، اساس مکتب اسلامیہ کے شاندار مستقبل کے لئے بے چین تھا، نمونہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ دوم

دارالعلوم دیوبند کا قیام

اور سالانہ حالات و کوائف

ہندوستان میں علومِ عربیہ دوسری صدی ہجری میں اسلامی فتوحات کے ساتھ داخل ہوئے، جب سندھ و ملتان کو سب سے پہلے مدینۃ العلم بننے کا شرف حاصل ہوا، علماء نے اس سرزمین کو علم کی روشنی سے پر رونق بخشی، پھر سلاطینِ غزنویہ کے عہد میں لاہور مرکزِ علم بنا، اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں دہلی علوم و فنون کا گہوارہ بنی، بعد ازاں دہلی کے فضل و کمال سے جونپور میں علم کی مسند بچھی، پھر ان ہی کے علم کی روشنی سے لکھنؤ منور ہوا، جہاں آفتابِ علم اس آب و تاب سے چمکا کہ اس نے پورب کے ہر قصبہ کو انوارِ علم سے جگمگا دیا، علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامؤ، خیرآباد اور بہار و بنگال کی علمی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں، شاہجہاں فخریہ یہی کہا کرتا تھا:-

"پورب شیرازِ ماست"

دہلی جس کو اسلامی علوم و فنون کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، ملک کے گوشے گوشے سے تشنگانِ علوم اپنی پیاس بجھانے کے لیے وہاں کا قصد کرتے تھے، مغل سلطنت کے

آخری دور میں اس سرزمین سے حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ / ۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) جیسا یگانۂ روزگار عالم اٹھا جس کے علمی فیض سے ایشیا کے اکثر ممالک آج تک سیراب ہو رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں علوم دینیہ بالخصوص تفسیر و حدیث کے جس قدر سلسلے موجود ہیں ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہؒ سے ہوتا ہے۔ اس برصغیر میں دینی علوم کا جو کچھ ذوق پایا جاتا ہے وہ سب اسی خانوادۂ ولی اللہی کا فیض ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک غیر ہندوستانی عالم کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے سارے ہندوستان کی سیاحت میں کوئی ایسا عالم نہیں دیکھا جو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۵۹ھ - ۱۲۳۹ھ / ۱۷۴۶ء - ۱۸۲۴ء) کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شاگرد نہ ہو۔[1]

اس دور میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینی علوم زوال کے آخری سرے پر پہنچ چکے تھے، چنانچہ مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا لکھتے ہیں:-

ولولا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق، فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهى الضعف في أوائل هذا القرن الرابع عشر[2]

اگر ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانے میں علم الحدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر و شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودہویں صدی کے اوائل تک حدیث کا علم ضعف کی آخری منزل تک پہنچ گیا تھا۔

خود ہندوستان کے ہمسایہ ملک افغانستان کی اس وقت جو حالت تھی اور اب تک باقی ہے، اس کا اندازہ مولانا محمد علی قصوریؒ کے مندرجہ ذیل خط سے ہو سکتا ہے

---

[1] شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک، از مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ص ۵۔

[2] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ، سید رشید رضا، ص ق، مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء۔

موقع پر قیام پذیر تھا، حضرت نانوتویؒ کی سسرال دیوبند کے محلہ دیوان میں تھی، اس لیے یہاں آمد و رفت زیادہ ہوتی رہتی تھی۔ دیوبند میں حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ اور حضرت حاجی محمد عابدؒ سے ملاقات و محبت کا رشتہ تو تھا ہی، حضرت کے وقت کا اکثر حصہ اسی مسجد میں صرف ہونے لگا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب اور جناب حاجی محمد عابد صاحب سلمہ اللہ چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے، مولانا نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا اور ان دونوں بزرگوں سے کمال درجے کا ربط و ضبط قائم ہو گیا[1]"

اس وقت بنیادی نقطۂ نظر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لیے ایک دینی و علمی درسگاہ کا قیام ناگزیر ہے۔ اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء خاص حضرت مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور حضرت حاجی محمد عابد رحمہم اللہ نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درس گاہ قائم ہونی چاہیے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلامی عہد حکومت میں مدارس کے لیے حکومت کی جانب سے اوقاف مقرر ہوتے تھے، جن سے مدارس کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے وہاں امراء و رؤساء بھی پوری فیاضی کے ساتھ مدارس کی سرپرستی کرتے تھے مگر جب یہ انقلاب قائم ہوا تو اسلامی حکومت کی وہ شمع جو چھ سو سال سے ہندوستان میں روشن تھی گل ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت نے عوام و امراء سے بے نیاز کر رکھا تھا وہ اسے

---

[1] یہ محلہ چھتہ کی مسجد کے مرقوم نام سے موسوم ہے۔ جہاں محلے کا خاص حصہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ دارالعلوم کا ابتدائی مدرسہ اسی مسجد کے صحن میں کھلا، تا ابھی کی تعمیر ہوئے ہیں

[2] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۲۱ و ۲۲۲

آنے والے عوامی دور کے پیش نظر یہ ایک زبردست پیش بینی تھی۔ تحریک خلافت کے موقع پر جب مولانا محمد علی جوہر مرحوم دارالعلوم میں آئے اور انہوں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول ہشتگانہ دیکھے تو مولانا مرحوم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا کہ "ان اصول کا عقل سے کیا تعلق! یہ تو خالص الہام و معرفت کے سرچشمے سے نکلی ہوئی باتیں ہیں۔ سو برس کے بعد دیکھ کر ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں، حیرت ہے کہ یہ بزرگ پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے"۔

اب جب کہ بڑی بڑی ریاستیں خواب و خیال بن چکی ہیں، اور رئیس و نواب ختم ہوگئے ہیں۔ مگر کشمیر سے آسام تک ہزاروں دینی مدرسے چل رہے ہیں اور ان پر حکومت کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس سے عوامی چندے کی افادیت اور مدارس کی بنیادوں کے استحکام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

اوقاف کے سابقہ طریقے کے بجائے عوامی چندے کا یہ طریقہ بہت کامیاب اور بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ دینی مدارس کے قیام اور دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے یہ ایک ایسا مفید اور مستحکم طریقہ تھا جس نے دینی تعلیم کے فروغ کو عوامی چندے کی تحریک میں تبدیل کر دیا۔ چندے کی نسبت دارالعلوم کا شروع سے طے شدہ اصول یہ رہا ہے کہ اس میں شرح چندہ کے لئے کوئی لازمی مقدار مقرر کی گئی ہے نہ مذہب و ملت کی تخصیص روا رکھی گئی ہے۔ چندے کی اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"چندے کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے اور نہ خصوصیت مذہب و ملت ہے"

بانیٔ دارالعلوم کا دستور العمل

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) جو اس تعلیمی تحریک کے کارساز اور روح رواں تھے۔ انہوں نے ملی، تعلیمی، تبلیغی، تصنیفی، سیاسی، اور معاشرتی امور میں برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم الشان اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں

انھوں نے دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم کے قیام و بقا کے لئے جو دستور العمل تجویز فرمایا ہے
اس میں اسلامی دینیہ حکومت کے سابقہ طریق کے برعکس اسی عوامی چندے اور جمہوری طرز
کے اختیار کرنے کی پرزور تلقین کی گئی ہے۔ اس دستور العمل میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے
بتایا ہے کہ دینی مدارس کے قیام کے لئے بنیادی طور پر یہ اصول ضروری قرار دئے
جائیں :

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیرِ چندہ پر نظر رہے، آپ
کوشش کریں اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲) ابقائے طعامِ طلبہ بلکہ افزائشِ طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ
ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی
بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ
کو اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ
کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہِ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس
و پیش میں اسلوبیِ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ
اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں، یعنی
یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں
نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب
میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ
رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز
اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت
نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے

، خوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر البتہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ، باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری کی نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے

ان اصول ثمانیہ کی نہایت ہی بلیغ تشریح حضرت مولانا محمد طیب نے فرمائی ہے جو ایک مستقل پمفلٹ میں بنام آزادی ہند کا خاموش رہنما شائع ہو چکی ہے۔

اس دستور العمل کی پہلی، دوسری، چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں دفعہ میں واضح طور پر عوامی چندے کو اوقاف کا بدل تجویز کیا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی پور

کہ اتفاقی درس گاہ میں تبدیلی ہو گئی، مدرسین میں بھی اضافہ کیا گیا، آخر سال میں جو روداد شائع

ہوئی اس میں لکھا ہے:-

بحمد للہ کہ ۱۲۸۳ھ بخیر و خوبی تمام ہوا، یہ وہ مبارک سال ہے جس میں مدرسہ عربی دیوبند

قائم ہوئی، اور اس قدر عرصہ قلیل میں اتنی رونق پکڑی کہ ہرگز امید نہ تھی۔ ابتدا میں خیال نہیں آتا تھا

کہ اس قدر طلبہ جمع ہوں گے، چندہ و دیگر خرچ اتنا ہو جاوے گا، حقیقت میں اکثر لوگوں کا خیال

تھا کہ پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آویں گے، مگر عنایت ربی سے علاوہ شہر دیوبند کے

طالب علم اطراف و جوانب سے اور ملک دور دراز سے ایسے جمع ہو گئے کہ گویا منتظر بیٹھے ہوئے

تھے، علاوہ قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع ممالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں آئے بلکہ پنجاب و کابل و

بخارا وغیرہ تک کے لوگ جمع ہو گئے، اور چونکہ ان کے کھانے اور مکان وغیرہ کی طرف سے

یہاں بالکل اطمینان میسر، فارغ البال تمام تحصیل علم میں مصروف رہے، ہر چند اہل دیوبند کا یہ خیال

زیادہ ہو گیا کہ چندہ قابل تحسین و آفرین ہے کہ انھوں نے باوجود کم استطاعتی کے اس پر دینی نیکی

اور خیرخواہی اہل وطن کے بناء اس مدرسہ کی ڈالی اور طلبہ بیرونی کا خرچ خوراک وغیرہ بے خود اپنے

ذمہ کر ان کو کمال عزت سے رکھا، اور شہر کا چندہ فقط نہایت خوشی اور خلوص سے چندہ ۱۲۸۳ھ

پیشگی دیا اور چندہ سال آئندہ بکمال کشادہ پیشانی دے رہے ہیں اور جن سے چندہ جو ادا نہیں

ہوا ان کو روز و شب فکر لاحق ہے، بلکہ کمال مشکور ہے، کہ صاحب جوائنٹ میرٹھ دیوبند کا حسن ساختے

اس کام کو محض مفید عام سمجھ کر خود شریک چندہ ہوئے اور لوگوں کو اس طرف راغب کیا۔ فی

الحقیقت یہ مدرسہ ظاہر میں اگرچہ خاص بمقام دیوبند معلوم ہوتا ہے لیکن فائدہ اس کا دور دور

تک پہنچتا ہے، اس لئے علاوہ اعانت اس کی جملہ اہل ہند پر واجب ہے، پس امید ہے کہ

جو صاحب شریک چندہ ہیں چندہ ۱۲۸۴ھ جلد مرحمت فرماویں، اور ترقی کا ارادہ اور زیادتی خرچ

مدرسہ پر نظر کرکے جہاں تک ممکن ہو زیادتی چندہ کا فکر کریں اور اپنے احباب و اقارب کو بھی

شامل اس کار خیر کے فرما دیں۔

ب واسطے اکتساب حال ترقی مدرسہ جمع و خرچ چندہ و انتظام خواندگی و امتحان و معاملہ سالانہ ۱۲۸۳ھ کی مجملاً کیفیت لکھتے ہیں تاکہ شرکا کو فرحت اور معینین کو رغبت ہووے اور یقین ہو جاوے کہ چندہ کو نہایت امانت و کفایت سے صرف کیا ہے، اس سال میں ۹۴۹ روپیہ چار آنے وصول ہوئے اور مع وصول شدہ کے ۳۹۲ روپیہ بارہ آنے تین پائی تنخواہ مدرسین و سائر خرچ مدرسہ میں صرف ہوا۔ اور ۲۵۵ روپیہ سات آنے نو پائی آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ کو باقی ہے، وجہ اس قدر بچت کی یہ ہے کہ ابتدا میں خرچ مدرسہ تھوڑا تھا، صرف ایک مدرس اور دو نائب رہے، بعدہ مدرس زیادہ ہوئے، آج کل خرچ ماہوار تخمیناً پچاس روپیہ کا ہے، اور تخمینہ خرچ ۱۲۸۴ھ سات سو روپیہ سے کم نہیں ہے۔
محرم ۱۲۸۳ھ میں تعداد طلبا ۲۱ تھی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ میں ۷۸ ہو گئے، منجملہ ان کے ۵۸ طلبہ بیرونجات کے ہیں، جن میں ۲۵ کو اہل دیوبند کی جانب سے کھانا ہے اور وہ طلبہ اپنے پاس سے کھاتے ہیں، اس سال کی تعلیم کی کارگزاری کی نسبت روداد میں لکھا ہے :-

کارگزاری اور محنت ہر ایک مدرس قابل تعریف ہے، یہ ایک عمدہ نتیجہ حسن سعی مدرسان ہے کہ بعض طلبہ جو میزان پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے تھے وہ کافیہ پڑھتے ہیں، اور چند متوسط الاستعداد قریب فارغ التحصیل ہونے کے ہو گئے۔

مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول اور مولوی محمود صاحب دیوبندی کی محنت اور توجہ کا شکر ہم پر واجب ہے کہ ان کی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کچھ ترقی تعداد اور استعداد ہوئی اور دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل، مولوی میر باز خان، اور مولوی فتح محمد و حافظ احمد حسن نے بھی بہت سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا، ہمارا ارادہ ہے کہ تنخواہ مدرسان پر اضافہ کیا جاوے، مگر یہ امر ترقی چندہ پر موقوف ہے، اہل چندہ ہماری اس تمنا کے پورا کرنے کا خیال رکھیں۔

اور شوریٰ کی بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ نظم و نسق کے لئے ایک جماعت مجلس شوریٰ کے نام سے قائم
کی گئی تھی۔ قیام دارالعلوم کے بعد جو اعلان شائع کیا گیا، اس میں مجلس شوریٰ کے تمام اراکین کے نام
درج ہیں۔ یہ ابتدائی مجلس شوریٰ حسب ذیل سات ارکان پر مشتمل تھی، حسب ترتیب اسمائے
گرامی یہ ہیں:-

حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ ۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ
حضرت مولانا مہتاب علی صاحبؒ ۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ ،
حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ ۔ منشی فضل حق صاحبؒ ۔ شیخ نہال احمد صاحبؒ ،

مجلس شوریٰ کی زیر ہدایت آمد و صرف کے حسابات رکھنے اور تعلیمی امور کے نظم و نسق کے
لئے حضرت حاجی عابد حسین صاحب کو جو مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے مہتمم مقرر کیا گیا اور دفتری
کاموں کی انجام دہی کے واسطے حاجی فضل حق صاحب کو سربراہ کار بنایا گیا۔

سالانہ امتحان

پہلے سال کا سالانہ امتحان جس میں منجملہ ۷۸ طلبہ کے ۲۱ طلبہ شریک امتحان
ہوئے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ، حضرت مولانا مہتاب علی
صاحب اور حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے لیا، ان حضرات نے نتیجے کے ساتھ روداد
میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار فرمایا:-

"ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر ہر طالب علم کا لیا اور جہاں تک سوالات مشکل
پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کے بابت لگائے، ماشاءاللہ بالعموم
قابل تعریف پایا، مدرسان کی سعی اور طلبہ کی محنت اس امتحان سے بخوبی
ثابت ہے۔"

سنہ ۱۲۸۴ھ کے حوادث

ابھی دارالعلوم کے قیام کا دوسرا ہی سال تھا کہ ایک
دو واقعے ایسے پیش آئے جن سے یہ خطرہ محسوس ہونے
لگا کہ یہ ننھا سا پودا پھلنے پھولنے سے پہلے ہی کہیں تند ہوا و حوادث نہ ہو جائے، پہلا حادثہ دیوبند کے

وبائی مرض کی شدت کا تھا جس میں اکثر اساتذہ اور طلبہ مرض وبائی میں مبتلا ہو گئے، اور بعض اپنے
اپنے وطن چلے گئے اس سبب سے دو مہینے تک تعلیم بند رہی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ وبائی مرض
کے دور ہونے کے بعد اساتذہ و طلبہ کی غیر معمولی محنت و دلسوزی نے اس نقصان کی تلافی کر دی
اور مقررہ خواندگی پوری ہو گئی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وبائی مرض کی شدت کے باوجود طلبہ
کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا، گزشتہ سال طلبہ کی تعداد ۱۰۰ تھی اور اس سال میں ۲۰۰ تک
پہنچ گئی، چندے میں بھی سال گزشتہ کے مقابلے میں دوگنا اضافہ ہوا، ۱۲۸۳ھ میں چندے کی
مقدار ۱۲۳۹ روپیہ تھی، اس سال میں زرچندہ کے ۲۶۵۰ روپیہ وصول ہوئے۔

دوسرا واقعہ جسے روداد میں "امر عظیم اور حادثہ فخیم" سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ تھا کہ وقفہ
حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ نے سفرِ حج کا ارادہ فرمایا، روداد میں مذکور ہے کہ "یہ ایسا زلزلہ
تھا کہ اگر بنیاد مدرسہ بیخ برکندہ ہو جاتی تو عجب نہ تھا کیونکہ مشغلۂ اہتمام دیوبند میں بظاہر کوئی
ایسا نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا متکفل ہوتا، لیکن خدا خود مسبب الاسباب است، سبب یوں ہوا کہ بعض
ارکان کو جنہیں لیاقت کامل اور اخلاص نیت حاصل ہے یہ القا ہوا کہ اس کام کے واسطے مولوی
رفیع الدین صاحب مناسب ہیں، چنانچہ ابتدائے شعبان ۱۲۸۴ھ سے یہ کام ان کے سپرد ہوا اور
منتظمانِ مدرسہ کی طرف سے بالکل اطمینان ہو گیا۔

گزشتہ سال جب مدرسین کو رکھا گیا تھا تو ان کے مشاہرے بہت کم تھے اور ان سے وعدہ
کیا گیا تھا کہ آمدنی میں اضافہ کے ساتھ مشاہروں میں ترقی دی جائے گی، چونکہ اس سال میں
آمدنی بڑھ گئی تھی اس لئے حسب وعدہ ترقی دی گئی، صدر مدرس کی تنخواہ میں دس روپے کا
اضافہ ہوا، مدرس دوم کے ۵ سے ۱۰ ہو گئے، اور نائب کی تنخواہ تین کے بجائے چھ روپے
کی گئی۔

درجۂ قرآن اور درجۂ فارسی کا آغاز

سال گزشتہ میں قرآن شریف اور فارسی و ریاضی کی تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا تھا اس نے

مقامی بچے ابتدائی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے دارالعلوم سے مستفیض نہ ہو سکتے تھے اس دقت کو رفع کرنے کے لئے درجۂ قرآن شریف اور دو مدارس کا ملحقہ کا اجرا کیا گیا اور مختلف درجوں میں ایک ایک استاد پانچ پانچ روپے پر مقرر ہوا۔

دارالعلوم کی روز افزوں ترقی کے پیش نظر اسی سال میں ایک محاسب کا تقرر عمل میں آیا۔

کتب درسیہ کی فراہمی

دینی مدارس کی دارالعلوم کے نقش قدم کے مطابق یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان میں تعلیم بلا معاوضہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ درسی کتابوں کی فراہمی کا بار بھی طالب علم پر نہیں ڈالا جاتا۔ دارالعلوم جب قائم ہوا تو اس کے پاس ضرورت کے مطابق نہ تو کتابیں موجود تھیں اور نہ ان کے حاصل کرنے کے لئے سرمایہ تھا، اس لئے یہ تدبیر کی گئی کہ دیوبند اور قرب و جوار کے جن اہل علم حضرات کے پاس درسی کتابیں موجود تھیں ان سے کچھ کے لئے عارضی طور پر کتابیں مستعار حاصل کر لی گئیں۔ اس سال کی روداد میں مستعار کتابیں دینے والے حضرات کی ایک طویل فہرست درج ہے۔ جب آئندہ سالوں میں دارالعلوم کے پاس کتابوں کا معقول ذخیرہ فراہم ہو گیا تو مستعار کتابیں واپس کر دی گئیں۔ بیرونی لوگوں میں دارالعلوم کے لئے کتابیں فراہم کرنے والوں میں شیخ الٰہی بخش میرٹھی، باشندگان دوناپور اور عبدالرحمن خان صاحب مہتمم مطبع نظامی کانپور کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

تعلیمی کیفیت

دارالعلوم کی تعلیمی ترقی شروع ہی سے نہایت عمدہ اور نتیجہ خیز رہی ہے۔ ابھی اس نے اپنی عمر کی دوسری منزل ہی طے کی تھی کہ یہاں سے طلبہ تیار ہو گئے جو تدریسی خدمات انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ دارالعلوم کے ایک فاضل مولوی میر باز خاں مدرسہ منبع العلوم بہار چند پور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ روداد میں لکھا ہے کہ مدرسین کی سعی اور محنت کے نتیجے میں یہ امر بالخصوص قابل ذکر ہے کہ باوجود موانع مذکورۂ بالا کے زمانہ میں ترقی ہوئی حتیٰ کہ امسال اس مدرسہ میں چند طلبہ ایسے ہیں جو فراغت کے قریب ہیں اور عربی و فارسی کی تعلیم کو ترقی

انجام دے سکتے ہیں چنانچہ حسب طلب مہتمم صاحب مدرسہ عربی سہارنپور مولوی میر باز خاں کو مدرس دوم مقرر کر کے بھیجا گیا ہے۔

۱۲۸۵ھ میں حضرت گنگوہیؒ کا معائنہ

اس سال کے حالات میں یہ واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کے ملاحظہ کے لئے تشریف لائے اور طلبہ کو دیکھا۔ طلبہ کا امتحان لیا اور بعد ازاں حسب ذیل معائنہ تحریر فرمایا:

"آج ۲۰ صفر ۱۲۸۵ھ کو یہ عاجز مدرسہ دیوبند میں حاضر ہوا اور اتفاقاً امتحان حال مدرسہ مذکورہ و طلبہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ۱۰۰ طلبہ عربی خواں سوائے فارسی خواں و قرآن خواں کے معلوم ہیں، مگر اس وقت ۴۰ طلبہ موجود و حاضر مدرسہ تھے، دیکھ کر جماعت متفرقہ کو ہر ایک کو ترقی اول تو اہتمام مہتمم و مدرسین کی محنت سے اور کوشش و محنت طلبہ کو قابل تحسین و آفرین ہوا، اگر ایسی ہی سعی کرتے رہیں گے تو یقین غالب ہے کہ چند مدت میں تحصیل عربی سے فراغت پا کر بعض رسائل علوم دینیہ ہوں گے۔"

اواخر سال میں جلسہ تقسیم انعام منعقد کیا گیا، جس میں اطراف و جوانب کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی، حضرت مولانا نانوتویؒ نے کامیاب طلبہ کو انعامی کتابیں عطا کیں، حاضرین کو سال بھر کی تعلیمی روداد سنائی گئی، انھوں نے دار العلوم کی کارگزاری کو بنظر استحسان دیکھا اور اپنی امداد و اعانت کا یقین دلایا۔

مختلف مقامات میں مدارس دینیہ کا اجراء

دار العلوم کے قیام کے تقریباً ۶ ماہ بعد سہارنپور میں مدرسہ مظاہر علوم جاری ہو گیا تھا۔ اس سال میں مختلف مقامات میں مدارس دینیہ جاری ہوئے، روداد میں مرقوم ہے:

"اکثر حضرات نے بہت سے اجراء مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقامات مختلفہ دہلی و میرٹھ و خورجہ و بلند شہر و سہارنپور وغیرہ میں جاری کرا دیے

ور دوسری جگہ منتقل کر لیا جاوے وغیرہ، اس کا رجسٹر اور تحریریں موجود ہیں۔[1]

۱۲۸۴ھ وبا اور قحط کی مشکلات

۱۲۸۳ھ کی طرح اس سال میں بھی دار العلوم کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، تپ لرزہ کی وبا نے تسلسل اختیار کر لیا، اساتذہ اور طلبہ بھی تپ لرزہ کا شکار ہو گئے، مرض نے کسی قدر طول کھینچا کہ مسلسل پانچ ماہ تک تعلیم معطل رہی، اس کے ساتھ ہی دار العلوم ملک گیر قحط کی وجہ سے بھی پریشان رہا، بہت سے طلبہ اور اساتذہ مرض کے طول سے پریشان ہو کر اپنے وطن چلے گئے مگر مرض کے رفع ہوتے ہی طلبہ جمع ہو گئے اور مدرسین کی انتھک سعی و کوشش سے آخر سال میں خواندگی پوری ہو گئی۔

اہتمام میں تبدیلی

اس سال اہتمام میں پھر تبدیلی ہوئی، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ حج کے لیے تشریف لے گئے، اُن کے بجائے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو دوبارہ مہتمم بنا دیا گیا

۱۲۸۵ھ میں سابقہ عوارض کے اثرات

پچھلے سال کے امراض تپ لرزہ و قحط کے اثرات اس سال کے آخر تک باقی رہے، طلبہ کی تعداد کم ہو کر رہ گئی، سالانہ امتحان بھی بیماری کی وجہ سے حسب معمول شعبان میں نہ ہو سکا، رمضان المبارک کے بعد شوال کے بجائے سال گزشتہ کی تعلیم کی تکمیل کرائی گئی، شب و روز کی غیر معمولی محنت کے بعد ذی الحجہ میں سالانہ امتحان لیا گیا، اس کے باوجود کہ ملک قحط اور گرانی کی مشکلات سے دوچار تھا، مگر مدرسہ کا توازن مالی اعتبار سے برقرار رہا۔

---

[1] دار العلوم دیوبند کے صد سالہ دور میں پیش آنے والے حالات کی تفصیل، آگے مرحلہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۲۸۹ھ کا سال ترقی

اس سال طلبہ کی تعداد گزشتہ سال کے مقابلے میں زیادہ رہی نیز اس کے ساتھ خرچ بھی آمدنی کے مقابلے میں بڑھ گیا طلبہ کی تعداد ۱۰۶ ہو گئی۔ طلبہ کی مختلف جماعتوں کے سبب سے وسیع مکان کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ دارالعلوم ابتداءً چھتے کی مسجد میں قائم ہوا تھا۔ یہ ایک مختصر سی قدیم مسجد ہے۔ جب طلبہ کی کثرت ہوئی تو دارالعلوم کو ایک دوسری قریبی مسجد میں منتقل کیا گیا جو قاضی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجد کسی قدر کشادہ تھی، مگر کچھ دنوں کے بعد جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو قاضی مسجد کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے لیا گیا۔ اس موقع پر اکابر دارالعلوم نے یہ محسوس کیا کہ اب دارالعلوم کے لئے ایک وسیع اور کشادہ عمارت کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں دیوبند کی جامع مسجد زیر تعمیر تھی، اس لئے یہ طے پایا کہ جامع مسجد میں اس مقصد سے حجرے اور دالان بنائے جائیں، چنانچہ اس کا اعلان کر دیا گیا اور چندے کے لئے اپیل کی گئی اور رجب ۱۲۹۰ھ میں جامع مسجد تیار ہو گئی تو دارالعلوم کو اس میں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا رفیع الدینؒ کی واپسی

دارالعلوم کے اہتمام کے علاوہ جامع مسجد کی تعمیر کا کام بھی حاجی سید محمد عابدؒ کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ دونوں کام کافی وقت چاہتے تھے، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ حاجی صاحبؒ کے کاموں کے بار کو ہلکا کیا جائے چنانچہ دارالعلوم کا اہتمام پھر مولانا رفیع الدینؒ کے سپرد کر دیا گیا جو حج سے واپس تشریف لا چکے تھے البتہ اہم امور کی نگرانی حاجی صاحب سے متعلق رکھی گئی۔

۱۲۹۰ھ، عطائے اسناد

قیام دارالعلوم کے بعد پہلی مرتبہ اسی سال طلبہ کو سند فراغت دی گئی۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۲۹۰ھ تک پانچ سالوں میں فراغت حاصل کرنے والے فضلاء کی تعداد اگرچہ ۲۵ تھی مگر جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر جو فارغین موجود تھے ان کی تعداد ۹ ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مولانا احمد حسن امروہیؒ، مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ،

مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھویؒ، مولانا شیخ محمد تھانویؒ، مولانا محمد فضل پھلتیؒ، مولانا احمد حسن دیوبندی، قاضی محی الدین نرویؒ، مولانا عبداللہ جلال آبادیؒ۔ ان میں سے متعدد حضرات کا شمار ہندوستان کے علمائے مشاہیر میں ہوتا ہے۔

دورۂ حدیث میں بعض علماء کی شرکت

دارالعلوم میں علمِ حدیث کی تعلیم کی شہرت سن کر اس سال میں چند ایسے حضرات نے بھی تکمیلِ حدیث کی غرض سے دارالعلوم میں داخلہ لیا جو اگرچہ فارغ التحصیل تھے مگر دارالعلوم کے درسِ حدیث سے مزید استفادہ کرنا چاہتے تھے، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

مولوی عبداللہ جونپوری، مولوی سلامت اللہ جونپوری، مولوی معشوق علی جونپوری، مولوی عبدالرحیم گل گنجی، مولوی برکت اللہ دہلوی۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جن جگہوں سے یہ علماء آئے تھے یہ وہ مقامات تھے جو قدیم زمانے میں علم و فن کے مشہور و برگزیدہ سمجھے جاتے تھے اور پرانے علماء کے باقیات الصالحات کے نشانات اگر کہیں تھے تو وہ یہی مقامات تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم اپنے ابتدائی چند برسوں میں ہی ہندوستان میں کس قدر وسیع علمی مقام حاصل کر چکا تھا، اور اس کی عظمت کا شہرہ قرب و جوار ہی میں نہیں بلکہ دور دراز مقامات اور قدیم علمی مرکزوں تک پہنچ چکا تھا۔

درسی کتابوں کے عطیات

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جب دارالعلوم قائم ہوا تو اس کے پاس طلبہ کو دینے کے لئے درسی کتابیں موجود نہیں تھیں، اس کا حل یہ نکالا گیا تھا کہ قرب و جوار کے اہلِ علم سے کچھ مدت کے لئے کتابیں مستعار حاصل کر لی گئی تھیں، مگر اس کے ساتھ کتابوں کی فراہمی کے لئے بیرونِ ملک سے اپیل کی گئی، جب یہ اپیل ملک میں شائع ہوا اور ہندوستان کے مطابع سے اس طرف توجہ پیدا ہوئی تو مطبوعات بڑی فراخدلی سے دارالعلوم کو پیش کی گئیں حتیٰ کہ بعض ہندو مالکانِ مطابع نے بھی بغیر کسی معاوضہ کے کتابوں سے دارالعلوم کی اعانت کی، چنانچہ روداد میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

بابت مشورہ ہے۔ ہم نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اخبار لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کے دریا دلی فرمائی اور چند کتب مفیدہ اس مدرسہ میں عنایت فرمائی فہرست ان کی مندرج ہے۔ ان میں خاص کر نسخہ قاموس کا کتب لغت میں بے نظیر ہے۔ اور منشی صاحب نے اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے طبع فرمایا ہے۔ مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا۔ یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے حاجی مولا بخش صاحب نے علاوہ دس روپیہ ماہوار کے جو برائے صرف طلبہ کے، سو روپیہ واسطے خرید کتب کے جداگانہ عنایت فرمائے۔ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب مالک مطبع نظامی کانپور نے کتب مندرجہ ذیل واسطے تقسیم طلبہ کے عنایت فرمائیں۔

یہ عطیات بڑے نیک فال ثابت ہوئے۔ بعد میں مسلسل ہر سال مطابع میں چھپنے والی کتابیں دارالعلوم میں آتی رہیں۔ اور آج تک درسی اور غیر درسی کتابوں کا جو عظیم الشان ذخیرہ دارالعلوم میں موجود ہے یہ اس کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں پیش قدمی اور دوسروں کے لئے نمونہ بننے کی سعادت عبدالرحمن خاں مالک مطبع نظامی کانپور اور منشی نول کشور آنجہانی کے حصے میں آئی۔ عبدالرحمن خاں صاحب اور منشی نول کشور جب تک زندہ رہے برابر اپنے مطبع سے چھپنے والی کتابوں کے نسخے دارالعلوم میں بھیجتے رہے اور روداد میں نہ صرف ان کی دی ہوئی کتابوں کا ذکر موجود ہے بلکہ باقاعدہ ان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اودھ اخبار لکھنؤ اس امر میں زیادہ قابل شکر گزاری ہیں کہ باوجود بُعد مسافت بیش قیمت کتب کا ذخیرہ سے معاونت کی۔

سنہ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں لکھا ہے:-

"جناب منشی نول کشور مالک 'اودھ اخبار' لکھنؤ اور جناب راؤ سنگھ صاحب مالک اخبار 'سفیر ہندوستان' کا بھی خصوصی شکریہ کہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں، مگر آخر زیادہ عرصہ ہیں ان کی سخاوت اور عنایت برکات ہے چنانچہ اخبار گرانبہا اپنے اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں

جملہ ارباب تحریری و زبانی صرفہ تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور سب صاحبوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو روز افزوں ترقی عطا فرما دے اور ان کی قوت و زور کو قائم رکھے۔ اور آئندہ کو بھی ان حضرات سے امید کی جاتی ہے کہ اسی طرح ہمیشہ کو ایسی ہی عنایات سے مدرسہ کو ممنون و مشکور فرماتے رہیں اور جملہ اہالیان مدرسہ ان کو اپنا دعاگو و خیرخواہ سمجھیں۔

۱۲۹۰ھ جلسہ تقسیم انعام

اس سال میں پانچ طلبہ نے مجموعہ نصاب کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی، فارغین کی اس جماعت میں حضرت شیخ الہند بھی شامل تھے۔ ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ یوم جمعہ کو جامع مسجد میں (جہاں دار العلوم منتقل ہو گیا تھا) جلسہ عطائے سند و تقسیم انعام منعقد ہوا، جس میں مختلف مقامات کے بہی خواہان دار العلوم نے شرکت فرمائی، شرکائے جلسہ میں قابل ذکر حضرات یہ تھے: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری، مولوی محمد ہاشم صاحب مالک مطبع ہاشمی میرٹھ، مولانا ذوالفقار علی صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع سہارنپور، حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری، منشی محمد صدیق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہزمجسٹی سرکل، مولانا محمد مظہر صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، خواجہ ابوالحسن صاحب دہلوی، منشی محمد حیات صاحب مہتمم نجم الاخبار وغیرہم۔

حضرت نانوتویؒ نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی جس میں دار العلوم کے قیام کی ضرورت و اہمیت اور اس کے نصاب تعلیم پر بڑی دیدہ وری اور ژرف نگاہی کے ساتھ بحث کی گئی ہے چونکہ اس تقریر میں دار العلوم کے مقصد تعلیم اور اس کے نصاب کی افادیت پر بڑی جامعیت کے ساتھ کلام کیا گیا ہے اس لئے ذیل میں اس تقریر کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

> "چند خیر خواہان اسلام نے بنام مدارس قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی طرح ڈالی، درحقیقت قوم خصوصاً اہل اسلام کی بہبودی کی صورت نکالی، سو جو اس کا منشا ہے

"مدرسہ کا آمد و خرچ کا حساب کتاب مثل آئینہ صاف ہے، ہر صاحب کو اجازت ہے کہ دیکھیں اور اطمینان کر جائیں، اور اس سے ہم کو ممنون احسان سمجھیں کیونکہ ایسی باتیں مدرسہ کی ترقی اور اہل اسلام کی بہبودگی کا باعث ہے، علاوہ ازیں ہم یہ جانتے ہیں کہ دیوبند کے بہت لوگوں کا نام جنھوں نے مال سے یا لکھنے سے اس مدرسہ کی امداد فرمائی ہے اور نیز دوسرے شہروں کا نام خوب روشن ہو جائے اور اہل عقل و فہم کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ کارخانہ کس غرض سے برپا ہو رہا ہے۔ بجائے خود جو لوگ اس مدرسہ کے حق میں ساعی ہیں ان کو کوئی مطلب ذاتی نہیں جس کے باعث سے کسی صاحب کو اور کچھ خیال آوے اور یوں سمجھے کہ آپ صاحبوں کی بہبودی میں ہمارا بھی مطلب ہے۔"

جلسہ میں حسب ذیل حضرات کے سروں پر دستار فضیلت باندھی گئی۔

مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبد الحق پورقاضوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا فتح محمد تھانوی اور مولانا عبد اللہ جلال آبادی۔

سنہ ۱۲۹۱ھ، دارالعلوم کی بین الاقوامی شہرت

دارالعلوم کی عمر کا ابھی نواں سال ہی تھا کہ اس کی شہرت و عظمت کا آوازہ ہندوستان سے گزر کر ممالک اسلامیہ تک پہنچ گیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ قسطنطنیہ کا ایک موقر اخبار "الجوائب" اعزازی طور پر دارالعلوم میں آنے لگا، عالم اسلام کا یہ ایک دینی اخبار تھا۔

مدارس کے الحاق کا آغاز

سال گزشتہ کے آخر میں مدرسہ تھانہ بھون کے منتظمین نے درخواست کی کہ ان کے مدرسہ کو دارالعلوم سے الحاق کر لیا گیا روداد میں مذکور ہے:

"تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں ایک مدرسہ عربی بسعی و کوشش اہل اسلام وہاں سے جاری ہے جس کی نسبت وہاں کے مہتمم منشی عبد الرزاق صاحب اور مولوی فتح محمد صاحب مدرس نے لکھا ہے

کہ یہ مدرسہ شاخ مدرسہ عربی دیوبند کیا جاوے۔ مدرسہ اس کی خواہش کی کہ انتظام اس کا مدرسہ عربیہ کی نگرانی حضرت مہتمم صاحب مدرسہ دیوبند ہو کر رہے۔ اس لئے حسب مشورہ مدرسہ تھانہ بھون کو شاخ مدرسہ ہذا کرلینا مستحسن معلوم ہوا، چنانچہ محرم ۱۲۸۳ھ سے انتظام اس کا سپرد مہتمم مدرسہ ہذا کیا گیا۔

یہ سلسلہ آگے چل کر خاصی ترقی کر گیا اور ملک کے بہت سے مدارس عربیہ الحاقی طور پر اپنا الحاق دارالعلوم سے کئے ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ مسندِ تدریس پر

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی تعلیم کا آغاز ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم کے افتتاح سے ہوا تھا، ۱۲۸۶ھ میں آپ دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل سے فارغ ہو چکے تھے، فراغت کے دوسرے سال ۱۲۸۷ھ میں مجلس شوریٰ نے آپ کو معین المدرسین مقرر کیا، ابتداءً یہ تقرر اعزازی طور پر تجویز ہوا تھا، مگر دوسرے سال ہی سے ان کو مدرس چہارم بنا دیا گیا اور پھر کچھ مدت کے بعد وہ صدارتِ تدریس کے منصب پر فائز ہو گئے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دارالعلوم کے لئے موجودہ جگہ کی تجویز

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ چھتہ کی مسجد میں جگہ تنگ ہو جانے پر مدرسہ کو قاضی مسجد میں منتقل کیا گیا اور جب کچھ عرصے کے بعد وہ جگہ بھی کم ثابت ہوئی تو جامع مسجد میں مدارس کے قدیم طرز کے مطابق حجرے اور دالان بنائے گئے، جب ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم منتقل کیا گیا مگر دارالعلوم کی روز افزوں ترقی کے باعث جب یہ جگہ بھی ناکافی ہو گئی تو حضرت نانوتویؒ کے ایماء پر مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ آبادی سے باہر ایک مستقل عمارت دارالعلوم کے لئے تعمیر کی جائے، چنانچہ ۱۲۹۲ھ کے جلسہ عام کے موقع پر یہ تجویز پیش کی گئی جس کو حاضرینِ جلسہ نے پسند کرتے ہوئے ضروری قرار دیا اور اس کے لئے اسی وقت چندہ جمع ہونا شروع ہو گیا، چنانچہ ایک قطعہ زمین آبادی کے شمال کی جانب میں خرید لیا گیا، یہ جگہ چھتہ کی مسجد سے متصل اور آبادی سے قریب ہونے کے باوجود ایسی کافی تھی جس میں دارالعلوم کے بڑھنے اور پھیلنے پھولنے کے لئے گنجائش موجود تھی اور اب بھی ہے۔

"اللہ کا شکر ہے کہ شمول توفیق و تائید غیبی کے اس آرزوئے دیرینہ میں بھی جس کی سالہا سال سے امید تھی تائید غیبی نے جوش مارا اور رحمت الٰہی شامل حال ہوئی یعنی ارباب شوریٰ کی رائے میں یہ تجویز قرار پائی کہ ایک مکان وسیع تعلیم و سکونت و دیگر حاجات طلبہ مدرسہ کے لئے تیار کیا جائے، چنانچہ ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۲ھ بروز جمعہ بعد جلسہ انعام الطلبہ اس کے لئے تذکرہ پیش کیا، اسی وقت بہت سے ذی ہمتوں نے ایک فرد چندہ تیار کی اور بہت سے اہل ہمتوں کے نام اس میں تحریر کئے گئے اور برابر فرد چندہ پر دستخط ہوتے جاتے ہیں جس میں بہت سا روپیہ وصول ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ایک قطعہ زمین نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا اب حضرات باہمت کی ہمت درکار ہے تاکہ روپیہ فراہم ہونے پر کام تعمیر جاری ہو اور یہ صدقہ جاریہ آپ کا جاری رہے، کوئی صاحب قلیل و کثیر پر نظر نہ فرماویں۔ قطرہ قطرہ ہم شود دریا توجہ و ہمت شرط ہے، اگر اہل صاحبوں کی ہمت ہوئی تو فضل الٰہی سے یہ کام بہت جلد انجام پاوے گا۔

ایک انگریز جاسوس کے دلچسپ مشاہدات

دارالعلوم دیوبند جس زمانے میں قائم ہوا اس وقت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو صرف ۹ سال گذرے تھے چونکہ عام مسلمان اور خود دارالعلوم کے اکابر جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے اس لئے انگریزی حکومت مسلمانوں کے سخت خلاف، وہ ان سے بدظن و برگشتہ تھی، مسلمانوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی، اسی بنا پر دارالعلوم کی نسبت مدت تک شبہ و خفیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء میں سر جو اس وقت یوپی کے گورنر سر جان اسٹریچی تھا جب ایک معتمد جان پامر کو اس غرض سے دارالعلوم میں بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کسی سازش میں مصروف ہیں، جان پامر نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ تیار کی اس

جواب دیا "یہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے"۔ یہاں سے آگے بڑھے تو ایک جگہ ایک صاحب جو نہایت
نہایت وجیہ بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلبہ کی ایک قطار تھی، قریب پہنچ کر پتا تو
علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر یہ لوگ چونکیں گے مگر کسی نے متوجہ
نہ کی۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا اور استاد کی تقریر سننے لگا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے
دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر سپرنگر
سے بھی نہیں سنے تھے۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے دالان میں گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے
طالب علم معمولی کپڑے پہنے بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے متعلق
بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے بیان کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
گویا اقلیدس کی روح اُن میں آگئی ہے۔[1] میں منہ تکتا رہ گیا۔ اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر و
مقابلہ اور ہندسے کے مساوات درجۂ اول کا ایک ایسا مشکل سوال طلبہ سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب
دانی پر پسینہ آگیا اور میں حیران رہ گیا۔ بعض طلبہ نے جواب صحیح نکالا۔ میں وہاں سے اٹھ کر تیسرے
دالان میں پہنچا، ایک مولوی صاحب حدیث کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر
تقریر کر رہے تھے۔[2] میں وہاں سے ایک زینے پر چڑھ کر دوسری منزل میں پہنچا، اس کے ہر طرف

۱؎ یہ حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ تھے جو ۱۲۸۳ھ میں مکتب دارالعلوم مقرر ہوئے اور ۱۳۰۲ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب
نانوتویؒ کی وفات پر صدر مدرس بنائے گئے، ۱۳۰۷ھ تک مسند صدارت پر فائز رہے۔ علوم ریاضی میں یگانۂ روزگار
تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ "مولوی سید احمد صاحب کو خدا تعالیٰ نے فنون ریاضی
میں وہ استعداد اور مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان علوم کے موجدوں کو بھی شاید نہ ملی ہو۔"

(روداد ۱۲۹۳ھ ص ۳۰)

۲؎ غالباً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر المدرسین کی جانب اشارہ ہے، مولانا موصوف دارالعلوم
کے آغاز ہی سے صدارتِ تدریس کی مسند پر متمکن تھے۔ سید محبوب رضوی

مگر درحقیقت یہ شفقت ہے، بچوں کو شروع ہی سے محنت شاقہ کا عادی بنا دینا اُن کے حق میں عین حکمت اور آئندہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کے لئے بہت ضروری ہے آج بھی مسلمانوں میں یہی تو ایک بات ہمت اور محنت کی رہ گئی ہے اور اسی لئے کچھ ٹوٹا پھوٹا دین ان کے پاس باقی ہے"۔

میں نے پوچھا گزشتہ سال اخبارات میں دیکھا تھا کہ چار طالب علموں کے دستارِ فضیلت باندھی گئی تھی؟ ان میں سے یہاں کوئی موجود ہے؟ وہ بولا کہ "ہاں ایک صاحب ہیں، چلئے میں ملائے دیتا ہوں!" وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا جہاں ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا، ایک عربی کی کتاب سامنے رکھی تھی، اور دس بارہ طالب علم بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف دو ضخیم جلدیں پڑی تھیں، انہیں سلام کیا، اس نے خوب اخلاق سے جواب دیا۔ میں نے پوچھا کہ سال گزشتہ آپ ہی کے دستارِ فضیلت بندھی ہے؟ بولے کہ "اساتذہ کی عنایت ہے"۔ میں نے کہا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ فرمایا کہ عربی زبان میں ایک فقہ کی کتاب ہے، ایک مطبع کے مہتمم نے ترجمے کے لئے بھیجی ہے اس کی اجرت ایک ہزار روپے ٹھہری ہے۔ مجھے ترجمہ کرتے ہوئے تین مہینے ہوئے ہیں اور چوتھائی کے قریب ہو چکا ہے، ابھی انشاء اللہ ایک مہینے میں ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا یہ جلدیں کیسی ہیں؟ کہنے لگے مجھے تفسیر کا شوق ہے، سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں، گیارہ سے ایک تک تفسیر لکھتا ہوں اور دو سے چار بجے تک ترجمہ کرتا ہوں۔

میں نے دریافت کیا آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟ بولے کہ خدا نے توکل کی گھر بیٹھے بٹھائے

ے دارالعلوم کی زندگی کا یہ ایک سرسری خاکہ تھا۔ مگر بعض لوگوں کے اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے حالات و کوائف اکثر زمانے کے اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ اور اخبارات میں دارالعلوم کی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں اس وقت دارالعلوم مرکزی اور امتیازی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا

معلوم ہوتا ہے۔ خیر خواہان مدرسہ اس بات کو خیال فرما دیں کہ زر چندہ کو کیسی احتیاط اور کفایت
سے خرچ کیا جاتا ہے اور اس تھوڑے سے خرچ سے کیسے کیسے بڑے کام نکلتے ہیں کہ بعد و شاید
اور کسی قدر نتیجہ ظاہر تعلیم کا بھی عرض کیا جاتا ہے کہ اس عرصہ کے سال میں دس طلبہ کو جو جمیع
علوم و فنون سے فارغ ہوئے ہیں دستار فضیلت مجمع عام میں بندھی اور چند ایسے طلبہ جن کی ایک ایک
کتاب کسی فن کی باقی رہ گئی تھی اور مدرسہ نے ان کو زیادہ فرصت نہ دی، در حالیکہ مدرسہ چھوڑنا پڑا۔
ان کو اسناد و تحصیل علوم کی دی گئی گویا یہ بھی قریب فارغ التحصیل کے تھے، و قرآن پاک طلبہ پورے
پورے عالم ہوئے، اوسط فی سال ۲ طالب ہوتے ہیں۔ ہاں سوائے ان کے جو اکثر تھوڑا بہت
پڑھ کر چلے گئے ان کا حساب و اندازہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ نتیجہ اب تک حاصل ہوا بہت ہی معمولی
نتیجہ ہے مگر انشاء اللہ ترقی آئندہ کو زیادہ امید ہے، اور ایک یہ بھی قابل عرض ہے کہ بالفعل کوئی
نہیں کوئی ایسا طالب علم نہیں ہے جو شروع مدرسہ کے قریب شروع سے داخل ہوا ہو اور اب تک
مدرسہ میں موجود ہو یعنی جو شروع میں داخل ہوئے وہ فارغ التحصیل ہو گئے۔

جلسہ تقسیم اسناد

ابتدا میں دار العلوم کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی طالب علم تحصیل علم سے
فارغ ہوتا تو علماء کے مجمع میں اس کا امتحان لیا جاتا تھا، اور کامیابی
کے بعد کسی بڑے عالم سے دستار فضیلت بندھوائی جاتی تھی، چنانچہ اسی سال ۱۹ ذی الحجہ یوم
جمعہ کو ایک بڑا جلسہ جامع مسجد میں منعقد ہوا، یہ جلسہ دار العلوم کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا
جلسہ تھا، دیوبند کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ قال اللہ و قال الرسول کی آوازوں سے معمور نظر آتا تھا،
ہر جگہ تفسیر و حدیث کا چرچا تھا، جامع مسجد کے صحن میں جلسہ کے لئے شامیانوں کا احاطہ بنا دیا گیا تھا،
مسجد زائرین سے بھری ہوئی تھی، بعد نماز جمعہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی ایک
مؤثر تقریر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نے پڑھ کر سنائی، جس میں قیام دار العلوم
کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ:۔

"اس آخری زمانے میں بایں وجہ کہ اہل اسلام کے سر پر کوئی صدمہ اسلام سلط

آٹھ سال کی مدت میں ۲۳۰۰۰ روپیہ کے صرف سے یہ عالی شان "نودرہ" کے نام سے بن کر تیار ہوئی، اس عمارت کے دو درجے ہیں، ہر ایک درجے میں نو نو در واقع ہیں، اس کا طول ۹۰ گز اور عرض ۱۲ گز ہے، دارالعلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے، نودرے کی یہ عمارت سادہ ہونے کے باوجود شاندار ہے، روداد میں لکھا ہے کہ "اس عمارت میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے، اس کا نقشہ منجانب اللہ قلب پر الہام ہوا تھا"۔[1]

حضرت مولانا رفیع الدینؒ نے جن کے زمانۂ اہتمام میں یہ عمارت تعمیر ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ ارشاد فرما رہے ہیں کہ: "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے ایک طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے، چنانچہ اسی کے مطابق بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی، نودرے کی تعمیری خصوصیات کی نسبت روداد میں لکھا ہے:۔

"اس کی تعمیر میں ہندوستانی اور انگریزی عمارتوں کا لطف موجود ہے، اس کی پشت پر ایک عمدہ تالاب اور جانب جنوب سبزہ زار اور بجانب شمال باغ مدرسہ ہے، اور وسط صحن میں ایک مختصر اور نفیس مگر نہایت خوش نما بنگلے کے بیچ میں شگفتہ ہے، اور بنگلے کے چاروں طرف گملوں میں ہر قسم کے مختلف الالوان پھولوں کے درخت موجود ہیں"۔[2]

دارالعلوم کا یہ مقام احاطۂ مولسری کے نام سے موسوم ہے، اسی احاطے میں وہ تاریخی کنواں ہے جو نودرے کے ساتھ بنا تھا، یہ کنواں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے، اس کا پانی نہایت شیریں اور ٹھنڈا ہے، مشہور عالم و مصنف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس کنویں کے پانی کی نسبت "چاہ

---

[1] روداد ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء، ص ۱۲

[2] روداد جلسہ دستار بندی ۱۳۰۱ھ، ص ۶، روداد جلسہ اہتمام ۱۳۰۰ھ / ۱۹۴۰ء، مترجمہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بابت ماہ رمضان ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۳ء، ص ۱۵، ۱۶

یہ تاثر بیان کیا ہے کہ "اتنا لذیذ، اتنا خوش گوار، اتنا شیریں، صاف و سبک اور خنک پانی میں نے اس سے پہلے نہیں پیا تھا"۔[۱]

حضرت مولانا رفیع الدینؒ ہی نے ایک دوسرے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالے سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جا رہا ہے۔ مولانا نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی یہ تعبیر دی کہ اس سے ہر شخص کا "ظرفِ علم" مراد ہے۔[۲]

۱۲۹۳ھ، فتاویٰ کا آغاز

اگرچہ دارالعلوم کی جانب سے فتاویٰ کے متعلق کوئی اعلان نہیں کیا گیا، مگر اس کی عالمگیر مرکزیت اور شہرت عامہ نے لوگوں کو شروع ہی سے شرعی امور میں طلب فتاویٰ کی جانب رجوع کر دیا تھا، اسی سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے استفتا موصول ہونے لگے تھے، دارالعلوم نے بھی اس کو ایک اہم دینی خدمت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

مدارس ملحقہ کے امتحانات

۱۲۹۵ھ میں تھانہ بھون کے مدرسہ کا الحاق ہوا تھا، اسی سال میں انبہٹہ (ضلع سہارنپور) مظفر نگر، دہ گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) میرٹھ میں مدرسے، یا حضرت نانوتویؒ قائم ہوئے، تینوں کا دارالعلوم سے الحاق کیا گیا، اسی لئے ان مدارس کے سالانہ امتحان کا دارالعلوم کی جانب سے انتظام کیا گیا، چنانچہ دارالعلوم کے اساتذہ نے ان مدارس میں پہنچ کر امتحانات لئے۔

۱؎ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا سلسلۂ مضامین "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" مشمولہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ت ۱۰، ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ ص ۲۳

۲؎ روداد جلسۂ انعام ۱۲۹۳ھ مع رپورٹ روداد دارالعلوم بابت ماہ رمضان ۱۲۹۵ھ/۱۲۹۶ھ ص ۱۳

۱۲۹۴ھ ترکی مجروحین کے لئے طلبہ کا چندہ

دارالعلوم میں شروع ہی سے امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعام میں کتابیں دیئے جانے کا دستور رہا ہے۔ گذشتہ سال طلبہ نے کتب انعام لینے کے بجائے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کتب انعام کی پوری رقم جو ستر روپیہ کے قریب تھی، ترکی مجروحین امداد کے لئے قسطنطنیہ بھیج دی جائے، اس کے علاوہ ساٹھ روپیہ جو خود طلبہ نے اپنے طور پر چندہ کر کے جمع کئے تھے قسطنطنیہ بھیجے گئے تھے۔ اس سال بھی اس پر عمل کیا گیا۔ یہ واقعہ پلیونا کی جنگ کے زمانہ کا ہے جو ۱۲۹۳ھ میں روس اور ترکی کے مابین ہوئی تھی۔

حضرات اکابر کا سفر حج

۱۲۹۴ھ کے اواخر میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی معیت میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس، حضرت مولانا رفیع الدین مہتمم اور حضرت مولانا محمود حسنؒ حج کے لئے تشریف لے گئے، اس دوران میں اہتمام کے فرائض حاجی فضل حق نے انجام دیئے۔

۱۲۹۵ھ ثمرۃ التربیت کا قیام

اس سال میں دارالعلوم کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ فضلائے دارالعلوم نے آپس کے مشورے سے ایک جماعت ثمرۃ التربیت کے نام سے قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو حضرات دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان پر اپنی مادر علمی کا بڑا حق ہے، اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ سال بھر میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی ایک ماہ کی آمدنی کا چوتھائی حصہ اپنی مادر علمی کو ضرور پیش کیا کریں۔ یہ جماعت ابتداءً ۱۰۶ افراد پر مشتمل تھی، اس کی سالانہ پیش کش کی مقدار ۲۰۰ روپیہ آٹھ آنے تھی

مدرسہ کے بجائے دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند شروع میں مدرسہ اسلامی عربیہ دیوبند کے نام سے موسوم ہوا۔ دارالعلوم ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا اطلاق عموماً اس تعلیم گاہ پر ہوتا ہے جس میں جمیع علوم عقلیہ و نقلیہ کی اعلیٰ تعلیم

دی جاتی ہو، اور علوم و فنون کے ماہر اساتذہ کی جماعت طلبہ کی تکمیلِ علم دین کے لئے موجود ہو۔ دارالعلوم اور یونیورسٹی ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔ اس تعریف کے لحاظ سے تو یہ مدرسہ شروع ہی سے دارالعلوم تھا، مگر یہ لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کیا گیا جب تک دارالعلوم نے علوم شرعیہ اور علوم معقولہ کا نصاب اور ضروری نصاب طلبہ کو ختم نہیں کرا دیا، جب ملک میں جا بجا اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور عام طور پر اس کی تعلیم کو مستند مان لیا گیا اور علمی حلقوں میں اس کی مرکزیت تسلیم کی جانے لگی تو یکم صفر ۱۲۹۶ھ کو جلسہ انعام کے موقع پر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ:۔

"خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ تیرہ برس سے اس مدرسہ کو جس کو دارالعلوم کہنا بجا ہے، خیر و خوبی پورا ہوا، اس تھوڑے سے عرصہ میں اسلام اور اہل اسلام کو بے شمار نفع پہنچا، بے اختیار اس کے حق میں یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"[1]

۱۲۹۶ھ تعلیم طب کا اجراء

دارالعلوم میں طبی تعلیم جاری کرنے کی نسبت گذشتہ سال اپیل کی گئی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ دارالعلوم میں تعلیم طب کی کمی ہے، جب کہ انسان کی تعلیم ضروریات بلکہ واجبات سے ہے کیونکہ اس سے فائدہ عام ہے۔ اس سال کی روداد میں لکھا ہے کہ گذشتہ سال ہم نے طبی تعلیم کی نسبت عرض کیا تھا اس وقت سے ارباب ہمت کے اس طرف متوجہ ہونے کے امیدوار تھے مگر کوئی صورت ظہور نظر نہیں آئی، اب توکلاً علی اللہ فن شریف طب کی تعلیم شروع کر دی گئی ہے، چنانچہ سدیدی اور شرح اسباب سے طبی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اگر حضرات خیر خواہان اس طرف توجہ فرمائیں اور قوم کی فلاح و

۱؎ روداد ۱۲۹۶ھ ص ۲ ۲؎ روداد ۱۲۹۶ھ ص ۱

مدرسہ والوں کو جیسی یہ مصیبت پیش آئی ایسی کوئی اور کبھی پیش نہ آئی تھی، ہر چند تواریخ اس حادثہ کی اکثر تحریر ہوئی مگر ایک قطعہ بر غایت درجہ اس واقعہ سے مناسبت رکھتا ہے جو نتیجۂ زاد جناب مولوی فضل الرحمٰن صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس کا ہے نذر ناظرین کیا جاتا ہے

وہ غم ہے قاسم بزم ہدیٰ کی رحلت کا ۔۔۔ کہ جس کے جوش الم سے جہاں پُر درد ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزم عرفاں کا ۔۔۔ مثال انجم فلک جام دل اثر گرد ہے
بجز ایک زمیں ہی نہیں درد مند اس غم سے ۔۔۔ جہاں چرخ بھی ماتم میں نیلگوں ہے
سن وفات لکھی عقل نے بدرد و الم ۔۔۔ وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے

حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی وفات کے بعد مجلس شوریٰ کے اراکین نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۲۹۷ھ سے دارالعلوم کا سرپرست تجویز کیا، یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے ہم درس اور خواجہ تاش تھے، دونوں حضرات نے ایک ہی جگہ تعلیمی مراحل طے کئے تھے، دونوں کو حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے حدیث میں شرف تلمذ حاصل تھا، دونوں کو شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ سے خلافت حاصل کرنے والے حضرات میں ممتاز ترین مقام حاصل تھا، خود حضرت شیخ المشائخ کو ان دونوں پر فخر تھا۔ روداد میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ مثل حضرت نانوتویؒ کے ہیں اور ہمیشہ دارالعلوم کی ظاہری و باطنی امداد فرماتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کو نعم البدل عطا فرمایا ہے، اس بات سے بڑی امید ہے کہ دارالعلوم کے کاروبار میں انشاء اللہ خلل نہیں آئے گا، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ سے جو امید کی گئی تھی، دارالعلوم کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ بدرجۂ اتم پوری ہوئی۔

شیخ المشائخؒ کی ہدایت

حضرت نانوتویؒ کی وفات پر شیخ عرب و عجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ نے مسترشدین کو جو ہدایت فرمائی تھی اس میں لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے جو متعلقین ۱۲۹۸ھ ہی میں کار رفاہ علم کو ہے در پیش کو

لگائے ہوئے طلب علم کے شوق میں چھپے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی جنت عالی کا ثمرہ عنایت فرمائے۔[۱]

دارالعلوم کے ہندو معاونین

دارالعلوم سے تعاون اور چندے کے سلسلے میں شروع ہی سے یہ عمل رہا ہے کہ اس میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے چندے کو قبول کیا جاتا رہا ہے۔ دارالعلوم کے آئین چندے کی پہلی دفعہ یہ ہے:

"چندے کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیت مذہب و ملت۔"

چنانچہ دارالعلوم کی رودادوں میں جابجا اہل ہنود اور دوسرے غیر مسلم چندہ دہندگان کے نام درج ہیں اور یہ سلسلہ شروع سے لے کر اب تک جاری ہے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے ابتدائی سالوں میں فارسی و ریاضی کے درجات میں مسلمان بچوں کے دوش بدوش ہندو بچے بھی نظر آتے ہیں۔ دارالعلوم میں ہندو بچوں کی تعلیم کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا ہے۔ جب برطانوی حکومت نے سرکاری ملازمتوں کے لیے سرکاری اسکولوں کی سند کو ضروری قرار دے دیا تو سرکاری ملازمتوں کے خواہشمند مسلم بچوں کی طرح ہندو بچوں کی تعلیم کا رخ بھی سرکاری اسکولوں کی طرف پھر گیا۔

نقد چندے کے علاوہ کتابوں کی فراہمی میں بھی غیر مسلموں اور بالخصوص ہندوؤں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے مشہور مطبع نول کشور لکھنؤ کے مالک آنجہانی منشی نول کشور صاحب کے نام کو دارالعلوم کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ منشی نول کشور جب تک زندہ رہے اپنے پریس کی مطبوعات کے نسخے دارالعلوم کو ضرور عنایت کرتے رہے۔ [illegible] کے حالات میں اوپر گزر چکا ہے کہ:

"امداد کتب کی نسبت جو سال گزشتہ میں لکھا گیا تھا بہت سے اہل ہمت نے

---

۱ روداد [illegible] ص ۱۲

اس طرف توجہ فرمائی کہ کتب قیمتی و کارآمد سے مدد فرمائی۔ بالخصوص منشی نول کشور
صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ نے اس امر میں زیادہ تر قابلِ شکر گزاری
ایسا کیا باوجود بُعدِ مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی۔

سالِ ۱۲۸۹ھ کی روداد میں منشی نول کشور صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ارباب شوریٰ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک
مطبع اعظم لکھنؤ کے جنہوں نے کمال مہربانی کا کام فرمایا اور چند کتب مفیدہ سے
امداد مدرسہ میں بہت فرمائی۔ خاص کر نسخہ قاموس سے کہ لغت میں بے نظیر ہے
اور منشی صاحب نے اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے طبع فرمایا ہے۔
مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے
کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔"

غرض کہ دارالعلوم کی روداد میں جا بجا ان کے عطیاتِ کتب کا ذکر ہے۔ اور بار بار
ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ نول کشور پریس سے شائع ہونے والا مشہور اردو اخبار بھی
ہمیشہ اعزازی طور پر دارالعلوم میں آتا رہا ہے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ کی روداد میں لکھا ہے۔

"جناب منشی نول کشور مالک "اودھ اخبار" لکھنؤ اور جناب راؤ امر سنگھ صاحب مالک
اخبار "سفیر" میرٹھ کا بالخصوص شکریہ، باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہلِ ہنود سے ہیں مگر ہزار
ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو عنایت
فرماتے ہیں۔ اہلکار ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور سب صاحبوں کے
حق میں دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو دم بدم ترقی عطا فرمائے
اور ان کی قوت و اقتدار کو قائم رکھے۔"

سنہ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے انگریز رجسٹرار ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر نے بھی مختلف علوم
و فنون کی تقریباً دو درجن کتابیں کتب خانہ کے لئے بھیجیں۔

بہت فیض پاکر وانی مقصود ہوسکتا ہے۔ تین بار جلسۂ دستار بندی پہلے ہو چکا ہے، پہلا جلسہ ۱۲۹۰ھ میں سات سال کے بعد ہوا، جس میں پانچ مولویوں کی دستار بندی ہوئی، دوسرا جلسہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا، اس میں بھی پانچ ہی کے سروں پر دستار باندھی گئی، تیسرا ۱۲۹۸ھ میں ہوا، اس میں سات طلبہ کی دستار بندی ہوئی، اب ۱۳۰۰ھ میں گیارہ صاحب فارغ التحصیل قابل دستار بندی موجود ہیں، انہیں کی دستار بندی میں آپ صاحبوں کو تکلیف قدم رنجہ فرمانے کی دی گئی ہے، اس اٹھارہ سال میں سترہ پہلے اور گیارہ اس مرتبہ کے اٹھائیس مولوی ہوئے، اور یہ امر بھی قابل گذارش ہے کہ ہر مرتبہ میں چند مولوی فارغ باقی اس شرف کے اس مدرسے کے تحصیل یافتہ اور بھی تھے جو اپنے وطنوں کو چلے جانے کے سبب سے نہ تھے، اگر ان کا عدد بھی ملا جائے تو وہ بھی اس عدد سے کم نہیں، اب یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ اٹھارہ سال کو ملاحظہ فرمائیں اور چھپن مولوی ہونے کو خیال فرمادیں۔

۱۳۰۰ھ کے آخر تک پچاس حافظ تیار ہوئے، اسی طرح کتب فارسی سے بہت سے طلبہ نے اچھی اچھی استعداد حاصل کی، ہر چند کہ یہ عدد اس مدرسہ کی نسبت بڑا عدد ہے، مگر تمام ہندوستان کی نسبت اتنا بھی نہیں جیسے آٹے میں نمک، اگرچہ بہت سے مدارس جگہ جگہ مقرر ہیں، اور اُن میں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری ہے، مگر ضلع کے ضلع اور ملک کے ملک علم دین سے خالی ہیں۔[1]

شعبۂ طب کا قیام

پچھلے چند سالوں سے دارالعلوم میں شعبۂ طب کے قیام کا مسئلہ زیر غور تھا، اگرچہ ۱۲۹۲ھ سے طب کی تعلیم جاری کردی گئی تھی مگر مستقل طور پر اس کے لئے کوئی انتظام نہ تھا، ۱۳۴۲ھ میں مجلس شوریٰ کی حسب ذیل تجویز کی رو سے شعبۂ طب کا قیام عمل میں آیا۔

---

[1] روداد جلسۂ دستار بندی ۱۳۰۰ھ ص ۱۱، ۱۲

یک عرصے سے واسطے تعلیم طب کے ایک معلم طب کے تقرر کا مسئلہ زیر غور ہے، اس کا تذکرہ چھپا ہوا رودادوں میں کیا گیا ہے، طلبہ تعلیم طب کے خواہش مند بھی ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی رائے ہے کہ اس کے لئے مستقل طور پر کسی طبیب کا تقرر کیا جائے، لہٰذا بہتر ہے کہ اس شعبہ کو قائم کر دیا جائے، طبیب کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ طب کی پڑھانے کے علاوہ فرصت کے اوقات میں طلبہ کے علاج کی خدمت بھی انجام دیا کرے۔

۱۳۰۲ھ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی وفات

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے، اس وقت یہ منصب صدر مدرس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، ۱۲۸۳ھ میں جو دارالعلوم کا پہلا سال ہے دیوبند تشریف لائے، دارالعلوم کی شہرت و عظمت میں حضرت ممدوح کے علم و فضل کا بڑا حصہ ہے، دارالعلوم سے اُن کے شغف اور تعلق کا کسی قدر اندازہ ان تقریروں سے کیا جا سکتا ہے جو گزشتہ سالوں کے حالات میں جا بجا پیش کی جا چکی ہیں، اٹھارہ سال کے قریب دارالعلوم کے شیخ الحدیث رہے، اس عرصے میں ۰۰ طلبہ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا احمد حسن امروہی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتوی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوری رحمہم اللہ جیسے صاحب علم و تقویٰ وغیرہ جیسے اکابر علماء شامل ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب، رحلت وفات سے کچھ دن قبل اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے تھے، ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو مرض ہیضہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے باب پنجم ملاحظہ فرمائیے۔

سلاطین و اُمراء کی یادگار مروّج تھی، اس دور میں دولت آصفیہ کی جانب سے جو عطیات ملے نمایاں ہیں وہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

مولانا رفیع الدینؒ کا سفرِ حج

حضرت مولانا رفیع الدینؒ جو کم و بیش ۲۰ سال تک مہتمم رہ چکے تھے، ۱۳۰۶ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے، ان کا یہ سفر حج بقصد ہجرت تھا، چنانچہ دو سال مدینہ منورہ میں قیام کے بعد ۱۳۰۸ھ میں وفات پائی، اراکین شوریٰ نے حضرت حاجی محمد عابدؒ سے اہتمام کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی درخواست کی، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے حاجی صاحبؒ شروع ہی سے مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور ۱۲۸۴ھ و ۱۲۸۸ھ میں دو مرتبہ مہتمم رہ چکے تھے۔

۱۳۰۸ھ شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر

قیام دارالعلوم کے موقع پر عرض کیا جا چکا ہے کہ جب دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا تو سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، ۱۲۸۸ھ میں انہوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اس کے اگلے سال ان کو مدرس بنا لیا گیا، بعد ازاں ۱۳۰۸ھ میں حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ کے مستعفی ہو جانے پر حضرت شیخ الہندؒ کو صدارت تدریس تفویض کی گئی۔

۱۳۱۰ھ معاونِ اہتمام

۱۳۱۰ھ کی روداد میں تعلیمی نتائج کی فہرست لکھا ہے کہ ۲۷ سال کی مدت میں ۳۳۴ عالم اور ۸ حافظ فارغ ہو چکے ہیں۔

۱۳۱۰ھ میں حضرت حاجی محمد عابدؒ کی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اہتمام میں تغیر رہا ہے، روداد میں لکھا ہے کہ "چونکہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب مدظلہ العالی بوجہ مجبوری اکثر اوقات کی مدت، برکت میں نزدیک و دور سے جوق در جوق واسطے دعا کے حل مشکلات و دفع موانع کے مشتاق حاضر ہوتے ہیں اور حضرت ممدوح بوجہ شفقت و اخلاق حسنہ کسی کا دل

عرصے میں شرق سے غرب تک اس کا آوازہ کہاں پہنچا اور اس کے بعض یادگار اب بجا ہدایت خلق اللہ میں مصروف ہوئے۔ یہ احسان اس مدرسہ کا ایسا نہیں جس کو کوئی فراموش کر سکے اور اس کے بار سے سبکدوش ہو سکے۔

۱۳۱۰ و ۱۳۱۲ھ اہتمام میں تبدیلی

سنہ گزشتہ میں حضرت حاجی محمد عابدؒ کی معذوریات کے باعث حضرت مولانا رفیع الدین کے بجائے حاجی فضل حق صاحب کو مہتمم مقرر کیا گیا تھا، ایک سال کے بعد انہوں نے استعفاء پیش کر دیا، اس لئے اُن کے بجائے مولانا محمد منیر نانوتویؒ کو مہتمم مقرر کیا گیا، بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا کہ یہ بھی مستعفی ہو گئے، اس لئے ضرورت تھی کہ اہتمام کے لئے کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جائے جو مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار، صاحب علم اور منتظم بھی ہوں تاکہ دارالعلوم کے ابتدائی دور کی روایات کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھ سکے بلکہ اُن میں نئی روح اور عمدہ جذبے سے تازہ روح پھونک دے، یہ سب خصوصیات حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ کی شخصیت میں یکجا موجود تھیں، حضرت گنگوہیؒ نے اس منصب کے لئے موصوف ہی کا انتخاب فرمایا، یہ انتخاب دارالعلوم کے لئے کتنا مفید اور سعید ثابت ہوا، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

حضرت گنگوہیؒ کی تشریف آوری

پچھلے چند سالوں میں اہتمام میں جو پے در پے تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اُن سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہو گیا تھا، حضرت مولانا گنگوہیؒ جو اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے دیوبند تشریف لائے اور ایک ہفتہ قیام فرمایا، دوران قیام کی جو کیفیت روداد میں درج ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اکثر مسلمانوں اور معاونین مدرسہ کو حضرت مولانا گنگوہیؒ کی تشریف آوری کا عرصے سے انتظار تھا اس لئے اطراف و جوانب دہلی، مراد آباد، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ سے علاوہ صلحاء و دیگر اہل اسلام و معاونین بہت جوق در جوق تشریف لائے، نواب محمود علی خاں صاحب رئیس چھتاری علی گڑھ اپنے ہمراہ شیخ شرافت علی صاحب منصرم ریاست کو لائے تھے، غرض کہ ایک عجیب

بابرکت اور پرشوکت مجمع اہل اسلام کا جمع ہوگیا تھا۔ نواب صاحب نے مدرسے کے اندرونی و بیرونی حالات کی کما حقہٗ تحقیق فرمائی اور جملہ حساب و کتاب و کاغذات دفتر و کتب خانہ وغیرہ کی جانچ خود و بواسطہ شیخ نثار علی صاحب فرمائی اور موجودات خزانہ کو بھی بہت تدقیق و تجزیہ کی نظر سے دیکھا اور غرض سب طرح سے درست پایا۔

اس کے بعد حضرت مولانا نے انتظام مدرسہ کی جانب توجہ فرمائی اور حسب تعلق بعض چھ حضرات کو جو علم و فضل اور وجاہت ظاہری اور عقل و انتظامی لیاقت کے اعتبار سے ممتاز تھے داخل اہل مشورہ کیا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ مولوی سید احمد حسن صاحب امروہی مدرس اول مدرسہ اسلامیہ امروہہ۔ نواب مولوی محی الدین خاں صاحب مرادآبادی مہتمم مدرسہ اسلامیہ مرادآباد، مولوی عبدالحق صاحب پور قاضی وکیل ریاست رتلام، مولوی شاہ مظہر حسین گنگوہی قدوسی، حکیم محمد حسین صاحب گنگوہی مقیم بمبئی المعروف بہ حکیم اجمیری، شاہ سید احمد صاحب انبہٹوی نائب وکیل ریاست امیر گڈھ، نیز دارالعلوم کے مہتمم اور صدر مدرس کو بھی بحیثیت عہدہ اہل مشورہ میں شامل فرمایا۔

دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے حیدرآباد کی مساعی

دارالعلوم میں بیرونی طلبہ کے قیام کے لئے کمروں کی تعمیر کی غرض سے

حیدرآباد میں دارالعلوم کے ہمدردوں نے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا، مولوی شوکت حسین صاحب مددگار صدر ورنگل، حیدرآباد میں اس تحریک کے روح رواں تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کی اپیل پر ایک معتد بہ رقم سات سو روپے چندہ کر کے کمروں کی تعمیر کے لئے بھیجے، انہی دنوں میں موصوف نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے بڑے موثر انداز میں یہ بتلایا تھا کہ دارالعلوم کی امداد کیوں ضروری ہے؟ ذیل میں اس مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے متعلق ملک میں کیا خیالات پائے جاتے تھے، موصوف لکھتے ہیں۔

"اب بحث طلب یہ امر ہے کہ یہ چندہ جو جمع ہوگا اس سے کیا کوئی جدید خود کسی مدرسہ کی
علیحدہ قائم کی جائے گی یا کسی بھی موجودہ مدارس عربی کی اعانت ہو گی۔ لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے
یہ ہے کہ بہ نسبت کسی جدید مدرسہ کے کسی قائم شدہ مدرسہ کو زیادہ نفع کیا جائے۔ مدرسہ دیوبند جیسے کی
مستقل ہونے کا فخر دینی مدارس ہو گا جو ہوتا چلا آتا ہے۔ اس سے ترقی جوان کی حیثیت سے ثابت
ہو جاتی ہے۔ پھر یہ معلوم کر سرمایہ کی مقدار بھی کب اس درجہ کو پہنچے کہ ہم حسب منشاء اپنی خواہش کے
موافق جاری رکھ سکیں۔ اور پھر معلوم نہیں کہ کل تک کیا ہونے والا ہے۔ ترمیم کب پیدا ہو اور چندے کی
مشکلات بھی نکل رہی آئیں ہیں۔ تو دو تین حسب منشاء کی صورت جہاں تک ہے وہ اس میں پائی جاتی
ہے کہ جیسے جیسے رقم ملتی جائے وہ کسی بھی ایک جگہ جمع نہ ہو مدرسہ پر لگا دی جائے تاکہ ہم شغل دیکھ
ایک مدرسہ دیکھ کر ترقی اور مضبوطی پا کر قوم کے لیے مصرف عزت اور فخر ہو سکے۔ تو وہ ایک مدرسہ
دیوبند ہے۔ جس کو ہم نے اس ادارہ کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ ہم نے اقطاع ہند کے موجودہ
مذہبی مدارس پر ایک نظر کی لیکن بجز ایک مدرسہ دیوبند کے اور کوئی بہت غنیمت کہا جا سکتا ہے اور
۳۰-۳۲ سال سے پیدا ہو کر ہر روز بڑھ رہا ہے تو ترقی ہی کرتا چلا آتا ہے اور اپنی قوامت اور
استقلال اور فضل و رسائی کے خیال سے تمام مدارس مذہبی ہندوستان میں اس وقت شاید
صورت ہو تو یہی ہے۔ ہندوستان کے خزانہ شاہی سے بھی یہی مدرسہ ہے جس کو سرکار نظام
بہادر کی وزارت کے زمانہ سے امداد سالانہ نذر کیا جاتا ہے۔

کامل نہ ذکر اسے پاور والی غیر مستقل اور جزئی آمدنی کے یہ مدرسہ ہمیشہ سے کچھ نہ
کچھ ترقی پذیر حالت ہی کے ساتھ قدم بڑھاتا آیا ہے۔ اور بے شک کسی معقول عمارت کا نہ ہونا کا شبہ کہ
اب تک ایک مختصر مکان بھی مدرسہ نے بطور خود تعمیر کر لیا ہے۔ کتب خانہ بھی ہو گیا ہے۔ جہاں
تک ہو سکتا ہے طلبہ کی بھی مجبوری مدرسے نہیں دیتا اور جیسے کچھ بھی ہوں ہر سال حافظ، مولوی
اور عالم بھی بنتا ہی رہتا ہے

غرض کہ ہندوستان میں اس وقت یہی ایک مدرسہ ہے جو تمام مدارس کے مقابلے

پہلو سے متاثر اور جاری کوششوں اور تائید سے مستفیض ہونے اور فائدہ پہنچانے کی قابلیت رکھنے والا نظر آتا ہے۔[1]

سنہ ۱۳۱۸ھ، دارالطلبہ کی تعمیر

گذشتہ سالوں میں دارالطلبہ کی تعمیر کے لئے جو اپیل کی گئی تھی وہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ نواب شاہجہاں بیگم والیٔ بھوپال نے دارالطلبہ کی تعمیر کے لئے ایک گراں قدر رقم عنایت فرمائی۔ روداد میں تعمیرات کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ بہت سے حجرے طلبہ کے مدرسے کے متصل ایک علیحدہ احاطہ میں تیار ہوگئے ہیں جو دارالطلبہ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس کے علاوہ دروازہ کلاں کے اوپر اس کے گرد و پیش میں دفتر و مہمان خانہ وغیرہ کی عمارتیں مکمل ہوگئی ہیں۔ ان پر ہزار ہا روپے صرف ہوئے ہیں۔ اس خوشی میں مستری اور مزدوروں کو شیرینی بانٹی گئی۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رکن مجلس شوریٰ نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"ہم کو یہ موقع نہایت خوشی اور شکر کا ہے کہ جس طرح اس ناچیز قصبہ کو محض بہ تائید ایزدی تعلیم علوم دینیہ کی عزت حاصل ہوئی اسی طرح یہ بھی شرف ملی کہ ایسی عالی شان، خوش وضع اور مستحکم عمارت بلا تجویز کسی نقشہ اور تخمینے کے یہیں کے ایک معمار کے ہاتھوں سے تیار ہوئی ہے جس کو بڑے بڑے ذی علم اور صاحب تعمیرات انجینیر بھی دیکھ کر پسند کرتے اور اظہار خوشنودی فرماتے ہیں"[2]

سنہ ۱۳۱۹ھ، کتب خانہ کا ذخیرۂ کتب

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے دارالعلوم کے کتب خانہ کی ابتدا سنہ ۱۲۸۳ھ ہی میں ہوگئی

---

[1] علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ستمبر سنہ ۱۸۹۵ء ص ۔

[2] روداد مجلس شوریٰ سنہ ۱۳۱۸ھ ص ۱۴۹ و ۱۵۰۔

تھی جس میں رفتہ رفتہ کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا، ابتداءً تو درسیات و ان کی متعلقہ شروح
وغیرہ سے آغاز ہوا تھا، پھر رفتہ رفتہ درسیات کے علاوہ عام کتابیں بھی فراہم کی جاتی رہیں
سنہ ۱۳۲۱ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال تک مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا معتد بہ
ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا، جیسا کہ روداد میں لکھا ہے، بفضلہ تعالیٰ مدرسہ میں ذخیرہ کتب درسیہ
وغیر درسیہ اس قدر جمع ہو گیا ہے کہ ضرورت مدرسہ کو ہر طرح سے کافی ہے، یعنی جس قدر کسی
جماعت میں طلبہ ہوتے ہیں ان سب کو ایام درس تک مدرسہ سے کتابیں مل سکتی ہیں، اور فن کی
ضروری کتابیں، شروح و حواشی موجود ہیں، بعض بعض نایاب کتابیں بھی جمع ہو گئی ہیں، مجموعی
حیثیت سے یہ بڑا عالی شان کتب خانہ ہے، مگر اب بھی مصنفات اسلامی کے وسیع اور
بے انتہا ذخیرہ کو اس کے مکمل ہونے میں بہت سے مراحل باقی ہیں، اگر یہ کتب خانہ مکمل ہو گیا تو
مسلمانوں کی اولو العزمیوں اور فیاضیوں کی قیامت تک قائم رہنے والی یادگار ہوگی، مولوی
عابد حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ جونپور مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں، انھوں نے اپنا
بیش قیمت کتب خانہ جو بعض نادر کتابوں سے معمور ہے دارالعلوم کو عطا فرما دیا ہے۔

اسی سال میں نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال نے از راہِ علم دوستی تین سو روپے سالانہ
کا چندہ دارالعلوم کے لئے مقرر کیا، ریاست بھوپال ماضی میں اپنی علم پروری کی وجہ سے خاص شہرت
و عظمت کی مالک رہی ہے، آئندہ سالوں میں بھوپال کے چندے کی مقدار ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی
تھی جو سقوط ریاست تک برابر جاری رہا۔

حضرت تھانویؒ اور رائے پوریؒ کی رکنیت مجلس شوریٰ

سنہ ۱۳۳۰ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ کو مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا۔

سنہ ۱۳۳۱ھ شعبۂ تجوید کا اجراء

دارالعلوم میں عرصے سے تجوید و قرأت کی تعلیم جاری کرنے کی تحریک تھی، اور متعدد مرتبہ اس کے لئے کوشش

کی جا چکی تھی مگر خاص مدرس نہ ملنے کے باعث شعبۂ تجوید کے اجراء میں کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ اس سال میں ادھر تو مجلس شوریٰ نے قرأت کا مستقل شعبہ جاری کر دینے کی تجویز منظور کی، ادھر غیب سے اتفاق یہ سامان پیدا کر دیا کہ حاجی علیم الدین صاحب رئیس شاملی نے ایک جائداد دارالعلوم کے لئے وقف کر دی جس کی آمدنی پچاس روپیہ ماہانہ تھی واقف نے اس آمدنی کو تجوید و قرأت کی تعلیم کے لئے مخصوص قرار دیا۔ قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی کو جو قاری عبدالرحمٰن مکی کے ارشد تلامذہ میں تھے دارالعلوم میں قرأت کی تعلیم پر مامور کیا گیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دارالعلوم کا افتتاح ایک طالب علم اور ایک استاد سے ہوا تھا، بالکل اسی طرح شعبۂ تجوید کا آغاز بھی ایک استاد اور ایک طالب علم سے ہوا، یہ طالب علم جس نے دارالعلوم کی فضا میں سب سے پہلے قرآن مجید کو تجوید سے پڑھا، آگے چل کر اپنے عہد کا مشہور ترین قاری و عالم بن کر آج حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام سے عالم اسلام میں روشناس ہیں۔

قاری عبدالوحید خاںؒ کے فیضانِ تعلیم کا حلقہ بڑا وسیع ہے، دارالعلوم میں تجوید کی تعلیم مدت سے لازمی ہے، اس لئے فضلائے دارالعلوم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو تجوید و قرأت سے محروم ہو اور قاری عبدالوحید صاحب یا اُن کے تلامذہ سے مستفیض نہ ہو۔

انگریزی تعلیم کی تجویز

اس سال کی روداد میں دارالعلوم کی جانب سے ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ ایسے طلباء کو جو کم از کم انٹرنس پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ چاہیں، ان کو دس پندرہ روپیہ ماہوار کے وظائف دئیے جائیں، اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلبہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے بھی وظائف مقرر کئے جانے کی ضرورت ہے اور دارالعلوم کے حامی ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لئے بہت سے فوائد ہیں۔ افسوس ہے کہ سرمایہ میں گنجائش نہ ہونے کی

وجہ سے یہ دو اب شروع شدہ تعمیر نہ ہو سکا

۱۳۴۲ھ صوبہ متحدہ کے گورنر کا ورود

سر جیمس ڈگلس میوش گورنر صوبہ متحدہ، ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم کو دیکھنے کے لئے آئے، دارالعلوم کی مختلف عمارتوں، درس گاہوں اور کتب خانہ کو دیکھا، سب سے زیادہ کتب خانہ کو پسند کیا، قرآن مجید کے قلمی نسخے نکلوا کر دیکھے، اساتذہ اور طلبہ سے بات چیت کی، اُن کا وطن پوچھا، دو طلبہ علم کی غرض وغایت دریافت کی، طلبہ نے بتلایا کہ ہمارا نصب العین حیاتِ دینی اور خدمتِ ملک و ملت ہے، غیر ملکی طلبہ سے دور دراز مقامات سے آنے کا سبب معلوم کیا، انھوں نے بتلایا کہ ہمارے یہاں آنے کا سبب دارالعلوم کی بے نظیر تعلیمی خوبی ہے، اسی علمی کشش نے ہمیں کھینچ بلایا ہے، قرآن مجید کی درس گاہ میں ایک بچے سے سورۂ رحمٰن کا ایک رکوع پڑھوا کر سنا، عصر کے بعد گورنر نے جلسہ عام میں سپاس نامے کے جواب میں شستہ اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> "مجھے مدرسہ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، یہاں ہر جگہ سے طلبہ آتے ہیں، یہ اس امر کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے، میں نے یہ بھی سنا کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ معاش سے پریشان نہیں ہیں، یہاں علم کے علاوہ تہذیب، اخلاق، متانت اور صداقت سکھائی جاتی ہے، آپ صاحبان مدرسہ کی ترقی میں کوشاں ہیں، یہ اچھی علامت ہے، ترقی کی یہی صورت ہوا کرتی ہے، جب کسی کام میں نئی ضرورتیں پیدا نہ ہوں تو خیال کیا جاتا ہے کہ ترقی رک گئی ہے، مجھ سے ایک نالے کی بابت کہا گیا ہے جو مدرسہ کے قریب سے گزرتا ہے، میں اس پر غور کروں گا۔"[1]

---

[1] یہ گندہ نالا جس کی طرف دارالعلوم نے توجہ دلائی تھی، بعد میں یکے بعد دیگرے گورنر کے حکم سے ہٹا دیا گیا، یہ نالا نو درے کے صحن سے گزرتا تھا، اس کی وجہ سے دارالعلوم کی عمارتوں کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔

گورنر کی تقریر کے بعد مولانا سید احمد امام شاہی جامع مسجد دہلی اور مولوی عبد الاحد مالک مجتبائی دہلی نے علم حدیث اور ادب عربی میں کامیاب ہونے والے دو طلبہ کو ایک سال تک دس روپے ماہانہ وظیفہ دینے کا اعلان کیا۔

مولانا ذوالفقار علیؒ کی وفات

حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ، اُن اکابر میں سے تھے جو دارالعلوم کی بنا و تاسیس میں شروع ہی سے شریک رہے تھے۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد تمام عمر مجلس شوریٰ کے رکن رہے، دارالعلوم کا خزانہ انھیں کی تحویل میں رہتا تھا، نہایت امانت و دیانت کے ساتھ انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا۔ علم و فضل، تدین، وجاہت، دلیری اور خوش خلقی میں یگانۂ روزگار تھے۔ انھیں علوم دینی کا ملکہ بھی تھی۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے نسبت تلمذ حاصل تھی، انگریزی تعلیم یافتہ، ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ عربی ادب سے خاص شغف تھا، چنانچہ دیوان حماسہ، دیوان متنبی، سبع معلقہ اور قصیدہ بانت سعاد کے جو ترجمے اور شرحیں انھوں نے لکھے ہیں وہ بہت مقبول ہیں۔ فن بلاغت میں تذکرۃ البلاغت ان کی مشہور تصنیف ہے۔

۱۰ رجب ۱۳۲۲ھ بروز شنبہ بیاسی سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ قبر کی نشاندہی کے لئے حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کا یہ شعر برلوح چسپ ہے ؎

اے جشن آسمعی قرہ ما بین درد امابین فرش
تا شمیم بزم مودت داعی شان تستہ خرد

۱۳۲۳ھ حضرت گنگوہیؒ کی وفات

گزشتہ سال ابھی حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا، ابھی ایک سال بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ۹ جمادی الآخر ۱۳۲۳ھ یوم جمعہ کو حضرت گنگوہیؒ نے بعد

۱؎ حضرت نانوتویؒ ۲؎ مشہور مصنف حضرت مولانا محمد احسن نانوتویؒ

۳؎ روداد ۱۳۲۲ھ صفحہ آخر

کی وفات کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا، روداد میں اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"مولانا مرحوم اُسی صدف کے اعلیٰ ذوبر تیم تھے جس سے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے اعلیٰ جوہر نکلے تھے، حضرت مرحوم نے اپنے وجود باجود کی بدولت مدرسہ دیوبند کو اس اعلیٰ ترقی پر پہنچایا تھا جس کی نظیر آج مشکل کسی دوسری جگہ مل سکے گی، آج صرف حضرت مرحوم ہی کی وفات نہیں ہوئی بلکہ گویا آج تمام حضرات اکابر مدرسہ دیوبند مثل حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی وفات ہوئی ہے، جن کی وفات کو حضرت مولانا کی نعمت وجود نے مسلمان فراموش کئے ہوئے تھے، اس لئے جس قدر فکر اہل اسلام کو مدرسہ دیوبند کی طرف سے پیدا ہو وہ تھوڑا ہے[1]۔"

حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد اراکین دارالعلوم نے متفقہ طور پر حضرت ممدوح کو دارالعلوم کا سرپرست اور مرجع الامر بنایا تھا، اور حضرت کا معاملہ بھی دارالعلوم کے ساتھ بالکل اُسی طرح رہا جیسے حضرت نانوتویؒ فرماتے تھے، اکثر سالانہ امتحانات و تقسیم انعام کے وقت دیوبند تشریف لاتے اور اپنے دست مبارک سے طلبہ کو انعام عطا فرماتے اور فارغ التحصیل طلبہ کے سر پر دستار باندھتے تھے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اُن قدیم طرز کے علماء میں سے تھے جن کا حلقۂ درس ملازمت سے بے نیاز تھا، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں قیام رہتا تھا، تزکیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کے حلقے کے ساتھ ساتھ طلبہ کا مجمع بھی زیر درس رہتا تھا، علم حدیث سے خاص طور پر غیر معمولی شغف تھا، تقریر بہت جامع اور مختصر ہوتی تھی، اس کا کسی قدر اندازہ جامع ترمذی کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو نفع الشذی کے نام سے شائع ہو چکی ہے، دارالعلوم سے فارغ التحصیل

---

[1] روداد ۱۳۲۳ھ صفحہ آخر۔

علماء میں جن حضرات نے حضرت گنگوہیؒ کے درس میں شریک ہو کر استفادہ کیا ان میں حضرت علامہ کشمیریؒ جیسے یگانۂ روزگار علماء شامل ہیں۔

۱۳۲۳ھ جلسۂ تقسیم انعام

دارالعلوم کے اکابر نے آغاز کار ہی سے یہ قرار دیا تھا کہ ہر سال شعبان میں سالانہ امتحان کے بعد تقسیم انعام کا جلسہ منعقد کیا جایا کرے، جس میں طلبہ کے علاوہ مقامی اور بیرونی لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ جلسہ کی غایت یہ ہوتی تھی کہ مجمع عام میں مدرسین و طلبہ کی سال بھر کی محنت اور سعی و کوشش کے نتائج سامنے آجائیں تاکہ کامیاب طلبہ کی انعام سے ہمت افزائی ہو اور ناکام طلبہ میں شوق و رغبت کی تحریک پیدا کی جائے۔ اس کے ساتھ دوسری غرض یہ بھی تھی کہ قوم اور بالخصوص چندہ دینے والوں کو بتلایا جائے یعنی ان کو چندے کے مصرف کا علم ہو جائے اور وہ بطور خود اطمینان حاصل کر سکیں کہ انہوں نے اپنی جس سرمائے کو دارالعلوم کے حوالے کیا تھا اس سے دارالعلوم کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے جلسہ ہائے انعام ہر سال دارالعلوم میں ہوتے رہے ہیں مگر کبھی کبھی ان جلسوں کو وسیع پیمانے پر بھی منعقد کیا جاتا تھا، جس میں قرب و جوار کے علاوہ دور دراز مقامات کے لوگوں کو بھی دعوت دی جاتی تھی۔ اس نوع کا سب سے پہلا جلسہ ۱۲۹۰ھ میں ہوا تھا، دوسرا ۱۲۹۵ھ میں، تیسرا ۱۳۰۱ھ میں اور چوتھا ۱۳۱۲ھ میں، یہ پانچواں جلسہ تھا اور اب تک تمام جلسوں سے زیادہ عظیم الشان تھا۔ قرب و جوار کے علاوہ علی گڑھ، مراد آباد، شاہجہانپور، بریلی، لاہور اور بھوپال وغیرہ مقامات سے بہت سے لوگوں نے اس میں شرکت کی، بیگم صاحبہ بھوپال کے نمائندے بھی آئے تھے، مہمانوں کو دارالعلوم اور شہر کے مکانات میں ٹھہرایا گیا، دیوبند کے لوگوں نے حسب معمول مہمانوں کی راحت رسانی اور مدارات میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔

جلسے میں اہتمام کی جانب سے کارگزاری کی رپورٹ پیش کی گئی، اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک نظم سنائی جس میں دارالعلوم سے قبل کی

آخری شعر میں دارالعلوم کے ہمدردوں کو مدد کی تلقین فرماتے ہیں :-

ہمیں مقصود یہ ہے یا قدمے یا درمے * یاری کرتے رہو احمق کو دعاؤں سے مدد

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مسندِ اہتمام پر

۱۳۲۵ھ میں اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے دارالعلوم کے مالیہ کو بڑھانے اور اس کو بڑھانے پر ترقی دینے کیلئے عظیم الشان تعلیم تیاری کی تھی اس کے ساتھ اہتمام میں ایک ایسے شخص کے تعاون اور خدمات کی ضرورت تھی جو ذی علم، صاحب الرائے، بیدار مغز اور اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیت کا مالک ہو تاکہ اسکیم کو بروئے کار لانے میں مدد دے سکے اور انتظامی امور میں اہتمام کا ہاتھ بٹا سکے۔ مجلس شوریٰ نے اہتمام کی درخواست پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا انتخاب کیا، جو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے فرزند رشید تھے، اور ان جملہ اوصاف سے بدرجۂ اتم متصف تھے جو اس اہم منصب کے لئے ضروری ہیں۔

کتب خانہ کی عمارت

کتب خانہ کی موجودہ عمارت سے قبل کتب خانہ نودرہ کے قریب جانب جنوب کے کمروں میں تھا، لیکن کتابوں میں روز افزوں اضافہ ہو جانے کے سبب یہ عمارت ضرورت کے لئے ناکافی ہو گئی تھی، اس لئے پچھلے چند سالوں سے کتب خانہ کے لئے ایک وسیع عمارت کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، دارالعلوم کے ہمدردوں میں نواب یوسف علی خاں صاحب رئیس میرٹھ نے اس اہم ضرورت کی جانب توجہ فرمائی اور سات ہزار روپے کی گراں قدر رقم کتب خانہ کی تعمیر کے لئے دارالعلوم کو عطا کی، اسی لئے تکمیل تعمیر کے بعد اس دور میں اس کا نام کتب خانۂ یوسفی پڑ گیا تھا جو بہت عرصے تک چلا۔ نواب صاحب موصوف کے علاوہ میرٹھ کے چند اہل خیر حضرات نے بھی کتب خانہ کی تعمیر میں حصہ

۱؎ روداد جلسۂ سالانہ ۱۳۲۳ھ۔

۷ صفر المظفر ۱۳۲۴ھ کو ایک بڑے مجمع میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ عمارت دو منزلہ ہے۔ نیچے دارالصنائع وغیرہ ہیں اور اوپر کی منزل میں کتب خانہ ہے جس میں فرش سے چھت تک الماریاں لگی ہوئی ہیں۔

۱۳۲۵ھ، حوادث وفات

اس سال میں دارالعلوم کے کئی ہمدردوں نے سفر آخرت اختیار کیا (۱) نواب یوسف علی خان صاحب رئیس میرٹھ دارالعلوم کے قدیم ہمدرد اور مخلص معاون تھے ہمیشہ بڑی بڑی رقموں سے اپنے والد بزرگوار (نواب محمود علی خاں صاحب) کی طرح دارالعلوم کی امداد فرماتے تھے، چنانچہ گذشتہ سال ہی کتب خانہ کی عمارت کے لئے سات ہزار روپیہ عطا فرمایا تھا، مرض وفات میں جو جائداد وقف فرمائی اس میں ایک معقول حصہ دارالعلوم کے لئے مخصوص کر دیا تھا، شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے شرف بیعت حاصل تھا، نواب صاحب موصوف نے جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۲) مولانا محمد حسین صاحب شیرکوٹی مدرس دارالعلوم فن ہیئت و ریاضی کے زبردست فاضل تھے، مولانا کو ہیئت کے آلات بنانے میں ید طولیٰ حاصل تھا، حج سے واپسی پر جدہ میں وفات پائی۔

(۳) حاجی ظہیر الدین صاحب دیوبندی نے بھی اسی سال میں انتقال فرمایا، حاجی صاحب حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے مخلص خدام میں تھے اور اپنی سنجیدگی مزاج اور سلامت طبع کے سبب سے منتخب و ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے تھے، موصوف ۱۳۱۹ھ سے مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

(۴) ابھی یہ زخم مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ شب ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے جو بانیٔ دارالعلوم کے شریک کار تھے سفر آخرت اختیار فرمایا ۱۳۲۵ھ کی روداد میں تحریر ہے کہ:

"مولانا فضل الرحمٰن صاحب اُن مقدس ارکان میں سے تھے جن کے مشترک
ہاتھوں سے مدرسہ کی ابتدا ہوئی تھی، مولانا کی تمام عمر مدرسہ کی خدمت گذاری
اور خبر گیری جاں نثاری اور خیر خواہی میں صرف ہوئی۔ وہ ہر حالت میں صبر و جہد
وسعی و جانفشانی کے ساتھ مدرسہ کے معاملات میں جانبازانہ سرگرم رہے
اس مدرسہ میں جب تک رہے احتیاط و دیانت داری، راست بازی و انتظام
ہی سے کام لیا۔"

مولانا موصوف نے دہلی کالج میں حضرت استاذ العصر مولانا مملوک علی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں تحصیل علوم کی تھی۔ علم ادب میں خاص ملکہ تھا، فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، عربی و فارسی کی نظم و نثر نہایت پاکیزہ و حسین ہوتی تھی۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا، ابتداء عمر میں ایک بزرگ سے بیعت کی تھی، آخر میں حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے تھے۔ چالیس سال تک مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

تعمیر مسجد کی تجویز

اس وقت تک دارالعلوم کے احاطہ میں مسجد نہ تھی، طلبہ قرب و جوار کی مساجد میں نماز پڑھتے تھے، اس میں طلبہ کے اوقات کا حرج بھی ہوتا تھا اور دقتیں بھی پیش آتی تھیں، اس کے علاوہ خود دارالعلوم کی حیثیت کا بھی تقاضا تھا کہ اس کے احاطے میں مسجد ہو، یہ تجویز عرصے سے سامنے تھی، چنانچہ ۱۲۹۲ھ میں دارالطلبہ کی تعمیر کے جزو نقشہ کے ساتھ اس اہم ضرورت کا بھی اعلان کیا جا چکا تھا مگر کسی مرد موفق کی اولیت کے عطایا سے سنگ بنیاد کی نوبت نہ آئی تھی کہ جب ۱۲۹۳ھ میں میرٹھ کے ایک "اہل خیر" حاجی مسیح الدین صاحب نے سبقت کی اور ابتدائی مصارف کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ پیش کر دیا جس سے مدرسہ کے شمال میں مسجد کے لئے زمین کا ایک قطعہ خرید لیا گیا۔

۱۳۲۶ھ حیدرآباد اور بھوپال کے چندے میں اضافہ

حیدرآباد جس نے ایک زمانے میں علم و فن کی سرپرستی کر کے ہمارے قدیم سلاطین کی بزم کہن تازہ کر دی تھی، ۱۳۰۵ھ میں دارالعلوم کی جانب متوجہ ہوا اور ابتداءً سو روپیہ ماہوار چندے سے دارالعلوم کی امداد کا آغاز ہوا۔ گزشتہ سالوں میں اس پر ۲۵ روپیہ کا اضافہ ہوا، اور سال رواں میں یہ چندہ دو المضاعف ہو کر ۲۵۰ روپیہ ہو گیا۔

اسی طرح بھوپال کے چندے میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا۔ بھوپال کا چندہ ابتداءً چھ سو روپیہ سالانہ تھا، اس میں پہلے ۴۰۰ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا، مگر چند ہی مہینوں کے بعد رمضان ۱۳۲۶ھ سے اس کی تعداد تین ہزار روپیہ سالانہ کر دی گئی۔

ایک مبصر کا تبصرہ

مولوی رحیم بخش پریسیڈنٹ ریاست بہاولپور دارالعلوم کے قدیم معاونین میں سے تھے، موصوف نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو اظہار خیال فرمایا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اقتباس ذیل میں پیش کر دیا جائے، موصوف لکھتے ہیں:-

"میں نے آج دیوبند کے عربی کالج کا معائنہ کیا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس سے ہر طرح مطمئن ہوا۔ فی زمانہ ہندوستان میں بہت سے ایسے مدارس اور کالج موجود ہیں جن میں صرف عربی ہی پرانے طریقہ پر پڑھائی جاتی ہے لیکن بہت باتوں میں یہ کالج اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے ثبوت میں میں چاہتا ہوں کہ اس کالج کی گزشتہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کے متعلق چند مشہور واقعات کو بالاختصار بیان کروں۔

یہ کالج ہندوستان کے بڑے حکماء اور مقدس اشخاص کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ خالص مذہب اہل سنت والجماعت کے اُن عقائد اور اصولوں کو ہندوستان میں محفوظ و مصئون رکھے جن کی قسمت

سے جیسا کہ اس سے واضح ہوتا ہے بطور پر زوال کا قریبی ذریعہ تھا۔ جو مضامین اس
کالج میں سکھلائے جاتے ہیں وہ متعدد اقسام و مختلف انواع کے ہیں۔ کالج
کی کل مدت تعلیم آٹھ سال کی رکھی گئی ہے، جس میں علاوہ صرف و نحو، عروض
فلسفہ، منطق، تاریخ، کلام، فقہ، ریاضی، تفسیر، شریعت، علم الٰہی اور ہر ایک
قسم کی جدید سائنس شامل ہیں، لیکن اگرچہ یہ سب علوم جو کالج کی درس میں
درج ہیں باہم نہایت مختلف ہیں، تاہم ان سب کا ایک خاص مقصد ہے جو
سب میں اشتراک رکھتا ہے، یہ سب علوم عربی زبان میں سکھلائے جاتے ہیں
جس کی بڑی غرض یہ ہے کہ طلباء کو کافی طور پر عربی کی استعداد حاصل ہو اور
اس کے بعد وہ لوگ دماغی ورزش بالخصوص قرآن شریعت اور مذہب میں قوت
حاصل کریں اور یہ علوم اس امر کے لئے ذریعہ ٹھہرائے گئے ہیں کہ مذہب
اسلام کے متعلق کامل درجے کی تعلیم ہو سکے، کیونکہ خاص مذہبی تعلیم ہی کی غرض
سے اس کالج کی ضرورت قائم کی گئی ہے۔

ہندوستان میں اور کوئی ایسا خوش قسمت کالج نہیں ہے جس میں طالب علموں
کی یہ کثرت، اور تعلیم کی اس قدر عمدہ حالت ہو، جیسی کہ مدرسہ دیوبند میں دیکھی جاتی
ہے۔ تمام واعظین اور پروفیسر ہندوستان کے مشہور اور علمائے اسلام میں
سے ہیں۔ اس قدیم مدرسے کی یادگار ہیں، ان لوگوں کی قابلیت مسلّم اور مشہور ہے
مذہبی معاملات میں ان کے فیصلے اور فتوے کو ہندوستان کے اندر اور باہر
اہل اسلام کی بڑی تعداد بلا چون و چرا قبول کرتی ہے۔ ان لوگوں کی شہرت
خصوصاً جناب مولانا محمود حسن کا صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے
خود دیگر ممالک کے لیے بھی یہی سبب ہے جس نے اس کالج کو دنیا کے تمام حصوں
کے اہل اسلام میں مشہور کر دیا ہے۔ فی الحال ۵۰۰ طلباء زیر تعلیم ہیں جن میں سے

زیادہ تر بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں، اور کالج ان کے خرچ کا متکفل ہے
اور یہ خرچ اُس کی آمدنی کے لحاظ سے کچھ تھوڑا نہیں ہے۔ طلباء ہندوستان
کے مختلف صوبہ جات اور دیگر ممالک سے جوق جوق آتے ہیں۔ یہ امر ظاہر کرتا
ہے کہ کالج اُن کی ضروریات کو کافی ہے، اور یہ امر صرف ہندوستان کے
مسلمانوں ہی کے واسطے باعث فخر نہیں ہے بلکہ سرکار انگریزی کے لیے بھی ہے
کیونکہ ملک میں یہ مشہور اور فیض پہنچانے والا کالج ہے۔ اس کالج سے سند حاصل
کرنے کے بعد جو طلباء نکلتے ہیں وہ اپنی جماعت یا گروہ میں نہایت وقعت کی
نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجے کا مرتبہ حاصل کر کے فوراً ہی اپنے پیروؤں
کی ایک کثیر جماعت کے ہادی اور رہنما بن جاتے ہیں اور اُن کی رائے کو مسلمان
نہایت عزت و وقعت کے ساتھ سنتا ہے۔ اس طرح وہ بہت سی جماعتوں کو
ایک راہ راست پر لا سکتے ہیں۔ خود اُن کی ذات سے کے واسطے شائستہ وفادار رعایا پروری
کی کمی پیش آتی ہوگی، یہ لوگ آسانی سے گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں داخل
ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، اس مدرسہ کی تعلیم زمانۂ قدیم کے موافق مشرقی
طور پر خالص مذہبی تعلیم ہے۔ عمارت صاف ستھری اور نہایت خوبصورت
ہیں لیکن تعمیرات کے علاوہ اور ضروریات بھی ہیں اور کالج کو مزید امداد روپیہ
کی سخت ضرورت ہے۔ تاکہ اُس کی حالت کو ضرورت موجودہ کے مطابق ترقی
دی جاسکے۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ مدرسہ کے چندہ دہندگان کی فہرست
میں ایک ہزار روپیہ چندہ دے کر اپنے نام کا اضافہ کرتا ہوں۔

سنہ ۱۳۲۶ھ مسجد کی تعمیر

دارالعلوم کی مسجد کے لیے زمین کی خریداری کا ذکر سنہ ۱۳۲۳ھ
کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ اس سال میں [illegible]

کے ایک مخیر تاجر حاجی غلام محمد اعظم صاحب نے مسجد کے تخمینہ کے مطابق انیس ہزار روپے عطا فرمائے۔ ۲۳ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کو مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ روداد میں سنگ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے:

"طلباء کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے بنیاد رکھی۔ اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں۔ اور صرف اینٹیں رکھیں بلکہ اس دیوار کی کل بنیاد جو بہت ہی گہری تھی، طلباء نے خود اپنے ہاتھ سے بھری۔ طلباء کے ساتھ مدرسین و اراکین مدرسہ نہایت ذوق و شوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے اور جیسے معمار دیوار کی تعمیر کرتے تھے۔ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ، جناب مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر المدرسین اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بھی دیگر طلباء کے ساتھ اینٹیں اٹھانے میں شریک تھے۔ سبحان اللہ! طلبہ کا جوش مسرت کے ساتھ سنت خلیل اللّٰہی میں مشغول ہونا، اور ساتھ میں اشعار رجزیہ اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعا بھی پڑھنا عجیب مؤثر اور پرجوش سماں تھا۔ شرقی دیوار کی بنیاد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب و حضرت مولانا اشرف علی صاحب و حضرت حافظ قمر الدین صاحب و جناب مولانا احمد حسن امروہی و مولانا سعید الدین صاحب و جناب مولانا عبد الحق صاحب پورقاضوی و جناب مولانا ظہور الحق صاحب دیوبندی سرکار رسالت کے ان اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی۔ غرض کہ اس وقت عجیب ہی ایسا مجمع علماء و صلحاء کا موجود تھا۔ والحمد للہ علی ذلک۔"

مسجد کے دو درجے مسقف ہیں، مشرقی بیرونی دیوار پتھر کی ہے جس میں نہایت نفیس نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ محراب بھی منقش پتھر کے بنائے گئے ہیں، جس کے آخری حصے میں سنگین حوض ہے۔ دروازہ پر سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے، جس میں مندرجہ ذیل اشعار جو نتیجہ فکر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کندہ ہیں۔

در مدرسہ حبیب ما پیدا شد	ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
روح جنبش نسیم اعظم	خواندم چو نعش او رسیدم
در سجدہ شکر چوں فتادم	در گوش رسید ایں کشیدم
مقرون شدہ ہے وقت دعا	در مدرسہ خانقاہ دیدم

[illegible]

حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا مدنی مسند تدریس پر

حضرت اقدس مدظلہ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو جنہیں نصیب ہوا دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے، تدریس کے لئے اعزازی طور پر بلا معاوضہ اپنی خدمات چند سالوں کے واسطے پیش کیں، چنانچہ حسب خواہش دونوں حضرات کو تدریس کا کام سپرد کر دیا گیا، حضرت مولانا مدنی کچھ چند سالوں میں حرم نبوی میں درس دے چکے تھے جس نے حضرت ممدوحؒ کی شخصیت کو بہت جلد چار چاند لگا دیئے تھے۔

جمعیۃ الانصار کا قیام

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحریک پر ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کو "انصار" کے نام سے فضلائے دارالعلوم کی ایک جمعیت کا قیام عمل میں آیا[1]، یہ جمعیت جن اغراض و مقاصد کے لئے قائم ہوئی ان میں سب سے اہم مقصد دارالعلوم کے اثرات کی اشاعت و ترویج اور اسے عالمگیر بنانا تھا اس کے ساتھ مالی امداد و اعانت بھی اس کے مقاصد میں شامل تھی، ۱۳۲۹ھ میں جمعیۃ الانصار نے مؤتمر الانصار کے نام سے ایک عظیم الشان اجلاس مراد آباد میں منعقد کیا، اور یہ دوسرا شگون تھا کہ ملک میں جا بجا نظم المعارف کے نام سے جمعیۃ الانصار کی شاخیں قائم ہو گئیں، جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد میں بتایا گیا ہے کہ اس جمعیۃ کی غرض مدرسہ عالیہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے روداد جمعیۃ الانصار ۱۳۲۹ھ، رفاہ عام پریس لاہور ص ۲ و ۳

دیوبند کے مقاصد کی تائید و حمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج و اشاعت ہے، لکھا ہے کہ:-

"مدرسہ کے اثر کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ مولانا رشید احمد صاحبؒ کے تمام مسائل اور حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ کی علمی تحقیقات ہیں جن کی اشاعت کرنے اور اطراف عالم میں پھیلانے سے بہت سے کام بن سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ جو شکوک فلسفۂ جدیدہ سے اب پیدا ہو رہے ہیں ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے عرصہ ہوا کہ رفع فرما دیا ہے، ہمارے جدید کالج میں یہ ہو کہ ہم مولانا مرحوم کی تالیفات کو اسی نظر تحقیق سے پڑھیں جیسے کہ فلسفہ و منطق کی کتابیں پڑھتے ہیں، یہ تجربہ ہے کہ جب مولانا مرحوم کی تحقیقات کو کبھی کسی فلسفی کے روبرو پیش کیا گیا تو اس کا اطمینان ہو گیا، مولانا مرحوم کی عبارات اچھی طرح ذہن نشین ہو گئیں، مولانا کی تحقیقات کے ذریعہ سے خدمت اسلام کرنا جمعیت کا فرض ہوگا۔"[1]

اس کے علاوہ متعدد بڑے بڑے اور اہم علمی مقاصد جمعیۃ الانصار کے پیش نظر تھے جن کی تفصیل روداد دارالعلوم اور خود جمعیت کی رودادوں میں مذکور ہے، مگر جمعیت کا مرکز بھی انقلابات زمانہ سے بہت جلد درہم برہم ہو گیا اور اس کا وہ خواب جو اس نے دارالعلوم کی علمی ترقی کی بابت دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ

فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی دارالعلوم کا قدیم معمول ہے، چنانچہ ابتدائی سالوں کے حالات میں جا بجا اس کا ذکر گزر چکا ہے، مگر ۱۳۰۱ھ کے بعد سے مسلسل کئی ایسے

---

[1] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۲۲ھ، ص ۲۱

تقاضے پیش آتے رہے کہ گزشتہ ۲۰ سالوں میں کوئی جلسہ نہ ہو سکا، اس سال میں گزشتہ
سالوں کی تلافی کے طور پر بیس ۲۰ فروری ... کو ... تاریخوں میں نہایت عظیم الشان پیمانے پر جلسہ
دستار بندی منعقد کیا گیا، ہندوستان کے مدارس عربیہ کی تاریخ میں ایسے روح پرور اجتماع
کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ اس جلسے کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس میں
... جو اس میں شریک ہوئے ان کی تعداد تیس ہزار سے اوپر تھی، جس میں ملک کے ہر گوشے سے
مسلمانوں کے ہر طبقے کے لوگ شریک تھے، قرب و جوار کے قصبات و دیہات سے پیدل آنے
والوں کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے، روداد میں مذکور ہے کہ "جس کثرت و ہجوم ... و حسرت
کے ساتھ دور و نزدیک کے لوگ آکر جمع ہوئے اور جو اثر اپنے دلوں میں لے گئے اس کی مثال
بمشکل مل سکے گی، علماء، امراء، غرباء اور اعلیٰ عہدیدار سے لے کر دیہاتی کاشتکار اور معمولی مزدور تک
سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، کسی کو کسی پر فوقیت اور برتری کا خیال تک نہ تھا۔
جلسے میں سب کی نشست یکساں تھی، سب لوگ مراتب ... سے علیحدہ ہو کر ... ...
... دلفریب منظر پر فریفتہ نظر آتے تھے، روحانی برکات و ثمرات کا نزول بھی ایسا کھلا ہوا
تھا کہ غیر حساس انسان تک اسے محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

جلسے کے دوران میں عجیب طرح کی اسلامی شان نمایاں تھی، دارالعلوم کی مغربی جانب تالاب
کے کنارے دور تک خیموں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا، نماز کے لیے خیموں کے سامنے میدان میں ہزارہا
آدمیوں کی بڑی بڑی صفیں قائم ہوتی تھیں، راتوں کو ذکر و شغل کی آوازوں سے جنگل گونجتا تھا
ہر شخص کو برکت اور روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی، جلسے کے ایام میں بعض صلحاء نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ اہل جلسہ سے مصافحہ فرما رہے ہیں، اس طرح کے متعدد
خواب جلسے سے قبل اور جلسے کے دوران میں لوگوں نے دیکھے۔ ایک بزرگ جو لوگوں سے بالکل
الگ تھلگ رہتے تھے اور کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتے تھے، جلسے سے قبل دیوبند آئے، جلسے
کی ہر چیز کو بغور دیکھتے رہے اور بہت مسرور ... ہر وقت جلسے میں پھرتے رہتے تھے اور جلسہ

ختم ہوتے ہی سب سامنے سے چلے گئے، لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جلسے کی خدمت کے لیے روحانی طور پر مامور تھے۔

اس اجتماع کی معنوی کرامت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس قدر بڑے مجمع میں ایک بھی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے مال کے نقصان یا چوری ہو جانے کی شکایت پیش آئی[1]، ہر شخص کو ہر وقت مل جاتا تھا۔ جس کا سبب دارالعلوم کا حسن اہتمام تھا۔

اس جلسۂ دستار بندی کے زمانے میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ دارالعلوم کے مہتمم تھے، موصوف نے اس موقع پر ایک طویل خطبہ "دارالعلوم کا ماضی اور مستقبل" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا، جس میں دارالعلوم کے قیام اور اس کی خدمات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اور ۴۰ سال کے آمد و خرچ کا موازنہ کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ سب سے بڑی بات جس پر مدرسہ اسلامیہ دیوبند فخر کر سکتا ہے یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے روپیہ کو اچھی طرح ٹھکانے سے لگایا، تھوڑے خرچ میں وہ کام کر دکھایا جو دوسری جگہ دس گنا خرچ کرنے کے بعد بھی حاصل نہ ہوتا، خیال فرمائیے کہ اس ۴۰ سال کے عرصے میں مدرسے کے جملہ قسم کے مصارف کی میزان جس میں تعمیرات مدرسہ و مسجد و کتب خانہ، خرید کتب، انعام طلبہ سب ہی کچھ شامل ہے، مبلغ تین لاکھ نو سو ترپن روپیہ ہے، اس میں اگر اسی ہزار لاگت کو جو تعمیر میں صرف ہوئے علیحدہ کر دیا جائے اور دس ہزار کتب کی قیمت جو تخمیناً بیس ہزار روپیہ ہے الگ کی جائے تو گویا تعلیم پر دو لاکھ روپیہ صرف ہوئے، اب ہم اس دو لاکھ کو ایک ہزار فیض یافتہ طلبہ پر تقسیم کرتے ہیں تو فی طالب علم دو سو روپیہ آتے ہیں، انصاف کیا جائے اور اعلان کیا جائے کہ صرف دو سو روپیہ میں ایک کامل عالم دین تیار کر دیا جائے جو مدرس بھی ہو، مفتی بھی ہو، واعظ و خطیب بھی ہو اور [illegible] ہو

---

[1] لوگ اپنے بستروں کو کھلا چھوڑ کر قیام گاہوں سے باہر چلے جاتے تھے، کارکن چوکیداری پر ہوتے اور پورے احساس ذمہ داری سے اپنے فرض کو انجام دیتے تھے۔

اس پر عمل بھی جاری تھا ، مگر اب تک یہ کام رسمی قیود و ضوابط سے آزاد تھا ، اور اس کا دائرہ صرف مسلمانوں میں انفرادی تبلیغ کی حد تک محدود تھا ۔ دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء حسب ضرورت اور حسب استطاعت بطور خود یہ خدمت انجام دیتے تھے ۔ ۱۳۲۵ھ میں جب آریہ سماج کی فتنہ پردازیاں سرگرمی سے بڑھ گئیں تو ضرورت ہوئی کہ تبلیغ کے لئے ایک مستقل شعبہ قائم کر کے تبلیغ کے دائرے کو اس کی ضروری حد تک وسیع کر دیا جائے ، اس کے علاوہ دارالعلوم میں بھی ایسے طلبا تیار کئے جائیں جو درس و تدریس کے علاوہ تقریر و مناظرہ میں معترضین و مخالفین کا کما حقہٗ مقابلہ کر سکیں ، چنانچہ اس کے لئے مختلف مذاہب سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے شعبۂ تبلیغ کا اجراء عمل میں لایا گیا ، اور ایک مدت تک اس میں سنسکرت کے بعض فضلاء بطور معلم کے رکھے گئے ۔

۱۳۲۹ و ۱۳۳۰ھ ، دارالحدیث کی تعمیر

جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلا ادارہ ہے جو عین زوال علم کے وقت مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی ، اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث ، ہندوستان میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالم وجود میں آئی ۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں جا بجا مدارس موجود تھے اور ایک ایک ذرہ علم کی روشنی سے منور تھا ، لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پیشتر نہیں تھی ۔ یہ شرف ان کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا کہ دارالحدیث کے نام سے ایک شاندار عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا ۔

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۱۷ ربیع الآخر ۱۳۲۷ھ کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا ، جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی ، طلبہ نے پاسداری و محدوروں کے بجائے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ رضاکارانہ انداز میں خود بنیاد کھودی ، حضرت تھانوی ، حضرت شیخ الہند ، حضرت مولانا خلیل احمد اور حضرت مولانا عبدالرحیم

اور قدم بقدم نے سنگ بنیاد رکھا حضرت تھانویؒ نے مجمع سے فرمایا کہ "سب صاحب ایک ایک
دو دو اینٹ لے لیں، تبرک سے رکھ دیں۔ نہ معلوم حق تعالیٰ کے یہاں کس کا خلوص قبول ہو جائے"
چنانچہ تمام شرکائے جلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں

بنیاد دارالحدیث میں طلبا کی مخلصانہ محنت

دارالحدیث کے لئے بنیاد تیار کر رہے تھے، طلبا نے جس مساعی محنت و مشقت سے
جوش عمل کا مظاہرہ کیا وہ طلبا کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ روداد
کی روداد میں مذکور ہے کہ "جلسہ دارالحدیث کے دن سنگ بنیاد تو رکھ دیا گیا تھا مگر بنیاد تعمیر
کرنے کے لئے پہلے کنکریٹ کٹوانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کسی قدر بنیاد بھی کھودنی باقی رہ گئی تھی
ابھی کنکریٹ ڈال کر کوٹنا ہی شروع کیا گیا تھا کہ رودوشر کی ایک طوفانی بارش ہو گئی اور قریبی تالاب
پانی سے بھر گیا۔ حتیٰ کہ دارالحدیث کی بنیادیں تک پانی سے لبریز ہو گئیں۔ یہ قطعہ زمین تالاب ہی
کا ایک حصہ تھا، برسات میں ڈوب گیا تھا۔ حتیٰ کہ ابھی پختہ نہ ہوئی تھی اس لئے اکھڑ گئی،
اور بنیاد کا حال دلدل کا سا ہو گیا۔ اس کے علاوہ دریا کا ابھار تک پانی کے پہنچ جانے سے
عمارتوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا، ادھر تو یہ حالت تھی ادھر مزدور دستیاب نہیں ہوتے تھے
بارش کے تواتر سے یہ احتمال بھی رہتا کہ پانی دو چار روز میں خشک نہ ہو سکے گا، ڈول لگوا کر پانی
نکلوانا شروع کیا، مگر سارے دن میں بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا۔ بالآخر نماز عصر کے بعد طلبا نے
کمر ہمت باندھی، دستیاں لے کر کمربستہ ہو گئے اور ایک گھنٹے میں تمام پانی نکال کر تالاب میں ڈال
دیا۔ پانی نکل جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایک سخت مرحلہ باقی ہے۔ بنیاد میں بعض جگہ دلدل
ہو گئی تھی، اس موقع پر مدرسین و طلبا کی محنت و جانفشانی کا منظر قابل دید تھا، کئی سو طلبہ
لگے ہوئے تھے اور تھکاوٹ کا نام نہ تھا، مٹی گارے کی بالٹیاں بھر بھر کر تالاب میں پھینک رہے
تھے اور جوش میں اشعار پڑھتے جاتے تھے اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی میں
لگا ہوا تھا۔ اس مقابلے اور مسابقت میں اور بھی لطف تھا۔ طلباء نے دو گھنٹوں میں سارا کام کو

نصف نصف تقسیم کر لیا تھا، جو کام پیشہ ور مزدوروں سے ہونا مشکل تھا وہ طلباء سے دو دن میں کرا دیا، کنکریٹ کی کٹائی میں بھی طلباء نے حصہ لیا، یہ کام بھی تنہا معماروں اور مزدوروں سے شاید ایک دو دن میں بھی ختم نہ ہوتا، لیکن طلباء نے اس عمدگی سے کنکریٹ، اینٹ اور چونا موقع پر پہنچایا کہ ایک ہفتے میں سب دیواریں اُٹھ گئیں۔ الغرض ایسی مقدس اور متبرک تعمیر کو ایسے ہی مخلص ہاتھوں سے بنیاد و تعمیر ہوں اور طلباء کی یہ آرزو کہ "دارالحدیث کی بنیاد ہم کھودیں گے" بتمامہٖ و کمالہٖ پوری ہو گئی۔

عالم اسلام میں ماضی میں جو دارالحدیث بنائے گئے اُن کے بنانے والے سلاطین اور فرماں روا تھے، اس دارالحدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعمیر میں غریب عوام کا ہاتھ کارفرما رہا ہے، اور انہیں کی معمولی معمولی امدادوں سے یہ عظیم الشان عمارت عالمِ وجود میں آئی ہے۔

بارگاہ نبوت میں دارالحدیث کی مقبولیت

دارالحدیث کی تعمیر سے قبل مختلف حضرات نے عالم خواب میں دیکھا کہ موقع تعمیر دارالحدیث پر سرورِ دو عالم کے اکابر صحابہ جمع ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے سامان تعمیر اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں اور تعمیر میں مصروف ہیں۔ اسی زمانے میں ریاست ٹونک میں مسرور گنج کے رہنے والے ایک صاحب سید یوسف علی ٹونک میں دارالحدیث کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا، جو انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے، موصوف لکھتے ہیں:

"گذشتہ نصف شب کے بعد میں نے عالم خواب دیکھا کہ میں سوار ہی ریل ٹونک جا رہا ہوں، ایک لق و دق ریگستانی مقام میں یکایک ریل ٹھہر گئی، ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں، میں بکمال شوق اُن کے ہمراہ ہو گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ چند مکان سرکی کے اور روشنی جیسے ایستادہ ہیں۔ میں پیچھے سرکی والے مکان میں گیا وہاں چند

حضرات تشریف فرما تھے ، ان میں سے ایک صاحب نے جو کسی قدر فربہ اندام اور کچھ سیاہ فام سے تھے ، پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا ، کرتہ کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی اور چند مجلد چرمی کتابیں اُن کے پاس رکھی ہوئی تھیں [1] ، مجھ سے فرمایا کہ رسول اکرم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاؤ ! میں نے عرض کیا کہ کیا حضور حجرے کے اندر ملیں گے ؟ فرمایا ہاں ! میں سلام کر کے حجرۂ مبارک پر پہنچا ، دروازہ پر یاد نہیں کہ پردہ تھا یا نہیں ، بہر کیف باریابی نصیب ہوئی ، حضور نے مسکرا کر میری جانب دست مبارک بڑھائے ، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دست مبارک کو بوسہ دیا اور سر پر رکھا ، بیٹھنے کا اشارہ ہوا ، میں بیٹھ گیا ، ہنس کر فرمایا : تم نے کس قدر چندہ وصول کیا ہے ؟ میں نے عرض کیا ۱۲ روپیہ ، ارشاد ہوا ، سرونج کا اہتمام زکریا کے ذمے ہے ؛ میں نے عرض کیا وہ میرا بھائی ہے ، فرمایا کہ اس اہتمام کا بار کیا کم ہے ، پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھو ، میں نے سورۂ فاتحہ سنائی ، فرمایا کہ قرآن شریف صحیح پڑھا کرو !

حضور کے قریب دو صاحب اور تھے ، ایک بوڑھے قد آور جوان ، خوبصورت چہرہ ، سرخ و سپید رنگ ، داڑھی سینہ تک ، بال سیاہ و سفید ، دوسرے صاحب لانبے ، لاغر جسم ، ان کا پورا حلیہ یاد نہیں رہا [2]

اس خواب کو نقل کر کے موصوف لکھتے ہیں کہ :۔

" قبل ازیں مجھ کو دو مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی لیکن خاص صورت مبارک میں اس مرتبہ کی زیارت چندہ دارالحدیث کے ساتھ جس کی بابت میں کوشاں ہوں خاص ہے [3]

---

[1] یہ حلیہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ کی تصریح کے مطابق حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر صادق آتا ہے

[2] ملاحظہ ہو رسالہ القاسم ج ۲ بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ — [3] ایضاً

علامہ سید رشید رضا کا ورود دارالعلوم میں

علامہ سید رشید رضا مرحوم دنیائے اسلام کے منتخب و متبحر علماء میں ناموراہل قلم مصر کے مشہور علمی رسالہ "المنار" کے ایڈیٹر اور یگانۂ روزگار مصنف تھے۔ ان کو مصر کے مشہور رہنما مفتی محمد عبدہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور علوم جدیدہ و قدیمہ میں ان کی وسعت نظر متفق علیہ ان کی خصوصیت تھی۔ المنار کا اجراء علامہ سید رشید رضا کے حصہ میں آیا تھا۔ موصوف جب ۱۹۱۲ء میں ہندوستان آئے تو دارالعلوم کی جانب سے انہیں دارالعلوم میں آنے کی دعوت دی گئی۔ علامہ موصوف نے دارالعلوم میں تشریف لاکر اس کی علمی خدمات، درس کی امتیازی خصوصیات، اس کے مذہبی مسلک اور طرز فکر کی مضبوط بنیادوں کو دیکھ کر اپنی حیرت اور مسرت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ نے عربی زبان میں ایک طویل تقریر فرمائی تھی جس میں علمائے دیوبند کے علمی مسلک اور ان کی علمی خدمات کی وضاحت کی گئی تھی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ نے عربی سپاس نامہ پیش کیا جس میں دارالعلوم کی تاریخ اور جماعت دارالعلوم کے فقہی مسلک کا تعارف کرایا گیا تھا۔ سید صاحبؒ نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ "جو علمی اشاعت اور گراں بہا خدمات آپ علم و دین کی انجام دے رہے ہیں، ان کے لحاظ سے آپ سب ہی تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ مجھے اس دارالعلوم کو دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں دارالعلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین واپس جاتا۔" سید صاحب کے خاص الفاظ یہ تھے۔ لولم ارها لرجعت من الهند حزينا

اس مدرسہ کی صحت میں نے سنی تھی جو کچھ سنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا، استاذ جلیل مولانا انور شاہ صاحب نے جو اصول بیان کئے ہیں اور اپنے مشائخ کا جو مسلک مجھے بتلایا ہے، میں اسے پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں۔ فقہ حنفی بلاشبہ کافی

روانی ہے:

علمائے دارالعلوم کی سادہ زندگی اور اُن کی علمی خدمات سے سید صاحب بہت متاثر ہوئے، اس کا اندازہ اُن کی اُس رائے سے ہوتا ہے جو انہوں نے مفتاح کنوز السنۃ کے دیباچہ میں ظاہر کی ہے، فرماتے ہیں:

"اگر ہمارے بھائی ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں علم الحدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک یہ علم ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔"[1]

انجمن ہلال احمر کی امداد میں دارالعلوم کی مساعیٔ حسنہ

خلافت عثمانیہ کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو تعلق اور خلوص رہا ہے اس کے بیان کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے، خلافت کے وجود سے اسلام کی عزت اور حرمین شریفین کی حفاظت و خدمت گزاری کا انتظام وابستہ تھا، سلطنت عثمانیہ کا کسی ایسے حادثہ میں پھنس جانا جس سے اس کی عظمت و شوکت میں فرق آجانے کا اندیشہ ہو، یا حرمین شریفین کی حرمت معرض خطر میں پڑ جائے، عالم اسلامی کو جس قدر بے چین اور مضطرب بنا سکتا تھا وہ ظاہر ہے، مسلمانوں کے دلوں سے طرابلس کے حوادث کے زخم ابھی مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ بلقان کی خونچکاں جنگ نے دنیا کے سامنے دوسرا قیامت خیز منظر پیش کر دیا۔ اخبارات کے ذریعے سے جب ترکی کے مظلوموں و مجروحین اور مہاجرین کے ناقابل برداشت اور دردناک حوادث و مصائب کا علم ہوا کہ کیوں کر ہزاروں مسلمان مرد و عورت، بچے، بوڑھے، سردی اور فاقے اور دوسرے گوناگوں مظالم و مصائب

---

[1] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ صفحہ ق"

کا شکار ہو رہے تھے تو عالم اسلامی میں بالعموم سخت اضطراب اور بے چینی پھیل گئی، مسلمان جہاں
جہاں اور جس ملک میں تھے اُن میں بے کس و مظلوم مسلمانوں کی اس حالت سے ہمدردی اور
حمیت اسلامی کا جوش پیدا ہو گیا، اُنھوں نے اپنی امکانی کوشش سے مجروح و بیمار و طبی امداد
کثیر و آفت رسیدہ مسلمانوں کی امداد و اعانت کا بیڑا اٹھایا، ہندوستان کے مسلمان اس
میں پیش پیش تھے۔ یہاں اس خدمت کو دارالعلوم نے اپنی مخصوص روایت کے مطابق انجام دیا
لاکھوں کی تعداد میں فتاوی اور اشتہار چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچائے، اساتذہ
اور طلباء نے ملک کے اطراف و جوانب میں دورے کر کے عام جلسوں میں اس کی اہمیت بیان
کی اور امدادی تحریک کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا، جگہ جگہ "انجمن ہلال احمر" کی امداد و
اعانت کے لئے انجمنیں قائم ہو گئیں، جن کے ذریعے سے لاکھوں روپیہ چندہ کر کے بھیجا گیا، اس کے
علاوہ خود طلباء نے اپنی حمیت ملی اور جوش عمل کا یہ ثبوت دیا کہ ۱۳۳۰ھ و ۱۳۳۱ھ کی طرح سالِ
دوم میں طلبۂ دل کی کتابوں کی پوری رقم ہلال احمر کو نذر کر دی، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ ضروری
استعمال کی اشیاء تک چندہ میں دے ڈالیں، اس روپیہ کے علاوہ جو ان حضرات کی کوششوں
سے ملک کے مختلف مقامات سے چندہ کر کے بھیجا گیا، خود ان کے ذاتی چندوں اور دوسرے عطیات
سے ۵۰ ہزار کی گراں قدر رقم دارالعلوم کے ذریعے سے روانہ کی گئی۔

۱۳۳۱ھ، مجلہ القاسم

علمائے دیوبند کے علوم و معارف اور مضامین عام مسلمانوں تک
پہنچانے اور عوام الناس کو دین کے صحیح مقاصد و مسائل سے
باخبر کرنے کے لئے ۱۳۳۱ھ میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ اور دوسرے اکابر علماء
کی زیر نگرانی دارالعلوم کے "پرچہ القاسم" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا،
"القاسم" علمی اور تاریخی مضامین کی اشاعت کے علاوہ دارالعلوم کے مقاصد اور اس کی دینی
و علمی خدمات سے بھی عام مسلمانوں کو روشناس کرانے کا ایک بڑا ذریعہ تھا، اس لئے اس
کا اجراء دارالعلوم ہی کی جانب سے ہونا چاہئے تھا، مگر ابتدائی مصارف سے دارالعلوم کو

چلانے کے لئے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اس کو اپنے ذاتی مصارف پر اس وقت تک چلاتے رہے
جب تک اس کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہو گئی۔ "القاسم" جس وقت جاری ہوا اس وقت
دیوبند میں طباعت کا کوئی انتظام نہ تھا، چنانچہ ابتدائی پرچے میرٹھ یا علی گڑھ میں چھپوائے گئے[۱]،
لیکن جب رفتہ رفتہ ان مشکلات پر قابو حاصل ہو گیا اور "القاسم" خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا
تو اس کا تعلق دار العلوم سے کر لیا گیا۔

یوں تو "القاسم" میں شائع ہونے والا ہر مضمون بجائے خود نہایت مفید، پُر از معلومات
اور اہم ہوتا تھا مگر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ کا ایک مخصوص عنوان "دنیا میں اسلام
کیونکر پھیلا؟" "القاسم" کے مضامین میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس عنوان کے تحت
مضامین کا ایک طویل سلسلہ برسہا برس تک "القاسم" میں جاری رہا جو حضرت ممدوح کی وفات
کے بعد "اشاعتِ اسلام" کے نام سے کتابی شکل میں چھپ گیا ہے، اس کی افادیت اور قبولِ عام
کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نا تمام ہونے کے باوجود اب تک متعدد ایڈیشن شائع
ہو چکے ہیں۔

جنگِ بلقان کے چندے کا اثر دار العلوم پر سالِ گذشتہ میں دار العلوم نے اپنے آپ کو نظر انداز کر کے ترکی کے مظلوم
مسلمانوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں جو جدوجہد کی تھی اس کا اثر دار العلوم کی مالیات پر پڑنا
لازمی تھا، چنانچہ سالِ رواں میں سات آٹھ مہینے سخت مشکلات اور ابتلاء و آزمائش میں گذرے
مگر بحمد اللہ اس کے بعد حالات بدل گئی اور ختم سال پر کل آمدنی مصارف کے مقابلے میں کم رہی
مگر تاہم دار العلوم کے کسی کام میں رکاوٹ پیش نہیں آئی، دولتِ آصفیہ سے اب تک معاف

---

[۱] یہ مطبع مولانا رشید احمد انبیٹھوی کا تھا، جو حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی محدث سہارنپوری کے
حقیقی بھائی تھے۔

سو روپے ماہانہ آتے تھے، مگر اس سال کے رمضان المبارک سے یہ مقدار دوگنی کر کے پانچ سو کر دی گئی۔

۱۳۴۲ھ اجمالی حالات

حسب سابق دارالعلوم کے تمام شعبہ جات تعلیم، اہتمام، تبلیغ، کتب خانہ، مطبخ، تعمیر وغیرہ کا سلسلہ حسن اسلوبی کے ساتھ قدیم طریقے پر جاری رہا۔ ہر چند معمولی موانع رفتار ترقی میں سد راہ ہوئے مگر بحمد اللہ دارالعلوم کی فطری قوت اور طبعی سلامتی سب پر غالب رہی، باعتبار آمد و صرف اور [illegible] وغیرہ یہ سال بہ نسبت سال ہائے گزشتہ بہت اچھا رہا۔

۱۳۴۱ھ میں بہت ہی مختصر پیمانہ پر مطبخ کا اجراء عمل میں آیا تھا، مگر طلباء کی روز افزوں کثرت نے اس میں اس قدر وسعت اختیار کی کہ اس سال میں مطبخ کے لئے ایک مستقل کاتب مقرر رکھنا پڑا۔

الرشید کا اجراء

سال گزشتہ "القاسم" کا تعلق براہ راست دارالعلوم سے کر دیا گیا تھا، اس سال میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے رسالہ کا اجراء "الرشید" کے نام سے عمل میں آیا، چونکہ "القاسم" کے معاونین کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا، اس لئے "الرشید" کو شروع ہی سے دارالعلوم کے تحت نکالا گیا۔ اس سال کی روئداد میں "القاسم" و "الرشید" کی افادیت اور مضامین کے معیار کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے، جس سے ان دونوں رسالوں کی علمی اور دینی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:

"القاسم" اور "الرشید" نے مسلمانوں کی جس قدر علمی خدمات انجام دی ہیں اور جس طرح صاف معلومات کے ذخائر بہم پہنچائے ہیں اور ہر ایک مسئلہ میں خواہ کسی علم کا ہو صحیح و بے لوث لکھا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے مجلدات گذشتہ موجود ہیں، جس کا دل چاہے بنظر غور دیکھے اور اس کے ساتھ ان موقت شیوع رسالوں کو بھی دیکھے جو نکل رہے ہیں، تو ان کا اختلاف تمام روز روشن کی طرح وہ فرق جو ان دونوں رسالوں اور ان رسائل میں ہے واضح ہو جائے گا۔

ان دونوں رسالوں میں جس مضمون کے ذریعہ قلم اٹھایا گیا ہے خواہ کسی فن میں ہو محققانہ طرز کے ساتھ سلف کے اس روشن ادوار کو حسب استطاعت قابل تقلید و تقلید سمجھنے کے ساتھ اٹھایا گیا ہے، رفتار زمانہ کی طرح یہ نہیں ہوا کہ جمہور اکابر کی نسبت جو چاہا لکھ دیا جس مسئلہ میں جو چاہا رائے قائم کر لی، ادبیات و تاریخیات میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ جو واقعہ معیار تاریخ پر جانچا گیا ہو ہے، اسی کے سبب سے وہ نتائج و ثمرات دکھلائے گئے جن کو دیکھ کر قوم بڑے بڑے فائدے اپنی معاشرت و تمدن اور دین و مذہب میں حاصل کر سکتی ہے۔

پھر یہ بھی کچھ کم تعجب انگیز امر نہیں کہ باوجود مذہب کے مسائل کے قریب مضامین میں متانت سلامت و اعتدال کا طریقہ قائم رکھا گیا ہے، بجز اس کے کسی معترض کو اس کی گنجائش نہیں دی گئی کہ اس پر بے جا طور سے نکتہ چینی کر سکے اور یہ بھی نوبت شاید نہ آئی اور آئی بھی ہو تو بہت ہی شاذ کہ کسی کو خواہ مخواہ بھڑکانے کا موقع ملا ہو۔

جبۂ نبوی کا غلاف

قسطنطنیہ میں دولت عثمانیہ کے زمانے سے شاہی خزانے میں بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، جھنڈا، اور جبۂ مبارک محفوظ ہیں، یہ آثار دسویں صدی ہجری کے اوائل میں آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے سلطان سلیم اول کو تفویض خلافت کے وقت سپرد کئے تھے، سلاطین عثمانیہ ان آثار نبویہ کو بطور سند استحقاق خلافت اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے، جبۂ مبارک پر حفاظت کی غرض سے ہمیشہ کپڑے کا غلاف رکھ دیا جاتا ہے، جس میں سے جبۂ مبارک صاف نظر آتا ہے، دولت عثمانیہ کے سفیر کا بیان ہے کہ زیارت کے وقت جبۂ مبارک کی صنعت کا جز الگ کر کے کھلا رکھا جاتا ہے اور کوئی شخص خواہ وہ کسی درجے کا ہو یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ خاص جبۂ مبارک کو ہاتھ لگائے یا بوسہ دے، جو لوگ زیارت کرتے اور بوسہ دیتے ہیں ان کا عمل اسی بالائی غلاف تک محدود رہتا ہے، عثمانی سلاطین کا سقوط خلافت تک یہ معمول تھا کہ وہ اپنے درباریوں کے ساتھ سال بھر میں ایک دفعہ ۱۵ رمضان المبارک کو آثار نبویہ کی زیارت کیا کرتے تھے۔

جزء مبارک پر جو غلاف رکھا جاتا تھا وہ کبھی کبھی خاص خاص لوگوں کو سلطان المعظم کی جانب سے تبرکاً ہدیہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ غلاف اس وجہ سے کہ جبۂ مبارک کو مس کئے ہوئے رہتا ہے بہت زیادہ متبرک اور موجب خیر و برکت سمجھا جاتا ہے۔

اب یہ جبۂ مبارک استنبول کے ایک شاہی قصر "توپ کاپی" میں رکھا ہوا ہے۔ اس قصر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد یادگاریں محفوظ ہیں۔ اس قصر کو سلطان محمد ثانی نے ۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ایک عرصہ تک یہ محل ترک سلاطین کا قصر خلافت رہا، بعد میں اسے میوزیم کی شکل دے دی گئی۔ توپ کاپی (TOP KAPI) ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں "توپ کا دروازہ"۔

توپ کاپی کے میوزیم میں متعدد ہال ہیں، ایک ہال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تلواریں چاندی کے ایک صندوق میں رکھی ہوئی ہیں، جبکہ سونے کے دو صندوق ہیں، ایک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور مہر ہے جو عقیق کو تراش کر بنائی گئی ہے جو گلابی رنگ کے عقیق کی ہے اور بیضوی شکل میں ہے، اور دوسرے میں آپؐ کا ایک جھنڈا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبۂ مبارک اور مکتوب گرامی سونے کے فریم میں لگا ہوا ہے، یہ وہ نامۂ مبارک ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کے حاکم مُقوقِس کے نام ارسال فرمایا تھا[1]، یہ نامۂ مبارک آثار قدیمہ کے ایک فرانسیسی ماہر بارتھلمی (BORTHLAMY) کو مصر میں ۱۸۵۰ء میں دستیاب ہوا تھا، فرانسیسی عالم نے اس مکتوب گرامی کو سلطان عبدالمجید خان اول (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء، ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء) کی خدمت میں پیش کیا، سلطان معظم نے طلائی صندوق میں محفوظ کرا کر توپ کاپی میں رکھوا دیا تھا۔

توپ کاپی کے اس حصے میں جہاں یہ تبرکات رکھے ہوئے ہیں دروازے پر چار

---

[1] اس مکتوب نبویؐ کی تفصیل کے لئے راقم سطور کی کتاب "مکتوبات نبویؐ (اردو)" سے مراجعت کی جائے۔

زبانوں ترکی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"گذشتہ سینکڑوں برسوں سے مسلمانوں کے نزدیک اس مقام کی مذہبی
اہمیت اور بڑی قدر ہے۔ اس میں جتنے آثار رکھے ہوئے ہیں سب مقدس
اور قابل احترام ہیں۔

آپ سے امید ہے کہ آپ اس مقدس جگہ پر خاموشی، متانت اور تہذیب کی
طرف داری رکھیں گے اور اس بابرکت جگہ پر کوئی نامناسب بات نہ کریں گے"[1]

دارالعلوم نے جنگ بلقان کے زمانے میں ترک مجروحین و مہاجرین کی مجلس ہلال احمر
کے ذریعہ ہندوستان میں قابل قدر امدادی خدمات انجام دی تھیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا
ہے، انہی سے سلطان محمد خامس ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء ، ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء بہت متاثر ہوئے تھے، چنانچہ سلطان المعظم
نے اپنے اس تاثر کا اظہار اس طرح فرمایا کہ دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا متبرک ہدیہ یعنی جبہ مبارک
کا غلاف دارالعلوم کو عطا فرمایا۔ غالب بیگ دولت عثمانیہ کے سفیر مقیم بمبئی ۱۹ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ
کو دیوبند تشریف لائے اور سلطان المعظم کی جانب سے یہ متبرک ہدیہ پیش کیا۔[2]

---

[1] بلاد العربیہ حکومت بابت جنوری ۱۹۵۳ء

[2] یہ ہدیہ متبرکہ دارالعلوم کے موجودہ کتب خانہ کی عمارت میں غالب بیگ نے میرے والد ماجد کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ پیش کیا، میں بھی وہاں موجود تھا، اور اس کی وہی تفصیل بیان کی جو آپ کتاب میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس وقت کلکتہ کے ایک بڑے تاجر حاجی محمد یعقوب صاحب مرحوم بھی سفیر ترکی کے ساتھ دارالعلوم میں موجود تھے، انہوں نے والد ماجدؒ سے فرمایا کہ اس مقدس ہدیہ کے لئے ایک قیمتی بکس بنوا کر بھیجوں گا، میرے لئے اجازت مرحمت فرمائی جاوے، جو بصد خوشی دے دی گئی، چنانچہ وہی بکس ہے جس کا اوپر کا حصہ بلور کا شیشہ لگا ہے یہ ہدیہ مبارک رکھا ہوا ہے اور وقتاً فوقتاً عوام و خواص کو اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ محمد طیب عفی عنہ

یہ غلاف رومال کی شکل میں ہے، کپڑا سفید نہایت مہین اور خوش وضع ہے، وسط میں جلی قلم سے سیاہ حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

نور الہدیٰ بنسابہ متکوّنا — صلوا علیہ و سلموا تسلیما

کناروں پر ترکی زبان کے شعر لکھے ہوئے ہیں

یہ ذخیرۂ خیر و برکت دارالعلوم کے خزانے میں ایک نہایت خوبصورت چوبی بکس میں رکھا ہوا ہے، جس دن سے دارالعلوم میں آیا ہے اکثر و بیشتر اس کے یمن و برکات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔[1]

ڈھاکہ کے لئے وفد کی روانگی

ڈھاکہ کے رئیس نواب سلیم اللہ خان صاحب کو قومی اور اسلامی کاموں سے بڑا شغف تھا، موصوف دارالعلوم کی امداد و اعانت میں بڑی بڑی رقموں سے پیش از پیش حصہ لیتے تھے ۱۳۲۳ھ میں جب دارالحدیث کی تعمیر و تکمیل کے لئے چندے کی اپیل کی گئی تو موصوف نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس سلسلے میں دارالعلوم کا ایک وفد ڈھاکہ آنا چاہیے، دارالعلوم کی پچھلی ساٹھ سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے ایک بڑے رئیس کی جانب سے اس قسم کی دعوت دی گئی، دارالعلوم میں اب تک وفود کے بھیجنے کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا ورنہ عموماً امراء و رؤساء کی بارگاہوں سے تو مستغنیانہ اجتناب ہی برتا جاتا تھا، مگر نواب صاحب کے دینی کاموں میں خلوص کے ساتھ حصہ لینے، قومی ہمدردی اور اسلامی کاموں سے شغف اور دل سوزی کے باعث ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وفد کی روانگی کا فیصلہ کیا گیا۔

۲ ربیع الاول کو دارالعلوم کے اراکین و اساتذہ کا ایک وفد مہتمم صاحب کی زیر سرکردگی

---

[1] روداد ۱۳۲۳ھ ص ۲۹، ۳۰

ڈھاکہ روانہ ہوگئے۔ نواب صاحب نے اراکین ریاست اور اپنے اعزہ کے ساتھ اسٹیشن پر استقبال کیا۔ اور وفد کی نہایت شان سے اس کی مدارات و تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دو روز تک ڈھاکہ میں جلسے ہوتے رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، علامہ عثمانیؒ اور مولانا مرتضیٰ حسنؒ نے وعظ و تقریریں فرمائیں۔ نواب صاحب نے اختتامی تقریر میں فرمایا کہ:-

"میں خاندانی طور سے دارالعلوم دیوبند کا دلی خادم ہوں اور ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ اس کی ترقی کی کوشش کروں اور دارالعلوم کی بہبودی کے ذرائع تلاش کروں، چونکہ اس وقت بھی کہ یہ خیر مقدم کا موقع ہے میں چاہتا ہوں کہ کچھ ہدیہ پیش کروں اور امید کرتا ہوں کہ دارالعلوم کے واسطے آپ اس ناچیز ہدیہ کو قبول فرمائیں گے، ہر چند یہ مختصر ہدیہ اس لائق نہیں کہ اس عظیم الشان کام کے لئے جس کا آپ حضرات نے ذمہ لیا ہے کچھ بھی کفایت کر سکے تاہم امید کرتا ہوں کہ اس قلیل مقدار کو قبول فرما کر سرفرازی بخشیں گے۔"

نواب صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی جانب سے تیرہ ہزار روپے کی رقم دارالحدیث کی تعمیر کے لئے عطا فرمائی اور مزید رقم آئندہ بالاقساط بھیجنے کا وعدہ کیا، ساتھ ہی دارالحدیث کی تکمیل کے لئے جس کی لاگت کا اندازہ ایک لاکھ روپیہ تھا نواب صاحب نے ایک کمیٹی بنائی اور وفد کو یقین دلایا کہ تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے، کمیٹی حسب ضرورت چندے کے ذریعے روپیہ پہنچاتی رہے گی۔[1]

۱۳۴۳ھ تنخواہوں میں اضافہ

تنخواہوں کے بارے میں دارالعلوم کا طرز ابتدا ہی سے نہایت سادہ رہا ہے

---

[1] وفد ڈھاکہ کے حالات روداد ۱۳۴۳ھ اور القاسم، ماہ جمادی الآخر و رجب ۱۳۴۳ھ میں بتفصیل مذکور ہیں۔

شان و نمود کے لئے گراں قدر مشاہرے مقرر کرنا کبھی پسند نہیں کیا گیا۔ اسی کے ساتھ خود دارالعلوم کے اساتذہ و کارکنوں نے بھی تنخواہ کی نسبت ہمیشہ یہ بات مدّ نظر رکھی ہے کہ وہ دارالعلوم پر صرف اسی قدر تنخواہ کا بار ڈالیں جس میں سادہ معاشرت اور قناعت و کفایت کے ساتھ گذر بسر کیا جا سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشاہرہ صرف چالیس روپیہ ماہانہ تھا۔ چنانچہ روداد میں مذکور ہے کہ :-

"دارالعلوم میں مشاہروں کی مقدار اُس کی عظمت و شان اور مدرسین کی کمال و شہرت نیز اُن کی کفایت مانحتا، ہر ایک کے لحاظ سے ہمیشہ کم رہی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو باوجود عظمت و کمال صرف چالیس روپیہ ملتے تھے مولانا سید احمد صاحب کو ۳۵ روپیہ، دارالعلوم کی شان اور ان حضرات کی وسعت و عظمت کو پیش نظر رکھ کے ان مشاہروں کو خیال کر لیا جائے جس تنگی و عسرت کے ساتھ یہ بزرگوار ان مشاہروں پر گزر اوقات کرتے تھے اس کا حال سب پر روشن ہے اور ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ یہ بزرگ اگر دیوبند سے باہر جانا گوارہ فرماتے تو کس منصب پر اور کتنے مشاہرے پر تشریف لے جاتے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھوپال بلایا گیا تھا۔ آپ نے انکار فرما دیا، لیکن مولانا سید احمد صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے"

(روداد ۱۳۲۳ھ ص ۳۸)

لیکن اسی کے ساتھ دارالعلوم نے بھی کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ اس کے کارکن معاشی پریشانیوں میں سرگرداں رہیں اور ان کا فراغ خاطر مفقود ہو جائے۔ چنانچہ جب کبھی ایسی صورت پیش آئی تو دارالعلوم نے اس پر پوری توجہ کی اور بر وقت مشاہروں میں حالات زمانہ کے لحاظ سے

اضافہ کرکے اپنے کارکنوں کے لئے سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بہم پہنچایا، چنانچہ سالِ رواں میں صدر المدرسین کا مشاہرہ پچاس روپے کے بجائے پچھتر کیا گیا اور اسی نسبت سے دوسرے کارکنوں کی تنخواہوں میں اضافہ عمل میں آیا۔

ریلوے اسٹیشن پر مسجد کی تعمیر

دیوبند میں دارالعلوم کی مرکزیت کی وجہ سے مسلمانوں اور طالبانِ علم کی بکثرت آمد و رفت رہتی ہے جس کا ذریعہ اُس وقت صرف ریلوے تھی، پختہ سڑک بہت بعد میں تعمیر ہوئی ہے، اسٹیشن پر مسجد نہ ہونے کے سبب سے سخت دقت پیش آتی تھی، دیوبند کے بعض حضرات نے متعدد مرتبہ مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا، یہاں تک کہ تعمیر کے ابتدائی مراحل بھی طے ہو گئے، مگر ہر مرتبہ کچھ ایسے موانع پیش آتے رہے کہ تعمیر شروع نہ ہو سکی، قدرت کی جانب سے یہ سعادت دہلی کے تین صاحبِ خیر اور حقیقی بھائی شیخ محمد ابراہیم، شیخ محمد یعقوب اور شیخ محمد حسین صاحبان کے لئے[1] مقدر ہو چکی تھی، ان حضرات کی توجہ و سعی سے اسٹیشن پر ایک خوشنما مسجد تعمیر ہو گئی، مسجد کا احاطہ کافی وسیع ہے، گرد اگرد پختہ چہار دیواری ہے، جس میں پختہ فرش، امام کا حجرہ اور مؤذن کے لئے کمرہ ہے، احاطہ کے باہر مسجد کے مصارف کے لئے چند دکانیں بھی بنائی گئی ہیں، پانچ ہزار روپیہ مسجد کی تعمیر پر صرف ہوئے، یہ مسجد دارالعلوم کے زیرِ انتظام ہے۔

گورنر یو۔پی کا ورود

دارالعلوم کی تاریخ میں اس سال دوسری مرتبہ صوبۂ متحدہ کے گورنر نے اس کا معائنہ کیا، پہلا موقع دس سال قبل حضرت گنگوہیؒ کی حیات میں ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں پیش آیا تھا، اس مرتبہ دعوت دینے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ [illegible]

---

[1] شیخ محمد یعقوب مرحوم "ماہنامہ شمع" دہلی کے مالک حافظ محمد یوسف صاحب کے والد ماجد تھے، شیخ محمد ابراہیم حافظ صاحب کے نانا اور شیخ محمد حسین چچا تھے۔ ان حضرات نے اپنی مرحومہ والدہ ماجدہ (اہلیہ حاجی عبدالرحمٰن) کے ایصالِ ثواب کے لئے مسجد تعمیر کرائی تھی۔

کی تعمیر ہونے والی تھی۔ یہاں سے ایک برساتی نالہ گزرتا تھا اس کے ہٹائے جانے کی کوشش بھی مدت سے جاری تھی مگر قریب والی زمین کے مہنگے داموں کے سبب سے اس سلسلے میں کچھ ایسی دشواریاں حائل تھیں کہ سرکاری منظوری کے بغیر وہ نالہ ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کام کی تکمیل کے لئے صوبائی حکومت کی اجازت کے ساتھ اُس کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ اسی بنا پر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کا عرصے سے خیال تھا کہ صوبے کے گورنر کو دعوت دی جائے۔ سر جیمس مسٹن اس وقت صوبہ متحدہ کے گورنر تھے۔ یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو دیوبند آئے۔ جلسہ خیر مقدم میں ہز آنر کو جو سپاسنامہ دیا گیا اس میں دارالعلوم کے نصب العین اصول تعلیم، طریق عمل، علماء کی ضروریات کی تکمیل اور نمود و نمائش سے احتراز، اساتذہ و طلباء کی سادہ زندگی اور دارالعلوم کی تدریجی ترقی اور مستقبل کے عزائم کو وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔

دارالعلوم کو دیکھ کر سر جیمس مسٹن کے قلب میں اس کی عظمت کا جو گہرا نقش قائم ہوا اس کا اظہار موصوف نے اپنی مندرجہ ذیل اردو تقریر میں اس طرح کیا ہے:-

"عرصے سے میری تمنا تھی کہ یہاں آکر بچشم خود اس مشہور مدرسے کو دیکھوں اور اس کے ذی علم مدرسین سے تعارف و ملاقات کا مجھ کو موقع ملے۔ میری اس آرزو کی متعدد وجوہ ہیں: اولاً یہ کہ علمائے مشرق کی جو جماعت بے غرضی سے دینی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے ہیں، تعظیم و تکریم جو نظر تاہر تعلیم یافتہ شخص کے دل میں جاگزیں ہونا چاہیے۔ دوم وہ فخر و مباہات جو ان معززین کے ہر رشتہ کو اس مدرسے کی وجہ سے ہونا چاہئے جس کی شہرت تمام ملک ایشیا اور اسلامی یورپ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں تہ دل سے اس کی قدر و مسرت کرتا ہوں کہ آپ نہایت سادگی سے محض مذہبی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے

اپنا مشہور و معروف مدرسہ مجھ کو دکھلایا، اور اپنے کام اور مقاصد اعلیٰ کے کچھ
کچھ حالات معلوم کرنے کا مجھ کو موقع دیا۔

آج کل دنیا کے لوگوں کا میلان تین امور ناقص کی طرف ہے، اول یہ کہ
لوگ بلا لحاظ معنی کی رغبت، ان کے رات دن دولت دنیا کے حصول کی سعی
کرتے رہتے ہیں، اور اسی ادنیٰ کام میں اپنی عقل و شعور کو جو ہمارے خالق نے
بہتر مقاصد کے لئے ہم کو عطا فرمایا ہے صرف کر دیتے ہیں، دوسرا امر یہ ہے کہ لوگ
ظاہری زیب و زینت، و نام و نمود کی طرف مائل رہتے ہیں اور روحانی و باطنی نیکی
و ترقیات حاصل کرنے کے لئے جو سچی اور واقعی نعمتیں ہیں کوئی حصہ اپنے وقت کا
باقی نہیں رکھتے، تیسرا امر یہ ہے کہ لوگ مذہب کے پردہ میں تعصب کا برتاؤ
کرتے ہیں اور باہمی نزاع و نفاق پھیلاتے ہیں، بجائے اس کے کہ مذہبی پند و تعلیم
سے یہ بات ذہن نشین کریں کہ خدائے عام کی نظر میں اس کے سب بندے یکساں
ہیں، اور سب کو باہم دگر انکسار و درگزر کا سلوک اور اس قول پر عمل کرنا
چاہئے ؎

مشنو سخن بجز برادر خویش — رو آشتی انگیز چو درویش

آپ نے ایڈریس کے اس فقرہ میں جو سب سے زیادہ موثر ہے، یہ
تحریر کیا ہے کہ آپ ان تینوں ناقص امور سے اجتناب کلی رکھتے ہیں اور مجھ کو
یقین کامل ہے کہ اس طرح آپ اپنے طلباء کی ایسی تعلیم و تربیت کر رہے ہیں
جو دنیا و عقبیٰ دونوں جگہ اُن کی راحت و خوشی کا باعث ہوگی۔

گرچہ آپ کی قوم پر تکلیف و بیماری کا زمانہ گذر رہا ہے مگر آپ اس کو
ہمیشہ مافوق رضا و امید کی روشنی دکھلاتے رہتے ہیں، اور سچے مذہب کی تعلیم
سے اس حالت افسردگی میں تسکین و تسلی دیتے رہتے ہیں، اس طرح اُن کی

سمجھیں جاتی رہیں گی۔ اس موقع پر میں صرف یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دنیوی طریقے
سے آپ کی امداد و اعانت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ شاید آپ کو ناگوار گذرے
لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کی طرف سے کبھی امداد کی خواہش کی جائے
گی تو میں کامل طور پر اور آمادہ دلی سے اس کے پورا کرنے کی سعی کروں گا، اور
اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ آج تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کی
بے لوث نوازش کا بہت ممنون رہوں گا اور میرے دل میں آپ کے کام کی بہت
عظمت و توقیر ہے اور میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ کو ہر قسم کی دینی
و دنیوی کامیابی و ترقی حاصل ہو۔

۱۳۴۳ھ، حیدرآباد کے عطیہ میں اضافہ

اس سال پھر حیدرآباد کے عطیہ میں مزید اضافہ ہوا۔ اب تک حیدرآباد
سے دارالعلوم کے لئے پانچ سو روپے ماہانہ آتے تھے۔ اس سال میں بھی حضرت مہتمم صاحب
کی سعی سے تین سو روپے کا اضافہ ہو کر آٹھ سو روپے ماہانہ ہو گئے، اور پھر چند ہی سال بعد ۱۳۴۵ھ
میں ایک ہزار کر دیئے گئے، جو اب سب حیدرآباد کے سقوط تک جاری رہے۔ ان اضافوں کی
کامیاب سعی سے جب بھی حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم حیدرآباد سے دیوبند
پہنچتے تھے تو دارالعلوم کی طرف سے ان کا شاندار خیر مقدم کیا جاتا، تہنیتی جلسے ہوتے اور ان میں
نظم کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ چنانچہ مزید اضافہ پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت
مولانا عبدالسمیع صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے جو اس وقت طالب علمی
کے دور میں تھے، اپنے تہنیتی قصائد سنائے۔

اس زمانے میں سلطنت آصفیہ کے جود و کرم سے ہندوستان کی تمام اسلامی درسگاہیں
علی العموم سیرابی حاصل کر رہی تھیں۔ حکومت آصفیہ جس طرح دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور بہت سے مسلم اداروں کی نہایت فیاضی کے ساتھ مدد کرتی تھی، اسی طرح

اور پابندی و التزام سے جاری ہے، ہر ایک منتظم اپنے اپنے موقع پر مثل تصویر تھا اور اکرام
کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار خداوند عالم کا شکر ادا ہوتا ہے کہ اس نے علوم دین کی اس بے قدری
کے زمانے میں دارالعلوم کو ایسی مقبولیت و شہرت نصیب فرمائی اور مسلمانوں میں علوم دین کی
تحصیل کا ایسا ذوق و شوق پیدا فرما دیا کہ دنیا کی دولت و عزت کو پس پشت ڈال کر اسلام کی
ترقی مسلمانوں کی رہنمائی اور تعلیم کی اشاعت میں اپنی عمریں بسر کرنا چاہتے ہیں اور کسی سے
صلہ و ستائش کے طالب نہیں بلکہ اس کے برعکس ہدف ملامت بن کر بھی تو اس کی طرف
متوجہ ہیں۔

لیکن عین اس وقت جب کہ تعلیم پورے شباب پر ہو رہی تھی دیوبند میں وبائی مرض نمودار
ہوئے اور چند طلبہ مرض کا شکار ہو گئے، اگرچہ طلبہ میں تشویش اور پریشانی ضرور پیدا ہو گئی مگر
تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا، لیکن جب مرض کی شدت بہت بڑھ گئی تو دارالعلوم میں مجبوراً
تعطیل کرنی پڑی، مدرسین میں سے اکثر موذی امراض میں مبتلا ہوئے، کئی مہینے تک دارالعلوم
بالکل بند رہا، یہ ناگہانی افتاد ایسی تھی جس سے باوجود انتظام تعلیم کے مکمل ہو جانے اور عمدہ تعلیم
کے اعلیٰ پیمانے پر جاری ہونے کے حرج واقع ہوا، لیکن بحمد اللہ پھر بہ دستور سابقہ حالت عود کر آئی،
مدرسین و طلباء ہمت کے ساتھ کام میں مصروف رہے اور ہر طرح جد و جہد سے تیاری کرتے رہے
خداوند عالم کے فضل و کرم اور مدرسین و طلباء کی مستعدی سے نتیجہ کامل تھا کہ جو مرحلہ بااسباب ظاہر
مجبور ہو رہے تھے اس کی تلافی ... ہو جانے کی، چنانچہ جب تعلیمی سال کے ختم پر سالانہ امتحان
ہوا تو ۷۰۰ طلباء میں ۵۰۰ نمبر وار شریک امتحان ہوئے، ۲۰۶ غیر حاضر رہے تھے،
حاضرین میں باوجود حرج شدید کے صرف چند طلبہ ناکام رہے اور ۴۴۵ نے کامیابی کے نمبر
حاصل کئے، یعنی کامیابی کا اوسط فی صدی تقریباً ۹۹ ½ ہے جو کامیابی کا اعلیٰ ترین درجہ
شمار ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری

گزشتہ سال کے آخر میں حضرت شیخ الہندؒ حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ فراغت حج کے بعد کچھ مدت حرمین شریفین میں قیام کا ارادہ تھا۔ مدینہ منورہ میں ایک خاص مصلحت بھی پیش نظر تھی جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ۱۳۳۴ھ کا پورا سال حرمین شریفین کے قیام میں گزارا اور ۱۳۳۵ھ میں واپسی متوقع تھی۔ ناگہاں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند کو برطانوی گورنمنٹ نے شریف حسین کے ذریعہ سے گرفتار کرا دیا ہے اور بمع رفقاء مالٹا بھیج دیا ہے۔ اس افسوسناک حادثے سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اور دارالعلوم اور حضرت کے متوسلین کو خصوصاً قلق و اضطراب کا ہونا ناگزیر تھا۔ دارالعلوم اور عام مسلمانوں کی جانب سے حضرت کی رہائی کے لئے ہر ممکن سعی کی گئی اور کوئی مؤثر طریقہ اٹھا نہیں رکھا گیا مگر بے نتیجہ رہا۔ اور دسمبر ۱۹۱۶ء کو علماء دارالعلوم کا ایک منتخب وفد بسرکردگی حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم صوبہ متحدہ کے گورنر سے ملا تحریری یادداشت پیش کی گئی اور زبانی ہمدردی کے اظہار کے آخر تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور حضرتؒ کو تقریباً سوا تین سال مالٹا میں جنگی قیدیوں کے ساتھ نظربند رکھا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا سبب ان کا وہ جنگی منصوبہ تھا جو انہوں نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کو ختم کرنے کے لئے بنایا تھا۔ یہ ایک منظم منصوبہ تھا جس کی شاخیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ جرمنی، ترکی اور افغانستان سے مدد لے کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد یعنی آزاد قبائل کے ذریعہ سے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اور اس کے ساتھ ہندوستان میں عام بغاوت برپا کرا دی جائے۔ اس وقت چونکہ برطانیہ کی ساری فوجی طاقت جرمنی اور ترکی کے مقابلہ میں مصروف جنگ تھی، اس لئے بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت پر انگریزوں کے لئے قابو پانا مشکل ہو جائے گا اور انہیں ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اس منصوبے کی تفصیلات ذیل میں پیش کی جائیں گی۔

باطنی کا طریقہ حضرت گنگوہی قدس سرہ سے بیعت اسی لئے تھا دارالعلوم کے ساتھ نہایت خصوصیت سے تعلق تھا، اس کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کی تائید و ہمدردی سے حصہ لیتے تھے۔

اسی عنوان کا دوسرا واقعہ دارالعلوم کے قدیم مدرس مولانا غلام رسول صاحب کا انتقال ہے۔ مولانا بفہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے ابتدائی تعلیمات تک اپنے وطن میں حاصل کی تھیں۔ [illegible] میں دارالعلوم میں تشریف لائے اور یہیں علوم کی تکمیل فرمائی۔ فراغت کے بعد [illegible] میں دارالعلوم کے مدرس مقرر ہوئے، اور تیس سال تک دارالعلوم کی تعلیمی خدمت انجام دی۔ دیوبند میں اس سال انفلوئنزا کی بڑی شدت تھی، ایک مہینے سے زیادہ دارالعلوم بند رہا۔ آٹھ دس طالب علم انفلوئنزا کی نذر ہو گئے۔ اسی مرض میں مولانا مرحوم نے ۷ محرم ۱۳۳۷ھ کو انتقال فرمایا۔ مولانا غلام رسول صاحب علوم عقلیہ و نقلیہ کے نہایت جامع الصفات عالم تھے، علوم عقلیہ میں معقول کے سمجھنے میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ طلبہ آپ سے استفادۂ علوم میں فخر محسوس کرتے تھے۔ متعدد بار ان کی جامعیت و مقبولیت کے سبب سے متعدد مرتبہ مختلف مقامات سے گراں قدر مشاہرے پر طلب کیا گیا مگر آپ نے دارالعلوم سے جدا ہونا گوارا نہ کیا، دارالعلوم کے قلیل مشاہرے پر دوسری جگہ کے بیش قرار مشاہرے کو ترجیح دینا پسند نہیں کیا۔ زندگی نہایت سادہ، تکلف سے بے نیاز تھی۔

دارالعلوم کا اثر جنوبی اور مشرقی افریقہ میں

گزشتہ صفحات سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ دارالعلوم کو شروع ہی سے دنیائے اسلام کی علمی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی، اور اس کی شہرت کا آوازہ ایشیا کو گزر کر یورپ اور افریقہ تک پہنچ گیا تھا، اسی طرح اس کی فیض رسانی کا دائرہ بھی صرف ہندوستان کی سرحدوں تک محدود نہیں تھا، روداد کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دارالعلوم میں جس طرح ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مقامات کے طلبہ موجود رہتے تھے، اسی طرح

کابل و ایران، بلخ و بخارا، چین، افریقہ، روس، شام و حجاز کے لوگ قرآن و حدیث کے علم کی تحصیل
کے لئے دیوبند کا سفر اختیار کرتے تھے۔ اگر ایک وقت امام بخاریؒ کے علم و فن اپنے وطن عجم
ترک کر کے حجاز سے نکلے تھے تو اب زمانے میں سرزمین عجم سے آکر دوسری طرف مصر و حجاز و شام
دیوبند تک دارالعلوم کے فیض یافتہ پہنچ کر اپنے اصل سرچشمہ سے علم پیدا کر رہے تھے،
لیکن جس طرح دارالعلوم کا فیض وسیع ہو گیا اور اس کے مصنف بڑھتے گئے اسی طرح
اس کے حامیوں اور مددگاروں کا حلقہ بھی ہر سال سے وسیع تر ہو گیا اور وقتاً فوقتاً ہندوستان
کے علاوہ دوسرے ممالک کے اہل خیر مسلمان اس کی امداد و اعانت میں حصہ لیتے رہے چنانچہ
۱۳۲۸ھ کے عظیم الشان جلسہ دستار بندی کے موقع پر جنوبی افریقہ کے اہل خیر مسلمانوں
نے معتدبہ رقم دارالعلوم کو عطا کی تھی، اس وقت سے یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ جنوبی افریقہ کے
مقامات ڈربن، کالا، ٹرانسوال، اسٹینگر وغیرہ میں دارالعلوم کے بہت سے ہمدرد اور معاون
پیدا ہو گئے۔ اور یہ سلسلہ جو جنوبی افریقہ سے شروع ہوا تھا مشرقی افریقہ تک پہنچ گیا۔

۱۳۳۸ھ کے حالات
سفر میں حضرت

۱۳۳۸ھ حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی اور مالٹا سے واپسی

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس کے بعد حجاز کے قیام اور مالٹا کی
سہ سالہ نظر بندی کے زمانے کے حالات اپنے مناسب مقام پر پیش کئے جائیں گے۔
یہاں مختصراً نظر بندی سے رہائی کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔

۲۲ جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ الہندؒ اپنے رفقاء کے ساتھ فوجی نگرانی میں
مالٹا سے روانہ کئے گئے تقریباً دو ہفتے سیدی بشر اور سویز میں روکا گیا۔ ۱۰ رمضان کو
سویز سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ ۲۰ رمضان کو جہاز بمبئی پہنچا۔ بمبئی پہنچنے پر بتلایا گیا
کہ آپ مع رفقاء کے آزاد ہیں اور اب کوئی پابندی نہیں ہے۔ بمبئی کی خلافت کمیٹی نے نہایت
عظیم الشان استقبال کیا۔ ۲۰ رمضان تک بمبئی میں قیام فرما کر ۲۱ رمضان کو دہلی تشریف

لے گئے۔

جدید دارالاقامہ کی بنیاد

پچھلے تقریباً دس سال سے دارالعلوم میں مسلسل ہر سال طلبہ کی کثرت اضطراب کا باعث رہا تھا، چنانچہ شروع میں
طلبہ کی تعداد ۱۰۰۰ تھی مگر اس سال میں یہ تعداد ۱۰۰ تک پہونچ گئی تھی، دارالاقامہ کے کمرے
اس تعداد کے لئے بالکل ناکافی تھے، اس لئے نصف سے زائد طلبہ شہر کی مختلف مساجد اور
متفرق مکانات میں رہتے تھے، اس صورت میں نہ تو طلبہ کو یکسوئی اور اطمینان حاصل تھا
اور نہ ان کی نگرانی اور تربیت حسب دلخواہ طریق پر ہو سکتی تھی، مقدورہ ذرائع جو طلبہ دارالاقامہ
میں مقیم تھے ان کی تعداد بھی دارالاقامہ کی وسعت کے لحاظ سے زیادہ تھی، لہٰذا جگہ
کی تنگی کے باعث اکثر پریشانی لاحق رہتی تھی، اس لئے مزید کمروں کی تعمیر کی ضرورت
بشدت محسوس کی جا رہی تھی، دارالحدیث کے شمالی مغربی اور جنوبی اطراف میں ایک وسیع
دارالاقامہ بنانے کی تجویز زیر غور تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس سال میں مرتب کی بعض اہل
خیر کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور ان کے عطیات سے اس مجوزہ وسیع دارالاقامہ کی بنیاد رکھی
گئی، یہ کمرے جو شیخ الہند میں وقتاً فوقتاً بنائے گئے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی دینداری
علوم دین سے اعتنا اور دینی کاموں سے تعلق خاطر مبارک کی قابل قدر یادگار رہیں گے، یہ کمرے صاف ستھرے
وسیع اور کشادہ ہیں کہ ہر ایک میں کم از کم چار طلبہ با آسانی رہ سکتے ہیں، کمروں کے سامنے چوڑے
برآمدے ہیں، آگے نہایت وسیع اور پُر فضا صحن ہے، جس کے تین سمتوں میں دارالاقامہ اور مشرقی
جانب دارالحدیث کی تہذیب عظیم الشان اور سر بفلک وہ عمارت ہے جو ہندوستان کی اپنی
نوعیت کی پہلی تعمیر ہے، صحن وسیع اور کشادہ ہے جس میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے
پھول دار درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے اور روش بنا کر ایک خوشنما باغ کی شکل
دی گئی ہے، دارالحدیث کے بالمقابل جدید مشرقی جانب باب الظاہر تعمیر کیا گیا ہے
جو افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ کی دارالعلوم سے وابستگی کی ایک اچھی یادگار ہے جو تاریخ

بالآخر جامعی فیصلہ بھی قرار پایا کہ امتثالِ امر سے انکار نہ کیا جا سکے۔ اور ربیع الآخر کو حضرت مہتمم
صاحب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو ہمراہ لے کر روانہ ہو گئے۔ ۲۸ ربیع الآخر کو نظام
دکن سے ملاقات ہوئی۔ حضرت مہتمم صاحب نے دارالعلوم کی خدمت اور اپنے شغف و
انہماک کا ذکر فرمایا تو ارشاد ہوا کہ ہم جب نہ چاہیں کہ وہ کام جس کو آپ سرانجام دیتے ہیں
بہت بڑا ہے علاوہ اگر آپ کسی بنا پر یہاں آنے سے انکار کرتے تو مجھے کچھ ملال نہ ہوتا۔
لیکن میرا خیال ہے کہ میرے منشا کا اتباع کر کے ضرور آئیں گے۔ آپ یہاں رہ کر بھی وہاں کام
کی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

اس تقرر میں عہدۂ افتاء کے علاوہ نظام کے سامنے مدرسہ نظامیہ کی تعلیمی و
انتظامی اصلاح کی بھی ضرورت پیش نظر تھی چنانچہ اس کی صدارت بھی تفویض کی گئی۔ اور
فرمان خاص صادر ہوا کہ مدرسہ نظامیہ کے ساتھ حالات کو دیکھ کر اصلاح و ترقی کے لئے
تجاویز پیش کی جائیں چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے اس سلسلے میں جو تجاویز پیش کیں ان کو
فرمانروا نظام کی منظوری حاصل ہو گئی۔

قیام حیدرآباد کے زمانے میں بھی حضرت مہتمم صاحب کا تعلق دارالعلوم کے ساتھ
بدستور قائم رہا اور صدارت اہتمام کا ایک عہدہ قائم کر کے آپ کو بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم [illegible]

لہ ریاست حیدرآباد کے سابق نظام میں مستقل طور پر دارالقضاء کا محکمہ قائم تھا جس میں ملک
کے شرعی معاملات پیش ہو کر طے ہوتے تھے۔ افتاء کا منصب بھی سرکاری طور پر قائم
تھا۔ عدالت عالیہ میں صدر مفتی کا عہدہ تھا۔ جس کا کام قتل و قصاص کے مقدمات میں شریعت
کے مطابق فتویٰ دینا تھا۔ عدالت عالیہ کے فیصلے اور سزائے موت کا انحصار مفتی کے فتویٰ پر ہوتا
تھا۔ اگرچہ یہ عہدہ عدالت عالیہ کے چیف جج کے ماتحت تھا مگر اس کو ایک خاص دینی
و شرعی منصب ہونے کے سبب انتہائی عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا

بھیجا گیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم دارالعلوم کو مہتمم بنا دیا گیا، اس صورت سے تمام اختیارات ان ہم عصر کے قبضے میں آ گئے جو پہلے کرتے تھے اور بہ اہم معاملات میں بھی مشورہ کے ذریعے سے دارالعلوم کی خدمات میں حصہ لیتے رہے۔

اضافۂ مشاہرات اور بعض تغیرات

دارالعلوم میں ہمیشہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے تنخواہوں کا معیار بہت ہی کم حد معمول رہا ہے اور ہمیشہ یہاں کے کارکنوں اور اساتذہ نے اپنی خدمات کے معاوضے میں حق تعالیٰ کی خوشنودی اور ایثار کو ترجیح دی ہے مگر انسانی ضرورتوں سے بھی کلیۃً قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، اس لئے جب جنگ عظیم کے سبب شدید گرانی پیدا ہوگئی اور مابعد جنگ بھی یہ حالت بدستور باقی رہی تو تنخواہوں میں اضافہ کا مسئلہ ناگزیر ہو گیا، چنانچہ اس مناسبت سے اضافہ عمل میں آیا کہ صدر مہتمم صاحب کے سابقہ مشاہرہ ۵۰ روپے میں ۵۰ روپے کا اور صدر مدرس صاحب کی تنخواہ ۱۰۰ روپے میں ۳۰ روپے کا اضافہ کیا گیا، اور اسی طرح علیٰ قدر مراتب تمام مدرسین اور ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کئے گئے۔

اس موقع پر مجلس شوریٰ نے تنخواہوں میں اضافہ کی ضرورت کی تجویز پاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جناب مہتمم صاحب نے دربارہ مشاہرات حضرات مدرسین و ملازمین دارالعلوم جو تجویز تحریر فرمائی ہے وہ بالکل مناسب ہے، تجویز مذکور میں جو وجوہ تحریر کی گئی ہیں ان کی بنا پر موجودہ حالات زمانہ پر نظر کرنے سے کوئی وجہ عدم تسلیم نہیں ہو سکتی، تمام دنیا کے ہر ایک طبقے و گروہ میں اس وقت خدمت کی قیمت بہت زیادہ ہو گئی ہے، لہٰذا حضرات مدرسین اور دیگر ملازمین دارالعلوم بھی اضافہ کا استحقاق رکھتے ہیں۔"

مجلس شوریٰ نے حضرات مدرسین کا شکریہ ادا کر کے نہایت امتنان کے ساتھ ان حضرات

کے ایثار کا اعتراف کرتی ہے۔ حضرات مدرسین نے محض بوجہ اللہ تعالیٰ خدمت تدریس دارالعلوم کو بہ ادائے دینی و قومی فریضہ جانا کر دوسری جگہ باوصف مشاہرہ مضاعف تنخواہ پر بلائے جانے کے باوجود دارالعلوم کو نہیں چھوڑا، بالخصوص حضرت مولانا انور شاہ صاحب صدر مدرس کا ایثار خاص شکریہ کے قابل ہے کہ حضرت موصوف نے دارالعلوم کی قلیل رقم مشاہرہ کو قبول فرما کر دوسری جگہ اضعافاً مضاعفہ مشاہرہ پر جانے سے بالکل انکار فرما دیا ہے۔ حضرت موصوف کا شکریہ بالخصوص ارکان مجلس شوریٰ پر اور بالعموم عام ہمدردان دارالعلوم بلکہ تمام اہل اسلام پر واجب ہے۔

جناب مہتمم صاحب نے اپنی یادداشت کے ساتھ مدرسین متعلقہ دارالعلوم کی فہرست مرتب فرمائی ہے لیکن اس میں کسی جگہ خود مہتمم اور نائب مہتمم کے نام کا اندراج نہیں ہے یہ بھی ایک طرح کا ایثار ہے جو حضرات موصوفین کا ہمیشہ سے شعار چلا آرہا ہے لیکن جہاں تک نظر دوڑائی جائے یہ بھی نظر آئے گا کہ دارالعلوم میں ترقیات مالی و انتظامی جس قدر ہوئی ہیں وہ حضرات موصوفین کی جد و جہد اور کوشش بلیغ کا نتیجہ ہے، لہٰذا ان حضرات کی خدمات کا در اصل کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا اور مجلس شوریٰ معاوضہ تجویز کرنے سے بالکل قاصر ہے مگر تاہم اس موقع پر دونوں حضرات کا اضافہ تجویز نہ کرنا مجلس شوریٰ کی ایک سخت کوتاہی اور نہایت ناسپاسی و ناقدری کا خیال کی جائے گی لہٰذا اس فہرست میں ہر دو حضرات کے لئے بھی اضافہ منظور کیا جاتا ہے۔[1]

۱۳۴۲ھ ارتداد شدھی اور سنگٹھن کے زمانے میں دارالعلوم کی تبلیغی خدمات

۱۳۴۲ھ کے حالات میں سب سے زیادہ اہم واقعہ شدھی اور سنگٹھن کا وہ افسوسناک فتنہ ہے جس نے دارالعلوم کی تمام تر توجہ اپنی طرف

۱؎ روداد مجلس شوریٰ منعقدہ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ۔

شائع ہو چکا تھا۔ اس سے اس جلسے میں مولانا [illegible] کی کارروائی سے قبل آل انڈیا نیشنل
کانگریس سے اخلاقی طور پر اپیل کی گئی کہ وہ ان تمام سرگرمیوں کو جو مسلمانوں اور ہندوؤں
میں منافرت و عداوت کے جذبات پرورش کر رہی ہیں اپنے ہمہ گیر اثرات سے فی الفور
بند کرا دے۔ تجویز کے متن کا ماحصل یہ تھا کہ:۔

"دارالعلوم کی یہ مجلس آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ
ملک کے پُر آشوب حالات کو محفوظ رکھتے ہوئے ان تمام کارروائیوں کو جو ایک باقاعدہ
حرکت کی صورت میں ظاہر ہو کر مسلمان اور ہندو قوم کے جذبات منافرت و عداوت کے
بھڑکانے اور مطلع آزادیٔ ہند کو تاریک بنانے کی موجب ہو رہی ہیں عام ملکی مفاد کی
خاطر موقوف کرا دے اور ملک کی سیاسی فضا کو جو بدقسمتی سے روز بروز مکدر ہوتی چلی جاتی
ہے صاف اور شفاف بنانے کے لئے ان مبلغین کو جو ایک طرح کی مذہبی جنگ آزمائی میں
منہمک ہیں واپس کرا دے۔ البتہ ایسی مذہبی تبلیغ جو جذبات رواداری کے ساتھ معتدل
اور ملائم طرز پر ہو اس سے کوئی جماعت دوسری جماعت کو روکنے کا اختیار نہیں رکھتی"
سنگٹھن کی نسبت یہ تجویز پیش کی گئی تھی:۔

"چونکہ ہندو سنگٹھن کی تحریک کے بعض علمبرداروں نے صحیح یا غلط طور پر یہ معنی سمجھ لئے
ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے پر ایک طاقتور نظام عمل بنایا گیا ہے جس کی غرض ہندوؤں
کو مسلمانوں سے ٹکرانا ہے اور اس خیال نے ملک کے امن و امان کو سخت مجروح و مخدوش بنایا
ہے۔ اس لئے یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہندو مہا سبھا سے بہت
زور کے ساتھ درخواست کرے کہ وہ اس نازک اور پُر خطر حالت کا تدارک کرتے ہوئے
جس سے ہمارا ملک گذر رہا ہے ہندو سنگٹھن کی موجودہ صورت کو ملتوی کر دے۔ جس سے معتد
خطرات کے پیدا ہونے کا ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے۔ البتہ جس وقت ملک کی فضا درست
اور حالات معتدل ہو جائیں، تب آل انڈیا کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ ہندو مسلمان

دونوں کی جسمانی قوت کو ترقی دینے کے لئے ایسی تدابیر کی تلقین کرے جن سے دونوں
قومیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے جسمانی قویٰ کو عام کمزوری سے محفوظ رکھ سکیں جو اس
زمانے میں دونوں قوموں کے کثیر افراد میں کم و بیش مشاہدہ کی جا رہی ہیں۔ تاکہ ملک ایسے
فرزندوں کی خدمات بیش از بیش مقدار میں حاصل کر سکے اور شریف لوگ شریروں کے
مقابلہ میں اپنی جان و مال، آبرو اور مذہب کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکیں۔

اسے ملک کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ دار العلوم کی جانب سے یکجہتی کی یہ
مصالحانہ اپیل اس وقت صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ دار العلوم میں جب خطوط اور اخبارات
کے ذریعے پہلے پہل آریہ سماج کی ناگوار فرقہ وارانہ سرگرمیوں اور مسلمانوں کے
ارتداد کی خبریں موصول ہوئیں تو ۲۲ ربیع الاول کو دار العلوم سے مبلغین کا ایک وفد
روانہ کیا گیا۔ وفد کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ آریہ سماج کی تحریک نہایت منظم اور وسیع پیمانے
پر پھیلی ہوئی ہے جس کے ازالے کے لئے مزید اور کامل مبلغین کی سخت ضرورت ہے۔ پھر
دار العلوم کے اساتذہ اور طلبہ کے پے در پے متعدد وفد روانہ کئے گئے۔ آگرہ کو تبلیغی کام کا
مرکز قرار دے کر علمائے دیوبند کا دفتر کھولا گیا۔ مولانا میرک شاہ صاحب مدرس دار العلوم
دفتر کے نگراں بنائے گئے۔ جو حسب ضرورت ہر جگہ مبلغین کو بھیجتے۔ مجاہدانہ مبلغین کی
ان تھک مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار مرتدین تائب ہو کر اسلام میں واپس ہو گئے۔
جن مقامات پر آریہ سماج کی تحریک جاری تھی وہاں کے مسلمان عموماً دین سے ناواقف
و رسم و رواج تھے اس لئے آریوں سے مخالفین کا شکار ہو جاتے تھے۔ مبلغین نے
وعظ و تبلیغ کے ذریعے ... لوگوں کو اسلام سے روشناس کرایا ان کے لئے
دینی تعلیم کا انتظام کیا، جگہ جگہ مدارس کھولے گئے، اکثر مقامات پر آریہ مبلغین سے
مناظرے ہوئے۔ جن میں بالعموم دار العلوم کے مبلغ کامیاب رہے۔

مبلغین نے وقتاً فوقتاً جو اطلاعیں بھیجیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع

سب سے زیادہ نمایاں طریق یہ ہے جو سب سے بڑا ادارہ مدرسہ عالیہ دیوبند کا ہے اور دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مذہبی حیثیت، علوم عربی، تفسیر و حدیث اور فقہ کے چرچے جو ابھی تک ہیں وہ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں:

مدیر نامہ "زمیندار" لاہور نے لکھا تھا: "یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کس قدر تبلیغی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے ممبران و طلبہ نہایت انہماک کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔ اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ حقیقی مبلغ وہی ہے جو وقت پر میدان عمل میں آ جائے۔" (زمیندار ۳ جون ۱۹۲۳ء)

تبلیغی تعلیم کا انتظام

آریہ سماج کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی مدافعت کیلئے صرف ندوہ کی کوششیں کافی نہ تھیں اس لئے ندوہ نے علمی طریق کار کے طور پر مبلغین کو آریہ مذہب سے براہ راست واقفیت پیدا کرانے کے لئے سنسکرت کا انتظام کیا گیا۔ مولوی عبدالرحمن صاحب میرٹھی جو سنسکرت میں بہارستان اور کہتے تھے منتخب کر کے مبلغین کی تعلیم کا کام سپرد کیا گیا۔ اسی زمانے میں اتفاق سے ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ موصوف آریہ سماج کے تبلیغی مشن کے زبردست رکن اور سنسکرت کے ماہر فاضل تھے ندوہ ہی کے زمانے میں اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی توجہ اور محنت سے بہت تھوڑے عرصے میں ندوہ کے طلبہ میں سے مبلغین کی جماعت تیار ہو گئی جو عربی معلومات کے ساتھ سنسکرت میں بھی کافی دخل رکھتی تھی۔ اور مخالفین کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دینے کے علاوہ ان کے مذہب پر براہ راست حملہ آور ہو کر خود ان کو اپنی مدافعت پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ مخالفین کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور آریہ سماج کے مشن نے ملک میں جو ہنگامہ، شورش اور فساد کی فضا پیدا کر دی تھی وہ ختم ہو کر حالات معمول پر لوٹ آئے۔

یک سال کی مزید توسیع کی گئی لیکن اس توسیع میں صحت خراب ہو گئی، جب علالت کا سلسلہ زیادہ بڑھا تو آپ قبل از وقت مستعفی ہو کر اوائل ربیع الآخر میں دیوبند تشریف لے آئے۔ حیدرآباد سے رخصت کی تقریب باغ عامہ میں نظام دکن نے بنفس نفیس شرکت فرما کر حضرت ممدوح کی خدمات جلیلہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف و تحسین فرمائی، ورخصتی خدمات کے صلہ میں پانسو روپیہ ماہوار وظیفہ کے اجراء کا فرمان صادر ہوا، غرض کہ حضرت ممدوح کا تعلق جس غیر معمولی اعزاز و احترام کے ساتھ شروع ہوا تھا اسی طرح نہایت عزت و وقعت کے ساتھ انجام پذیر رہا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے بجائے حضرت مہتمم صاحب

حضرت ممدوح کے مستعفی ہو کر چلے آنے کے بعد نظام دکن نے فرمایا کہ ہم آپ کی جگہ پر مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کا تقرر کرنا چاہتے ہیں، آپ ان سے دریافت کر کے جواب دیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب سے استمزاج امر کے بعد یہ تعلق منظور فرمایا اور وہ جمادی الاولیٰ کو حیدرآباد تشریف لے گئے، لیکن دو تین ماہ کے بعد جب حضرت مہتمم صاحب کی علالت نے طول کھینچا تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا کو واپس بلا لیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے نظام کی بارگاہ میں مجلس کی جانب سے ایک عرضداشت ارسال کی گئی جس میں دارالعلوم کی مصلحت اور اس کی ضرورت کے پیش نظر استدعا کی گئی تھی کہ حضرت مولانا کو مراجعت دیوبند کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، چنانچہ حضرت ممدوح حیدرآباد سے رخصت ہو کر ربیع الاول ۱۳۴۷ھ کو دیوبند تشریف لے آئے۔

حضرت تھانوی کی سرپرستی

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی وفات کے بعد سے اب تک سرپرستی کے لئے کسی معتمد اور باثر شخصیت کا انتخاب نہ ہو سکا تھا۔ اس اہم منصب کو پُر کرنے کے لئے مجلس شوریٰ

نے مولانا سعید الدین صاحب رکن مجلس کی تحریک پر متفقہ طور پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو سرپرستی کے لئے تجویز کیا۔ حضرت موصوف ابتداءً اپنی کثیر مصروفیتوں کے سبب سے انکار کرتے رہے، مگر جب مجلس اور اہتمام کی جانب سے زیادہ اصرار ہوا تو بالآخر آپ نے قبول فرما لیا۔

ایک اہم حادثہ

یوں تو دارالعلوم اپنے آغاز ہی سے خلافتِ راشدہ کی طرح گونا گوں حادثات کا شکار رہا ہے۔ مگر اس سال کے اواخر میں جو اہم حادثہ پیش آیا وہ دارالعلوم کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ تھا۔ اب تک جو حوادث پیش آئے تھے وہ باہر سے اٹھے ہوئے عوارض تھے، مگر یہ حادثہ اندرونی طور پر رونما ہوا تھا۔ اور بعض شعبوں کے متعلقین کے خلاف طلباء کی ہنگامی شکایتوں سے اس کا آغاز ہوا، عام طور پر ہر جگہ ایسی شکایتیں متعلقین کے خلاف اکثر پیدا ہوا کرتی ہیں، مولوی گل محمد خاں مرحوم سے مطبخ وغیرہ مختلف شعبوں کا کام متعلق تھا، طلباء کو انہی سے زیادہ شکایات تھیں، ان معمولی باتوں نے شعبان میں سالانہ امتحان کے موقع پر یعنی دورانِ امتحان میں یہاں تک ایک ایسے حادثے کی شکل اختیار کر لی جو آگے چل کر دارالعلوم کی تاریخ میں ایک عجیب اور اہم ہنگامہ بن گیا، مولوی گل محمد خاں مرحوم کے ساتھ زد و کوب کا افسوسناک اور توہین آمیز معاملہ کرنے کے جرم میں پانچ طلباء کا اخراج عمل میں آیا اسی کے ساتھ دوسرے متعلقین سے طلباء کو شکایات تھیں انھیں بھی مؤثر فہمائش کر دی گئی مگر مذکورہ طلباء کے اخراج سے طلباء کی ایک بڑی جماعت میں ہیجان پیدا ہو گیا، انھوں نے اپنے مطالبات میں قوت پیدا کرنے کے لئے "لجنۃ الاتحاد" کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ دارالعلوم کی جانب سے اس جماعت کو خلافِ انتظام سمجھ کر خلافِ قانون قرار دیا گیا، اس دوران میں سالانہ امتحان کے بعد عام تعطیل ہو گئی، طلباء کے اپنے اپنے وطن چلے جانے سے اس وقت یہ ہنگامہ فرو ہو گیا۔

سنہ ۱۳۴۵ھ، گذشتہ ہنگامے کی تجدید

گذشتہ سال طلباء کے جو ہنگامے کا آغاز ہوا تھا وہ اگرچہ اُس وقت بالکل وقتی حالات کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا، طلباء کو بعض منتظمین سے جو شکایات تھیں اُن کا اُس وقت تدارک کر دیا گیا تھا مگر بعد میں بتدریج شکایتوں میں اضافہ ہوتا گیا، اور رفتار کے ہر موڑ پر اب تک ایسی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں جنھوں نے حالات کو شدید سے شدید تر بنا دیا، طلبہ کی "انجمن اتحاد" جس کی بنیاد گذشتہ سال پڑ چکی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ باقی تھی بلکہ اُس کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، لیکن اب تک جو کچھ ہوا وہ صرف طلبہ ہی کی حد تک محدود تھا، طلبہ کو اساتذہ کی اعانت حاصل نہ تھی مگر وسط شعبان کے پہلے ہفتے میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نے طلباء کے مطالبات کی تائید میں یکے بعد دیگرے دو مرتبہ مسجد دارالعلوم میں تقریر فرمائی، حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سراج احمد صاحبؒ اور چند دوسرے اساتذہ بھی شریک ہو گئے، دراصل معاملات کے موقع پر منتظم مطبخ کو مطبخ سے علیحدہ رکھے جانے کا مطالبہ طلباء کی جانب سے کیا گیا، یہ مطالبہ منتظم اور طلبہ کی ایک معمولی آویزش پر مبنی تھا، مہتمم صاحب کو اس مطالبے کے منظور ہونے میں کلام تھا، اساتذہ مہتمم صاحب کو منتظم مطبخ کی علیحدگی پر شدومد سے اصرار تھا، یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ اس کو خلاف نظم قرار دے کر ایسے طلبہ کا اخراج کر دیا گیا جنھوں نے ایجی ٹیشن کی، دو مہینوں میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ مذکورہ طلبہ کے اخراج پر ہیجان اور بڑھ گیا، اب "انجمن الاتحاد" نے اپنے مطالبات اخبارات کے ذریعے ملک کے سامنے پیش کئے، ان پر تائید کی اور تردید کی مضامین کا ایک طویل سلسلہ عرصے تک اخبارات میں چلتا رہا۔

دستور اساسی میں ترمیم

گذشتہ سال سے دارالعلوم کے اندرونی نظام

میں اختلافات کے سبب سے جو معاملات پیش آ رہے تھے ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اہتمام کے اختیارات کو قدرے وسیع کر دیا جائے۔ اس کے لئے قدیم دستور اساسی میں تغیر و تبدیل کیا گیا۔ حضرت سرپرست صاحب کی سہولت کی غرض سے مجلس شوریٰ کے اجلاس دیوبند کے بجائے متعدد جگہوں میں منعقد ہوا، دستور اساسی کے قواعد و ضوابط کی تفصیل نظم و نسق کے عنوانات سے آئندہ اوراق میں پیش ہوگی۔

مجلس انتظامیہ کا قیام

دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مجلس شوریٰ نے اپنے کاموں میں سہولت اور عجلت کے پیش نظر "مجلس انتظامیہ" (مجلس عاملہ) کے نام سے ایک ذیلی مجلس قائم کی جس کے ارکان کی تعداد پانچ مقرر کی گئی۔ مجلس انتظامیہ کے ارکین کے انتخاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ ایسے ارکین پر مشتمل ہو جو دیوبند کے قرب و جوار میں مقیم ہوں تاکہ ماہانہ اجلاسوں میں بسہولت شرکت کر سکنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً دارالعلوم کا معائنہ بھی کرتے رہیں۔

۱۳۴۶ھ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم خیال حضرات کا استعفا

گزشتہ دو سال سے اختلافات کا جو تلاطم جاری تھا، ہر چند اس میں بعض اوقات کمی تو ہو جاتی تھی مگر اس کا بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا تھا، اس لئے وہ دب دب کر بھی بار بار نمایاں ہو جاتا تھا۔ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ رخصت پر اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے۔ ۱۷ محرم ۱۳۴۶ھ کے دوران میں آپ نے وہیں سے استعفا بھیج دیا، ۲۰ ربیع الاول کو حضرت شاہ صاحبؒ واپس دیوبند تشریف لائے اور چونکہ مستعفی ہو چکے تھے اس لئے درس شروع نہیں فرمایا۔ دارالعلوم میں صدر المدرسین کی شخصیت کو چونکہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی علیحدگی سے طلبہ کا متاثر ہونا لازمی تھا، چنانچہ ۲۳ ربیع الاول کو حضرت شاہ صاحبؒ کی واپسی کے

اساتذہ و طلبہ کی دو جماعتیں ہو گئی تھیں، ایک جماعت اہتمام کے ساتھ تھی اور اس جماعت کے طلبہ "جمعیۃ الطلبہ" کے ساتھ منسلک تھے، دوسری جماعت حضرت شاہ صاحبؒ سے وابستہ تھی۔ "انجمن اتحاد" طلبہ کی اسی مؤخر الذکر جماعت کا نام تھا، اسٹرائک اور مطالبات بھی اسی جماعت کی جانب سے تھے، اور مقدم الذکر جماعت نے صرف یہ کیا کہ اسٹرائک میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ اس نے پوری شدت کے ساتھ "انجمن اتحاد" کا مقابلہ بھی کیا، چونکہ سال کا یہ آخری مہینہ تھا، حالات پر قابو پانے کے لئے سالانہ امتحان کی تاریخیں کچھ مقدم کر دی گئیں، دو ثلث کے قریب طلباء شریک امتحان ہوئے اور ایک ثلث نے بدستور اپنا مقاطعہ جاری رکھا۔

دوسری اسٹرائک کے بعد سے حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے ہم خیال اساتذہ و طلباء کا رسمی تعلق دارالعلوم سے بالکل منقطع ہو گیا، نیز ان تمام طلباء کو دارالعلوم سے خارج کر دیا گیا جو "انجمن اتحاد" سے دلچسپی رکھتے تھے۔

۱۳۴۸ھ حیدرآباد کا تحقیقاتی وفد

گزشتہ دو تین سال سے اخبارات میں دارالعلوم کے نظم و نسق اور حسابات کی نسبت جس بے اطمینانی کا اظہار کیا جا رہا تھا اس سے متاثر ہو کر متعدد مقامات سے مختلف حضرات وقتاً فوقتاً دارالعلوم میں تشریف لائے، حالات کا جائزہ لیا اور حسابات کی جانچ پڑتال کی، اس سلسلے میں نظام دکن نے حیدرآباد کے محکمۂ تعلیمات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر سید محی الدین صاحب کو دارالعلوم کے حسابات کی جانچ و تنقیح کے لئے مامور فرمایا، سید صاحب اوائل محرم میں دیوبند تشریف لائے، محکمۂ تعلیمات کے دو اسسٹنٹ ساتھ تھے، کئی روز قیام فرما کر حسابات کی جانچ کی، اساتذہ کے طرز تعلیم اور طریقۂ درس کو دیکھا اور مختلف شعبوں کے کاموں کی تحقیق کی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم نے سید صاحب کے سامنے

اس موقع پر جو تقریر پیش کی اس میں نظام کی توجہ فرمائی کا خیر مقدم کرتے ہوئے دارالعلوم کے طریق کار پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی تھی

"دارالعلوم کے موجودہ معاملات چار حصوں پر منقسم ہو گئے ہیں، حصہ اول، حسابات دارالعلوم، حصہ دوم، انتظامات دارالعلوم، حصہ سوم، تعلیمات دارالعلوم، حصہ چہارم اخلاقیات دارالعلوم۔ حسابات دارالعلوم کے متعلق میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ان میں کوئی خیانت ثابت ہو سکے تو با استثنیٰ موجودہ مہتمم کا علیحدہ کیا جانا ضروری ہے، انتظامات دارالعلوم کے متعلق ہمیشہ یہ اصول مد نظر رکھا گیا ہے کہ عمل میں سہولت رہے، دارالعلوم کو کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے کہ اس کے انتظامات نقائص سے مبرا و پاک ہیں ایسا کوئی بھی نہیں کہہ سکتا، خدام دارالعلوم ہمیشہ اصلاح نقائص کے متلاشی رہا کرتے ہیں اور معقول مشورہ و اصلاح سے انحراف نہیں کرتے۔"

دارالعلوم کے تعلیمی اور رسالہ امور کی عمدگی اور صحت وصفائی نے نظام کو بہت متاثر کیا آپ نے دارالعلوم کے متعلق جو رپورٹ پیش کی اس نے نظام کو دارالعلوم کی جانب سے بالکل مطمئن کر دیا۔

حضرت حافظ صاحب کا سانحۂ وفات

نظام دکن نے حضرت حافظ صاحب سے اسی وقت جب آپ حیدرآباد میں افتاء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے ایک مرتبہ دارالعلوم کے دیکھنے کا شوق ظاہر فرمایا تھا، اس سال کے اوائل میں جب مجلس شوریٰ منعقد کی گئی اس سے پہلے آپ حسب معمول حیدرآباد تشریف لے گئے کر نظام دکن کو وعدہ یاد دلایا اور دارالعلوم کی طرف سے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی، حضرت ممدوح نے باوجود پیرانہ سالی اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کے جماعت کی خواہش کو منظور فرمایا، دکن کے طویل طویل سفر کے عادی تھے، ہو گئے، ماہ ربیع الثانی [illegible] حیدرآباد پہنچے۔ پہنچنے پر نظام سے ٹیلیفون پر گفتگو کے بعد ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا، لیکن تقدیر الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

۱۳۴۸ھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا حادثۂ وفات

گذشتہ سال حضرت حافظ صاحبؒ کی وفات سے دارالعلوم کو جیسا جگر

پاش صدمہ پہنچا تھا ابھی وہ مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ امسال حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی وفات کا حادثہ عظیم پیش آگیا۔

۱۳۴۷ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ "یہ سال بھی دارالعلوم کی کامیابی کے لحاظ سے ایک کامیاب سال تھا، شعبوں کی ترقیات سے خود دارالعلوم کو بھی گذشتہ کی نسبت اونچی ترقی پر پہنچایا تھا، طلبہ کی تعداد، آمد و صرف کی وسعت، سامان کی افزائش، رجوع عام کی کثرت دلیو سب ہی ترقی پذیر رہے۔

لیکن ان ہی ترقیات کے دور میں قضا و قدر نے ایک ایسا الم ناک حادثہ بھی دارالعلوم کے لئے مقدر کر دیا تھا جو تاریخ دارالعلوم کے لحاظ سے ہمیشہ اس کے حوادث میں الم انگیز نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ اور گو ہم اسے دارالعلوم کے لئے تنزل سے تعبیر نہ کر سکیں لیکن جذبات کی شدت سے یہ ضرور کہیں گے کہ اس واقعے نے تمام ترقیات کو تاریک بنا دیا اور ماضی کی مسرتیں حال کے اندوہ پر غالب نہ رہ سکیں۔ یہ حادثۂ فاجعہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کی وفات حسرت آیات کا تھا، جس نے دارالعلوم علم و عمل کو ۱۳۴۷ھ کے بعد پھر ایک دفعہ مجسم غم و حسرت بنا دیا، ابھی گذشتہ سال کا سانحہ جانگداز یعنی ۱۳۴۷ھ میں حضرت صدر مہتمم صاحبؒ کی دائمی مفارقت کا داغ سینوں سے محو نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۳۴۸ھ میں اس سانحہ دوم نے زخم کو اور گہرا کر دیا۔"

۳ رجب ۱۳۴۸ھ کی تاریخ دارالعلوم کے لئے ایک قیامت خیز تاریخ تھی، جبکہ شب کو دس بجے دارالعلوم اس مبارک ہستی کے فیوض و برکات سے محروم ہو گیا تھا اور ہر شخص تصویر غم بن گیا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں جو ہستی دارالعلوم میں آئی تھی ۱۳۴۸ھ کی واپس

تاریخ جس کی پوری تکمیل ہو گئی۔ ۳، ۴ رجب کی درمیانی شب میں عشاء کے بعد ۱۳۴۸ھ تمام
میں محفوظ رکھی گئی جس جدائی کو حضرت مرحوم کی شخصیت سے ۴۰ برس تک رفتہ رہی
تھی آج کی شب وہ جدائی بصورت جنازہ سب خدام کے لئے حسرت و یاس کا باعث
بنا ہوئی تھی۔ ۴ رجب کو جمعہ تھا۔ علی الصباح تجہیز و تکفین کے فرائض عمل میں آئے
تقریباً ۹ بجے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مجمع کی
انتہا نہ تھی۔ صحن دارالعلوم ہجوم سے پُر تھا۔ طلبہ، علماء، اہل شہر غرض ٹوٹے پڑتے تھے۔ ۱۰ بجے
کے عمل میں جنازہ قاسمی قبرستان میں پہنچایا گیا اور ۱۲ بجے تک اس گنجینۂ علم و عمل اور
فہم و فراست کے خزانے کو سپرد خاک کر کے سب لوگ خالی ہاتھ واپس چلے آئے۔ انا للہ
وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کے عزم و استقلال، ہمت و جرأت، دانش و تدبر، فکر و نظر، علم و تبحر
اور ادب کے ساتھ غیر معمولی انتظامی قابلیت، غرض کہ ہر حیثیت سے آپ کی ذات ملک میں
غیر معمولی اور منفرد تسلیم کی گئی تھی۔ اب وہ تاریخ کی دستاویزی عصری شہود زمانہ تھی۔ تاریخی حیثیت
سے آپ کی معرکۃ الآراء اور مقبول زمانہ تصنیف "اشاعت اسلام" ایک زبردست شاہکار
اور ایک عظیم یادگار ہے۔ نیز متعدد عربی تصانیف مثلاً لامیۃ المعجزات اور قصیدہ مناجاتیہ
وغیرہ عربی قصائد حضرت مرحوم کی ادبیت کے شاہد عدل ہیں۔

اہتمام کے لئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا انتخاب

اور ۱۳۴۸ھ میں مجلس شوریٰ کے رکن مولانا سعید الدین صاحب رام پوری نے مجلس میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ حضرت مہتمم
صاحب اپنی کبر سنی کے سبب سے ضعیف ہو گئے ہیں۔ ہر چند ان حضرت نے اب تک
خدمات دارالعلوم میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، تاہم مجلس شوریٰ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس
امر کا احساس کر کے جلد ایسے وسائل اختیار کرے جس سے ان حضرت کو فی الجملہ اپنے

رکھتے ہیں کہ اس تھوڑی سی مدت میں ان خوبیوں کا مہتمم صاحب سے ظہور
ہو رہا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس سے اضعافاً مضاعفہ ظاہر ہونگے، وما
ذٰلک علی اللہ بعزیز۔ یہ الفاظ بے ساختہ قلب سے نکلے ہیں اس میں
تصنع کو دخل نہیں ہے۔ مہتمم صاحب کی خدمات کی داد دیجئے۔

مسجد میں اضافہ اور دارالحدیث کی تکمیل

طلباء کی روز افزوں کثرت کے سبب سے مسجد دارالعلوم تنگ ہو گئی تھی، بالخصوص دوچار ماہ بارش میں سخت تکلیف پیش آتی تھی اس لئے حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے سب سے پہلے جو ابتدائی تجویز اپنے قلم سے لکھی وہ مسجد کی بالائی منزل کی تعمیر سے متعلق تھی، نیز صحن مسجد کو بھی مشرق کی جانب بڑھایا گیا، اور وضو جو پہلے صحن کے اندر تھا توسیع کے بعد تقریباً وسط میں ہو گیا، اس تعمیر کے تمام مصارف سید زین العابدین صاحب حیدرآبادی نے ادا فرمائے۔ دارالحدیث کی پرشکوہ عمارت جو عرصے سے زیر تعمیر تھی بجمادی سنہ ۱۳۶۳ھ[1] میں بہر وجوہ مکمل ہو گئی۔

۱۳۶۵ھ: دورۂ تفسیر کا اجراء

دارالعلوم میں عرصے سے یہ تجویز زیر غور تھی کہ جس طرح حدیث کی اعلیٰ تعلیم دورۂ حدیث کے ذریعے دی جاتی ہے، اسی طرح تفسیر میں بصیرت پیدا کرانے کے لئے نصاب تعلیم میں دورۂ تفسیر کا اجراء کیا جانا ضروری ہے۔ اب تک علم تفسیر میں جلالین اور تفسیر بیضاوی کی صرف سورۂ بقرہ داخل نصاب تھی۔ ان کتابوں کی تعلیم سے قرآن فہمی میں اس قدر مناسبت اور استعداد تو ضرور پیدا ہو جاتی تھی کہ طالب علم فراغت تحصیل کے بعد ذاتی مطالعے سے مزید بصیرت حاصل کر سکتا تھا، مگر ضرورت کے وقت آیات قرآنیہ سے فی الجملہ استفادہ بھی

---

[1] روداد ۱۳۶۳ھ ص ۵۔

کر سکتے تھے مگر چونکہ سب لوگوں کو بالعموم ایسے حالات میسر نہیں آتے کہ وہ منتہائے تحصیل علم کے بعد علوم سے مزاولت جاری رکھ کر اپنے علم و معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ زمانۂ تعلیم ہی میں تفسیر کے متعلق ضروری معلومات کا ذخیرہ طالب علم کیلئے مہیا کر دیا جائے تاکہ بعد میں اگر مطالعۂ کتب کا موقع میسر نہ آئے تو محفوظ شدہ معلومات سے اس کی کچھ تلافی ہو سکے۔

ہندوستان کے اسلامی مدارس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے پہلے علم حدیث کی بھی یہی حالت تھی مشکوٰۃ مصابیح یا مشارق الانوار کا پڑھ لینا اس علم میں کافی سمجھا جاتا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس قدیم روش میں تبدیلی کر کے حدیث کی تعلیم کے معیار کو بلند کیا۔ شاہ صاحبؒ کے اس معیار کی دارالعلوم نے کما حقہ اشاعت کی اس لئے یہاں دورۂ حدیث کو تعلیم حدیث کے لئے ہمیشہ سے ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔

دورۂ تفسیر کے اجراء کے ساتھ مزید دو کتابیں داخل نصاب کی گئیں، ایک تفسیر بیضاوی (مکمل) اور دوسری تفسیر ابن کثیر، یہ دونوں کتابیں فہم قرآن کے لئے علم تفسیر میں نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں، دورۂ تفسیر سے پہلے جلالین اور اصول تفسیر میں الفوز الکبیر پڑھائی جاتی ہے، دورۂ تفسیر کے اجراء سے دارالعلوم میں علم حدیث کی طرح علم تفسیر کا معیار بھی بہت بلند ہو گیا ہے۔

تجوید کا لزوم

تجوید کی تعلیم تو شروع سے ہو رہی تھی مگر اب تک اس کی مشق تمام طلبہ کے لئے ضروری نہیں تھی، امسال سے تجوید کی مشق لازمی کر دی گئی، اور یہ ضابطہ بنا دیا گیا کہ جب تک طالب علم کم از کم پارۂ عم کی مشق نہ کرے اسے سند فراغت نہ دی جائے۔

۱۳۵۲ھ تعمیر دارالحدیث فوقانی

امسال جدید دارالحدیث کا سنگ بنیاد رکھا

تھا تو تجویز یہ تھی کہ دار الحدیث کی عمارت "نودرہ" کے اوپر تعمیر کی جائے، چنانچہ ۱۳۲۸ھ
میں اس کا سنگ بنیاد بھی رکھا گیا لیکن اس کے بعد دوسری تجاویز کے مطابق ۱۳۵۵ھ
میں دار الحدیث کی تعمیر کا آغاز بجائے نودرہ کے جانب مغرب سے کیا گیا اور چند
سالوں میں اہل خیر مسلمانوں کی توجہ اور مدد سے یہ عظیم الشان عمارت عالم
وجود میں آ گئی جس میں ایک وسیع ہال کے علاوہ متعدد حجرے کمرے بنے ہوئے
ہیں، اپنی نوعیت کی ہندوستان کے اسلامی مدارس میں یہ پہلی عمارت ہے مگر آغاز
تعمیر سے ٹھیک بیس سال بعد دار العلوم کی روز افزوں ترقی کے باعث ضرورت محسوس
ہوئی کہ ۱۳۷۵ھ کے مجوزہ نقشے کے مطابق ایک اور ہال دار الحدیث کے لئے "نودرہ"
پر تعمیر کیا جائے، چنانچہ ۱۳۸۵ھ میں اس کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا، اور چند سالوں میں بحمداللہ
یہ عظیم الشان ہال تعمیر ہو گیا۔

قواعد داخلہ میں اصلاح

طلبہ کے داخلے کا اب تک جو طریقہ رائج تھا، وہ
نہایت دقت طلب تھا، طلبہ درخواست کے
ذریعے داخلہ کراتے تھے، جس میں عدم نظم و ضبط کے سبب سے تقدیم و تاخیر طلبہ کے لئے
بڑی تکلیف اور پریشانی کی موجب ہوتی تھی، اس کو دور کرنے کے لئے اس سال داخلہ
کے فارم طبع کرائے گئے، اور قدیم و جدید طلبہ کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں، ان فارم کے
ذریعے سے ایسا نظام قائم کیا گیا ہے کہ بغیر کسی الجھن کے داخلہ فارم تمام متعلقہ شعبہ جات
سے گذر جاتے اور داخلے کی جملہ ضروریات، اسباق متعلقہ، تعیین درجات، تقسیم کتب
اجراء امداد و امداد رہائش کا انتظام بروقت ہو جاتا ہے۔

کھانے کے ٹکٹ

قواعد داخلہ کی طرح تقسیم طعام میں بھی اسی سال سے اصلاح
عمل میں لائی گئی، اب تک یہ طریقہ رائج تھا کہ طلبہ مقررہ
وقت پر مطبخ میں پہنچ جاتے تھے اور ہر ایک شخص اپنا اپنا کھانا لے آتے تھے، اس میں

انتظام کے علاوہ ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ یہ پتہ چلنا دشوار ہوتا تھا کہ کس طالب علم نے
کھانا نہیں لیا یا کسی نے دو مرتبہ تو نہیں لے لیا، یہ بات محض مقسم طعام کی قوتِ یادداشت
پر منحصر تھی۔ اس طریقے کو منسوخ کرانے کے لئے اہتمام کے مطبوعہ ٹکٹ بنوائے گئے
یہ ٹکٹ صبح و شام کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں، ٹکٹوں پر صبح یا شام کے الفاظ کی صراحت کے
علاوہ اختلافِ رنگ کے ذریعہ بھی ان کو ممتاز کر دیا گیا ہے، ٹکٹوں پر نمبر کندہ ہیں اور
ہر نمبر کے دو ٹکٹ ہوتے ہیں، مطبخ کے رجسٹر میں طلباء کے نام درج ہوتے ہیں اور جس نمبر
میں جس نمبر پر نام لکھا ہوتا ہے وہی نمبر اس طالب علم کے ٹکٹ کا ہوتا ہے، ٹکٹ داخل
کرنے پر اگلے وقت کے لئے اسی نمبر کا دوسرا ٹکٹ دے دیا جاتا ہے، مقسم ٹکٹ
ٹکٹ کو دیکھ کر کھانا حوالے کر دیتا ہے، اس طریقے سے جہاں طلباء کے لئے راحت و
سہولت پیدا ہو گئی ہے وہاں تقسیم میں بھی ضبط و نظم قائم ہو جانے کے سبب سے دوبارہ
کھانا لے سکنے کا اندیشہ باقی نہیں رہا، اس کے علاوہ تقسیمِ طعام میں اگر کوئی طالب علم
غیر حاضر ہو تو بسہولت اس کا پتہ چل جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ایک
ہزار طلباء کو گھنٹہ بھر میں بآسانی کھانا تقسیم ہو جاتا ہے۔

سنہ ۱۳۵۳ھ ایک مبارک چندہ

شوال سنہ ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے
گئے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ نذر احمد صاحب نے جو شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ
صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے خلیفہ تھے، چند ہزار روپیہ دارالعلوم کے لئے عطا فرمائے۔
اس گرانقدر رقم کو دارالعلوم کے لئے ایک صاحبِ نسبت بزرگ کا متبرک عطیہ ہونے
کے علاوہ سرزمینِ بیت اللہ کی موہبتِ عظمیٰ سے اگر تعبیر کیا جائے تو نامناسب
نہ ہوگا۔ حرمِ بیت اللہ سے کسی جدید ترقی اور ادارے کی امداد کا غالباً یہ پہلا
موقع ہے۔

پنشن کا اجراء

دارالعلوم میں سرانجامیٔ خدمت کی بجا آوری کی تحدید نہیں ہے، جب تک کوئی کارکن باعتبار صحت قویٰ مستعد فرائض کو انجام دے سکتا ہے اس کے علم کی پختگی اور کارکردگی کے تجربے سے محروم ہونے کو پسند نہیں کیا جاتا، لیکن جب قویٰ کام کرنے سے جواب دے دیں اور سبکدوشی ناگزیر سمجھی جائے تو دیرینہ خدمت گذار کی خدمات کا ذہنی تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ مروت و اخلاق اور دستگیری کا معاملہ برتا جائے، جب تک اس کے لئے کوئی [illegible] [illegible] تھا، مولانا محمد یٰسین صاحب، مفتی منظور احمد صاحب کو جو تقریباً ۴۰ سال سے درجۂ فارسی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے سبکدوش کیا گیا تو مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ ان حضرات کی طویل خدمت کے پیشِ نظر ان کو پنشن دی جائے۔

۱۳۵۴ھ، صدارت اہتمام

گذشتہ سال حضرت مہتمم صاحب کے زمانۂ سفر حج میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی عارضی طور پر قائم مقام مہتمم مقرر کئے گئے تھے، ۱۳۵۴ھ میں مجلس شوریٰ نے مولانا کو ان کی عظیم شخصیت اور علم و فضل کے پیشِ نظر صدارت اہتمام کے لئے منتخب کیا، اس زمانے میں مولانا کا مستقل قیام گجرات کے مشہور مدرسہ ڈابھیل میں تھا، مولانا عثمانی وہاں سے بالکلیہ قطع تعلق کے لئے آمادہ نہ تھے، چنانچہ تقریباً کچھ مدت تک یہ صورت رہی کہ کچھ عرصہ ڈابھیل میں قیام فرماتے تھے اور کچھ عرصہ دیوبند میں، مگر بالآخر دارالعلوم کی مرکزیت نے ان کو یہاں کھینچ لیا۔

سرپرستی کا مسئلہ

اس سال کے اہم واقعات میں ایک واقعہ سرپرستی کا مسئلہ ہے، دستورِ قدیم سے دارالعلوم کی سرپرستی کی یہ شکل تھی کہ جماعت میں جو شخصیت اپنے علم و فضل، دینداری و تقویٰ، زہد و ورع اور صاحب رائے ہونے کے لحاظ سے برتر ہوتی تھی، اس کو دارالعلوم کے تمام امور کا مرجع الامر تصور کر کے

مجلس شوریٰ اپنی تجاویز کے فیصلوں میں سرپرست سے رجوع کرتی تھی البتہ اس کیلئے
کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ دارالعلوم میں شوریٰ و ضوابط کی ضابطہ بندی ہونے
کے بجائے درحقیقت سرپرست و علمائے دیوبند کے اخلاق و خلوص و للہیت پر زیادہ تر کاموں کی سرانجام دہی
کا مدار سمجھا جاتا تھا۔ سرپرست کے اختیارات کا ماحاصل یہ تھا کہ ممبران میں اختلاف رائے
کی صورت میں سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا، اس میں خواہ سرپرست
کی رائے قلت ہی کی جانب کیوں نہ ہو، البتہ اگر ممبران متفقہ طور پر کسی چیز کو پاس
کرتے اور سرپرست کو اس سے اختلاف ہوتا تو وہ وجوہ اختلاف کو مدلل تحریر کر کے
مجلس میں دوبارہ غور و خوض کے لئے بھیج دیتے تھے، اس صورت میں اگر مجلس اپنی سابقہ
رائے سے رجوع نہ کرتی تو حسب مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی تھی اور بغیر استرضائے
سرپرست اس کا نفاذ ہو جاتا تھا۔

[illegible] میں جب انتظامی امور کے لئے قوانین مدون ہوئے تو مندرجہ بالا
طریق عمل کو باضابطہ بنا دیا گیا۔ مگر [illegible] میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بارے
میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا، ایک جماعت کی رائے تو اسی
طریق عمل کی حامی تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے بسی اور
عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر رکھنا چاہتی تھی، چنانچہ
مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
جو [illegible] سے دارالعلوم کے سرپرست تھے از خود معذرت کر کے سرپرستی سے مستعفی ہو گئے۔

رجب [illegible] میں مجلس شوریٰ نے حسب ذیل الفاظ میں یہ استعفیٰ منظور کر لیا۔

> مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس پورے غور و فکر اور احترام و تقدیس اور
> خلوص کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے استعفا کو
> نہایت افسوس کے ساتھ منظور کرتا ہے، اور حضرت ممدوح سے درخواست

کرتا کہ اپنی دعوتِ صالحہ اور توجہاتِ عالیہ سے دارالعلوم پر ہمیشہ ظلّ گستر رہیں گے[1]۔

۱۳۵۵ھ: تین شعبوں کا قیام

دارالعلوم کے فضلاء اور بہی خواہان کی تنظیم، آمدنی کی توفیر، کاغذات و اسناد کے تحفظ، طلباء کی جسمانی ورزش کے سلسلے میں حسبِ ذیل تین شعبے قائم کیے گئے۔

شعبۂ تنظیم و ترقی

اس شعبہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ لٹریچر اور عملی کارروائی کے ذریعے ملک میں دارالعلوم کے فضلاء اور بہی خواہوں کے نام سے ایک ایسی جماعت قائم کی جائے جو دارالعلوم کے اثرات کو ہمہ گیر بنانے والی ہو اور جس کا ہر فرد خود بھی کم از کم ایک روپیہ سالانہ چندہ گذار ہو۔ اس سلسلے میں توفیرِ آمدنی کے لیے حسبِ ضرورت سفیر رکھے جاتے ہیں، جن پر ملک کے مختلف حصوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے، یہ سفراء اپنے اپنے علاقوں میں کام کرتے ہیں، شعبۂ تنظیم و ترقی کی کارگذاری کی تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کی جائے گی۔

محافظ خانہ

اب تک دارالعلوم کے شعبہ جات و دفاتر کے کاغذات و اسناد، رجسٹر وغیرہ دفاتر ہی میں رکھے جاتے تھے، ان کی کوئی باقاعدہ ترتیب و تہذیب اور مرتب یادداشت نہ تھی، جس کے سبب سے اکثر و بیشتر بروقت ضرورت مطلوبہ کاغذات کی دستیابی میں سخت مشکلات پیش آتی تھیں، دارالعلوم کی طویل عمر اور وسیع کاروبار نے ان مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، کاغذات مختلف شعبہ جات میں منتشر رہتے تھے، نیز اکثر کاغذات میں دفتری طوالتِ کار کے لحاظ سے منتظم بھی باقی رہ جاتا تھا جو آئندہ کے لیے صورتِ مسائل بن جاتا تھا، اس کوتاہی اور دقت کو رفع کرنے کے لیے محافظ خانہ کے نام سے ایک شعبہ کا قیام عمل میں آیا

---

[1] روداد مجلس شوریٰ ۳۰ رجب ۱۳۵۵ھ۔

گئی، اور جملہ شعبوں کے تمام سابقہ ریکارڈ کاغذات اور دستاویزات کو محافظ خانہ میں منتقل کر کے ترتیب و انضباط کے ساتھ رکھا گیا تاکہ بوقت ضرورت کاغذات بسہولت حاصل ہو سکیں، اور ہر کاغذ کی دفتری ضابطے کے مطابق بروقت تکمیل ہوتی ہے، اس وقت محافظ خانہ میں دارالعلوم کا ایک سو سال کا تاریخی سرمایہ محفوظ ہے۔

شعبۂ ورزش

بقائے صحت کے لیے تفریح اور ورزش جس قدر ضروری ہے، اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے، بالخصوص طلباء کے لئے جو دن رات دماغی محنت میں منہمک رہتے ہیں اس کا ہونا بہت ضروری ہے ہر چند طلباء اب تک بطور خود فرصت کے اوقات میں مختلف کھیل کھیلتے رہتے تھے مگر اس کا کوئی منظم انتظام نہ تھا، اس اہم ضرورت کے پیش نظر باقاعدہ اس کا انتظام کیا گیا اور ایک شعبہ ورزش جسمانی کے نام سے کھول دیا گیا تاکہ دماغی محنت کے ساتھ جسمانی ورزش کے ذریعہ اعضائے بدن کی نشو و نما اور طاقت و توانائی کے حصول پر خاطر خواہ توجہ دی جاسکے، نیز ایسے نتائج کا شروع ہی سے انسداد کر دیا جائے جو طلباء کو لہو و لعب کی طرف لے جانے والے ہیں، اس شعبہ میں مختلف جسمانی ورزشوں کے علاوہ لاٹھی، گتکا اور بنوٹ وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

علمائے مصر کا وفد

۱۳۸۰ھ میں جامعہ ازہر کے علماء کا ایک مختصر وفد جو مصر کے مشہور اساتذہ پر مشتمل تھا ہندوستان آیا ہوا تھا، دارالعلوم کی دعوت پر ۲ ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ کی شام کو وفد کے اراکین دارالعلوم میں تشریف لائے۔

اگلے روز وفد نے دارالعلوم کا جائزہ لیا، اساتذہ کی محنت و توجہ کو اور کثرت اسباق اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم و تدریس کی جامعیت کو دیکھ کر وفد کو حیرت ہوگئی تھی چنانچہ امیر وفد شیخ ابراہیم الیبالی نے متعدد بار اپنے تعجب کا اظہار کیا، کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ایک ہی استاد ۵۔۶ گھنٹے کس طرح مختلف علوم کی متعدد بلند پایہ کتابیں پڑھا

سکتا ہے اور مختلف علوم میں کیونکر مہارت پیدا کر سکتا ہے

معائنے کے بعد خیمہ منعقدہ کے جلسے میں سپاس نامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں اسپیکر موصوف نے دارالعلوم کا شکریہ اور اس کی علمی خدمات کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے دارالعلوم اور جامعہ ازہر کے درمیان ارتباط باہمی کے رشتے کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کئے جانے کی خواہش کا پر زور الفاظ میں اظہار فرمایا۔

سنہ ۱۳۵۲ھ: چند جدید عمارتیں

سال زیر بحث کی تاریخ میں دارالعلوم کے معمولی واقعات و سوانح کے علاوہ سات مستقل عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں پہلی عمارت درجہ فارسی کی وہ درسگاہ ہے جو اس درجے کی قدیم درسگاہ کے قریب شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی یادگار کے طور پر "یادگار سعدی" کے نام سے موسوم ہے۔ "یادگار سعدی" حیدرآباد دکن کے سرور خاں صاحب گنڈاپور کے عطیے سے تعمیر ہوئی ہے۔ دوسری محافظ خانے کی وہ دو منزلہ عمارت ہے جو دارالاہتمام کی جنوبی سمت میں واقع ہے۔

تیسرا سلسلہ جدید دار الطلباء کی تکمیل سے متعلق ہے جس کی تفصیل جو حضرت مہتمم صاحب کی یادداشت سے ماخوذ ہے، یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمہما اللہ کے دور میں دار الطلبہ جدید کے صرف پانچ کمرے شمالی مغربی سمت میں تعمیر ہو سکے تھے بلکہ اس عظیم دار الاقامہ میں ۱۰۰ کمرے تجویز شدہ تھے۔ دارالعلوم کے معمولی چندوں سے یہ عظیم عمارت خدا جانے کتنے طویل عرصہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچتی۔ اس لئے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حیدرآباد دکن کا سفر اختیار فرمایا۔ تاکہ ریاست دکن سے کوئی یکمشت بڑی امداد حاصل کی جا سکے۔ یہ سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ کا زمانہ تھا حضرت ممدوح نے بتوسط نواب عبدالباسط خان صاحب [illegible] صدر اعظم موصوف سے ملاقات کا وقت لیا ملاقات کے دوران مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے

فرمایا کہ دار جدید کے، ہر کسی جیسے مطلب پڑے ہوئے ایسے شاہی قسم کا کام ہے
وہ بڑے فیاض اور فن پسند شاہیت ہی سے پیدا کر سکتی ہے جو بلاشبہ آپ کے اندر
موجود ہے۔ سلطنت آصفیہ دکن جس کے آپ اس وقت عملی سربراہ ہیں اگر آپ
نے اس میں فیاضی سے کام لیا تو آپ کا دور یادگار دور رہے گا اور علمی حلقوں میں ہمیشہ آپ کا
نام احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ سر اکبر حیدری نے اس تقریر سے متاثر ہو کر فرمایا کہ میں
اعلیٰ حضرت سے سفارش کروں گا، تدبیر یہ ہے کہ سرکار عالی کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے
ان کے ایصال ثواب کے نام سے آپ ایک معروضہ سرکار عالی کی خدمت میں پیش فرما دیں
جس میں عام تعلیمی اداروں کے ضمن میں دارالعلوم کا ذکر بھی فرما دیجئے۔ جتنی رقم کی منظوری
مرحمت فرمائیں گے اس میں نصف دارالعلوم کی ہوگی اور نصف ہم یہاں کے تعلیمی اداروں
کے لئے رکھ لیں گے، چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے اس عرضداشت کا مسودہ سرکار عالی کو پیش کرنے
کے لئے سر اکبر حیدری کے پاس بھجوا دیا جس پر انہوں نے ایک لاکھ روپیہ کی سفارش
لکھی۔ یہ مسودہ اسی دن سرکار عالی کے سامنے پیش ہو گیا انہوں نے نہ صرف اسے منظور ہی
فرمایا بلکہ ایک کے بجائے دو لاکھ کی منظوری دیدی جو حضرت مہتمم صاحب کے لئے
غیر معمولی خوشی کا سبب ہوئی اور وہ تخمیناً پچاس ساٹھ ہزار کا اندازہ لگائے گئے تھے اس
زمانے میں ایک لاکھ کا تخمینہ تقریباً ایک ہزار ہوتا تھا علامہ حکیم مقصود علی خاں صاحب حیدرآبادی
رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم نے فوری مبارک باد دی اور فرمایا کہ اس ملک کا یہ پہلا واقعہ ہے
کہ بغیر دفتری چکروں کے چند روز میں کسی معروضہ کی منظوری ہوئی اور وہ بھی طلب سے زیادہ دوگنی رقم
کی مل گئی۔ سر اکبر حیدری نے اس رقم کے لئے ایک کمیٹی بنا دی اور اس پر پہلے ہی سے
اپنی طرف سے یہ بھی لکھ دیا کہ اس رقم کو بینک میں جمع کر کے اس کے منافع سے طلباء دکن
کے وظیفے جاری کئے جائیں۔ حضرت مہتمم صاحب نے کمال جرأت سے سر اکبر حیدری سے
پھر ملاقات کا وقت لیا، صاف گوئی کے ساتھ ناگواری کے لہجے میں اس اندراج پر ناخوشی کا

ان کے سامنے جا کر ان کا سفر نامہ انداز سے اٹھ کر چلے آئے جس پر سوائے حسرت ندامت کے اور کچھ نہ کہہ سکے۔

یہ افسوس ہے کہ حضرت ممدوح واپس دیوبند لوٹ آئے۔ اور اسی مقصد کے لئے اسی دوران مدراس کا سفر کیا جہاں حاجی ۔۔۔ صاحب مرحوم کے یہاں قیام ہوا جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ سے بیعت تھے حضرت ممدوح نے فنڈ کی اپیل کا ارادہ ظاہر کیا تو سنا کر فرمایا کہ اب میں کس طرح اس ظلم و الم کی تلافی آپ حضرات کو کرنی ہے، جس پر مرحوم حاجی صاحب بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ آپ صرف ایک مہینہ یہیں ٹھہر کر وعظ فرمائیں کام ہم کریں گے آپ کو کہیں آنا جانا نہیں پڑے گا اس طرح اس رمضان کے ایک ہی عشرہ میں ۴۰ ہزار روپے جمع کر کے انہوں نے ممدوح کی خدمت میں پیش کر دیا اور کہا کہ اگر آپ بقیہ حصہ رمضان بھی یہیں دے دیں تو یہ رقم ایک لاکھ تک پہنچ سکتی ہے مگر حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جس ضرورت کی تکمیل کے لئے آیا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی ہے تو اس کی ابھی ضرورت نہیں، چنانچہ اس رقم سے دار جدید کے تمام کمرے سوائے صدر دروازہ کے (جو باب الظاہر کے نام سے موسوم ہے) مکمل ہو گئے۔[1]

۱۳۵۷ھ حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر رسل و رسائل کا ورود

دارالعلوم کو ریلوے اسٹیشن سے ملانے کے لئے عرصہ سے ایک مستقل سڑک کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ۱۹۳۷ء میں جبکہ ہندوستان کے سات صوبوں میں قومی حکومت قائم ہو گئی تھی یو پی کی صوبائی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی گئی۔ اس سلسلے میں وزیر رسل و رسائل حافظ محمد ابراہیم صاحب کو دعوت دی گئی تاکہ وہ بچشم خود دارالعلوم کی اس اہم ضرورت کا معائنہ فرمائیں۔

---

[1] ماخوذ: یادداشت حضرت مہتمم صاحب مدظلہ۔

چنانچہ ۲۱ مئی [illegible] کو موصوف دیوبند تشریف لائے۔ اسٹیشن پر اکابر دارالعلوم اور طلبا کے علاوہ عمائدینِ شہر و ضلع سہارنپور، حکام ضلع، ممبران میونسپل بورڈ معزز مہمان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ حافظ صاحب کا شاندار جلوس اسٹیشن سے روانہ ہو کر شہر کے آراستہ بازاروں سے گذرتا ہوا ۹ بجے دارالعلوم میں پہنچا۔

دارالعلوم کی تاریخ میں ارکانِ دارالعلوم کے لئے ایسے مسرت انگیز شاندار استقبال کا یہ پہلا موقع تھا، یہاں یہ بتلانا ضروری نہیں کہ یہ جوش و خروش اور مسرت دارالعلوم کی دیرینہ حریتِ ملی کا ثمرہ تھی، اس کی مسرت یہ تھی کہ حکومت کے وزیر ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا دارالعلوم نے عرصہ ہوا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کا سماں دارالعلوم کی آنکھوں کے سامنے تھا اس سے جس قدر بھی جوش و مسرت کا اظہار ہوتا وہ کم تھا۔ خیر مقدم کے جلسے میں سپاسنامہ اور جذباتِ تشکر سے لبریز قصائد پڑھے گئے، اکابر دارالعلوم نے معزز مہمان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ سپاسنامہ میں تحریک حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے نام سے ایک سڑک تعمیر کئے جانے پر توجہ دلائی گئی تھی، جو اسٹیشن دیوبند سے سیدھی دارالعلوم تک پہونچتی ہے۔ آخر میں حافظ صاحب نے جوابی تقریر فرمائی جس کے ایک ایک لفظ سے دلی اخلاص و عقیدت اور محبت مترشح ہوتی تھی، موصوف نے فرمایا کہ:-

"میں جب سے وزارت پر مامور ہوا ہوں بہت سے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا، اور بہت سی بستیوں میں سپاسنامے بھی پیش کئے گئے، ان میں اگر کوئی سپاسنامہ میرے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ آج کا سپاسنامہ ہے جو دارالعلوم میں دیا گیا، یہ سپاسنامہ ایک طویل مدت یادگار رہے گا جس کا بھولنا مشکل ہے، میرے پاس

سوا نہیں جس سے میں عزت افزائی کے احساس کو بیان کر سکوں۔ علمائے کرام کی بدولت ہندوستان میں اسلام کا نام باقی ہے۔ صحیح تعلیم باقی ہے۔ وہ جماعت جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو الحاد و دہریت کے حملوں سے بچایا۔ مسلمانوں میں ان ہی علماء کی بدولت برطانیہ کی حکومت پر اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ ایسے علماء کی جماعت کسی کو کسی طرف سے عزت دے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی نہیں ہو سکتی۔ یہ آپ کی عزت افزائی ایسی چیز ہے جو میرے نزدیک اس پر ایک وزارت کیا ممبریاں اور وزارتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ میں باوجود اس صوبہ کا وزیر ہو جانے کے اب باوجود آپ کے اس احترام کے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو طالب علم آپ کے مدرسے میں چھوٹے سے چھوٹا ہے میں اس سے بھی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہوں اور اس کی خدمت کرنا میری سعادت ہے۔ مجھ سے جو کچھ بھی اس ادارہ کے لئے ہو سکتا ہے چاہے میں گورنمنٹ میں ہوں یا نہ ہوں اس کے انجام دینے کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں۔

سڑک کے متعلق سپاس نامے میں ذکر کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ایسی خدمت نہیں جس کے انجام دینے کو کوئی خدمت سمجھا جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ سڑک بنائی جائے۔ موجودہ حکومت نے حدود کے اندر رہ کر جو خدمت انجام دے سکتی ہے اس کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ یہاں کے مدرسین اور طلباء کی خدمت کے لئے میں موجودہ حکومت کی طرف سے یقین دلاتا ہوں۔

۱۳۵۸ھ مولانا سندھیؒ کی واپسی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو حضرت

شیخ الہند حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک انقلاب آزادیٔ ہند کے سرگرم رکن اور حضرت شیخ الہند
کے شاگرد رشید اور دست راست تھے ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے
تحریک کے سلسلے میں افغانستان چلے گئے تھے، برطانوی حکومت کو جب ان کے
مقصد سفر کا پتہ چلا تو حکومت نے جلا وطنی کا حکم جاری کر دیا، سات سال کابل میں مقیم رہ کر
مولانا ماسکو چلے گئے وہاں سے ترکی تشریف لے گئے ۱۳۴۴ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے جہاں ۱۳۵۸ھ
تک قیام رہا غرض کہ ۲۵ برس کی ہندوستان سے طویل مفارقت کے بعد
۱۹۳۸ء میں یو پی کی پہلی کانگریس حکومت نے ان پر لگی ہوئی پابندی واپس لے لی
پابندی کے ختم ہونے کے بعد اچانک ۸ر صفر ۱۳۵۸ھ کو بغیر اطلاع کے مولانا سندھیؒ دیوبند
تشریف لائے، مولاناؒ نے سب سے پہلے مسجد دارالعلوم میں پہنچ کر دوگانہ ادا کیا
اطلاع ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم ان سے
ملنے کے لیے مسجد میں پہنچے حضرت مہتمم صاحب کا سامنا ہوا تو لپک کر آگے بڑھے اور حضرت
مہتمم صاحب کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر جھک گئے اور رونے لگے، آمد کی خبر پہنچتے ہی
دارالعلوم میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی، اساتذہ و طلبہ اور متعلقین مسجد میں جمع ہو گئے،
طلبہ دارالعلوم کی جانب سے ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی
تحریک کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور اپنی طویل سیاحت کے تجربات بیان
فرمائے۔

سلطان ابن سعود کا علمی ہدیہ

اسی سال میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے

زمانۂ حج میں مرحوم سلطان ابن سعود نے حضرت ممدوح سے ملاقات فرما کر خلعتِ شاہی
سے نوازا، اور کتب خانہ دارالعلوم کے لیے حکومت حجاز کی جانب سے طبع شدہ کتابیں
عنایت فرمائیں سلطان کا یہ علمی ہدیہ کتب خانے میں عطیۂ سعودیہ کے عنوان سے

ایک ممتاز جگہ رکھتا ہے۔

حضرت مہتمم صاحب کا سفر افغانستان

ہندوستان اور افغانستان کا تعلق تاریخی حیثیت رکھتا ہے، دارالعلوم میں شروع ہی سے افغانستانی طلبہ زیر تعلیم رہے ہیں چنانچہ [illegible] میں دارالعلوم کا پہلا سال ہے اس سال بھی ہندوستان کے مختلف اطراف کے طلباء کے دوش بدوش افغانی طلباء نظر آتے ہیں اسی تعلق کی وجہ سے ہمیشہ دارالعلوم میں افغانستان کے ساتھ ہمدردی اور وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے، نادر شاہ شہید کی تخت نشینی پر جلسۂ تہنیت منعقد کیا گیا، اور ان کی شہادت کے موقع پر تعزیت کا جلسہ منعقد ہوا، اسی طرح اعلیٰحضرت ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر بھی تبریک و تہنیت کا جلسہ منعقد ہوا، اس موقع پر بیس روز کے لئے بحیثیت دارالعلوم اور افغانستان کے قدیم علمی اور تعلیمی روابط کی تجدید اور ان کو مستحکم بنانے اور تبریک و تہنیت کے پیغام کو حکومت افغانستان تک پہنچانے کے لئے مہتمم صاحب، دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے کابل تشریف لے گئے جن میں مولانا حافظ انصار محمد صاحب غازی کار رفیق سفر تھے۔ اطلاع پہلے سے ریڈیو ہی کی گئی تھی اور اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہو چکی تھی درمیانی اسٹیشنوں اور بالخصوص لاہور اسٹیشن پر ایک کثیر مجمع ملاقات کے لئے موجود تھا جس میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مفسر قرآن اور حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب سندھی بھی شامل تھے۔ ان حضرات سے رخصت ہو کر پشاور پہنچے تو مولانا غلام غوث صاحب اور کثیر التعداد فضلاء دیوبند نے خیر مقدم کیا، پشاور سے بذریعہ موٹر کار افغانی سرحد میں داخل ہوئے تو شاہی مدارات شروع ہوگئی، نہایت تعظیم و احترام سے نہایت شاندار استقبال کیا گیا، کابل پہنچنے پر اولاً وزیر امور خارجہ سردار علی محمد خان صاحب سے ملاقات ہوئی، حضرت مہتمم صاحب نے ایک طویل فارسی تقریر کے ذریعے دارالعلوم کا تعارف کرایا، اس کے بعد صدر اعظم سردار

کو پیدا کرنے میں دنیا سے اسلام کی آزاد حکومتوں کے مقصود و منشا کے ساتھ پورا پورا تعاون کر سکیں اور سلطنت کے لئے مثالی رجال کار ثابت ہوں ۔

(۳) اس سلسلے میں ضروری ہے کہ والا حضرت کی رہنمائی اور توجہات کے زیر اثر مجھے افغانستان کی جدید سیاسیات ، متوقعہ ضروریات اور مکاتیب عرفانی کے مطالعہ اور اکتساب نظر و فکر کا موقع دیا جائے تاکہ ملت افغانیہ کے عرفانی تصورات کا اصلی خاکہ میرے سامنے آجائے اور دارالعلوم دیوبند کے آئندہ پروگرام اور بالخصوص افغانی طلبہ کی تربیت میں مشعل راہ بن سکے ۔

مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایک طرف دنیا سے اسلام کی آزاد اور مستقل حکومتوں میں افغانستان ہی وہ دولت ہے جس نے اپنے پورے علاقہ اثر میں اسلامی شوکت اور اثر و نفوذ کو باقی رکھا ہے اور دوسری طرف دارالعلوم دیوبند ہی وہ اہم ادارہ ہے جس نے اسلامی روح کی حفاظت کرنے میں پوری تنظیم اور جرأت سے کام لیا ہے اس لئے ان دونوں اسلامی مرکزوں میں باہمی روابط کا استحکام جس قدر ضروری ہے اسی درجہ میں تمام عالم اسلام کے لئے بہترین منفعت اور نتیجہ خیز بھی ہے اور جس کا نفع آیا کار افغانستان کے احیاء امت اور روشن ضمیر علماء کی صورت میں بطور افغانستان ہی کی طرف لوٹ آئے گا ۔

اس جدید یادگار دورے ، تحت جہاں دارالعلوم دیوبند کے منشور کی روشنی میں ملت افغانیہ کے لئے خدمات پیش کرے گا وہیں دولت علیہ کی طرف سے اس کے مناسب شان اگر ، عموم پر اس کی خصوصی اور اخلاقی توجہات مبذول ہوں جو ان عرفانی روابط کے اظہار و بیان اور اس قسم کے روابط حسنہ کے دوامی تحفظ کا پُرستی صرف احساس ہو سکیں تو دارالعلوم نہ صرف انہیں قبول ہی کرے گا بلکہ اپنے لئے باعث فخر و اعزاز اور ان روابط کے بقاء و استحکام کے لئے ضروری اور مفید سمجھے گا ۔

حضرت مہتمم صاحب کو دورانِ قیام میں کابل کی متعدد فکری علمی اور دینی جماعتوں سے سرکاری طور پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ [illegible] کے بقول مہتمم صاحب کے افکار و نظریات سے علماء اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے نے یکساں اثر قبول کیا۔ وزارتِ تعلیم نے کابل یونیورسٹی اور کالجوں کے معائنہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ مہتمم صاحب نے یونیورسٹی کے تعلیمی نظام پر تفصیلی تبصرہ لکھ کر پیش فرمایا۔ جس میں یونیورسٹی کی ذاتی تعلیمی خوبیوں کا اعتراف و اظہار کرتے ہوئے بعض تجاویز و مشورے پیش کئے گئے تھے اس تبصرے میں بحث کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ غیر زبانوں اور علومِ جدیدہ کی تعلیم کسی ایسے مشرقی خصوصیات سے عاری کی جائے جدیدیت کے ساتھ ٹکرا جائے اور قوم میں مختلف الاخلاق طبقے پیدا ہو کر کوئی تخالف کا باعث بن جائیں۔ بلکہ دینی اور دنیوی تعلیم مشترک طریق پر ہونی چاہیئے تاکہ پیدا شدہ تفریق ختم ہو جائے۔

اس سفر کے نتائج میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ اسلامی مرکزوں میں تعلیمی وحدت و تعلق کا قیام و استحکام ہے۔ اگر اس سے دانشمندانہ طریق پر کام لیا جائے تو تعلیمی ترقی کے سلسلے میں عالمِ اسلام کے لئے مستقبل میں اہم نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ کابل سے واپسی پر صدرِ اعظم نے وداعی ملاقات کرتے ہوئے اپنی حکومت کی جانب سے دارالعلوم کے لئے پچاس ہزار روپیہ افغانی کے عطیے سے مطلع فرمایا۔ صدرِ اعظم کے خاص الفاظ یہ تھے کہ "آپ کا ارشاد مستغنی ہیں اور دارالعلوم کا مدار توکل پر ہے۔ اسے خدا کے سوا کسی کی حاجت نہیں۔ لیکن بہر حال حکومت کا فریضہ تھا کہ وہ کم از کم دارالعلوم کے معاملے میں اپنے فرض کو پہچانے۔ اعلیٰ حضرت نے جو کچھ ملک دارالعلوم کے لئے منظور فرمائی ہے وہ دارالعلوم کی شان سے کم ہے۔ مگر دنیا کے موجودہ حالات میں افغانستان کی جو مجبوریاں ہیں جو حیثیت رکھتی ہیں ان کا آپ کو بھی علم ہے۔"[1]

---

[1] اس سفر کے تفصیلی حالات کے لئے حضرت مہتمم صاحب کا سفر نامہ افغانستان ملاحظہ فرمایئے۔

شاہانہ عطیے کے وصول ہونے پر دار العلوم میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں حضرت مہتمم صاحب نے حکومت افغانستان کی مہمان نوازی، بارگاہ خسروی میں باریابی، صدر اعظم اور وزراء سے ملاقاتیں، حکومت کی بے پناہ علمی سرگرمیاں، تعلیمی متعلق اداروں، انجمن ادبی، علماء کا جذبۂ علم پروری اور مختلف علوم و السنہ کے کالجوں کے حالات اور افغان قوم کے رفیع اور مذہبی احساسات پر نہایت دلکش الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

ہندوستان کے مختلف اداروں، انجمنوں، مدارس اور معزز شخصیتوں نے بھی شاہ افغانستان کی اس علم دوستی کے شکریے اور سپاسگذاری میں پُرجوش حصہ لیا، اخبارات نے بالعموم اپنے کالموں میں اس خبر کو نہایت نمایاں طور پر شائع کیا، اور اس اضافۂ تعلق کی تجدید و استحکام پر پورے ملک میں نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا۔

دار التفسیر

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ دورۂ حدیث کی طرح ۱۳۵۳ھ سے دورۂ تفسیر بھی جاری کر دیا گیا تھا اس وقت دورۂ تفسیر کے لئے کوئی مستقل درسگاہ موجود نہ تھی، ۱۳۵۵ھ میں دار الحدیث کی بالائی منزل پر ۳۰×۳۰ فٹ مربع ہال کی درسگاہ دار التفسیر کے نام سے تعمیر کی گئی، دار التفسیر کے اوپر ایک پُرشکوہ گنبد بنایا گیا ہے جو اپنی رفعت و عظمت کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دار العلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے، دار الحدیث و تفسیر کی یہ عظیم الشان عمارت بحیثیت مجموعی بڑی با شوکت ہے جسے دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

۱۳۵۹ھ باب الظاہر کی تعمیر

اس شاہانہ عطیے کے مصرف کی نسبت مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ چونکہ دار العلوم

کی مخصوص سڑک تیار ہو گئی ہے اور دارالتفسیر کا گنبد بھی مکمل ہو چکا ہے اس کے روبرو شیخ
کے بالمقابل دارالطلبہ کے صدر دروازے کا تعین پانا ضروری ہو گیا ہے لہذا اس
موقعہ پر اسے صدر دروازہ تعمیر کرا کر اس کا نام شاہ افغانستان کے نام نامی پر باب الظاہر
رکھا جائے تاکہ دارالعلوم اور افغانستان کے علمی تعلق کی ایک دیرپا یادگار قائم
ہو جائے۔ باب الظاہر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے نواب صدر یار جنگ مولانا
حبیب الرحمن خان صاحب شیروانی کو انتخاب کیا گیا جنہیں دعوت دینے کے لئے
حسب منشا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مہتمم صاحب خود حبیب گنج ضلع علیگڑھ تشریف
لے گئے۔ مولانا صاحب وعدہ فرما کر بتاریخ [illegible] دیوبند پہنچے۔ علماء، طلبہ اور مسلمانوں
کے ایک بہت بڑے مجمع میں صدر یار جنگ مرحوم کے مبارک ہاتھ سے باب الظاہر کی
بنیاد رکھی گئی۔ دارالعلوم میں باب الظاہر ایک عظیم الشان اور پر شوکت مرتفع عمارت
ہے، جس میں متعدد کمرے اور بڑی کشادہ درسگاہیں ہیں جن میں شعبہ خوشنویسی کے
اساتذہ طلبہ کو فن کتابت سکھلاتے ہیں۔

ایک مفید تعلیمی اسکیم کی تدوین

فرمانروائے ریاست قلات کی طلب و دعوت پر حضرت مہتمم صاحب قلات تشریف
لے گئے، خان قلات کا مقصد یہ تھا کہ ریاست قلات کے ذہین طلباء کی تعلیم و تربیت
کے لئے ایک ایسا نصاب تعلیم تجویز کیا جائے جس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری
علوم اور معاشرتی ضرورتوں کا بھی پورا لحاظ رکھا جائے نیز دینی اور دنیوی تعلیم کے اختلاف
سے جو شبہ پیدا ہو کر قوم میں دو طبقے پیدا ہو گئے ہیں جن کے مابین منافرت کی
زبردست خلیج حائل ہو گئی ہے اس کو دور کرنے کے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ اور ایک ایسا
جامع نصاب تعلیم وضع کیا جائے جس کے ذریعے سے دونوں تعلیموں کو بقدر ممکن جمع کر کے
تعلیمی ثنویت کی اس خلیج کو درمیان سے ہٹا دیا جائے۔ تاکہ قدیم و جدید تعلیمی رجحانات

کو ایک متفقہ، متحاد پر جمع کر کے قوم میں علم و فکر کی وحدت پیدا کرنے کی سعی کی جا سکے۔

اس نقطۂ نظر سے تعلیمی اسکیم کو مرتب کرنے کے لئے حضرت مہتمم صاحب نے دارالعلوم کے اپنے ساتھ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی کو لے لیا تھا، وہاں پہنچ کر متعدد قدیم و جدید ماہرین تعلیم کے مشورے سے ایک نہایت جامع اور مفید نصاب مرتب کر کے پیش کیا گیا، فرمانروائے قلات کی خواہش کے مطابق اس نصاب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دارالعلوم سے مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا حامد الانصاری غازی اور چند دوسرے حضرات کو قلات بھیج دیا گیا لیکن اس سے دارالعلوم کا نقصان یہ ہوا کہ اول الذکر کو وزارت تعلیم کا منصب تفویض ہوا اور موخر الذکر نشر و اشاعت کے ڈائرکٹر بنا دیے گئے، اور یہ دونوں حضرات قلات کے ہو گئے۔ لیکن ابھی یہ اسکیم اپنی ابتدائی منزل ہی میں تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر برطانوی حکومت نے اپنے دفاعی مصالح کی بنا پر ریاست کے انتظام کو اپنے کنٹرول میں لے لیا، افسوس ہے کہ اس نہایت مفید اسکیم کے ذریعے سے قدیم و جدید رجحانات میں وحدت و اتحاد پیدا کرنے کے لئے جو ذرائع تجویز کئے گئے تھے وہ بروئے کار نہ آ سکے۔

دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق

دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے ہیں، جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یکے بعد دیگرے عالم وجود میں آئے۔ دارالعلوم نے اسلامی علوم کی راہ سے مسلمانوں کے دین کو سنبھالا، اور مسلم یونیورسٹی نے عصری اور معاشی علوم کی تعلیم کے ذریعے سے مسلمانوں کو دنیوی تباہی سے بچایا، باوجودیکہ دونوں مسلمانوں ہی کے لئے قائم ہوئے اور مسلمانوں کے لئے کام کر رہے ہیں، مگر دونوں کے درمیان کوئی ربط و مناسبت تعلق قائم نہ تھا، تحریک خلافت کے زمانے میں جب حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ

دوسری تقریر سال بعد ۱۹ء میں "اسلامی تہذیب و تمدن کے عناصر ترکیبی" پر ہوئی اس تقریر کو بھی بے انتہا پسند کیا گیا اور بالآخر تقریر انجمن کی جانب سے کتابی شکل میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

ان تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ یونیورسٹی میں علماء کے خلاف جو علمی استخفاف اور بدظنی پھیلی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی، اس وقت سے اب تک دارالعلوم اور یونیورسٹی کے تعلق میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور ان دونوں علمی اداروں کے مابین جو بُعد واقع تھا وہ اب بحمد اللہ بہت کم ہو چکا ہے۔

۱۳۶۰ھ، دارالاقامہ کی تکمیل

۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء کا وہ زمانہ ہے جس میں دنیا تباہ کن اور ہولناک عالمگیر جنگ میں مبتلا تھی، ملک کے عام اقتصادی حالات نہایت نازک اور پیچیدہ ہو رہے تھے، مگر حق تعالیٰ کا فضل و کرم دارالعلوم کو آگے بڑھانے میں مصروف تھا، رمضان المبارک میں جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے حضرت مہتمم صاحب مدراس تشریف لے گئے، اس سفر سے چند ماہ قبل مدراس کے تاجروں کا ایک وفد حاجی اسماعیل صاحب سیٹھ کی قیادت میں یہاں پہنچ کر دارالعلوم کا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا اور دارالعلوم کے نظم و نسق کی خوبیاں، اساتذہ اور کارکنوں کے اخلاص و للہیت، طلباء کے تعلیمی انہماک اور دارالعلوم کی مخصوص اخلاق کے خالص دینی ماحول سے متاثر ہو کر دارالعلوم کی امداد و اعانت پر متوجہ تھا ان حضرات کا یہ معائنہ حضرت مہتمم صاحب کے سفر کے لئے زبردست محرک ثابت ہوا، الغرض آپ مدراس تشریف لے گئے، رفیق سفر حضرت مولانا مبارک علی صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) — انداز بیان اور دلچسپ تشبیہات نے ان دقیق مباحث کو جتنا عام اور دلچسپ بنا دیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سید محبوب رضوی

نائب مہتمم دارالعلوم تھے، دارالعلوم کے بے شمار عقیدت مندوں اور بہی خواہوں کے حلقہ بگوشی کی ترغیب کے سبب تھا، اہلِ مدراس نے ۳۰ ہزار روپے دارالافتاء کے کمروں کی تکمیل کے لئے پیش کئے اس میں ۱۰ ہزار روپے تنہا حاجی محمد اسماعیل صاحب کی جانب سے تھے۔

حضرت مہتمم صاحب کی مدراس سے واپسی کلکتہ کے راستے سے ہوئی اور چند روز کلکتہ میں قیام رہا۔ بحمداللہ یہ سفر بھی کافی نتیجہ خیز ثابت ہوا اس سفر کا ثمرہ ۵۰ ہزار روپے کی شکل میں برآمد ہوا اس میں ۲۰ ہزار روپے تنہا حاجی محمد دین صاحب تاجر چرم نے عنایت فرمائے، حق تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور جو گذر چکے ہیں انہیں علیین میں مقام بلند نصیب فرمائے۔ آپ کی توجہ اور شرافت سے دارالافتاء کی تکمیل ہو گئی جو برسہا برس سے نامکمل پڑا ہوا تھا اور طلبہ جگہ کی قلت کے سبب سخت تکالیف اٹھا رہے تھے۔ دارالافتاء کی تکمیل سے دارالعلوم کا احاطہ جو اب تک بالکل غیر محفوظ تھا وہ محفوظ ہو گیا۔ جزاہم اللہ خیراً فی الدنیا والآخرۃ۔

ماہنامہ "دارالعلوم"

مسلمانوں کے عقیدہ و عمل کی دینی اصلاح و تربیت کے لئے ۴۴ سال قبل (۱۳۲۸ھ میں) دارالعلوم کی سرپرستی اور نگرانی میں ماہنامہ "القاسم" جاری ہوا تھا، جو عرصے تک نہایت کامیابی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مفید خدمات انجام دیتا رہا۔ "القاسم" نے علماء دیوبند کے بے محققانہ اور بلند پایہ علمی مقالات شائع کئے اور جس بہترین معیار و انداز سے دینی صحافت کا بہترین نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا، اس کی یاد آج تک اہلِ علم کے دلوں میں تازہ ہے۔ "القاسم" ۱۱ سال کی طویل مدت تک جاری رہنے کے بعد بند کر دیا گیا تھا اس کے بعد سے اب تک پیہم کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے کہ دارالعلوم کی جانب سے کوئی رسالہ جاری نہ ہو سکا، حالانکہ ۲۰ سال کی مدت میں دارالعلوم کے تعلیمی و تبلیغی

کی جانب سے مسلسل ایک ماہنامہ کے اجراء پر اصرار کیا جاتا تھا، نیز خود اکابر دار العلوم بھی اس کی اہم ضرورت کو محسوس کرتے رہے لیکن اس کے باوجود اس بارے میں کوئی عملی قدم نہ اٹھ سکا بالآخر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ سے "دار العلوم" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ کا اجراء عمل میں آیا۔ ماہنامہ دار العلوم کے مقاصد جن کے تحت اس کا اجراء ہوا ہے حسب ذیل ہیں۔

(۱) دار العلوم کے حالات و کوائف سے معاونین و متوسلین دار العلوم کو باخبر رکھنا۔

(۲) اسلام کی تعلیمات کو سہل و دلنشین پیرایہ میں پیش کر کے مسلمانوں میں صحیح مذہبی ذہنیت پیدا کرنا۔

(۳) علمی مسائل کے متعلق علمائے دیوبند کے محققانہ مقالات اور حالات حاضرہ پر دار العلوم کا موقف پیش کرنا۔

(۴) مخالفین اسلام کے حملوں کی سنجیدگی کے ساتھ مدافعت کرنا۔

۱۳۶۱ھ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری

۱۰/ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ کی درمیانی شب میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر مدرس دار العلوم دیوبند، جھنگ (مغربی پنجاب) کی ضلع مسلم اتحاد کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے دیوبند سے روانہ ہوئے، سہارنپور کے قریب چھپسری کا سٹیشن پر پولیس انسپکٹر نے وارنٹ گرفتاری پیش کیا اور سہارنپور سٹیشن پر حضرت مدنیؒ کو گاڑی سے اتار کر سہارنپور جیل بھیج دیا گیا، وہاں سے اگلے دن مراد آباد لے جایا گیا۔ گرفتاری ایک سیاسی تقریر کی بنا پر عمل میں آئی تھی جو حضرت مولانا مدنیؒ نے جمعیۃ علماء ضلع مراد آباد کی کانفرنس منعقدہ بچھرایوں میں فرمائی تھی، یہاں ایک لطیفہ سنئے، اس جلسے کی صدارت حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے فرمائی تھی، حضرت مہتمم صاحب جب حضرت مدنی سے مراد آباد جیل میں ملنے کے لئے تشریف

اواخر جون ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اگست ۱۹۴۲ء
میں کانگریس ہائی کمانڈ کی گرفتاری کے ساتھ ملک بھر میں کانگریس کو خلاف قانون
قرار دے دیا گیا جس سے ہندوستان بھر میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہو گئی۔ لیڈر گرفتار
کئے جا چکے تھے، عوام نے کم و بیش ہر جگہ تشدد اختیار کر لیا۔ حکومت کے اداروں اور
ریلوے لائنوں پر بالعموم حملے کئے جانے لگے۔ یہ زمانہ شعبان کا مہینہ تھا جس میں دارالعلوم
میں سالانہ امتحان ہوتا ہے اور پھر عام سالانہ تعطیل ہو جاتی ہے۔ ملک کے تشویشناک
حالات سے اندیشہ تھا کہ طلبہ اپنے اپنے وطن پہنچنے سے محروم نہ رہ جائیں اس لئے
دارالاہتمام میں تخفیف امتحان کی تجویز زیر غور تھی کہ اسی اثناء میں خود طلبہ نے بھی
متفقہ طور پر یہ استدعا کی کہ ملک کے موجودہ تشویشناک حالات میں امتحان کے ختم
ہونے تک اگر ہم لوگ ٹھہرے رہے تو اندیشہ ہے کہ ہم اپنے اپنے وطنوں تک
نہ پہنچ سکیں گے کیونکہ ریلوے لائن خطرے میں پڑ جانے کے باعث وطن تک
پہنچنے میں سخت دشواریاں حائل ہو جانے کا اندیشہ ہے، دوسرے یہ کہ یہ وقت
کی پکار اور ضرورت پر لبیک کہنا اس میں شریک ہونا بھی ہے، لہٰذا طلبہ کو جلد سے
جلد چلے جانے کی اجازت دی جائے چنانچہ وقتی ہنگامی غیر حالات کے پیش نظر اس
فیصلے کے ساتھ کہ سالانہ امتحان ماہ ذی قعدہ تک دے دینا لازمی ہوگا، طلبہ کی مذکورہ
درخواست منظور کر لی گئی اور دارالعلوم میں شروع ہی سے امتحان کے ساتھ عام تعطیل کا
اعلان کر دیا گیا۔

چینی نمائندہ عثمان وو کی آمد

چینی اسلامی قومی سالویشن فیڈریشن نے ہندوستان کے مسلم اداروں کے حالات
معلوم کرنے کے لئے عثمان وو کو اپنا نمائندہ بنا کر ہندوستان بھیجا تھا۔ موصوف
اپنے اس دورے کے سلسلے میں ۲۴ شعبان کو دارالعلوم میں تشریف لائے اور

یہاں کے نظم و نسق اور طریق تعلیم وغیرہ امور کا بنظر غائر مطالعہ کیا بحیثیت مجموعی دارالعلوم کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال فرمایا۔

"میرے لئے یہ ایک اعزاز ہے کہ مجھے دارالعلوم کے دیکھنے کا موقع ملا مولانا محمد طیب صاحب نے مجھے دارالعلوم کی سیر کرائی جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔ یہ ادارہ خالص مذہبی ادارہ ہے جس کو مشرق کا الازہر کہہ سکتے ہیں، ہند اور بیرون ہند کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس مشرقی "الازہر" کی نگہبانی کرے اور اس کی امداد میں کوشاں رہے تاکہ مشرق میں "اسلامی کلچر" بہتر حالت میں جاری رہ سکے۔"

۱۳۶۲ھ ملکی حالات کا اثر دارالعلوم پر

۱۳۶۲ھ میں سنین ماضیہ کے اعتبار سے طلباء کی تعداد نسبتاً بہت کم رہی، ملک میں اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کے اثرات کم و بیش ہر جگہ پائے جاتے تھے، ریلوے لائنوں کے خطرے میں پڑ جانے سے سفر کرنا خطرناک ہو گیا تھا بالخصوص بنگال اور بہار میں سخت ابتری کی پھیلی ہوئی تھی، گرانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی، سیاسی بے چینی اور شورش عام تھی، بنگال قحط اور فاقہ زدگی سے دم توڑ رہا تھا، اس لئے بنگال اور دوسرے دور دراز کے طلباء کے لئے گھر سے قدم نکالنا بھی مشکل تھا بنگال کے طلباء جن کی بڑی تعداد ہر سال دارالعلوم میں مقیم رہتی ہے اس مرتبہ بہت کم آسکے۔

ایک طرف تو ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا اور دوسری طرف خود دارالعلوم کے ارباب حل و عقد میں سیاسی مسلک کے اختلاف کی بنا پر کشیدگی اور جماعت کا شدید خلفشار رونما ہو گیا جس کا آخر صدر مہتمم اور پانچ اساتذہ کے استعفاء اور علیحدگی پر منتج ہوا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، مستعفی جماعت کے ساتھ تقریباً ۲۰ طلباء بھی دارالعلوم سے علیحدہ

ہو گئے۔ مگر بحمد اللہ اس کے باوجود اساتذہ کی خالی شدہ آسامیوں کے فی الفور پُر ہو جانے کے باعث تعلیم میں کوئی غیر معمولی اور قابلِ ذکر فرق رونما نہیں ہوا۔

علامہ عثمانیؒ کی یکسوئی

۱۳۵۴ھ میں جب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ صدر مہتمم مقرر ہوئے تھے تو دارالعلوم کے مسلک کے تحفظ کے سلسلے میں حضرت مہتمم صاحب کے اختیارات بھی حضرت صدر مہتمم صاحب کی جانب منتقل کر دیئے گئے تھے لیکن عملاً دارالعلوم کا انتظام حضرت مہتمم صاحب ہی کے ہاتھ میں تھا۔ صدر مہتمم صاحب کا قیام چونکہ دیوبند میں کم رہتا تھا۔ اور ڈابھیل کے مدرسے کی صدر مدرسی پر فائز ہونے کی وجہ سے سال کا زیادہ حصہ وہیں گزارتے تھے، اس لئے ہر قسم کی ذمہ داری اور جواب دہی مہتمم صاحب ہی پر عائد ہوتی تھی۔ وہ گذشتہ دو برس مدت کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عملاً جبکہ پورے ادارے کو مہتمم صاحب ہی چلا رہے ہیں تو انہی کو اختیارات بھی حاصل ہونے چاہئیں، یہ معاملات اس بنا پر بحث و نظر بنے ہوئے تھے کہ مہتمم صاحب کو عملاً فرائض ذمہ داری نبھانے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ شعبہ جات و دفاتر کے امور کی تکمیل کے لئے مجلس شوریٰ و انتظامیہ کے سامنے جواب دہ تھے، دستورِ اساسی کی رو سے کلیۃً عملی اور انتظامی ذمہ داریاں مہتمم صاحب سے متعلق تھیں، اس لئے ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ میں مجلس نے وقتی حالات کے قدرتی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اختیارات مہتمم صاحب کی جانب منتقل کر دیئے، اس تجویز کی رو سے صدر مہتمم کی حیثیت صرف ایک آئینی نگران کی قرار پائی۔ اور انتظامی امور سے صدر مہتمم کا تعلق ختم ہو گیا۔ اس وقت عام ملکی حالات کے پیش نظر، اساتذہ اور کارکنوں کی ایک بڑی اکثریت ملکی سیاسیات میں شریک ہو کر عملی جدوجہد کی ضرورت اور وقت کا اہم تقاضا سمجھتی تھی اور علامہ عثمانیؒ دارالعلوم کے تعلیمی ادارہ ہونے اور بعض دیگر وجوہ کے نقطۂ نظر

سے اس کے وابستگان کی عملی جدوجہد کو مضر سمجھتے تھے۔ ان کی رائے پر حتی کہ دارالعلوم من حیث الجماعت عملی سیاسیات سے دامن کشا رہا ہے۔ یہ کشمکش یہاں تک بڑھ گئی کہ فریقین کے درمیان عدم تعاون کی خلیج حائل ہو گئی۔

ایسے مواقع پر ہمیشہ دارالعلوم میں یہ طریق عمل جاری رہا ہے کہ جب کوئی ذمہ دار باقی کسی حکمت عمل کو چلانے میں دشواریاں اور ناکامی محسوس کرتا ہے تو وہ مستعفی ہو کر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے، تاکہ عدم تعاون سے ردعمل کے مضر نتائج بروئے کار نہ آئیں، چنانچہ حضرت علامہ عثمانیؒ نے بھی اس موقع پر اسی عاقلانہ تدبر کا ثبوت دیا اور وہ مستعفی ہو کر کنارہ کش ہو گئے۔ علامہ عثمانیؒ کے ساتھ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا ظہور احمد صاحبؒ اور دوسرے اساتذہ اور تقریباً ۲۰ طلباء بھی جو ممدوح کے ہم خیال تھے، ان کی یکسوئی کے بعد مستعفی ہو کر دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے۔ البتہ کچھ مدت کے بعد حضرت مہتمم صاحب کی سعی و کوشش سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ اور مولانا ظہور احمد صاحبؒ دارالعلوم میں واپس تشریف لے آئے۔

۱۳۶۳ھ حضرت مولانا مدنیؒ کی رہائی

۱۳۶۳ھ ہندوستان کی سیاسیات میں نہایت ہنگامہ خیز سال تھا۔ ملک کے تمام بڑے چھوٹے لیڈر جیل کی چار دیواری میں محبوس کر دیئے گئے تھے۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کو جمادی الاخری ۱۳۶۱ھ کے عشرۂ اول میں دیوبند اور سہارنپور کے درمیان سفر کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ میں آپ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ حضرت مولانا مدنیؒ ۱۲ رمضان المبارک کو دیوبند تشریف لائے۔ اسٹیشن پر ہزارہا عقیدتمندوں کا ہجوم تھا، ہجوم کا یہ عالم تھا کہ مدت سے ایسا منظر دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ بعد نماز ظہر نودرہ کی جامع مسجد

خیر مقدم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا حضرت مولانا نے تبلیغی قصائد کے بعد جس میں ایک اہم قصیدہ حضرت مہتمم صاحب نے بھی فارسی زبان میں لکھ کر سنایا تھا، انگریزوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان ہو دنیائے اسلام کی آزادی کی [illegible] قلوب کو مطمئن کر سکتی ہے جب تک یہ حاصل نہ ہو جہاد (فرض) باقی رہے گا۔ اور آزادی کی جنگ جاری رہے گی۔"

سنہ ۱۳۶۴ھ شعبہ خوشخطی کا اجراء

پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا جو تعلق ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے، تحریر و کتابت کا علم سے گہرا تعلق ہے اسی بنا پر خط کو "نصف علم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مدارس عربیہ میں حُسنِ تحریر کو اب تک مناسب جگہ نہیں دی گئی ہے، البتہ دارالعلوم میں خط کی عمدگی کا اس قدر لحاظ ضرور رکھا جاتا تھا کہ امتحانات کے پرچوں میں جن طلباء کا خط عمدہ ہوتا ان کو حُسنِ تحریر پر امتیازی نمبر دئے جاتے تھے، مگر خط کی اصلاح و عمدگی کا دارالعلوم کی جانب سے بطور خاص کوئی انتظام نہ تھا اور صرف طلباء کے لئے اپنے ذوق پر اس کا انحصار تھا۔ دارالعلوم طلباء کے خط نہایت بھدے ہوتے تھے۔ اس نقص کی اصلاح کے لئے خوشخطی کے شعبے کا اجراء عمل میں لایا گیا، اور طلباء کے خط کی درستگی اور حُسنِ تحریر کو ضروری قرار دیا گیا۔ شعبۂ خوشخطی کے ذریعہ نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حُسنِ تحریر کے علاوہ جو طلباء خوش نویسی (کتابت) کی تعلیم بحیثیت فن حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو کلی طور سے اس کی مشق کرائی جاتی ہے اس طرح یہ خط کی اصلاح کے علاوہ یہ شعبہ طلباء دارالعلوم کے لئے حصولِ معاش کا بھی ایک باعزت اور عمدہ ذریعہ ہے۔

سنہ ۱۳۶۵ھ دارالصنائع کا قیام

یہ تو ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں دارالعلوم کے طلباء پر تعلیم و تدریس اور تبلیغ و دینی قیادت کے

کہ خود اپنے گھروں میں مقیم رہنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں
کانگریس کی خدمات تاریخ کے صفحات سے بھلائی نہیں جا سکتیں۔ دیوبند کے فرزندوں نے
بیرونی حملوں کے صدمے نے تریاق کا کام کیا تاہم ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو خود مسلمانوں ہی
کی جانب سے ڈھارس اور اطمینان دلا کر انھیں خود اعتمادی کا اور صبر و استقلال کی تبلیغ و
تلقین کرنے کے علاوہ اخلاقی طور پر آمادہ کیا جاتا۔ ایسے رجحان کو بند کرنے کی جدوجہد
کی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے دارالعلوم سے وفود بھیجے گئے، جن کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد
ہوا اور بہت سے مسلمان جو ترکِ وطن کا ارادہ کر چکے تھے وہ رک گئے اور جو نکل چکے
تھے وہ حالات کے معمول پر آجانے کے بعد اپنے گھروں میں واپس آگئے۔

تقریباً یہی صورت گذشتہ دنوں کشمیر میں پیش آئی اور دارالعلوم کے وفد نے وہاں
پہنچ کر حکومت کی مدد سے مساجد اور مکانوں کی صفائی و درستگی، مرمت اور شہیدوں
کی تدفین اور امن و امان بحال کرنے میں نہایت تندہی، جانفشانی اور دل سوزی سے
کام لیا۔ مسلمانوں کا خوف و ہراس دور کر کے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں بسنے پر
آمادہ کر دیا۔

پراویڈنٹ فنڈ کا اجراء

دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنوں کے مشاہرے ان کی خدمات کے عوض میں چونکہ بہت کم رہے
ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے مشاہرے بمشکل ان کی اور ان کے اہل و
عیال کی ضرورت کے لئے کفایت کر سکتے ہیں، اس میں پس انداز ہونے کا کوئی امکان
ہی نہیں ہوتا، مگر انسانی ضرورتیں ہمیشہ روز مرہ ہی تک محدود نہیں ہیں، اس لئے جب
کوئی وقتی اور ہنگامی حادثہ پیش آتا تو انھیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔
اسی طرح جو لوگ بڑھاپے یا دوسرے اسباب کی بنا پر سبکدوش ہوتے ان کے
مستقبل میں کوئی معمولی سا مالی سہارا بھی نہیں ہوتا تھا، خود دارالعلوم سے اپنی

انھوں نے اپنے متعدد قیمتی اوقات دیئے ہیں کہ دارالعلوم میں آخر عمر تک ملازمت
کرنے کے بعد جب انتقال ہوا تو پسماندگان میں اتنی مالی مقدرت بھی نہ تھی کہ وہ مرحوم
کے کفن دفن کا انتظام کر سکیں۔ خود ملازم بھی اگر کبھی کسی مزمن مرض میں مبتلا ہو جاتا تو اپنا
علاج نہ کر سکتا تھا۔ انہیں تجربات اور ملازمین دارالعلوم کی درخواست پر ناگزیر اسباق
احوال و ضروریات کے پیش نظر دارالعلوم میں پراویڈنٹ فنڈ کا سلسلہ جاری کیا گیا
جنگ شدید ضرورتوں یا سبکدوش ہونے کے مواقع پر بصورت امداد جیتر آ سکے۔ اس
موقع پر مجلس شوریٰ نے ملازمین کی درخواست پر توجہ کے ساتھ اپنی ہمدردی کا
ثبوت دیا۔ پراویڈنٹ فنڈ میں ہر مستقل ملازم کی تنخواہ سے دو پیسے فی روپیہ کے حساب سے
وضع کیا جاتا ہے اور اسی قدر اس میں دارالعلوم کی جانب سے شامل کر دیا جاتا ہے
سبکدوش ہونے پر پراویڈنٹ فنڈ کی جمع شدہ رقم اس کے حوالے کر دی جاتی ہے
نیز دوران ملازمت میں ضرورت کے موقعوں پر پراویڈنٹ فنڈ کا دو تہائی حصہ
بطور قرض بھی لیا جا سکتا ہے جو پانچ فیصد کے حساب سے ماہ بماہ وضع ہوتا رہتا ہے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان
کی آزادی کی جدوجہد میں علمائے کرام کو جو مقام حاصل
ہے اس میں کوئی جماعت ان کی حریف قرار نہیں دی جا سکتی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب
کے بعد صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو ملک میں زندہ رکھا، اس کی
مسلسل جدوجہد نے بالآخر پورے ملک میں آزادی کی روح پھونک دی۔ حضرت
نانوتوی قدس سرہ اس تصور کے سب سے بڑے داعی اور اس تحریک کے سب سے
بڑے مبلغ تھے، انھوں نے جس سرگرمی سے اس تصور کو پروان چڑھایا، اس کی
یہ ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے اس بارے میں [illegible] سے کام نہیں لیا
ہندوستان کی آزادی کے موقع پر حضرت نانوتویؒ کی تیار کی ہوئی جماعت نے جس طرح

منتشر ہونی چاہیے تھی اس کا اندازہ حضرت مہتمم صاحب کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو حضرت
ممدوح نے جشن آزادی کے موقع پر ۱۵، ۱۶ اگست کی درمیانی شب میں طلبائے دارالعلوم
اور اہل شہر کے مجمع میں فرمائی تھی، چونکہ اس تقریر سے آزادی کی جدوجہد میں علماء کی خدمات
کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لئے تقریر کا بجنسہٖ پیش کر دینا مناسب ہوگا۔
حضرت ممدوح نے فرمایا۔

بزرگانِ ملت علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم آج کا مبارک دن ہندوستان
کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلم تھا کہ اس پر
کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور
اور متکبر خاندان کے گلیڈسٹون نے پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر
طاقتور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک
لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے
نہیں بلکہ زمین کے چند ذروں کے اڑنے سے اس صورت سے ختم ہو چکی ہے کہ تاریخ
اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی! ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں
پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوانانِ ہند اس مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی
قربانیوں اور مساعی نے یہ خیر باثمر ہندوستان کے سامنے دھری۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم علمائے امت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں
نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب آزادی کے تصور سے
بھی اس ملک کے دل و دماغ خالی تھے، یہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی
مجاہد جماعت ہے جو دو سو برس سے اس ملک میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر
اور خون سے اس کی راہ ہموار کر رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل
ہو کر پورے طور سے اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی

کے تصور کو اس ملک میں ہمیشہ زندہ رکھا اور یہ ولولہ ہی اس تصور کا سبب کہ دیوبند جیسا مرکز پیدا ہوا۔ دارالعلوم
میں بانئ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ بقول حضرت مولانا رشید
احمد صاحب گنگوہیؒ اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے
امین تھے، انھوں نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی قیادت میں خود
ہتھیار اٹھائے اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اترے لیکن وقت کی مصلحت
کے باعث جنگ کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا اور
ملک آزادی سے محروم ہو گیا لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے غافل نہ ہوئی حضرت مولانا
محمد قاسم صاحبؒ اس دنیا سے گئے تو ان کے رنگ میں رنگے جانشین حضرت شیخ الہند
مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے جو ان کے علم اور نظریات کے جانشین اور وارث تھے، اپنی
جماعت کے ساتھ تحریک آزادی کو جاری رکھا۔

مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق شیخ الہندؒ کی شخصیت عربی لیڈر اور
مفکرین سے بھی ہمہ گیر کرامت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ
میں لے لیا، بہرحال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جہاد و غضب
کے لئے تھا، وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے
تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے، اور
اقتدار کے طور پر جس کا حق ہو اسے سپرد کیا جائے جس کی بنا سے حق کا کلمہ بلند ہو۔

ان بزرگوں کا سب سے بڑا مشغلہ یہی ذکر و فکر ہر وقت رہتا تھا کہ انگریزوں کو یہاں
کس طرح کس صورت سے نکالا جائے؟ اسی کے بارے میں پیشگوئیاں اور مکاشفات تھے
اور اسی کے بارے میں تمام نظم اور اہتمام، ایک دن چھتہ کی مسجد میں سب بزرگ بیٹھے تھے،
انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی سید محمد عابد صاحبؒ نے
فرمایا: انگریزوں نے اکھڑ پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے
شیخ الحدیث تھے فرمایا حاجی صاحب! آپ کس خیال میں ہیں وہ وقت دور نہیں جب کہ
ہندوستان صف کی طرح الٹ جائے گا، کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالت امن وسکون یہ
ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا رات کو سوئیں گے ان کی عملداری اور صبح کریں گے
دوسری عملداری کا میں:

میں آغا کے جاں بازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی انہیں
ہٹ سکتا کہ آزادی کی تمام اساسی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد پر جو رنگ رنگ گئے
اور اس لئے میں ببانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد
مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریز
کے خلاف فتویٰ دیا، ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ
اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اس فتویٰ کو استعمال کیا، اور اس
نسخہ شفا کی اس ترکیب سے پیا اور پلایا حضرت شیخ الہندؒ نے اس نسخے کو مرکب
کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کر دیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کر سکے چنانچہ
وہ استعمال مشترک ہو کر عام ہو گیا، تحریک خلافت جس کا نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے
استعمال کیا اور بہرحال عام استعمال شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گذر کر
برادران وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور
قربانیوں کا ثمرہ تھیں جو آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم
ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے
ہیں جن کی تخم ریزی کا یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔
ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد
کا دائرہ محدود نہیں بلکہ وسیع تر ہے، ہماری مبارکباد کا مستحق ہندوستان و پاکستان

اس موقع پر دارالعلوم کی جانب سے حسبِ ذیل اعلان شائع کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کی ایک مذہبی درسگاہ اور ایک عظیم الشان علمی ادارہ ہے، جس نے ملکی سیاسیات کے ہنگاموں میں بھی اپنی تعلیم اور تعلیمی کاموں کی ہمیشہ حفاظت کی ہے، اور تعلیمی سلسلوں میں کسی وقتی تحریک سے متاثر ہو کر کسی خلل نہیں پڑنے دیا، لیکن اس کے باوجود اس سے پہلے غیر ملکی غلبہ و اقتدار کی حالت کی حد تک کبھی بھی اپنی قوم اور قومی تحریکات سے بیگانگی نہیں برتی بلکہ زندہ دارانہ طریق پر اس قسم کے قومی معاملات میں مناسب حصہ لیا۔

ہندوستان کی وطنی آزادی کا واقعہ اور بیرونی سیاسی سامراج کے استیلاء اور تسلط سے اس کی نجات کا پہلا قدم کوئی ایسی چیز نہیں کہ دارالعلوم اس سے الگ رہ سکے دارالعلوم وطن کی آزادی پر نہ صرف مسرور ہی ہے بلکہ اسے مستقبل کی حقیقی آزادی کیلئے فال نیک تصور کرتا ہے اور آئندہ کی بہت سی مسرتوں کا پیش خیمہ سمجھ رہا ہے۔

اس نے ہندوستان کے اس ابتدائی آزادی کے دن کو اور انتہائی آزادی کی پوری توقع پر اظہار مسرت کرنے کے لئے طے کیا ہے کہ ۱۵ اگست کو عام تعطیل منائی جائے، چنانچہ تعطیل کے ذریعے ملک کی اس عام مسرت میں دارالعلوم شریک ہے ہندوستان دو سو سال کی غلامی کے بعد آج آزادی کی پہلی قسط حاصل کر رہا ہے۔

ہم ان تمام دوست افراد کو جنہوں نے ملک کی آزادی کی خاطر قربانیاں دی ہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کی مساعی کو بار آور بنا کر آزادی کی دولت سے بہرہ ور فرمایا، ہمیں امید ہے کہ ملک کے یہ جانباز اس وقت تک راہ جد و جہد کو جاری رکھیں گے جب تک کہ ہندوستان مکمل آزادی حاصل نہ کرلے۔ اور انہیں آزادی کے ساتھ اپنے تمام شعائر ملی و مذہبی کو بلند کرنے کا موقع حاصل نہ ہو جائے۔

۱؎ رسالہ دارالعلوم دیوبند، ماہ شوال ۱۳۶۶ھ، ستمبر ۱۹۴۷ء

۱۳۷۶ھ دارالافتاء کی جدید عمارت

دارالعلوم کے دارالافتاء کو ملک میں جو اہمیت اور عظمت حاصل ہے اس کا اندازہ ان بے شمار سوالات سے کیا جا سکتا ہے جو ہمیشہ شرعی مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے دارالافتاء سے کئے جاتے ہیں۔ برصغیر کا کوئی دیہات گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں دارالعلوم سے طلب فتاوی کے خواہشمند موجود نہ ہوں۔ دارالافتاء کی قدیم عمارت بہت مختصر تھی، دارالافتاء میں کارکنوں کے اضافے کے بعد جگہ بہت تنگ ہو گئی تھی، اس لئے مسجد دارالعلوم کی مشرقی جانب کی عمارت کی بالائی منزل پر ایسی وسیع اور کشادہ عمارت تیار کرائی گئی جو دارالافتاء کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ دارالافتاء کی یہ عمارت متعدد کمروں پر مشتمل ہے، ان میں ایک کمرہ دارالافتاء کے کتب خانہ کے لئے مخصوص ہے۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ سے دارالافتاء کو جدید عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

انسدادِ ارتداد مسلمانانِ دہرہ دون

دہرہ دون کے نواحی علاقے میں فساد کے بعد مسلمانوں کے ارتداد کا فتنہ نمودار ہو گیا تھا، دارالعلوم سے اس فتنے کے انسداد کے لئے مبلغ بھیجا گیا، دارالعلوم کے مبلغ نے دہرہ دون کو مرکز قرار دے کر دیہات میں گشت کیا۔ مبلغ کے بروقت پہنچنے سے وہاں کے مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، مبلغ صاحب نے مسلمانوں کو دوبارہ آباد کرنے میں بڑی تندہی کا ثبوت دیا، ان کی جد و جہد سے بہت سے مرتدین اسلام میں واپس آ گئے، دیہاتی مسلمانوں میں ہمت و استقلال اور خود اعتمادی سے مشکلات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا، جو لوگ خوف و ہراس کے باعث ترک وطن کر چکے تھے دوبارہ اپنے گھروں میں لوٹ آئے۔

۱۳۷۶ھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کیلئے علمائے دیوبند کا انتخاب

دیوبند اور علی گڑھ کے

تین عرصے سے جو تعطل چلا آرہا تھا ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کی
یونیورسٹی میں تقریر دور سے کس میں بڑی کمی آگئی تھی چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم
یونیورسٹی کی کورٹ کے لئے علمائے دیوبند کو منتخب کیا گیا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مولانا
حفظ الرحمٰن، مرحوم اور مولانا محمد طیب صاحب کا کورٹ کی رکنیت کے لئے انتخاب عمل میں
آیا اور اس طرح ان دونوں عظیم علمی اداروں میں تعاون کی راہیں کھل گئیں۔

دارالعلوم کی تلاشی اور احکام عیدالاضحیٰ کی ضبطی

گذشتہ سال بھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر حکام کی طرف سے دارالعلوم کے ساتھ اہانت آمیز واقعہ پیش آیا تھا۔ امسال بھی عیدالاضحیٰ سے چند
روز قبل ۹ ذی الحجہ کو دارالعلوم کی تلاشی کا افسوسناک حادثہ پیش آیا۔ ایک سی آئی ڈی
پولیس افسر چند مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ دارالعلوم کے دروازے پر پہنچا اور ادارہ
اہتمام کے کسی رکن سے اجازت اور ان اخلاقی تقاضوں سے کام لئے بغیر جو اس قسم کے
مواقع پر ضروری سمجھے جاتے ہیں اس نے دفتر اہتمام کی تلاشی لے کر عیدالاضحیٰ کے مطبوعہ
احکام و مسائل پر قبضہ کر لیا جن میں قربانی کے احکام درج تھے۔ قربانی کے احکام چندے
کی اپیل کے ساتھ ہر سال سے شائع ہوتے رہے ہیں اور اس سے پہلے کبھی ان پر اعتراض
نہیں کیا گیا۔ اس مرتبہ حکام کے نزدیک اشتہار کے مضمون کا وہ حصہ خاص طور سے
قابل اعتراض تھا جس میں قربانی کے جانوروں کی تفصیل کے ساتھ گائے کا ذکر تھا
حکام کے نزدیک گائے کے ذکر کے یہ معنی تھے کہ دارالعلوم کی جانب سے حکومت کے
احکام کے خلاف قربانی کی ترغیب دی گئی ہے۔ حکام کو بتایا گیا کہ گائے کا ذکر بطور
مسئلہ کے کیا گیا ہے، چنانچہ اس میں اونٹ کی قربانی کا ذکر موجود ہے حالانکہ ہندوستان
میں عموماً اونٹ کی قربانی نہیں ہوتی۔ تیزیوں کے ساتھ یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ بحالت
موجودہ مسلمان وقت کے مصالح کے پیش نظر گردو پیش کے ملکی حالات کی رعایت

ملحوظ رکھیں اور یہ طریقہ اختیار نہ کرے جو کہ مسلمانوں میں سے مستثنیٰ ہو، تاکہ ملک میں خلفشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ دارالعلوم دنیائے اسلام کے مسلمانوں کا مرکزی دینی ادارہ ہے، پیشتر کی احکام میں جن کا منشا دارالعلوم کا ذبیحہ ہے۔ احکام ہندوستان سے باہر بھی بڑی تعداد میں بھیجے جاتے ہیں جہاں گائے کی قربانی پر پابندی کا کوئی سوال نہیں ہے، علاوہ ازیں خود ہندوستان میں بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں گائے کا ذبیحہ ممنوع نہیں ہے مگر حکام کا اصرار بدستور باقی رہا، چنانچہ ان کے اصرار پر ایک مزید اعلان شائع کیا گیا، جس میں حکام کے مشورہ کا اظہار کرتے ہوئے بتلایا گیا کہ جن مقامات پر حکومت کی جانب سے گائے کی قربانی پر پابندی عائد ہے وہاں ملک کے موجودہ حالات اور آپس کے میل ملاپ کے لئے گائے بیل اور بچھڑے کی قربانی سے احتراز کیا جائے نیز حکومت کے احکام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔

ملک میں حکام کے اس توہین آمیز اقدام پر جابجا احتجاجی جلسے کئے گئے اور اخبارات کے ذریعے اس اقدام کی مذمت کی گئی۔

۱۳۶۹ھ پاکستانی طلبہ کے داخلے میں حکومت ہند کا تعاون

ہندوستان کی تقسیم کے بعد پرمٹ[1] سسٹم کی وجہ سے پاکستانی علاقے کے طلباء کی آمد و رفت بالکل منقطع ہو گئی تھی، بالخصوص مغربی پاکستان کے طلباء کے لئے دارالعلوم میں حصول علم کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تھا، دارالعلوم کی شہرہ آفاق مرکزیت کے پیش نظر طالبانِ علم دارالعلوم میں آنے کے لئے بے چین تھے۔ داخلے کے لئے درخواستوں

۱؎ اس وقت دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ اور ویزا کے بجائے پرمٹ سے کوئی ایک دوسرے ملک میں سفر کیا جا سکتا تھا

کے ساتھ کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ مطبخ بہت صاف ستھرا تھا۔ طالبات
کا حسب دستور خیال رکھا جاتا ہے۔ دارالعلوم میں ایک بہت بڑا کتب خانہ
ہے جس میں مختلف موضوعات پر قیمتی کتابیں ہیں۔ حقیقت میں یہ ادارہ
ایک یونیورسٹی ہے۔"

عبدالفتاح عودہ ناظم نشریات عربی نے کہا کہ:-

"یہ امر واقعہ ہے کہ میں نے دیوبند میں اسلام کا ایک قلعہ اور ہادی روشنی
نبوی کی ایک پناہ گاہ پائی۔ یہاں آکر میں نے معلوم کیا کہ دین و دنیا و آخرت
دونوں کے لئے کس طرح کی صلاحیت دارالعلوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ
بڑی قیمتی میراث ہے جس کے ساتھ تمسک کرنا ہمارے لئے ضروری ہے
اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مستقبل کی تعمیر کے لئے اسے عماد اور
ستون بنائیں۔"

علی امیر مرزا ناظم نشریات فارسی نے بیان کیا کہ:-

"یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اسلام کی حقیقی عظمت اور قدرت کا
احساس کیا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی صفیں نماز میں خالی نہیں اور وہ
ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر کار ایک
دن آئے گا کہ اسلام کے اتحاد و سادگی کے سامنے اور مسلمانوں کی
بے ریائی اور بے رونقی کے نتیجے میں اسلام تمام جہان پر چھا جائے گا۔
اسلام کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق خدا کی عبادت
جس سے ہم مشرقی و مغربی ممالک میں دور ہو گئے تھے اور جن کی
مال و دولت اور جاہ و جلال نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اس کو
ہم نے تمہارے مقدس مقام میں پایا اور اس طرح پاکر اسلام کی عظمت

سے ہم دوبارہ آگاہ ہوسکے۔

سفیر افغانستان کی دارالعلوم میں تشریف آوری

جس طرح دارالعلوم کا علمی فیضان عام ہے اسی طرح اس کے ہمدردوں کا حلقہ بھی وسیع ہے، آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمان بھی اس کی تعمیر و ترقی میں کم و بیش شریک رہے ہیں، خصوصاً افغانستان نے دارالعلوم کی دینی خدمات کو ہمیشہ اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے، چنانچہ ان ہی قدیم روابط کے پیشِ نظر سفیر افغانستان متعینہ دہلی سردار نجیب اللہ خاں ۸ رجب کو دارالعلوم میں سرکاری حیثیت سے تشریف لائے اور کئی گھنٹے تک اکابر دارالعلوم سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات فرمایا۔ دارالعلوم کے شعبے اور درسگاہوں کا معائنہ کیا، سفیر موصوف "باب الظاہر" کی بالائی منزل میں قیام پذیر ہوئے، "باب الظاہر" افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ کی علم دوستی کی شاندار یادگار ہے، ممدوح کے اعزاز میں دارالحدیث کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں حضرت مہتمم صاحب نے خیر مقدم کی تقریر میں دارالعلوم اور افغانستان کے تاریخی تعلقات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور دارالعلوم کے بین الاسلامی مسلک کی وضاحت فرمائی، جواب میں سردار نجیب اللہ خاں نے اپنی جوابی تقریر میں ملتِ افغان کے دارالعلوم سے شغف و تعلق اور دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:۔

"دارالعلوم دیوبند افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک عوامی علمی درسگاہ ہے، مگر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک علمی درسگاہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم نے اس زمانے میں جبکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت باقی نہیں رہی تھی دینی اور اسلامی علوم کی حفاظت کی اور مجھے اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح

علوم و فنون کی خدمت میں مصروف رہے گا اور ہندوستان کے عوام اور علماء اور علم دوست اس کے قدردان ہی نہیں بلکہ علماء کے مددگار رہیں گے جو اس کی ہیں

ثقافت ہند کی اس روحانی محبت سفارت اور جمعیت منصفانہ کی بہت ہی اور یہ دارالعلوم اس حد تک مستحق ہے۔

دارالعلوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ راست گوئی اور راست گفتار فرزند پیدا کئے ہیں جن پر دارالعلوم صحیح طور پر فخر کر سکتا ہے۔ دارالعلوم تو ہندوستان کا ادارہ نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلامی کی میراث ہے میں خداتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس دارالعلوم کو ترقیوں کے ساتھ باقی رکھے اور عالم اسلامی کے لئے مفید ہو سکے۔

حکومت ہند کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ۹ فروری

۱۳۷۰ھ مولانا آزادؒ کی تشریف آوری

۱۳۷۰ھ کی صبح کو دیوبند تشریف لائے۔ تشریف آوری سے قبل آپ کا تار حضرت مہتمم صاحب کے پاس اس مضمون کا پہنچا کہ ۹ فروری کو آ رہا ہوں اور کھانا اساتذہ و طلبہ کے ساتھ کھاؤں گا۔ آپ کی تشریف آوری کے موقع پر آپ کا پرجوش استقبال کیا گیا۔

سب سے پہلے آپ دارالعلوم میں تشریف لائے تو حضرت مہتمم کا اس درجہ احترام ملحوظ رکھا کہ صدر مقام سے کسی قدر ہٹ کر بیٹھے اور دیر تک تعلیمی امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ نشست کے بعد مولانا نے دارالعلوم کے شعبہ جات اور درسگاہوں کا معائنہ فرمایا اور دوران معائنہ میں ہر ہر شعبہ کی اہمیت اور ان کی کارکردگی کا اپنے مخصوص انداز میں اظہار فرماتے رہے۔ بعد ظہر جلسہ خیر مقدم ہوا، جس میں تین سپاسنامے پیش کئے گئے۔ حضرت مہتمم صاحب نے تفصیل کے ساتھ دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ آخر میں مولانا آزاد نے نہایت

فصیح و بلیغ اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں بانیٔ دارالعلوم کی مثالی زندگی کی خصوصیات دارالعلوم کی علمی اہمیت و عظمت اور اس سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے ان کو زرین نصائح کی تلقین فرمائی۔ تقریر کا یہ ٹکڑا اس قدر اہم ہے کہ اگر طالبانِ علم اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیں تو علم کی دنیا میں حیات آفریں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے، مولانا آزاد نے فرمایا۔

طلباء عزیز! کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ تم جو تعلیم حاصل کر رہے ہو اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ علم مقصود ہے یا وسیلہ! دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو وسیلہ ہیں، اصل مطلوب نہیں، البتہ جو مطلوب ہیں وہ ان کے بغیر نہیں مل سکتیں، اس لئے وسیلہ بھی مطلوب ہو جاتا ہے۔ مثلاً سکہ چاندی سونے کا چلتا ہے، دولت کمانے کا یہی ذریعہ ہے مگر ہماری زندگی کی ضرورتوں میں یہ سونا چاندی کس کام آتا ہے، اگر پیاس لگی ہو تو کیا چاندی کھانے سے بجھ جائے گی؟ بھوک میں کیا سونا بھوک بجھا دے گا؟ مگر جب تک یہ سامان نہ ہو کھانے پینے کی چیزیں نہیں مل سکتیں، اس لئے چاندی سونا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ گورنمنٹ نے کرنسی نوٹ چلائے ہیں، کاغذ کا یہ ایک چھدام کا بھی نہیں ہے مگر گورنمنٹ نے اس پر چھاپ دیا ہے ایک ہزار روپے، اب یہ وسیلہ ہے اسی کاغذ کے ذریعہ سے روپیہ اور اشرفیاں مل جاتی ہیں یہ کاغذ وسیلہ ہو گیا ہے ایک ہزار روپے وصول کرنے کا۔ اب لوگ ہزار روپیہ کی اشرفیاں یا چاندی کے سکے نہیں رکھتے بلکہ کاغذ کا یہ پرزہ رکھ لیتے ہیں، جو چیزیں وسائل کا حکم رکھتی ہیں اُن کا بھی مستقل ضروری نہیں ہے، لیکن جو چیزیں مقاصد میں داخل ہیں اُن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی بھوک میں غذا مقصد ہے، وسیلہ اس کو بدل نہیں سکتا۔

تم نے اپنے گھروں اور عزیز و اقارب کو چھوڑا اور یہاں آگئے۔ ملک میں تعلیم کے دوسرے طریقے بھی رائج ہیں، لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر تم نے اسکولوں

دیکھو مجھ سے انھیں یہ دیکھ کر کہ تا کہ دینی علوم میں مہارت حاصل کرو، بڑا مبارک ارادہ ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ جس علم کو تم سیکھ رہے ہو وہ علم وسیلہ ہے یا مقصد؟ تمہارے
ذہن سے اگر اس کو نکال دیں تو میں مستنبط کر دوں گا کہ تم صحیح کام نہیں کر رہے ہو۔ اور قوموں
نے ہمیشہ علم کو وسیلہ سمجھا ہے مگر مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو کبھی
مقصد کے بجائے ذریعہ معاش نہیں سمجھا۔ ہندوستان میں ہم ہزاروں درسگاہیں ہیں، کالج
ہیں، یونیورسٹیاں ہیں، اسکول ہیں جن کا جال دیہات تک پھیلا ہوا ہے۔ ان میں جو تعلیم ہوتی ہے
اس کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے، مقصد نہیں سمجھا جاتا۔ ان میں صرف اس لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے
کہ سرکاری ملازمتیں مل سکیں، اور اونچے عہدے حاصل کئے جا سکیں، جو شخص وہاں جاتا ہے
وہ سمجھتا ہے کہ جب تک یہاں کی ڈگری موجود نہ ہو وہ معاش حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر میں آپ کو
یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس علم کی خاطر تم نے اتنے سفر طے کئے ہیں وہ علم مقصد ہے،
وسیلہ نہیں ہے، اس کو کسی وسیلے کے طور پر حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس لئے حاصل
کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے،
وسیلے کے طور پر نہیں۔ انھوں نے کبھی علم کو اس لئے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے سے
معیشت حاصل کریں۔ مسلمانوں نے ذریعہ معیشت کسی اور چیز کو بنایا، جنھوں نے
علماء کے افسانے سنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ جنھوں نے علم فقہ مدون کیا جس
پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں وہ بزاز تھے، انھوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعہ
معیشت نہیں بنایا۔ معروف کرخی موچی تھے، آج تم اس پیشے کو کتنا سخت سمجھتے ہو،
نہیں جو وہ کرخ؎ میں نکل جاتے، بازار میں بیٹھ جاتے اور آدمیوں کے جوتے سیتے،
اور اس کی اجرت سے گذر بسر کرتے۔ شمس الائمہ کا نام ہی حلوائی پڑ گیا تھا اور
اتنا بڑا امام اپنا ذریعہ معیشت حلوہ فروشی بنائے ہوئے تھا

اسی طرح اسلام کے مشہور علماء نے علم دین کے چشمے بہائے مگر کبھی علم دین کو

؎ کرخ بغداد کے ایک محلے کا نام ہے

ذریعۂ معیشت نہیں بنایا۔ وہ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے، زخارفِ دنیوی کے لئے نہیں۔ ان کے نزدیک یہ گناہ تھا کہ علم کو دنیا کے لئے حاصل کیا جائے۔ وہ تشنگانِ علم کو علم کی روشنی سے سیراب کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے! یہ ہمارے علماء کا خاص شیوہ رہا ہے کہ دین کی خدمت اور علومِ دینیہ کی اشاعت کو انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا ہے۔ انھوں نے اس کے لئے معاوضہ کا باقاعدہ نرخ مقرر نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اگر تم نے سمجھ لیا تو پھر ہماری زندگی کی تاریخ دہرا سکو گے۔

اللہ نے تمہیں علمِ دین کی توفیق دی ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی صدا ہر شخص کے کانوں تک پہنچا دو۔ کچھ دنوں کے بعد تم تعلیم کے مرحلوں کو طے کر کے فراغت حاصل کرو گے، اور ایک عالمِ دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش ہو گے۔ اس وقت تمہارے سامنے یہی فریضہ ہونا چاہئے۔ اگر تم نے یہ کر لیا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو علم تم حاصل کر رہے ہو اس آسمان کے نیچے اس سے اونچا عزت کا کوئی اور مقام نہیں ہوگا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کی توفیق بخشے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مجھے انشاء اللہ بار بار اس جشن کی تقریبات میں شرکت کا موقع ملے گا۔[1]

ملک کی تقسیم کا آمدنی اور طلباء کی تعداد پر اثر

۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء یعنی ملک کی تقسیم کا سال

دارالعلوم کی آمدنی کے لئے بڑا پریشان کن سال تھا۔ طلباء کی تعداد بھی غیر معمولی طور پر کم ہو گئی۔ متحدہ ہندوستان کے جو علاقے پاکستان کے حصے میں آئے تھے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "روداد خصوصی مقدم مولانا آزاد" شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند۔ مرتبہ سید محبوب رضوی

دی۔ دارالعلوم کی آمدنی کے علاقے تھے، مغربی پاکستان کے علاقے سے آمدنی زیادہ
ہوتی تھی اور مشرقی پاکستان سے طلبا زیادہ تعداد میں آتے تھے، پھر دہلی، کلکتہ،
حیدرآباد کے فسادات اور ان مقامات کی مسلمان تاجر پیشہ آبادی کی اکثریت کا پاکستان
منتقل ہو جانا مزید پریشانی کا باعث ہوا۔ دارالعلوم کے لئے یہ زمانہ بڑی آزمائش و
ابتلا کا تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ حالت تبدیل ہوتی رہی، طلبہ کی تعداد جو سولہ سو سے گھٹ
کر ایک ہزار پر آگئی تھی اس سال میں ترقی کر کے بارہ سو سے اوپر پہنچ گئی تھی، آمدنی میں
بھی بتدریج اضافہ ہوتا رہا، حالات پرسکون ہو جانے پر پاکستان کے اہل خیر نے
بڑی فیاضی سے امداد و اعانت میں حصہ لیا، چنانچہ دارالعلوم کی جانب سے پاکستان
کے مرکزی مقامات میں تحصیل چندے کے دفاتر کھول دیئے گئے، چند سالوں تک
پاکستان سے سب سے بڑی امداد غلے کی ہوتی رہی، پانچ ہزار من گیہوں جو طلبا،
و اساتذہ و عملے کی سال بھر کی ضروریات کے لئے درکار ہوتا تھا بہت ہی معمولی
نرخ پر بہاولپور (پاکستان) سے ہر سال آتا رہا، اس بحرانی زمانے میں دارالعلوم
کے سنبھالے رکھنے میں بہاولپور کے اس غلے کا بڑا حصہ ہے، خصوصاً ملکی تقسیم کے
بعد چار سال تک اگر یہ امداد میسر نہ آتی تو دارالعلوم کو بڑی دشواریاں پیش آتیں،
حق تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر و اجر عظیم عطا فرمائے جن کی توجہ اور سعی و کاوش
ایسے حالات میں دارالعلوم کے لئے مددگار ثابت ہوئی۔

۱۳۷۱ھ آچاریہ ونوبا بھاوے کے تاثرات

آچاریہ ونوبا بھاوے اپنی بھودان کی تحریک کے
سلسلے میں ۲ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ (۳ دسمبر ۱۹۵۱ء) کو وارد دیوبند ہوئے، اتفاق سے
اس تاریخ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، حضرت مہتمم صاحب، حضرت
مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آچاریہ جی سے ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر تشریف

لے گئے۔ وقت کی تنگی کے باعث پنڈت جی کو وہاں دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکا

شب میں سات بجے کے قریب پنڈت جی آئے اور دارالعلوم کو دیکھ کر اس مسرت کا

اظہار کیا کہ ان کو ایشیا کی اس عجیب و غریب تعلیم گاہ کے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ نے

طلباء اور ذمہ داران دارالعلوم کو مبارکباد دی کہ خدمت ملک و ملت کے اعلیٰ مقصد

کو سامنے رکھتے ہوئے انگریز کے اقتدار کے دور غلامی میں انہوں نے عظیم الشان خدمات

انجام دی ہیں۔

طلباء کی درخواست پر انہوں نے ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ یونیورسٹی ہمارے ملک کا بہترین سرمایہ ہے جس میں باہر سے ایشیا کے نوجوان جمع ہیں جن کے ذریعے سے ہم ایشیا کے اتحاد کے نقشے میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ غلامی کے دور میں اس یونیورسٹی نے جو خدمت انجام دی ہے، مجھے امید ہے کہ اس سے بہت زیادہ عظیم الشان خدمت آزادی کے دور میں انجام دے گی۔ ہم اس یونیورسٹی کے ذریعے سے مشرقی ایشیا میں اپنا پیغام پہنچا سکیں گے۔ ہندوستان ہمیشہ سے پریم اور اتحاد کا حامل رہا ہے۔ یہاں بہت سی قومیں آئیں اور پریم و اتحاد کی گنگا جمن سے سیراب ہو گئیں۔ ہندوستان کا یہ پیغام پورے ایشیا بلکہ تمام دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اسی کے پیغام سے دنیا کی موجودہ گتھی سلجھ سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ یونیورسٹی ہمارے اس پیغام کو پہنچانے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوگی۔[1]

دارالعلوم کو دیکھنے کے بعد پنڈت جی نے شہر میں جو تقریر کی اس میں بھی بطور خاص انہوں نے دارالعلوم کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"میں اس ادارے میں جا کر بہت خوش ہوا۔ یہ سادہ زندگی، کم سے کم ضروریات

---

[1] سہ روزہ "الجمعیۃ" مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۵۱ء

زندگی اور ایک با مقصد زندگی کی طرف رہنمائی کرنے والا ادارہ ہے، جس نے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو مذہب کی برکتوں سے مالا مال کیا ہے، یہ علم کا بڑا مرکز ہے، یہاں سے علم کی جو ہوائیں چلتی ہیں وہ دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس مشینی دور میں اس ادارے کے لوگ مشینی زندگی کی اہمیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی بڑی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔

آخر میں انہوں نے کہا "یہی ایک ادارہ ہے جس نے پہلے دن سے برٹش سامراج کی مخالفت کی، اور اس مخالفت میں ہر محاذ پر سب سے پہلے قربانیاں پیش کی ہیں۔

دارالعلوم کا ایک نازک مالیاتی دور

مابعد جنگ جو اقتصادی زبوں حالی پیش آئی اس سے کوئی ادارہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، دارالعلوم پر بھی اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا، ادھر ملکی تقسیم کے بعد امداد کے بڑے علاقے پاکستان میں شامل ہو چکے تھے، مسلمانانِ عالم کی اس مشترک دولت کی حفاظت کے لئے ایک مالی اپیل نشر کی گئی، اور بحمد اللہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، خصوصاً پاکستان کے مخیر حضرات نے اس میں بڑا حصہ لیا، حتیٰ کہ سر دست محمد ذریشا جن کا نام کبھی دارالعلوم کے معاونین حلقے میں سننے میں نہیں آیا تھا وہ بھی چندہ دہندگان کی صف میں شریک ہو گئے، اور اس طرح بفضلہ تعالیٰ دارالعلوم کی کشتی گرداب سے نکل کر ساحل مراد کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

قرب و جوار کے مسلمانوں کی فیاضی

اسی کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں ایک نئی اسکیم کا آغاز کیا گیا یعنی دارالعلوم

کی جانب سے فصلِ ربیع کے موقع پر قرب و جوار کے مسلمان زمینداروں اور کاشتکاروں کا ایک نمائندہ اجتماع بلایا گیا۔ جس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ دارالعلوم کی امداد و اعانت میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس کی یہ صورت تجویز کی گئی کہ دارالعلوم کی سال بھر کی ضروریات کے لئے پانچ ہزار من غلے کی فراہمی کاشتکاروں اور زمینداروں کی جانب سے ہونی چاہئے۔ چنانچہ اس پر عمل شروع کر دیا گیا اور باوجودیکہ پہلے سے کام کا تجربہ نہ تھا اور ادھر فصل کٹنے کا زمانہ ٹھیک رمضان المبارک کا مہینہ تھا مگر اس کے باوجود ساڑھے تین ہزار من غلہ فراہم ہو گیا۔ اگرچہ غلے کی یہ مقدار مطلوبہ ضرورت سے کم تھی تاہم اس سے دارالعلوم کو اس نازک اور ہوشربا گرانی کے زمانے میں بڑی تقویت پہنچی۔ اللہ تعالیٰ اس نیک کام کرنے والوں کے اموال میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ غلے کی فراہمی کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے اور اب اس میں میرٹھ، ڈیرہ دون کے اضلاع کے علاوہ بجنور اور ہریانہ کا علاقہ بھی شامل ہو گیا ہے۔

ایک مصری فاضل کا ورود

عرب لیگ جو ممالکِ عربیہ کی ایک سیاسی جماعت ہے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ علمی کاموں سے بھی دلچسپی رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں عرب لیگ کا ثقافتی شعبہ اپنی لائبریری میں نادر اور کمیاب کتابیں جمع کرنے کے لئے مختلف ممالک میں اپنے نمائندوں کو بھیجتا ہے، تاکہ ان ممالک کے کتب خانوں سے نوادر مخطوطات حاصل کر کے اپنے یہاں ایک بیش بہا علمی ذخیرہ فراہم کرے جو بے مثال ہو۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے انہوں نے اپنے نمائندے شیخ محمد رشاد ابن عبدالمطلب کو ہندوستان بھیجا۔ شیخ موصوف دیوبند تشریف لائے اور نصف درجن مخطوطات کا انتخاب کر کے ان کے فوٹو لے گئے۔

شیخ محمد رشاد ابن عبدالمطلب عربی اور انگریزی زبانوں کے نہ صرف ایک نوجوان فاضل تھے، بلکہ ان تمام علمی اور تحقیقاتی نقطوں سے بھی واقف تھے جو جدید

کی تہذیب اور موجودہ دور کی سائنسی تحقیقات نے بالخصوص علم طب کے لئے پیدا کر دیئے ہیں
مختلف ممالک کے علمی وفود نے شیخ موصوف کو جس بیت وسیع النظر پایا تھا ،
دارالعلوم کو دیکھ کر جن سے وہ متاثر ہوا وہ اُن کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو شیخ
نے کتاب معائنہ میں لکھے ہیں

"کوئی شبہ نہیں کہ فروسامات کے زبردست اسباب میں سے
ایک بات یہ ہے کہ جس نے اس زبردست مدرسہ کو بافعل قدیم طرز
اور مضبوط بنیادوں پر قائم پایا اس کا ایک ہی سبب ہے، اور وہ
ہے اس کے قائم کرنے والوں کا انتہا درجے کے ساتھ خلوص اور
ان کے اعمال صالحہ"!

۱۳۴۳ھ شعبۂ طب میں اضافہ اور دارالشفاء کا قیام

جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے

دارالعلوم میں فن طب کی تعلیم قیام دارالعلوم کے چند سال بعد ہی شروع کر دی
گئی تھی طبی کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ہی طبیب دارالعلوم بیمار طلبہ کے علاج و
معالجے کی خدمات بھی انجام دیتا تھا، بیمار طلبہ طبیب سے اپنے مرض کی تشخیص
اور نسخہ تجویز کرا کر ایسے عطاروں سے دوا لیتے تھے جو دارالعلوم کی جانب سے
مقرر تھے، دواؤں کی قیمت دارالعلوم سے ادا کی جاتی تھی معمولی مریضوں کے لئے
تو یہ طریقہ کافی تھا مگر جو لوگ شدید بیماریوں میں مبتلا ہوں اُن کے لئے عرصے سے
ایک ایسے دارالشفاء کے قیام کی تجویز زیر غور تھی جس میں مریضوں کے لئے تمام
ضروری چیزیں موجود ہوں، چنانچہ اس سال ایک دارالشفاء کا اجراء کیا گیا اور اس کے
لئے ایک عمارت بنوا کر مخصوص کر دی گئی، اس میں مفردہ مرکب اور پیٹنٹ ادویہ کے
ذخیرے کے ساتھ چارپائی، بستروں اور تیمارداری کا بھی ضروری سامان

پیش کی گئی تھی، جس میں لکھا گیا تھا کہ اخبارات میں وہ مقالات جو دارالعلوم سے شائع ہوئی ہیں جن میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جلالۃ الملک کو خطاب فرمایا گیا ہے، اس سے ہماری عقیدت میں بدرجہا اضافہ ہوا ہے۔ ہم جلالۃ الملک کی بقا اور خدمت حرمین کی مزید توفیق کے آرزومند ہیں۔"

سفیر حجاز مقیم ہند کی معرفت جلالۃ الملک کی جانب سے جو ہدیہ موصول ہوا اس میں مرقوم تھا۔

"مجھے جلالۃ الملک نے حکم دیا ہے کہ آنجناب نے اپنے تار میں جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے آنجناب کو اور دارالعلوم کے اسٹاف کو جلالۃ الملک کی خوشنودی کا پیغام پہنچا دوں۔ جلالۃ الملک اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تمہیں ان تمام چیزوں کی توفیق عنایت فرمائے، جو اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی کے لئے مناسب ہوں۔"[1]

اتفاق سے جلالۃ الملک اسی سال ہندوستان تشریف لائے اور دارالعلوم پر شاہانہ توجہ مبذول فرماتے ہوئے ۲۵ ہزار کا عطیہ دارالعلوم کو عطا فرمایا۔

النور السادات کی دارالعلوم میں آمد

عرب جمہوریہ کے موجودہ صدر النور السادات جو اس وقت مؤتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری تھے دارالعلوم میں تشریف لائے، موصوف نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے تاثرات رقم فرمائے۔

"اس عظیم دینی علمی درسگاہ کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں تعظیم قلب سے بھائیوں کی خدمت میں مبارکباد پیش کروں جو اس ادارے کو چلا رہے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارے کو

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ ص ۳

علم حدیث کا سارا ورثہ پہنچا اور ہمیشہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں دارالعلوم کا تعارف

کناڈا یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے ایک ریسرچ اسکالر کی طلب پر جن کی تحقیقات کا موضوع "عصر حاضر میں مسلمانوں کی دینی تعلیم" تھا، دارالعلوم کی علمی اور دینی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بھیجا گیا جو امریکہ اور یورپ کے علمی حلقوں میں دارالعلوم کے تعارف کا اچھا ذریعہ ثابت ہوا، یہ مقالہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے ارشاد پر راقم سطور نے لکھا تھا۔

۱۳۷۵ھ مصر سے دارالعلوم کے روابط

مؤتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری انور السادات کی آمد کے موقع پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے موصوف سے جامعۃ الازہر اور دارالعلوم کے مابین روابط قائم کئے جانے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، مؤتمر اسلامی اور جامعۃ ازہر میں حضرت مہتمم صاحب کی اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور وہاں سے دو جلیل القدر استاذ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی کو دو سال کے لئے دارالعلوم میں جدید عربی ادب و انشاء کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ ان حضرات کی دو سالہ مدت پوری ہو جانے پر شیخ عبدالوہاب محمود ان کی جگہ پر تشریف لائے، جامعۃ الازہر سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد سے طلبۂ دارالعلوم میں عربی ادب اور عربی زبان میں تقریر و تحریر کا ایک خاص ذوق پیدا ہو گیا ہے اور اب ایک مستقل شعبہ "صفِ عربی" کے نام سے قائم ہے جس سے عربی تعلق والے طلبہ

لے ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ [illegible] ۱۹۵۶ء ص ۴

طلبہ نے مہارت پیدا کرتے ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ عربی بول چال اور عربی
مضمون نگاری پر قادر ہو چکے ہیں۔

دارالعلوم کی مسجد میں توسیع

ابتدا سے یہاں کی مساجد کے عام دستور کے مطابق دارالعلوم کی مسجد کا حوض درمیان
میں تھا۔ گرمی، سردی اور برسات میں اس پر بیٹھ کر وضو کرنا تکلیف دہ ہوتا تھا۔ اسی
کے ساتھ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے مسجد کا صحن بھی تنگ ہو گیا تھا۔
۱۳۹۰ھ میں حوض کو وسط صحن سے ہٹا کر مشرق کی جانب دارالافتاء کی عمارت کے
نیچے بنایا گیا، اس تغیر سے مسجد کے صحن میں بھی کشادگی پیدا ہو گئی اور گرمی، سردی اور
برسات میں کھلی ہوئی جگہ پر وضو کرنے کی تکلیف بھی ختم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ سردی کے موسم میں گرم پانی کے لیے ایک بڑی ٹنکی تیار کرائی گئی
اور حوض کے چاروں طرف پائپ لگا کر اس میں پانی کے نل لگا دیئے گئے۔ اس سے وضو
کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی اور اب بیک وقت بہت سے آدمی حوض کے اطراف
میں بیٹھ کر گرم پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔

ایک مذہبی اجتماع

اس سال بعض اداروں کی جانب سے ملک میں دو اہم اجتماعات منعقد کئے گئے، ایک اجتماع
تبلیغی آل انڈیا سالانہ اجتماع کے نام سے شیرکوٹ (بجنور) میں اور دوسرا
تبلیغی کانفرنس آرہ دست ما چھپرہ (موندرت) میں منعقد ہوا۔ دونوں اجتماعات
میں دارالعلوم کی جانب سے مبلغ دارالعلوم مولانا سعیف اشر صاحب ہاشمی نے نمائندگی
کی، پہلے اجتماع میں اسلام کی فطری تعلیمات اور محاسن اخلاق پر تقریر ہوئی، اس
اجتماع میں صدر جلسہ نے دارالعلوم کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

"اسلام کی خوبیاں تمام مذاہب سے زیادہ ہیں اور دارالعلوم کا مشن تمام
مشنوں سے اونچا اور بلند رہا ہے"

دیوبند کے جلسے میں مولانا موصوف نے خدائے بزرگ و برتر کی توحید، انبیاء و رسل کی عام بعثت، اسلامی اخوت اور بھائی چارے کے موضوع پر تقریر کی، اس تقریر کے بارے میں دیوبند کے اخبار "اتحاد دنیا" نے حسب ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:۔

مسٹر رام جیت سنگھ صاحب نے کہا کہ سب سے دلچسپ تقریر جناب حبیب اللہ صاحب کی تھی، موصوف دیوبند سے آئے، اسلام پر بولے، اس مبلغ اسلام نے اس طرح تبلیغ کی کہ ہر دین کا آدمی ذرا بھی خلاف نہیں کہہ سکتا تھا اور تعریف ہندوؤں نے کی ہے[۱]

فتاویٰ دارالعلوم کی تدوین

طلب فتاویٰ کا سلسلہ قیام دارالعلوم کے زمانے ہی سے شروع ہو چکا تھا، ابتداءً یہ کام حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی انجام دیتے رہے، حضرت مولانا کی وفات کے بعد مختلف اساتذہ سے یہ کام لیا جاتا رہا، لیکن جب طلب فتاویٰ کی تعداد زیادہ بڑھ گئی تو ۱۳۱۰ھ میں اس کے لئے ایک مستقل دارالافتاء قائم کیا گیا، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دارالعلوم کے پہلے مفتی مقرر ہوئے۔ ابتداءً فتاویٰ کی نقول رکھنے کا معمول نہیں تھا، اور خود بقیدہ ۱۳۲۹ھ سے فتاویٰ کی نقول رکھنے کا قاعدہ مقرر ہوا۔ اس لئے دارالعلوم میں شروع کے ۴۰ سال کے فتاویٰ کی نقول موجود نہیں ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کے زمانے کے فتاویٰ جو ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۴۶ھ تک کے فتاویٰ کی تعداد ۳۷۰۶۱ ہے، بالعموم ایک مستفتی کئی کئی سوالات لکھ کر بھیجتا ہے، اگر وسطاً تین سوالات ہر مستفتی کے مان لئے جائیں تو اس طرح فتاویٰ کے مسائل کی تعداد تین گنی ہو کر سوا لاکھ

---

۱ روداد ۱۳۴۷ھ ص ۱۶

کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

حضرت مہتمم صاحب کی اس تحریک کو مجلس شوریٰ نے پسند کیا کہ فتاویٰ کو فقہی ترتیب پر ابواب وار مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ ان فتاویٰ کے مدون و مرتب مولانا ظفیر الدین صاحب نے ترتیب فتاویٰ کے سلسلے میں ایسے فتاویٰ کو جو مکرر تھے اپنی ترتیب میں حذف کر دیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی مسئلہ کی نوعیت میں نمایاں فرق ہوا تو اسے دوبارہ بھی دے دیا گیا ہے۔ فاضل مرتب نے یہ التزام کیا ہے کہ فتاویٰ میں حوالے درج نہیں تھے، مرتب نے ایسے مسائل کے کتب فقہ سے حوالے دیئے ہیں اسی کے ساتھ حوالوں میں کتاب اور باب کے ساتھ مسئلہ کی عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے۔ اس التزام سے ہر مسئلہ اپنی جگہ پر مبرہن ہو گیا ہے اور اگر قاری اصل کتاب سے رجوع کرنا چاہے تو وہ بغیر کسی دشواری کے مراجعت کر سکتا ہے۔ اس طرح سے فتاویٰ دارالعلوم کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ فتاویٰ اپنی اصل شکل میں تاریخ وار تھے یعنی جس ترتیب سے مستفتیوں کی جانب سے بھیجے گئے تھے، اسی ترتیب سے ان کے جواب دیے گئے تھے۔ لیکن کتابی شکل میں لانے کے لئے ان کو فقہی انداز پر مسائل وار مرتب کیا گیا ہے جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کتاب الطلاق میں ۱۸ ابواب ہیں اور ہر باب میں چار چار فصلیں قائم کی گئی ہیں تاکہ تلاش مسائل میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اب تک ان کی ضخیم جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ابھی کئی جلدیں طبع ہونے سے باقی ہیں۔ فتاویٰ دارالعلوم کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ فتاویٰ کا سلسلہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے مگر جو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان کے کئی کئی ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔[1] نویں جلد کتاب الطلاق کے مسائل و احکام پر مشتمل ہے اور تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ دارالعلوم مقدمہ جلد نہم

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳۷۶ھ میں تشریف آوری کے موقع پر فتاویٰ کے
اس ذخیرے کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ اس سے ایک دوسرا تاتارخانیہ مرتب ہو سکتا ہے۔
یہ ایک بڑی دینی خدمت ہے اس سے لوگوں کی مشکلات حل ہوتی ہیں۔[1]

۱۳۷۶ھ صدر جمہوریہ ہند دارالعلوم میں

اس سال کے اہم واقعات میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی دارالعلوم میں تشریف آوری ہے۔

صدر جمہوریہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ (۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء) کو دارالعلوم میں تشریف لائے
یہ کسی سربراہ مملکت کے دارالعلوم میں آنے کا پہلا موقع تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد
مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم
اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے علاوہ مصر کے اسلامی ملک کے نامور
مشائخ عبدالمنعم ... شیخ عبدالعال العقباوی وغیرہ حضرات نے ریلوے اسٹیشن پر

---

[1] فتاویٰ تاتارخانیہ: فتاویٰ عالمگیری کی طرح فقہ کی ایک ضخیم کتاب ہے جو چند جلدوں میں مشتمل ہوتی ہے، یہ کتاب ہدایہ کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں سلطان فیروز تغلق کے عہد میں عالم بن علا تاتارخانی کی فرمائش پر شیخ عالم بن علاء الحنفی نے فتاویٰ کا یہ مجموعہ چار ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں خان اعظم تاتارخان امارت کے منصب پر فائز تھے۔ ایک روایت ہے کہ فتاویٰ تاتارخانیہ کی عام شہرت ہو گئی ہے۔ حلب کے عالم ابراہیم بن محمد نے اس کتاب کی ایک تلخیص بھی تیار کی ہے۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ اس کتاب کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا اس سے خان اعظم کی طرف منسوب ہو کر فتاویٰ تاتارخانیہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

(کشف الظنون مطبوعہ استنبول جلد دوم ص ۲۶۸)

صدر جمہوریۂ ہند کا خیر مقدم کیا۔ صدر جمہوریہ کی کار جب دارالعلوم کے سامنے بیرونی نودرہ پر پہنچی اور قریب دو جلوس کے ہزاروں آدمی شریک جلسہ صدر کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ دارالعلوم کی تاریخ میں اس نوعیت کا استقبال اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا۔ پورا راستہ رنگ برنگ جھنڈیوں سے آراستہ تھا۔ اسٹیشن کے قریب سب سے پہلے دروازے پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

دیدۂ و دل فرش راہ

معائنہ دارالعلوم کے باہر طلبائے دارالعلوم کی دو رویہ قطاریں کھڑی ہوئی تھیں، سامنے ہی ہند و بیرون ہند کے طلباء کے علیحدہ علیحدہ گروپ تھے۔ طلباء دارالعلوم ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔

صدر جمہوریہ نے دارالعلوم کا تفصیلی معائنہ فرمایا، عمارتیں دیکھیں، کتب خانہ کے نوادر مخطوطات ملاحظہ فرمائے، آزادیٔ وطن کی راہ میں علمائے دیوبند کی قربانیوں کی داستان سنی، ساتھ ہی طلباء کا سادہ طرز معاشرت دیکھا، قرآن مجید کے ایک فارسی ترجمے کو بڑی توجہ سے ملاحظہ فرمایا اور اس میں راقم سطور سے چند آیتوں کا ترجمہ پڑھوا کر سنا۔ معائنہ دارالعلوم کے بعد خیر مقدم کے ایک عظیم الشان جلسہ میں حضرت مہتمم صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا، صدر نے اس کے جواب میں دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"دارالعلوم کے بزرگوں نے صرف اس ملک کے رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے ایسی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ملک کے طالب علم بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر اور جو کچھ یہاں انھوں نے سیکھا ہے اپنے ملکوں میں واپس جاکر اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے سبھی باشندوں کے لئے قابل فخر

ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ جس خلوص، نیک نیتی اور جس عزم و ارادے کے ساتھ اس کام کو آج تک کرتے آئے ہیں آئندہ بھی اسے جاری رکھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ دارالعلوم دن بدن ترقی کرتا رہے گا اور صرف اس ملک ہی کی نہیں بلکہ غیروں کی بھی خدمت کرتا رہے گا۔

سہ پہر میں ظہرانے کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند نے اراکین دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"دارالعلوم کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھنا مقصد سمجھتے ہیں، ایسے لوگ پہلے بھی ہوتے ہیں، مگر کم جنہوں نے علم کو محض علم کی خدمت کے لئے سیکھا اور سکھایا، ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دارالعلوم یا مسلمانوں کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے۔

آج دنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیل رہی ہے۔ دلوں کا اطمینان اور سکون مفقود ہے۔ اس کا صحیح علاج روحانیت ہے، میں دیکھتا ہوں کہ سکون اور اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لئے مہیا فرما رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے تو دنیا کو بالآخر اسی راستہ پر آنا ہے اس لئے دارالعلوم کے بزرگ جو اہم علمی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ آگے بڑھے گی اور کام اسی طرح جاری رہے گا۔ میں دارالعلوم آکر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں، میں تمام ذمہ داران دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتا ہوں"[1]

[1] صدر جمہوریہ ہند دارالعلوم دیوبند میں (۱۹۵۷ء) مرتبہ سید محبوب رضوی، شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

حضرت مہتمم صاحب نے صدر جمہوریۂ ہند کی نسبت اپنے تاثرات کا حسب ذیل الفاظ میں اظہار فرمایا:۔

"صدر جمہوریۂ ہند کو ہم نے نہ صرف ایک عظیم عہدے کا باوقار مسند نشین دیکھا بلکہ ہم نے انہیں ایک نہایت ہی معقول شخص اور جذبۂ احترام کا مستحق اور ایک صاحب تہذیب و اخلاق انسان بھی پایا۔"

دارالعلوم میں صدر جمہوریۂ ہند کی آمد کے موقع پر ہندوستان کے انگریزی کے پریس خصوصاً ہندوستان ٹائمز نے دارالعلوم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے نامناسب نہ ہوگا اگر ان کو بجنسہ یہاں پیش کر دیا جائے۔ آج کل جدید تعلیم یافتہ طبقے میں جو ترقی پسند رجحانات پائے جاتے ہیں "ہندوستان ٹائمز" نے اپنے مقالے میں ان کی ترجمانی کی ہے اس نے لکھا ہے:۔

"ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو دارالعلوم کے متعلق زیادہ معلومات کا دعویٰ کر سکتے ہیں جن کی پبلسٹی بہت ہی کم ہوئی لیکن جو عرصے سے اپنے خاموش اور اصلی کام سے افراد اور واقعات پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، ایک ایسا ادارہ دورۂ ہند میں اسلامی درسگاہ دارالعلوم ہے جہاں صدر جمہوریۂ ہند گئے تھے، ایک مذہبی کالج کے اعتبار سے دارالعلوم کا تمام دنیائے اسلام میں الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے بعد دوسرا درجہ ہے، اس لئے یہ بات باعث تعجب نہیں کہ الازہر کے دو اساتذہ کا ایک خیرسگالی مشن گذشتہ دو سال سے دارالعلوم میں کام کر رہا ہے، جن لوگوں نے ۱۸۶۷ء میں دیوبند کی درسگاہ کی بنیاد رکھی ان میں وہ علماء تھے جنہوں نے دس سال پہلے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا، یہ مدرسہ کی بنیاد رکھنا غیر ملکی حکومت کے قیام کا ایک ردعمل تھا کیونکہ اس کے بعد سے دیوبند کے رہنماؤں نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا اور سرگرمی کے ساتھ وابستہ رکھا جس کا مقصد ملک کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا، جمعیۃ علماء ہند کے بیشتر رہنما جو قوم پرست علماء کی ایک جماعت ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل

گئی ہے جب مسٹر جناح مسلم لیگ کی پرورش (برطانیہ تھا) پالیسیاں ورنہ کئی ہندو قوموں کی تعمیری
کسی وقت بھی باحوصلہ اور کر قومی کیریکٹر کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے باز رکھ سکیں۔
رد عملات کے بعد میں سیاست کے خلاف تھے۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں انھوں نے جنگ عظیم دوم
کے ختم ہونے پر کانگریس کے رجحان کی تصدیق کی۔ لیکن اس درسگاہ نے صرف ملک کی سیاسی
زندگی ہی میں اہم حصہ ادا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے مذہبی کام جن میں دیوبند کی کتابوں کی
تیاری بھی شامل ہے دنیائے اسلام تک سراہے گئے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں اس نے
اسلامی معاشرے کی روایت کو قائم رکھا۔ عربی اور فارسی میں دلچسپی کو برقرار رکھا اور اردو
کے کاز کو ترقی دی۔

دیوبند کی درسگاہ پر جو نکتہ چینی کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ سیاسی طور پر اور اکیڈیمک میدان
میں یہ زیادہ ترقی پسند نہیں رہی ہے۔ کلاسیکل قسم کے جمود اور قدامت پرستی پر اس کا اصرار
قابل تعریف ہو سکتا ہے لیکن اگر درسگاہ مستقبل میں کرنے کی خواہش رکھتی ہے جو اس کو رکھنی چاہئے تو
اس کو اپنے طریق کار میں موجودہ حالات کے مطابق اعتدال پیدا کرنا ہوگا۔ سیکولرزم نے اب
یہ معنی اختیار کر لئے ہیں کہ ہر مذہب کی بھی موجودہ حالات کے مطابق نئی تشریح ہونی چاہئے
مختلف مذہبی رہنماؤں کی طرف سے اپنے پیروؤں میں زیادہ مفاہمت اور یکسانیت پیدا کرنے کی
تحریک خاص توجہ کی مستحق ہے۔ تاہم کوشش مستقل بنیاد پر نہیں ہونی چاہئے۔ یہاں دیوبند
جیسے ادارے کا کام ہے کہ وہ ایسے نظریات کو فروغ دینے کے سلسلے میں عملی اقدامات کرے
جن کا مقصد ہو کہ جو تمام مذاہب کے اصول اور عادات کے احترام کے حامل ہوں اور جو
ہندوستانی اور صحت مند سیکولرزم کے جدید تصورات کو نظر میں رکھتے ہوئے حوصلہ افزائی کرتی

ہندوستان ٹائمز نے اپنے اداریے کے آخر میں دارالعلوم کو جو مشورہ دیا ہے

۱؎ ہندوستان ٹائمز، مورخہ [illegible] جولائی ۱۹۶۷ء

اس پر روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی نے اُسی وقت تبصرہ کیا تھا، اس تبصرہ کے بعد مزید کسی جواب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ "الجمعیۃ" کا تبصرہ حسب ذیل ہے:۔

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کو حال ہی میں دیوبند تشریف لے جانیکا اتفاق ہوا۔ تشریف بری کی غرض یہ تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کا معائنہ فرمائیں اور اس مرکز علوم سے جو ایک صدی تک تحریک آزادی کا سرچشمہ رہا ہے رابطہ پیدا کریں۔ آپ نے وہاں پہنچکر دارالعلوم کے کتب خانے پر نظر ڈالی، اس کے نادر نایاب مخطوطات کو معائنہ کا شرف بخشا، اساتذہ کرام سے تبادلۂ خیال فرمایا، اور اپنی تقریر میں دارالعلوم کی طویل خدمات کو سراہا، اور اس کی تاریخی اور مذہبی عظمت کا اعتراف کیا، اس کی طرف سے بہترین جذبات لے کر واپس ہوئے۔

معاصر "ہندوستان ٹائمز" نے بھی صدر محترم کے اس مختصر دورہ کو خاص اہمیت دی ہے، اور پوری سیر چشمی کے ساتھ دارالعلوم کے شاندار ماضی کو خراج تحسین ادا کیا ہے، اس نے برملا طور پر اعتراف کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اُن اداروں میں سے ہے جس نے اپنی خاموش اور مسلسل خدمات سے اشخاص اور واقعات کو بیحد متاثر کیا ہے، اور ہندوستان میں صرف یہی ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جو عالم اسلام میں الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے بعد خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کے بیروں میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے سب سے پہلے جنگ آزادی میں حصہ لیا اور آزادی کی ہر تحریک کو اپنایا، جمعیۃ علماء ہند جو قوم پرور علماء کا سب سے زیادہ طاقتور ادارہ ہے، اس کی کارفرما شخصیتیں اسی دارالعلوم دیوبند کی پیداوار ہیں، ان علماء کو نہ تو مسلم لیگ کی جدید پالیٹکس، جیسی متاثر کر سکی اور نہ دو قومی نظریہ، ان کے دل و دماغ کو بدل سکا، تحریک آزادی کے بعد بھی علماء کانگریس کے فیصلوں کی تصدیق میں پیش پیش رہے۔ معاصر نے ان سطور میں دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء اور اس کے سربراہوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد صرف واقعات ہیں، اور ہم خوش ہیں کہ وہ حقیقت کا اعتراف اس خوش اسلوبی

کے سپرد کیا گیا۔

معاصر نے ان اعتراضات کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ دارالعلوم کو اپنی قدامت پسندی کی پرانی رسم ترک کرتے ہوئے ایک نئی لچک پیدا کرنی چاہیے کہ وہ جدید مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ دارالعلوم پر اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ اس نے سماجی اور اقتصادی میدان میں خاطر خواہ ترقی نہیں کی، لیکن ہمارے نزدیک یہ اعتراض کی کوئی بات نہیں، ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کو مشورہ دینے اور اس کی بعض خامیوں پر انگلی رکھنے کا مجاز ہے، اور ہم بھی اسی بھائی چارہ کی اسپرٹ میں عرض کریں گے کہ ترقی اور قدامت پسندی کا مفہوم اضافی RELATIVE بھی ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ معاصر کے نزدیک دارالعلوم کے کردار میں جمود ہو مگر یہ واضح ہے کہ دارالعلوم جن مقاصد کے لئے قائم کیا گیا ہے وہ شروع سے ہی بڑی شان سے [illegible] رہا ہے، اگر ملک کی تقسیم عمل میں نہ آتی اور حالات کی تبدیلی اس کی مالیات پر اثر انداز نہ ہوتی تو اس کے دائرہ کار میں مزید وسعت پیدا ہوتی اور اس کے قدم ترقی کے میدان میں اور آگے بڑھتے، مگر یہ اندازہ ہو سکا جس کا ہمیں اپنے معاصر سے زیادہ احساس ہے۔

معاصر کے مشوروں میں یہ مشورہ بھی شامل ہے کہ آج کے نظام کے تحت نئے معنی دیئے جا رہے ہیں، اسی طرح مذہب کی تشریح اور تعبیر بھی ایسی ہونی چاہیے جو موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کر سکے، شاید معاصر کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے اصول ہر زمانے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور ہم کسی ایسی تفسیر پر مجبور نہیں ہیں جو اصولوں کو مسخ یا ان کی نفی کرنے کے مترادف ہو۔ تجربہ یہ ہے کہ عالمگیر اصولوں میں مساوات، انسانی بھائی چارہ، احترام آدمیت اور شخصی و عائلی حقوق، وراثت اور عورت کے احکام صرف اسلام ہی کی رسائی کا نتیجہ ہیں۔ اور دوسروں نے اسلام کے ان ہی اصولوں اور قوانین کی پیروی کر کے اپنی تمدنی ترقی کا نتیجہ [illegible] پایا ہے، جہاں تک مذہب کی نئی تعبیر کا تعلق ہے، دوسروں کو اس کی ضرورت ہمیشہ پیش آئی ہے، اسلام تو بجائے خود ایسی تفسیر ہے جو ہر زمانے کے مزاج پر حاوی ہے

اور سوسائٹی کی ہر ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

مولانا کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر مذہب کے لیڈروں کو سماجیت کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے، نیز دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام مذاہب کے اصول و اعمال کا احترام کرتے ہوئے ایسے خیالات کو نشوونما دے جو موجودہ رجحانات کے ساتھ حقیقی اور صحت مند سیکولرزم کو فروغ دے سکیں، بلاشبہ اس مشورہ سے اختلاف کرنا مشکل ہے لیکن اگر سیکولرزم کے وہ معنی نہیں ہیں جو آج تنگ دلی اور تعصب کے لئے مشہور ہے تو اس کے علم بردار ہمیشہ علماء دیوبند ہی رہے ہیں، تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں جب کہ سیکولرزم وجود میں بھی نہیں آیا تھا جب علماء دیوبند نے اپنی حکومت کا نقشہ بنایا تو اس کی صدارت کے لئے ان کی نظر انتخاب راجہ مہندر پرتاپ پر پڑی، ہمیں کہنے دیجئے کہ اس سے بہتر اور صاف اور ستھرا سیکولرزم آج تک پیدا نہ ہو سکا، اور آئندہ بھی اس کی توقع ہم سے یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی، ہم نے صاحب کے اشارات کے لئے اشارات ہی کی زبان اختیار کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس زبان کو سمجھنے میں ان سے دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

حضرت مہتمم صاحب کا سفر برما

اس سال کے اہم حالات میں حضرت مہتمم صاحب کا سفر برما بھی شامل ہے، اس سفر کے محرک رنگون کے ایک رجل خیر جناب حاجی اسمٰعیل محمد باگیا صاحب تھے، موصوف سورت کے رہنے والے ہیں مگر مدت سے تجارت کے سلسلے میں رنگون میں قیام ہے، حضرت مہتمم صاحب کا یہ سفر جمادی الاولیٰ سے ۱۰ رجب تک جاری رہا، اور برما کے مختلف شہروں میں وہاں کے اہل خیر حضرات کی دعوت پر جانا ہوا، حضرت مہتمم کے اس طویل سفر کے بعد برما میں دارالعلوم کا تعارف خواص سے گذر کر عوام تک ہو گیا اور دارالعلوم کے حلقۂ اثر کی غیر معمولی توسیع ہوئی، عوام اور حکومت دونوں حضرت مہتمم صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوئے،

؎ روزنامہ الجمعیۃ دہلی [illegible] جمادی الثانیہ [illegible]۔

برما کے وزیر اعظم او نو کے علاوہ وزیر عدل و اوقاف جناب عبداللطیف صاحب اور وزیر
معدنیات جناب عبدالرشید صاحب نے مقصد سفر کو کامیاب بنانے میں بڑا حصہ لیا، خصوصاً
جناب عبداللطیف صاحب اکثر برما کے سفر دورہ میں حضرت مہتمم صاحب کے ہمراہ رہے۔
عوام نے اپنے غیر معمولی جذبہ کا اظہار دارالعلوم کے لئے دو لاکھ روپے سے زائد کی رقم فراہم
کرکے کیا اور حکومت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس رقم کو ہندوستان منتقل کرنے کی
اجازت دے دی۔ اس رقم سے کتب خانہ دارالعلوم کے لئے ایک بڑا ہال تعمیر کیا گیا ہے جو
مسلمانان برما کی دارالعلوم میں ایک عظیم یادگار ہے۔

اس چندے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں دس ہزار روپے خود وزیر اعظم او نو کی جانب
سے تھے، موصوف نے غیر مسلم ہوتے ہوئے اپنی علمی فیاضی اور رواداری کی ایک ناقابل
فراموش مثال قائم کی۔ مجلس شوریٰ نے مسلمانان برما کی اس علم دوستی پر دارالعلوم کی
جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے بطور خاص وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا۔ یہاں یہ بتا دینا
ضروری ہے کہ اہل برما خصوصاً رنگون کے باشندے اگرچہ دارالعلوم کی امداد و اعانت
میں حصہ لیتے رہے ہیں، مگر اتنی بڑی مقدار میں چندہ کی فراہمی کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس سفر
کی تفصیلات سفر نامہ برما کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۳۷۷ھ حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات

اس سال کے عظیم ترین اور دردناک
[illegible] سب سے بڑا حادثہ
جو دارالعلوم ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کے لئے حادثہ کبریٰ تھا، وہ حضرت مولانا
سید حسین احمد صاحب مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات کا تھا۔
حضرت مولانا مدنیؒ نے طویل علالت کے بعد ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ بمطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء
کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مولانا مدنیؒ کی شخصیت دارالعلوم کے لئے صرف صدر المدرسین
کی ہی نہیں بلکہ وہ دارالعلوم کے سرپرست اور مربی بھی تھے، ان کے ظاہری اور باطنی فیوض

سے دارالعلوم کے اساتذہ، کارکن اور طلبا سب ہی بہرہ ور ہوتے تھے۔ ۳۲ سال تک آپ نے دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے علم حدیث اور دارالعلوم کے نظام تعلیم کی بے نظیر خدمات انجام دیں اور ہزاروں تشنگانِ علوم آپ کے دریائے علم و معرفت سے سیراب ہوئے ۳۰۲۰ سو علماء نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ حضرت مولانا مدنیؒ نے علم و فضل زہد و تقویٰ اخلاق و کمالات، علمی و دینی اور سیاسی و اجتماعی خدمات کے لحاظ سے ہندوستان[1] کے علمی و دینی اور سیاسی طبقۂ علماء میں ایک بے نظیر شخصیت رکھتے تھے۔ اس لئے پورے عالم اسلامی میں اس حادثۂ کبریٰ کو محسوس کیا گیا۔ حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ اپنے استاذ جلیل حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے برابر قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

شاہ افغانستان کا ورود

۱۹۵۸ء کے اہم واقعات میں شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ کا دارالعلوم میں ورودِ مسعود ہے، جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا باب ہے جو نہ صرف دارالعلوم کے ذریں ماضی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے، بلکہ اس کے شاندار مستقبل کی بھی غمازی کرتا ہے۔ شاہ افغانستان نے ازراہ علم نوازی دارالعلوم کی دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور پروگرام کے مطابق ۵ شعبان ۱۳۷۷ھ (۲۵ فروری ۱۹۵۸ء) کو دیوبند تشریف لائے۔ دارالعلوم کی جانب سے شاہ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور افغانستان کے تعلقات

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانستان سے ہمیشہ دارالعلوم کے مخلصانہ تعلقات رہے ہیں جن میں دونوں طرف سے یگانگی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کا عظیم الشان دروازہ "باب الظاہر" دارالعلوم اور افغانستان کے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے شاہ افغانستان دارالعلوم دیوبند میں ص ۱۳۲، مرتبہ سید محبوب رضوی شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

گہے بہر حال یہ رشتہ تعلق کی ایک ایسی یادگار ہے جو ہر وارد و مسافر کے ذہن کو بے ساختہ افغانستان
کی دولت عہد ماضی کی جانب منتقل کر دیتا ہے

ہندوستان اور افغانستان کا تعلق جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے اتنا ہی پرانا ہے۔
جتنا دو ہمسایہ ملکوں کا قدرتی طور ہو سکتا ہے۔ دونوں ملک ایک مرتبہ متحد بھی رہ چکے ہیں اور
ہیں بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی ہندوستان اور افغانستان ایک دوسرے کے بہت قریب
ہیں۔ افغانستان کی زبان فارسی ہندوستان پر چھ سو سال کے قریب حکمران رہی ہے اور
آج بھی ہندوستان کے بہت سے لوگ اس کو سمجھتے اور پڑھتے ہیں۔ ہندوستان کی
مشکل ہی سے کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں تھوڑے سے بہت فارسی کے الفاظ موجود نہ ہوں۔

۱۸۶۷ء میں جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو بیرونی ممالک میں افغانستان
ہی وہ ملک ہے جس نے سب سے پہلے دارالعلوم کا خیر مقدم کیا، اور اپنے نوجوانوں کو اسلام
کی آغوش تعلیم و تربیت کے سپرد کر دیا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں سفر کی موجودہ سہولتیں میسر نہ
تھیں، شمالی ہند کا نارتھ ویسٹرن ریلوے جو بعد میں افغانستان اور ہندوستان کے درمیان
آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ بنا ہے اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی، اس چیز سے
جہاں ایک طرف افغانستان کے غیر معمولی دینی جذبہ اور علم دوستی کا ثبوت ملتا ہے، وہیں دارالعلوم
کی روز اول سے مقبولیت کا پتہ بھی چلتا ہے، اسی وقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم
کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں افغانستان کے طالب علم کی تعلیمی سرگرمیاں
دارالعلوم کی رونق کا باعث نہ رہی ہوں، اور اُدھر افغانستان میں بھی فضلائے دارالعلوم
کے لئے ملک کے اعلیٰ علمی و دینی عہدوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ نے جب بیسویں صدی کے دوسرے
عشرے میں ہندوستان کے لئے ایک عارضی حکومت کا خاکہ تیار کیا تو اس کا مرکز افغانستان
ہی کے دارالسلطنت کابل ہی کو بنایا گیا تھا، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت

مولانا محمد میاں منصوری عرف مولانا منصور انصاری کو اسی مقصد کے لئے بطور خاص
افغانستان بھیجا گیا۔ یہ دونوں حضرات حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی تحریک کے سرگرم ارکان
تھے۔ ان کی یہ جدوجہد دارالعلوم اور افغانستان کے درمیان تعلقات کے استحکام
میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

غرض کہ افغانستان کے ہندوستان اور بالخصوص دیوبند سے بہت پرانے اور گہرے
تعلقات قائم رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم
دیوبند کے سفر افغانستان کے موقع پر ان دیرینہ تعلقات کا اظہار ہوا جس کی
قدرے تفصیل گذر چکی ہے۔ دارالعلوم میں "باب الظاہر" کی تعمیر اسی سفر کے نتیجے میں عمل پذیر
ہوئی۔

جشن صد سالہ میں شرکت کے لئے اعلیٰ حضرت امیر کے رفقا حضرت مہتمم صاحب
اور حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی معیت میں دارالحدیث کے شمالی زینے سے اوپر
تشریف لے گئے اور "رسالہ دارالعلوم" کے دفتر سے گذرتے ہوئے دارالاہتمام میں رونق
افروز ہوئے۔ بعد ازاں اعلیٰ حضرت نے معائنہ نامۂ دارالعلوم کا معائنہ فرمایا اور "بسیار خوب است"
کے الفاظ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ کتب خانے میں تشریف لے گئے، یہاں نادر و
نایاب مخطوطات، مختلف عہد کے لکھے ہوئے قرآن شریف کے قلمی نسخے اور شاہی عطیات
میں سعودی عرب، ترکی، مصر، ایران اور دکن کی عطا کی ہوئی کتابیں نہایت قرینے کے
ساتھ سجائی گئی تھیں۔ حکومت افغانستان کی عطا کی ہوئی کتابیں خاص طور پر رکھی ہوئی تھیں
ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ کا ترجمہ قرآن مجید بحواشی حضرت مولانا
شبیر احمد عثمانیؒ کا وہ نسخہ بھی شامل تھا جس کو حکومت افغانستان نے سردار محمد ہاشم
خاں مرحوم سابق وزیر اعظم کی نگرانی میں سرکاری طور پر اردو سے فارسی میں منتقل کرایا
ہے۔ اس کا اردو ایڈیشن حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے شاہ افغانستان کی خدمت

میں طور ہدیہ پیش کیا گیا تھا اور اسی وقت سے اس کے فارسی ترجمے کی داغ بیل پڑ گئی تھی یہ کتاب پر خوشنما کور چڑھا ہوا تھا جس میں کتاب کا تعارف درج تھا۔ شاہ نے نہایت توجہ اور پسندیدگی سے ان سب چیزوں کو ملاحظہ فرمایا۔

شعبہ جات دارالعلوم اور کتب خانہ کے معائنہ کے بعد شاہ دارالحدیث کے مشرقی برآمدہ سے گزرتے ہوئے اور وہاں کی تعمیرات کو ملاحظہ فرماتے ہوئے دارِ جدید کے شمالی صحن میں تشریف لائے یہاں دفتروں کے سامنے سے "باب الظاہر" کو ملاحظہ فرمایا اور جلوس گاہ میں تشریف لے گئے۔

دارِ جدید کے جنوبی صحن میں باب الظاہر کے نیچے ایک وسیع و عریض پنڈال تیار کیا گیا تھا۔ یہ عظیم الشان پنڈال بہ حسن و سادگی و شوکت کا ایک عجیب دلکش منظر پیش کر رہا تھا مختلف قطعوں میں تقسیم تھا۔ اس کی داہنی جانب دارالعلوم کے اساتذہ، شعبہ جات کے نظماء اور دیگر کارکنوں، ہمراہیان اعلیٰ حضرت اور انڈیا یونین کے نمائندوں کی نشستیں تھیں، اور بائیں جانب اعلیٰ حضرت کے رفقاء، مقامی حکام اور معزز مہمان تشریف فرما تھے، سامنے کے حصے کو دو قطعوں میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلا قطعہ طلبہ دارالعلوم اور دوسرا حصہ عوام کے لئے مخصوص تھا، یہ مجمع تقریباً بیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

ڈائس کے سامنے دارالعلوم زندہ باد اور اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ افغانستان اور جمہوریہ ہند زندہ باد کے خوشنما کتبے آویزاں تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم نے فارسی میں افتتاحی تقریر فرمائی جس میں اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری پر دارالعلوم کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے دارالعلوم کی علمی و عرفانی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی تھی، حضرت ممدوح نے فرمایا۔

"اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک! دارالعلوم میں آپ کی تشریف آوری کا ہم پُرخلوص خیر مقدم کرتے ہوئے بڑے ادب و عقیدت سے جذبات تشکر و امتنان پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لطف و

کرم سے آپ کا وجود مسعود ہمارے لئے فخر و مباہات کا موجب ہے

اعلیٰ حضرت! جس جگہ آپ اس وقت رونق افروز ہیں یہ مقام دینی تعلیم کا مرکز اور مسلک حق کا محور ہے۔ یہ صرف ایک مدرسہ جامعہ ہی نہیں بلکہ یہ بلند دین و ایمان کا ستون اور طریقت و شریعت کی اساس اور محبت الٰہی کے خزانے بھی اپنی آغوش میں رکھتا ہے اور مادیت و الحاد کی اس گرم بازاری کے زمانے میں حق و صداقت کا روشن مینار اور انجمن حق کی شمع فروزاں ہے۔

اعلیٰ حضرت! اس تشریف آوری کے موقع پر آپ ہندوستان میں بہت سی قدیم عمارتیں اور تاریخی مقامات ملاحظہ فرمائیں گے اور یہاں کی دینی شخصیتوں سے مل کر یقیناً مسرور ہوں گے مگر یہ سب ذہنی اور دنیوی ترقی کے مظاہر ہیں۔

لیکن یہ دارالعلوم تمام اسلامی دنیا میں علمی روحانی اور اخلاقی عظمت کے لحاظ سے ایک بلند و علمی مقام رکھتا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ادارہ رشد و ہدایت کا آفتاب الصراط مستقیم اور دین قویم کا مظہر ہے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

اعلیٰ حضرت! ہر چند یہ ادارہ دنیوی طمطراق اور تمدنی شان و شکوہ سے تہی دامن ہے مگر اس کا قدم قدم حق و صداقت کا پابند اور علم و معرفت کی درخشانی کا مظہر ہے اور اس ادارے کے ماضی و حال کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہاں کے اکابر و علماء ہمیشہ علم و معرفت کے علمبردار رہے ہیں اور سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے کوئی چیز ان کے لئے محور عمل نہیں رہی:

جلسہ خیر مقدم میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اعلیٰ حضرت کو سپاس نامہ پیش کیا آخر میں اعلیٰ حضرت پُرجوش نعرہ ہائے تکبیر کے درمیان تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے فارسی میں تقریر فرمائی جس میں دارالعلوم کی علمی و عرفانی

کا اعتراف دارالعلوم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شاندار استقبال پر اظہارِ مسرت
کیا شاہ کی تقریر کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور پر دوسرے ممالک کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے۔ افغانستان کے علماء دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور علم و روحانیت کے میدان میں جو فضیلت اور مرتبت انھیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل اور مداح رہے ہیں۔ افغانستان میں اس دارالعلوم کی شہرت محض اس سبب ہی سے نہیں ہے کہ یہ ایک مشہور ادارہ ہے، بلکہ درحقیقت یہ نتیجہ ہے ان تعلقات کا جو افغان طلباء اور اس دارالعلوم کے درمیان عرصۂ دراز سے قائم رہے ہیں، بہت سے افغان علماء اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے اور انھوں نے اپنے وطنِ عزیز واپس جا کر علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دی ہیں۔

میں آپ کے اس دوستانہ اور پُرمسرت استقبال سے جو میرا یہاں کیا گیا ہے بہت ہی متاثر ہوا ہوں اور تہِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اس علمی درسگاہ سے تعلق رکھنے والے تمام اشخاص کی مزید کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں"

۱۳۷۷ھ شعبۂ تنظیم فضلائے دارالعلوم

مجلس عام میں فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کا طریقہ شروع ہوا

ل شاہ افغانستان دارالعلوم دیوبند میں [illegible]

ہی سے دارالعلوم میں جاری ہے، ابتداءً دستار بندی کے جلسے چند سالوں کے فاصلے سے
جلد جلد ہوتے رہے تھے، جیسا کہ ابتدائی سالوں کے حالات میں ان کی تفصیلات درج کی
جا چکی ہیں، پھر طویل وقفے کے بعد ۱۳۴۴ھ میں بڑے پیمانے پر دستار بندی کا ایک عظیم الشان
جلسہ منعقد کیا گیا جس کی یاد اب تک دیکھنے والوں کے دلوں میں باقی ہے، ۱۳۴۴ھ کے
بعد سے اب تک بڑے پیمانے پر دستار بندی کا کوئی جلسہ منعقد نہیں ہو سکا، اس سے
مجلس شوریٰ نے ایک تجویز کے ذریعے طے کیا کہ ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم کی عمر کے سو سال
پورے ہونے پر فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کے لئے عظیم الشان پیمانے پر جلسہ
دستار بندی منعقد کیا جائے، چنانچہ اخبارات میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا، اس وقت میں
چونکہ طلبائے دارالعلوم کی ایک بڑی تعداد نے فراغت حاصل کی تھی اس لئے اس کام کیلئے
عارضی طور پر ایک شعبہ "نظم جلسہ جشن دستار بندی" کے نام سے قائم کیا، مگر حالات کی ناسازگاری
کی وجہ سے یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا، اسی بناء پر جو شعبہ اس مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا
۱۳۸۳ھ میں اسے "تنظیم فضلائے دارالعلوم" کے نام سے موسوم کرنا مناسب سمجھا گیا کہ جلسہ
دستار بندی سے قبل فضلائے دارالعلوم کی تنظیم کا کام ہو سکے۔

تنظیم فضلائے دارالعلوم بھی اکابر کی ایک دیرینہ آرزو تھی اور عرصے سے یہ خواہش
محسوس کی جا رہی تھی کہ فضلائے دارالعلوم ایک رشتے کی لڑی میں منسلک ہو جائیں جس کے
ذریعے سے دارالعلوم ان کے حالات کار اور خدمات سے باخبر رہے اور وہ دارالعلوم کے عمومی
حالات سے واقف رہیں، چنانچہ اخبارات اور کتابچوں کے ذریعے سے تنظیم فضلائے دارالعلوم
کی غرض و غایت کی اشاعت کی گئی، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فضلائے دارالعلوم بھی اس کو
ضروری سمجھتے ہیں اور انہوں نے اس بارے میں اپنی خدمات پیش کرنے کا یقین دلایا تو ایک نقشہ
عمل مرتب کر کے کام شروع کر دیا گیا اور فضلائے دارالعلوم کی فہرستیں تیار کر کے ہر ضلع
میں بھیجی گئیں، چنانچہ مختلف صوبہ جات اور اضلاع میں فضلائے دارالعلوم نے مرکز

کی ہدایت کے مطابق ہر صوبے ضلع میں اجتماعات بلا کر دارالعلوم کے ساتھ مخلصانہ تعاون
کا ثبوت دیا، مگر افسوس ہے کہ بہت سے مقامات کے فضلائے دارالعلوم کی سرد مہری یا
لاعلمی کے باعث تنظیم فضلائے دارالعلوم میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہو سکی اور اب تک یہ کام
پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، امید ہے کہ ابتدائی مراحل طے ہونے پر اجلاس منعقد کیا
جا سکے گا۔

۱۳۷۹ھ حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ افریقہ

ری یونین (مشرقی افریقہ) کے ہمدردانِ دارالعلوم جناب
حاجی احمد پٹیل و محمد پٹیل صاحبان کی دعوت پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے اوائل ۱۳۷۹ھ میں
ری یونین کا سفر فرمایا، اس سفر کے دوران زنجبار، دارالسلام، موریشس، مڈغاسکر اور
ری یونین کے مختلف شہروں میں تشریف لے جانا ہوا، وہاں کے باشندوں نے عقیدت
مندانہ انداز سے خیر مقدم کیا، جگہ جگہ جلسے ہوئے، حضرت مہتمم صاحب نے جلسوں میں اس
سفر میں اس کی تحریک فرمائی کہ دینی لحاظ سے ان علاقوں کے پسماندہ مسلمان اپنے
بچوں کو تعلیم کے لئے دارالعلوم بھیجیں تاکہ یہ بچے دینی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے
مقامات کے عوام تک اسلام کی تعلیمات پہنچانے کا ذریعہ بنیں، اس کے علاوہ خود مقامی طور
پر ابتدائی تعلیم کے لئے تعلیم گاہوں کا انتظام کریں، حضرت مہتمم صاحب کے اس سفر سے
دارالعلوم کو مادی فائدہ بھی کافی پہنچا اور تقریباً [illegible] روپے دارالعلوم کو ملے، طلبہ
تحریک حاصل ہو گئے۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جوبلی میں دارالعلوم کی نمائندگی

دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ایک مشہور
اشاعتی ادارہ ہے یہ ادارہ صرف ہندوستان ہی نہیں
بلکہ دنیائے اسلام کے اہم اداروں میں
شمار ہوتا ہے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ نے اپنی زندگی میں علمی نوادر اور مخطوطات کی طباعت

و اشاعت کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور مختلف اسلامی علوم و فنون کی کتابیں
گرانقدر مصارف برداشت کر کے بڑے اہتمام سے شائع کی ہیں جو ہند و بیرون ہند
کے علمی حلقوں میں بڑی قدر و عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، دائرۃ المعارف نے
جنوری ۱۹۷۰ء میں بڑے پیمانے پر جشن منانے کا اہتمام کیا تھا جس میں ایشیا
اور مغربی ملکوں کے فضلاء نے بھی شرکت کی تھی اس میں باضابطہ دارالعلوم کو بھی شرکت کی
دعوت دی گئی تھی، دارالعلوم کی طرف سے مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم اور
ناظم مطبوعات جناب محبوب رضوی کو حیدرآباد بھیجا گیا، دارالعلوم کی جانب سے حضرت مہتمم
صاحب کا پیغام اور ایک علمی مقالہ بھی جشن کے اجلاس میں پیش کیا گیا، اس موقع پر کتب خانہ
دارالعلوم کے نایاب مخطوطات بھی جشن کی نمائش میں پیش کئے گئے، دارالعلوم کی اس علمی
شرکت سے ہندوستان کے ان دونوں علمی اداروں میں گہرے روابط قائم ہو گئے، دوران
قیام حیدرآباد میں آندھرا پردیش کے گورنر جناب بھیم سین سچر نے دارالعلوم کے ارکان
وفد کو چائے پر مدعو کیا جو دارالعلوم کی عظمت اور مرکزی حیثیت کا اعتراف تھا۔

صدر جمال عبدالناصر کے لئے علمی ہدایا

مارچ ۱۹۶۰ء میں صدر جمہوریہ مصر جمال عبدالناصر مرحوم ہندوستان
کا دورہ کرنے والے تھے، اس سفر سے قبل حضرت مہتمم صاحب قاہرہ میں موجود تھے حضرت
ممدوح نے صدر ناصر کو دارالعلوم میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی، صدر ناصر جب
ہندوستان کے دورے پر آئے تو رمضان کا پہلا ہفتہ تھا جو دارالعلوم میں تعطیل کا زمانہ ہوتا
ہے، اس لئے حضرت مہتمم صاحب نے ایام تعطیل میں دارالعلوم میں صدر ناصر کی تشریف
آوری کو ان کے شایان شان نہ سمجھتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ خود دہلی پہنچ کر ملاقات
فرمائیں، حضرت ممدوح نے اس موقع پر دارالعلوم میں سالانہ تعطیل کا عذر کرتے ہوئے
دیوبند میں ملاقات نہ ہو سکنے پر اظہار معذرت فرمایا، اور اس کی تلافی کے طور پر دارالعلوم

کتاب سے معجم البخاری، فتح الملہم اور سوانح قاسمی کے نسخے علمی ہدیے کے طور پر
پیش فرمائے۔ صدر ناصر نے شکریے کے ساتھ بڑی عقیدت سے اس ہدیہ کو قبول کیا، اور وقیع
الفاظ میں دارالعلوم کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے جواب میں صدر ناصر نے قاہرہ پہنچ کر قرآن شریف
کا ایک حسین و خوبصورت نسخہ دارالعلوم کے لئے ارسال کیا۔ یہ قرآن مجید ایک خوبصورت
چوبی فریم میں مجلد کیا ہوا ہے، اس فریم کی یہ صفت قابل ذکر ہے کہ دیکھنے میں بجائے
خود ایک مجلد کتاب معلوم ہوتی ہے، اور کھولا جائے تو وہی رحل کی صورت ہو جاتا ہے۔

حجاجِ کرام

اس سال میں دارالعلوم کے متعدد حضرات حج بیت اللہ اور
زیارت روضۂ نبوی سے مشرف ہوئے۔ حضرت مولانا قاری
محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ
مولانا معراج الحق صاحب، مولانا عبدالاحد صاحب، مولوی محمود احمد گل صاحب، مولانا
احمد رضا صاحب، مولوی زاہد حسن صاحب اور حاجی اشرف کا ملازم خیرات حج کے لئے
تشریف لے گئے۔

۱۳۸۰ھ جامعہ طبیہ کا اجراء

دارالعلوم میں تعلیم طب کا آغاز ۱۳۲۸ھ
میں ہوا تھا، پہلے اس شعبہ میں مولانا
حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کا تقرر ہوا، حکیم صاحب
درس فقہ و حدیث اور طلبائے دارالعلوم کے علاج کے علاوہ فن طب کی تعلیم بھی
دیتے تھے۔ ۱۳۳۹ھ میں اسے مستقل شعبے کی شکل دی گئی، دارالعلوم کی طرح
یہ شعبہ بھی سال بسال ترقی کی جانب گامزن رہا، مگر اب تک اس کے لئے کوئی مستقل
عمارت نہ تھی، ۱۳۸۰ھ میں جامعہ طبیہ کو وقف کرنال سے ایک معقول امداد اس
شرط کے ساتھ پیش کی گئی کہ دارالعلوم کے شفاخانہ کا نام نواب عظمت علی خاں صاحب
مرحوم کے نام پر "عظمت شفاخانہ" رکھا جائے، اسی کے ساتھ جامعہ طبیہ کی ایک مستقل

کمیٹی کا بنا کر (جو ملک کے موقر اور با اثر اطبا پر مشتمل ہے) حکومت سے کہا گیا کہ وہ ملک کے دوسرے طبیہ کالجوں کی طرح دارالعلوم کے جامعہ طبیہ کی سند کو تسلیم کر کے جامعہ طبیہ کے فارغین کو مجاز مطب قرار دے، جس کو حکومت نے منظور کر لیا ہے۔ جامعہ طبیہ میں چار سالہ نصاب کے ذریعے فن طب کی علمی اور عملی تعلیم دی جا رہی ہے، اب جامعہ طبیہ میں متعدد اساتذہ تعلیم طب اور طلبا سے دارالعلوم کے معالجہ پر مامور ہیں، احاطہ دارالعلوم کے شمال میں جامعہ طبیہ کی ایک وسیع اور شاندار عمارت تیار ہو چکی ہے جس میں درس گاہوں کے علاوہ مریضوں کے بستروں کا بندوبست بھی کیا گیا ہے نیز معالجہ طلبہ کی حد تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ بلا تخصیص مذہب و ملت سب کا علاج کیا جاتا ہے۔

دارالشفاء کے دو وارڈ تعمیر ہو چکے ہیں، اور مزید کچھ عمارتیں زیر تجویز ہیں۔

ڈاکٹر پی، ہارڈی کی آمد

لندن یونیورسٹی میں شعبہ تعلیم اسلام کے لکچرر ڈاکٹر پی، ہارڈی اپنی تاریخی تحقیق کے سلسلے میں دیوبند سے تقریباً ایک ہفتہ دارالعلوم میں قیام کیا، حضرت مہتمم صاحب سے دارالعلوم کے اپنے مشاہدوں کے علمی مقاصد کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی، ڈاکٹر ہارڈی کا یہ تاثر قابل ذکر ہے کہ جس اسلام کو ہم کتابوں میں پڑھتے تھے، اور جس اسلام کو پیغمبر اسلام نے دور اول میں پیش فرمایا تھا، لگتا یہ ہے کہ وہ اسلام ہم نے دیوبند اور علمائے دیوبند میں موجود پایا۔

ڈاکٹر ہارڈی نے تحریری شکل میں جو تاثرات چھوڑے ہیں وہ یہ ہیں:

میں ہندوستان میں یہ توقع لے کر آیا تھا کہ یہاں مجھے اسلام کے سلسلے میں تعلیمی مواد فراہم ہو سکے گا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد میں نے دارالعلوم دیوبند آنے کا ارادہ کیا تاکہ اپنا مقصد حاصل کر سکوں، یہاں آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ میری توقعات پوری ہوئیں بلکہ بہترین اخلاق اور مخلصانہ

معاونوں نے مجھے بے حد مسرت دی، یہاں کے فاضل علماء نے میری رہنمائی کی
بالخصوص حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے میرے مقاصد کے سلسلے میں
میری کافی رہنمائی کی۔ میں نہ صرف یہاں کی بہترین یادیں ساتھ لے کر جاؤں گا
بلکہ واقعۃً اس کی کوشش کروں گا کہ مجھے پھر یہاں آنے کی اجازت دی جائے
چنانچہ ۱۹۶۳ء میں مہتمم صاحب کے سفر افغانستان کے موقع پر موصوف
نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ میں ایک سرکاری کام کی ضرورت سے جرمنی جا رہا
ہوں ورنہ آپ کے پاس کچھ وقت گزارتا۔

۱۳۸۱ھ مسٹر ہمایوں کبیر کی آمد

اس سال جن واردین و صادرین کی آمد ہوئی حضرت مہتمم صاحب سے ملنے والوں میں سب سے
زیادہ نمایاں شخصیت مرکزی حکومت کے وزیر ثقافت و سائنسی تحقیقات پروفیسر ہمایوں
کبیر کی تھی، موصوف ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ میں تشریف لائے، خیر مقدم کے جلسے میں
پروفیسر ہمایوں کبیر نے دارالعلوم کی دینی اور ملکی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا
"دارالعلوم کے بزرگوں نے دینی اور علمی خدمات کے علاوہ وطن کی آزادی کی جدوجہد اور
ہم آہنگی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت معروف اور ناقابل تردید ہیں،
وہ جنگ آزادی میں بڑی کام ہم کرتے تھے، ہے آپ کا یہ دارالعلوم ایشیا میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے
دارالعلوم نے ہندوستان میں سب سے پہلے مفت تعلیم کا انتظام کیا جو اس
سے بھی بڑھ کر حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کے لئے
خوراک اور لباس کا انتظام بھی مفت کرتے ہیں، آٹھ نو سو طلباء کے خورد و نوش کا انتظام
معمولی بات نہیں ہے اور پھر جب معلوم ہوا کہ لاکھوں روپے سالانہ کے مصارف آپ
صرف مسلمانوں کے چندوں اور ... کی رقموں سے پورا کرتے ہیں تو اور بھی زیادہ حیرت
ہوتی ہے، چندے کا کام دراصل آپ کے لئے بڑا مفید کام ہے، اس لئے آپ کو مسلمانوں میں

جانے اور تقریری کا کام کرے اور عوام کے ساتھ دارالعلوم کا تعلق قائم رکھنے کا کام کرنا پڑتا ہے
اس طرح آپ مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اس سے دوسری طرف
مسلمانوں میں خود اعتمادی اور ذمہ داری کا یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ آج بھی ان کا دارالعلوم
کو چلانا ہے۔ اس خیال کو سامنے رکھنے سے ان میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔ آپ کے یہاں
ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے اور اس سے بھی زیادہ دور دراز کے طلبا
پڑھنے آتے ہیں۔ اس طرح آپ کا اثر ساری دنیا میں پھیلتا ہے۔ اور آپ بین الاقوامی علم
کا مرکز بنتے ہیں۔ دارالعلوم اسلامی ادارہ ہے۔ آپ کے اوپر اسلام کی طرف سے بھی ذمہ داری
عائد ہوتی ہے اور ہندوستان کی طرف سے بھی۔ علم ایک بڑی طاقت ہے۔ دنیا میں ہر جگہ
علم کی عزت کی جاتی ہے۔ اسلام نے بھی خدا کے بھروسے پر زور دیا ہے۔ اور حقیقت
ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کا
یہ دارالعلوم دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اسلام نے دنیا کو سب سے پہلا جو پیغام دیا وہ علم کا
پیغام ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس کی ابتدا
اقرأ کے لفظ سے ہوتی ہے جس کے معنی ہیں "پڑھو" اسلام کا یہ اولین پیغام تھا۔ جب
اسلام دنیا میں آیا تو ہندو یونان اور مصر وغیرہ ممالک میں اگرچہ علم موجود تھا۔ مگر اس کو مخصوص
لوگوں تک محدود رکھا جاتا تھا۔ عام لوگ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ علم پر ہر جگہ اجارہ داری
قائم تھی۔ مصر میں خاص طبقہ کے لوگوں کے سوا کوئی دوسرا طبقہ علم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔
یہی حال یونان کا تھا۔ ہندوستان میں بھی تعلیم کا چرچا تھا لیکن یہ صرف برہمنوں اور اونچی
ذات کے لوگوں کے لئے مخصوص تھی۔ شودروں کو تحصیل علم کی اجازت نہ تھی۔ بعض اوقات
اس طبقے پر علم حاصل کرنے کے جرم میں بڑے بڑے مظالم کئے جاتے تھے۔ یہ اسلام ہی
تھا جس نے علم کو عام کیا اور ہر شخص کو علم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اسلام کے پیغمبر
نے ساری دنیا کو یہ کہہ کر علم سے روشناس کرایا کہ "ہر مرد و عورت کے لئے علم حاصل کرنا

دارالعلوم کو مدد کرتا چلا جائے۔ یہ آپ ہی کو یہ کام کرنا ہے کہ قومیت اور مذہب کے جھگڑے دنیا سے ختم کر دیں۔ اس سلسلے میں آپ کا دارالعلوم ایک بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔ اور اس طرح یہ صرف ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ پوری دنیا کی خدمت کر سکتا ہے۔ اس ملک کی تاریخ میں تعلیم کو عروج تک پہنچانے کا جو سنگ آپ نے رکھا ہے اسے ہندوستان کی تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں دارالعلوم کی شرکت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ "اس ادارے کے علماء و فضلاء جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس ادارے سے فرقہ پرستی کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے۔ یہ دارالعلوم جس طرح پہلے فرقہ پرستیوں سے بالاتر رہا ہے آئندہ بھی اسی طرح رہے گا۔ یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ اب حملوں کیا جارہا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے ملک کی آزادی کے لیے زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ آج کچھ لوگ تنگ نظری کا شکار ہو کر اس محب وطن جماعت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس جماعت کی ایک روشن تاریخ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اگرچہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کا رواج عام ہے۔ مگر دارالعلوم نے فرقہ پرستی کی ہوا کو قریب بھی نہیں آنے دیا۔ میرا یقین ہے کہ یہ دارالعلوم ہمیشہ دنیا کو انسانیت و شرافت اور یکجہتی اور محبت کے ساتھ قومیت کا سبق دیتا رہے گا۔ جس سے ہم ایک ایسا ہندوستان بنانے میں کامیاب ہوں گے جس میں سب مل جل کر رہ سکیں گے۔"[1]

قرآن مجید کے ریکارڈ

حکومت مصر نے پورے قرآن مجید کی قراءت کے ریکارڈ تیار کیے ہیں۔ یہ قراءت شیخ محمود حصری کی ہے جو مصر کے مشہور قاری ہیں۔ ان ریکارڈوں میں پورا قرآن مجید آگیا ہے۔ حکومت مصر کی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے جدید سیاحت سیر دارالعلوم مطبوعہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند ۱۹۶۰ء مرتبہ مسٹر محمود ... کی جائے۔

جانب سے ایک پورا سیٹ دارالعلوم کو دیا گیا ہے جو دارالعلوم کے لئے بڑی ہے اس سیٹ کے لانے کا فخر راقم سطور کو حاصل ہے ۔

۱۴۰۲ھ، دارالعلوم ایک صدی کے بعد

دارالعلوم کی تاریخ کا یہ وہ سال ہے جس میں اس نے اپنی عمر کے ایک سو سال پورے کر لئے تھے۔ جشن صد سالہ کی مناسبت سے گو دارالعلوم دیوبند کا ہر قدم بڑھتا تھا آگے کی جانب بڑھتا رہا ہے۔ اس سال کی روداد میں ایک سو سال پیچھے کے حالات سے جو تذکرے ہوئے حضرت مہتمم صاحب نے اہتمام فرمایا ہے جو تحقیق کے انداز میں پیش خدمت ہے :

"الحمد للہ کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی عمر کے سو سال پورے کر لئے۔ محرم ۱۲۸۳ھ میں جس مکتب کی بنیاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور ان کے مقدس رفقاء کے ہاتھوں سے رکھی گئی تھی سو سال کی مدت میں وہی مکتب ایک عظیم الشان دینی و علمی تعلیمی اور تربیتی ادارے کی صورت میں نظر آرہا ہے، جو نہ صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی ہے جس سے طلباء محض سند حاصل کر لیتے ہیں بلکہ ایک آفاقی ادارہ بھی ہے جہاں تعلیم کے ساتھ تربیت اور اسلامی زندگی کے طور طریق بھی سکھائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم کا فاضل اگر ایک طرف علوم دینیہ میں مہارت رکھتا ہے تو دوسری طرف اسلامی طور طریق، تہذیب اور مذہبی زندگی کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی گوشے میں آپ چلے جائیں دارالعلوم کا تربیت یافتہ اپنی حیثیت میں نمایاں اور ممتاز نظر آئے گا۔

بہر حال اس سو سال کی مدت میں دارالعلوم دیوبند نے اگر ایک طرف ہزاروں افراد اور اسلامی تعلیمات کے ماہر پیدا کئے تو دوسری طرف مبلغ، مفسر، قائد، مفکر، سیاست داں اور اسلامی زندگی کے نمائندے بھی پیدا کئے جن سے دنیا کے گوشے گوشے میں مسلمان دینی رہبری اور مذہبی رہنمائی حاصل کر رہے ہیں ۔

میں اجتماعی خوشی کے جذبات کا ظہور ایک امر طبعی تھا چنانچہ سب سے پہلے یہ جذباتی کیفیت
حضرت محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دل میں موجزن ہوا اور پھر وہ ذریعہ دارالعلوم کے
حلقوں، حضرات اساتذہ کرام، حضرات کارکنان، ارباب شوریٰ، اراکین انتظام اور عزیز طلبا کی طرف
سے بھی اجتماعی طور پر اس جذبہ کا اظہار بعنوان تقریب کیا گیا۔

اس مبارک موقع پر طبعی خوشی و مسرت کے لئے تقریب کی کوئی مناسب
شایانِ صورت اختیار کی جائے؟

ظاہر ہے کہ دارالعلوم کوئی رسمی ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ روحانیات سے بالاتر ایک حقیقت
اور حقیقتوں کا مرکز و ادارہ ہے اس لئے اس کی خوشی کا مظاہرہ پھول پتیوں کی نمائش یا چراغاں
وغیرہ کی نمود یا عام رسمی مظاہروں کی صورت اختیار نہیں کر سکتا تھا اور عام جذبات یہی تھے
کہ اس تقریب سعید کے موقع پر دارالعلوم میں ایک عام اجتماع منعقد کیا جائے جس میں بتائے
دارالعلوم کے حالات، اس کی تاسیس کا پس منظر، قیام دارالعلوم کے مقاصد، اس کے
بانیوں کی سیر و کردار، اس کے آئندہ کے لائحہ عمل وغیرہ کی تذکیر کی جائے، اور دارالعلوم
کی اعتقادی خصوصیات کو ایک بار دنیا میں پھر تازہ کر دیا جائے کہ یہی مسرت کی صحیح صورت
دارالعلوم کے شایان شان ہو سکتی تھی، لیکن بحث و اتفاق کی دنیا بالکل ہی الگ ہے، صورت حال کا مشاہدہ
ہی کا متقاضی ہے۔ ملک کے زیر ہنگامہ ماحول میں جب کہ جگہ جگہ فسادات برپا تھے چند
ملکی صوبوں میں جو شرکی متوقع ہو کر نتائج ہو گئیں، ایسی صورت میں اتنے بڑے پیمانہ پر دارالعلوم کی
صد سالہ تقریب کا عظیم اجتماع اس اجلاس سے متصادم ہو جو ملت کے اجتماعی مفاد کے
پیش نظر کسی طرح بھی مناسب نہ تھا اس لئے ایسے تزاحم کے وقت دانشمندی سے اجتماع
کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے ان تاریخوں میں اجتماع کے جلسہ کو ترک کر کے صرف اس پر اکتفا کیا
گیا کہ اس موقع پر سردست ان تاریخوں میں دارالعلوم کی تعطیل کر دی جائے اور اجتماع
کا معرکہ بعد میں کسی وقت پر اٹھا رکھا جائے۔

وہ پورا ہوا ان سے ملاقات ہوئی! اسی میں احقر مہتمم جنوبی افریقہ کے سفر کے لئے چلا گیا تھا جس میں تقریباً ساڑھے تین ماہ صرف ہو گئے۔ اس لئے اس خواب کی تعبیر برآمد ہونے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ حق تعالیٰ کو منظور ہے تو انشاء اللہ جلد ہی یہ موقع آنے والا ہے۔

کتب خانہ کی ترتیب

کتب خانہ دارالعلوم میں ایک لاکھ کے قریب کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے، اس میں بڑی تعداد گرچہ درسی کتابوں کی ہے مگر کم و بیش نصف کتابیں ان میں غیر درسی ہیں، ان میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں طرح کی کتابیں شامل ہیں، مخطوطات بھی معتد بہ تعداد میں موجود ہیں۔

کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست تیار کرنے کا کام پہلی مرتبہ [illegible] میں ناظم صاحب کے سپرد ہوا تھا، مدت تک وہی فہرست کام دیتی رہی جو تھائی صدی کے بعد [illegible] میں پھر مزید ترتیب کی ضرورت پیش آئی، اس دوران میں ہزاروں کتابوں کا کتب خانے میں اضافہ ہو چکا تھا، اس کے لئے مجلس شوریٰ کی جانب سے مولانا ظہیر الدین صاحب کا انتخاب کیا گیا، مولانا موصوف نے بڑی جگر کاوی اور دیدہ ریزی سے فہرست کی تیاری کا کام انجام دیا ہے، اس مرتبہ مزید یہ اضافہ ہوا ہے کہ لائبریریوں کے موجودہ طریق کے مطابق کتابوں کے کارڈ تیار کرکے ان کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے، کارڈوں کے ذریعے کتاب برآمد کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی ہے، علاوہ ازیں مخطوطات کی تعارفی فہرست بھی تیار کی گئی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، کتب خانے کا تفصیلی تعارف "کتب خانہ" کے زیر عنوان آئندہ اپنے مقام پر پیش کیا جائے گا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات

اس سال کے سانحات میں ایک اہم واقعہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات کا سانحہ ہے۔ مولانا نہ صرف دارالعلوم کے علمی حلقوں میں ممتاز اور نمایاں شخصیت رکھتے تھے بلکہ ملک میں سیاسی لحاظ سے بھی اُن کا بڑا مقام تھا، مدت تک جمعیۃ علماء ہند کی نظامت اعلیٰ کے منصب

پر فائز رہے۔ اُن کی زندگی کا آغاز دارالعلوم کی مدرسی سے ہوا تھا پھر آخر میں مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے اُن کا انتخاب کیا گیا۔ مولانا کی عمر کا بڑا حصہ دارالعلوم کی خدمت میں گذرا چنانچہ اُن کی خدمات کا اعتراف مجلس شوریٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے تاثرات اور دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے، وہ قوم سے ایسی یگانۂ روزگار شخصیت کے اٹھ جانے کو ایک عظیم قومی حادثہ اور زبردست نقصان تصور کرتا ہے، حضرت مرحوم نہ صرف ایک جید عالم، فاضل مصنف اور بے نظیر خطیب تھے بلکہ صحیح معنی میں مجاہدِ ملت بھی تھے، ہندوستان کی سیاسی اور قومی تاریخ میں اُن کی جدوجہد و سرفروشیاں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں، وہ نہ صرف ملک کے ممتاز لیڈر تھے، بلکہ مسلمانوں کے قائد اور علمی و سیاسی رہنما بھی تھے، ان کی ذات گرامی اپنی ہمہ گیر قابلیت اور مقبولیت کے لحاظ سے بلا امتیاز مذہب و ملت پورے ہندوستان کی ہمہ گیر شخصیت تھی، اُن کے تدبر و معاملہ فہمی، وقت شناسی، ثبات قدمی اور استقلال کا ہر موافق و مخالف سبھی مانتے تھے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز اور پرآشوب زمانے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک اور بالخصوص مسلمانوں کی جو زبردست اور عظیم الشان خدمات مرحوم نے انجام دی ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ اُن ہی کا حصہ تھا، ماضی میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کو ان کی مخلصانہ اور مدبرانہ باخبری سے بڑی مدد اور تقویت ملتی رہی ہے، وہ معاملات کی تہ تک پہنچ جانے اور مشکل گتھیوں کو سلجھانے کا بے نظیر ملکہ رکھتے تھے، اس لحاظ سے اُن کی زندگی پوری قوم اور ملک کے لئے ناقابل فراموش ہے، جماعت دارالعلوم اپنے اس جلیل القدر مربی کی دائمی مفارقت پر مغموم ہے۔"

کار تعلیم میں اس کی خصوصی مدد و سعادت ان کے شامل حال ہو تاکہ بصورت دعا اس فریضے کو
مرحلۂ تکمیل تک پہنچا سکیں بار بار تقاضے کے لئے یہ گزارش ضروری ہے، دعا ذریعہ حق
مصروفیت اور نیک ارادوں نے امید کے لئے ان کے بلند عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی
ایسا کٹھن اور دشوار گذار مرحلہ نہیں ہے کہ نا قابل عبور ہو۔

۱۳۷۲ھ حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ و مصر

سال زیر تذکرہ میں حضرت مہتمم صاحب کے دو
بیرونی سفر ہوئے، پہلا سفر جنوبی افریقہ کا تھا اور دوسرا مصر کا، یہ دونوں سفر مختلف
حیثیتوں سے دارالعلوم کے لئے مفید ترین ثابت ہوئے، اوائل محرم میں جنوبی افریقہ
کا سفر ہوا، جوہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر استقبال کے لئے جنوبی افریقہ کے چاروں
صوبوں کے مسلمانوں کا نمائندہ اجتماع خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھا جو تقریباً
دو ہزار افراد پر مشتمل تھا، جوہانسبرگ کے ڈپٹی میئر مسٹر ادبر ہولا خیر مقدم کے لئے مع اپنی
اہلیہ کے اس موقع پر موجود تھے، یہاں پولیس بھی کافی تعداد میں تھی، چند دن جوہانسبرگ
میں قیام ہوا اور وہاں سے ڈربن اور پھر کیپ ٹاؤن تشریف لے گئے، ڈربن کے دوران قیام
میں اطراف و جوانب کے مختلف مقامات پر جانا ہوا، کیپ ٹاؤن کے ایک اجتماع سے خطاب
کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں کو مادی طاقت سے ہرگز پریشان نہیں
ہونا چاہئے، مسلمانوں کو اپنی روحانی طاقت بڑھانے کی ضرورت ہے، مسلمان اپنے ان
فرائض کو بھول چکے ہیں جن کی بجا آوری کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں، ہمیں نیکی کی تلقین کرتے
رہنا چاہئے اور بُرے کاموں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

جنوبی افریقہ میں دارالعلوم دیوبند اور جماعت دارالعلوم کے خلاف جو غلط فہمیاں

۱؎ روداد ۱۳۷۲ھ ص ۱۲ - ۱۳ -

کے ممتاز علماء کو دعوت دی گئی تھی۔ اس میں ۴۰ ملکوں کے منتخب علماء نے شرکت کی۔ مدعو
علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی یعنی مجموعی طور پر سو سو علماء مؤتمر میں شریک رہے۔ ہندو پاک
کے نمائندے سب کے سب علمائے دیوبند تھے۔ حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ حضرت
مولانا سید منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی
سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مؤتمر میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اس
مؤتمر کا مقصد تمدن جدید سے پیدا شدہ مسائل کی شریعت اسلامی کی روشنی میں تحقیق و تنقیح
تھا۔ یہ مسائل حسب ذیل عنوانات پر مشتمل تھے۔

(۱) اسلام میں مالیات کی تقسیم کا نظام۔
(۲) عرب اور اسلام کے عالمگیر نفوذ کے طبعی اسباب۔
(۳) اسلام میں آراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔
(۴) دولت ہندوستان کے اموال میں غریبوں کے حصے کی نوعیت۔
(۵) اسلام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام۔
(۶) اسلام میں اجتہاد کا ماضی و حال۔

اگرچہ مؤتمر میں مذکورہ بالا سبھی عنوانات پر بحث و تمحیص ہوئی مگر سب سے زیادہ زور
آخری عنوان پر تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کانفرنس کی بیشتر مدت میں وقتاً فوقتاً
وقت صرف اسی مسئلہ پر صرف ہوا۔ نظریہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ
نہیں کھولا جائے گا اس وقت تک جدید مسائل حل نہیں ہوں گے کیونکہ آج کی صورت حال
جدید اکتشافات کی موجودگی میں یکسر بدل گئی ہے۔ پچھلا نقش قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔
حضرت مہتمم صاحب جو ہندوستانی وفد کے رئیس تھے اور مولانا محمد یوسف بنوری
مندوب پاکستان نے اس موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ حضرت مہتمم صاحب کے
مقالے کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہمارے فکر و نظر یا طریق استنباط میں جو اسلوب

قواعد فن کی پابندی کی ضروری ہے ویسا ہی سلف کی پیروی کا بھی ضروری ہے۔ ہم اجتہاد کے دائرے میں رہ کر بھی ائمہ سلف کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے۔ سنت اور آثار سلف ہمارے اجتہاد کی ابتدائی منزل ہونی چاہیے جیسا آپ نے فرمایا کہ:۔

"آج مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں انھیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے۔ ان کے سلسلے میں اس کے بجائے کہ ہم اپنے لیے منصب اجتہاد ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ ان مسائل کا عملی حل پیش کر دیا جائے اجتہاد کے لیے اجتہادی قوتوں پر خرچ کیے جانے کے بجائے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور نتیجہ خیز راستہ ہے۔ نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ نئے افکار و نظریات، نئے رجحانات و احوال کی وجہ سے ہمیشہ سامنے آتے رہتے ہیں، اور ہر دور کے مفکر علماء اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصول فقہ اور منضبط مسائل فقہیہ کی روشنی میں فیصلے دیتے رہے ہیں، چنانچہ آج بھی نئے حوادث کے سلسلے میں مسائل کی تنقیح میں علماء مختلف نے کتابیں لکھی ہیں۔ حوادث الفتاویٰ اور اسلام اور جدید مسائل کے شرعی احکام کے نام سے ہندوستان میں مستقل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں۔ البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی ہے کہ ایسے احکام کی اشاعت و تنقیح عالمی پیمانے پر ہو اور صرف مقامی کے بجائے بین الاقوامی سطح پر پیش کیا جائے اور ایسے جدید فتاویٰ اور مواد کسی بھی ملک کے ہوں، انھیں پورے عالم اسلامی کے سامنے لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر کون انجام دے سکتا ہے۔ وہ اپنے عالمگیر اثرات سے دنیا کے جدید فتاویٰ کے ذخیرے فراہم کر سکتی ہے اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم

پیش کر سکتی ہے اگر فکر میں عالمیت اور گیرائی پیدا ہو کر اُمت کے عمل میں یکجہتی پیدا ہو جائے، دعوتِ اُمت کے لئے یہ تو تحریک دینے کا کام دے سکتی ہے۔

حضرت بنوری صاحب نے اپنے مقالے میں موجودہ زمانہ میں اسلام سے متعارف کرانے پر بھی زور دیا اور موتمر اسلامی سے اپیل کی کہ اسلام کو پورے عالم کا دین بنانے کی جدوجہد موتمر کے پیشِ نظر رہنی ضروری ہے۔

مقالے کے آخر میں کہا گیا ہے کہ اجتہاد کی گنجائش کچھ تو قیامت تک بھی ہمارے علماء کے اندر موجود ہیں، اگر نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا مگر اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے کہ اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہیے کہ ہم آج کے مغربی تمدن سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کر لیں اور پھر قرآن و حدیث سے اس کے موافقات تلاش کر کے انہیں مدد دینا شروع کر دینے کی فکر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب و سنت کا اتباع نہیں بلکہ کتاب و سنت سے اپنا اتباع کرانا ہے ایک خطرناک غلطی ہے بلکہ غور و فکر اور طریق استنباط میں جہاں اصول و قواعد کی پابندی کا سوال ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی اور ان کا ذوق کی بھی ضرورت ہے جو انہیں اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے اور اس کے بغیر وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو فیضِ صحبت کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں ملا ہے۔ اس لئے ہم طلباء اجتہاد کے دائرے میں رہ کر بھی اتباعِ سلف سے باہر نہیں جا سکتے، یہ ایک سنت اور ایک اسوۂ سلف ہمارے جدید اجتہاد کی بنیادی منزل ہونی چاہیے۔[۱]

موتمر میں دارالعلوم دیوبند کی نمائندگی کے رکن حضرت مولانا مفتی [illegible] عثمانی

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے "دارالعلوم" ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کا اعلیٰ موتمر اسلامی

شمارہ نمبر [illegible] ص [illegible]

اسٹیشن پر اساتذہ و طلبہ دارالعلوم نیز وفادار اراکینِ شہر کی جانب سے پُرجوش استقبال کیا گیا۔ جلسے دارالعلوم کی درخواست پر حضرت مہتمم صاحب نے دارالحدیث کے طلبۂ خیر مقدم میں ایک طویل تقریر فرمائی جس میں آپ نے سفرِ مصر و حجاز کے تاثرات اور موتمرِ اسلامی کا جائزہ اور جامعۂ اسلامیہ مدینہ کے تفصیلی حالات بیان فرمائے۔

مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت

مستشرقین کی بین الاقوامی

کانگریس کا چھبیسواں اجلاس جنوری ۱۹۶۴ء کی شروعات تاریخوں میں منعقد ہوا، جس میں گیارہ سو باہر کے مستشرقین نے شرکت کی، ان میں پانچ سو بیرونی ممالک کے نمائندے شریک تھے، بقیہ چھ سو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے فضلاء شامل تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ اس کانگریس کا اجلاس یورپ سے باہر ایشیا میں ہوا، ایشیا میں سب سے پہلے یہ فخر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کی سرزمین کو حاصل ہوا۔ کانگریس کے ابتدائی سالوں میں اس کی مجلسوں میں شرکت صرف یورپ کے باہر کے مستشرقین تک محدود تھی، مگر رفتہ رفتہ اس کے دائرے میں توسیع ہوتی گئی، ایشیائی ملک بھی اس میں شریک ہونے لگے۔ دہلی میں کانگریس کا اجلاس وگیان بھون کی عظیم الشان عمارت میں منعقد ہوا تھا۔

یہ کانگریس دس شعبوں پر منقسم تھی، اس میں ایک شعبہ نوادر مخطوطات کے لیے مخصوص تھا، انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کی معرفت سے دارالعلوم کے منتخب مخطوطات اس موقع پر پیش کیے گئے، مستشرقین نے ان کو خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور متعدد مخطوطات کے فوٹو بھی لیے، اس طرح مستشرقین کی یہ کانگریس دارالعلوم کے لیے وسیع طور پر بین الاقوامی تعارف کا ذریعہ ثابت ہوئی، دارالعلوم کے مخطوطات کو کانگریس میں متعارف کرانے کا اہتمام ناظم کتب خانہ نے کیا تھا۔

۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء مجلہ دعوۃ الحق کا اجراء

زمانہ حال میں عربی مجلہ دارالعلوم کو دارالعلوم کے حالات

تعلق ہے۔ اس سے باہر رکھتے ہوئے دارالعلوم کے مسلک کی ترویج و اشاعت کے لئے ایک زمانے سے

میں "القاسم" اور "الرشید" وغیرہ ماہنامے شائع ہوتے رہے ہیں۔ القاسم کے چند

برس کے بعد ۱۳۳۲ھ میں "ماہنامہ دارالعلوم" جاری ہوا۔ مگر اب تک یہ رسائل صرف اردو

زبان میں شائع ہوتے تھے۔ اس لئے اردو داں طبقہ کے حلقے کو وسیع تر کرنے کے لئے

ایک سہ ماہی عربی مجلہ "دعوۃ الحق" کے نام سے نکالا گیا۔ "دعوۃ الحق" برصغیر کے ممالک

مدارس کے علاوہ عرب ممالک میں بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ عربی مجلہ عرب ملکوں

میں مسلک دارالعلوم کی اشاعت کا ذریعہ ہونے کے علاوہ عرب ممالک سے رابطے کا بھی

ایک قوی ذریعہ بنا ہوا ہے[1]

غلے کی فراہمی میں حکومت اتر پردیش کا تعاون

۱۳۹۳ھ کے آخری مہینے میں دارالعلوم کو شدید غذائی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت مہتمم صاحب نے اس صورت حال پر حکومت اتر پردیش کو توجہ دلائی۔ دارالعلوم کی جانب سے حکیم محمد الیاس صاحب کشوری اور راقم سطور کو لکھنؤ بھیجا گیا۔ ان کا ان وفد نے حکومت کے ذمہ داروں، خصوصاً وزیر اعلیٰ اور وزیر خوراک کو بتایا کہ دارالعلوم کو غذائی ضروریات کو پورا کرنے میں کیا دقتیں پیش آرہی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان مشکلات کی وجہ سے دارالعلوم سے تعلیمی سال کے آغاز میں طلبہ کا داخلہ نہ ہو سکا تو اس سے دارالعلوم دیوبند کی بین الاقوامی حیثیت اور حکومت کے وقار پر ناخوشگوار اثر مرتب ہوگا۔ اس وقت کی وزیر اعلیٰ مسز سوچیتا کرپلانی نے اس موقع پر اپنے عہدے سے تعاون کا ثبوت دیا اور دارالعلوم کے لئے مطلوبہ غلے کی فراہمی میں سہولت بہم پہنچائی جس کا سلسلہ بحمد اللہ اب تک جاری رہا ہے۔

---

[1] اب کچھ عرصے سے "دعوۃ الحق" کے بجائے ایک پندرہ روزہ عربی اخبار "الداعی" کے نام سے نکل رہا ہے

اُتر پردیش کے گورنر کی دار العلوم میں آمد

اس سال دار العلوم میں جو مختلف حضرات تشریف لائے ان میں اُتر پردیش کے گورنر جناب وشوناتھ داس صاحب کا بھی ذکر ہے۔ موصوف ۲۳ مارچ سنہ ۶۷ء کو دار العلوم میں تشریف لائے اور دار العلوم کو دیکھ کر جلسۂ عام میں اپنے جن گہرے اور گراں قدر تاثرات کا اظہار کیا یہاں اُن کا نقل کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا۔ موصوف نے فرمایا:

"علم انسان میں جو تبدیلی اور انکسار پیدا کرتا ہے یہاں اس کی بہت اچھی مثال دار العلوم میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ حضرات جس محنت اور جانفشانی سے تعلیم دے رہے ہیں، اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اس پر میں آپ لوگوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دار العلوم کے طریقۂ تعلیم کو دیکھ کر مجھے ہندوستان کے اس قدیم طرزِ تعلیم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس میں گرو اپنے شاگردوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے مصارف خود برداشت کرتے تھے۔ مگر جب سے ہندو سوسائٹی میں زمینداری وغیرہ کی برائیاں جاگزیں ہوئی ہیں وہ پرانا طریقہ ختم ہو گیا ہے۔ مگر اب پھر اس کی اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا ہے۔ مجھے دار العلوم کے شعبۂ تعلیم کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کا یہ دار العلوم ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔"

آپ نے موجودہ طرزِ تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کل جو طریقۂ تعلیم رائج ہے اس میں استاد اور شاگرد کے مابین روحانی تعلق نہیں رہا ہے۔ اس نے استادوں اور طلبہ کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے، اور آئے دن طلبہ کے ہنگامے پیش آتے رہتے ہیں۔ علم اور جہل دو متضاد صفتیں ہیں۔ علم انسان کو اوپر اٹھاتا ہے اور جہالت اسے پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ آپ اپنے طلبہ کو جہالت کی پستی سے اٹھا کر انہیں علم کی

کی مانند کاموں پر منحصر ہے یعنی اسی طرح انسانیت کی تکمیل کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔ استاد کی مثال اس کمہار کی مانند ہے جو گیلی مٹی سے حسب منشا برتن بناتا ہے، اسی طرح طلبہ کی زندگی استاد کی تعلیم کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کی تعلیم میں دنیوی مال و دولت آپ کے پیش نظر نہیں ہے۔

گورنر صاحب نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ جو کچھ اپنے استادوں سے سیکھ رہے ہیں مجھے امید ہے کہ آپ اپنی زندگی میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں آپ کی ترقی کے لئے دعا کرتا ہوں اور دوسرے ملک کے جو طلبہ یہاں زیر تعلیم ہیں ان کو تعلیمی سہولت پہنچانے کے لئے دارالعلوم سے خصوصی درخواست کرتا ہوں، یہ طلبہ ہمارے ملک کے مہمان ہیں، یہ طلبہ فراغت کے بعد جب یہاں سے اپنے وطن واپس جائیں گے تو یہ ہمارے ایلچی ثابت ہوں گے۔

گورنر صاحب نے ملک کی ایک اہم بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"دنیا کے اکثر ملکوں میں مختلف قومیں آباد ہیں جو مختلف زبانیں بولتی ہیں ان کے مذہب بھی الگ الگ ہیں مگر اس کے باوجود سب بھائی بھائی مل جل کر اور بھائی چارہ کے ساتھ رہتے ہیں، اسی طرح اس ملک میں بھی رہنا چاہئے۔ میں مہتمم دارالعلوم، یہاں کے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں کی خدمت میں ان کے پرخلوص اور پرتپاک استقبال پر دل سے شکرگذار ہوں نیز اپنے ملک کے اس عظیم ادارے کی ہر وہ خدمت جو یہ ادارہ پسند کرے انجام دینے کے لئے میری حکومت ہر وقت تیار ہے۔

حضرت مہتمم صاحب نے اس موقع پر تقریر فرمائی جس میں دارالعلوم کے مختصر تعارف

طریق کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ نے دارالعلوم کے بنیادی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"دارالعلوم کی بنا اور اس کا سارا نظام سب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرنے پر رکھی گئی ہے۔ اسی لئے بغیر چندہ کو بانی نے اصل الاصول بنایا ہے اور مستقل آمدنی کے وسائل جیسے کوئی جائداد یا جاگیر یا سرکاری گرانٹوں کے وعدے وغیرہ پر بھروسہ سے منع کیا ہے تاکہ کارکنوں میں بے فکری ذہنیت اور صرف آمدنیوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ رہیں کیونکہ اس کا نتیجہ تعیش اور اس کا ثمرہ آپس کی پھوٹ ہے۔ حضرت بانی کا منشاء یہ ہے کہ مالی سلسلوں میں ایک گونہ بے سروسامانی اور فکر قائم رہے جو فکر حق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بنتا ہے، جس سے توکل اور حقیقی بندگی کی شان پیدا ہوتی ہے۔ نیز انہی اصول میں حضرت بانی نے زیادہ تر غریبوں کے چندے کی طرف توجہ دلا کر درحقیقت دارالعلوم کی بنیاد ڈالی ہے تاکہ یہ ادارہ غریبوں کا رہے اور علماء کہلانے سے سرکاری یا جاگیردارانہ نہ ہو۔ اسی لئے یہاں کے فضاء میں یہ اثرات الحمدللہ موجود ہیں۔ طلباء، اساتذہ اور منتظمین میں سادگی، کفایت شعاری اور تھوڑے پر قناعت کے جذبات پرورش پاتے ہوئے ہیں جس سے ان میں ہوسناکی اور حرص و ہوس کے جذبات جمع نہیں ہونے پاتے۔ اس ادارے کی سب سے بڑی خصوصیت اور اساس و بنیاد علم و اخلاق ہے جس کی تکمیل کے لئے یہ ادارہ قائم ہوا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی قوم کی برتری یا ترقی کا راس المال درحقیقت وہ سرمایہ ہے جو دینی تعلیم بلکہ کردار و اخلاق اور علم صحیح ہے۔ اس لئے یہاں کے بزرگوں کی مرام تر زور طلباء کے علم و اخلاق کی درستگی، معاشرت کی سادگی، کردار کی بلندی اور ہمت کے یقین پر مبنی ہے۔"

دارالعلوم مرکزی حکومت کی نظر میں

مرکزی حکومت ہند کی جانب سے شائع کردہ ایک کتابچہ جس کا عنوان ہے "ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے" اس میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف ان الفاظ

میں کرایا گیا ہے۔

"ہندوستان میں ایک ایسی یونیورسٹی ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے
بے مثال اور مشہور ہے۔ دہلی سے کوئی سو میل کے فاصلے پر دیوبند کے چھوٹے
شہر میں اسلامی تعلیم کی یہ جامع درسگاہ واقع ہے۔ اس کی بنیاد گزشتہ صدی
کے اواخر میں پڑی تھی۔ یہ ادارہ عباسیوں کے عہد کے بغداد کی پرانی یونیورسٹی
کی یاد دلاتا ہے، کیونکہ یہ طرز تعلیم کے لحاظ سے بے کم و کاست اسی
کی طرح کا ہے۔"

دارالعلوم دیوبند دنیا کے مشہور اسلامی اداروں میں سے ہے۔ تقریباً
نوے سال[1] پہلے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسلامی تہذیب کے مطالعے
کے لئے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ابتدا میں یہ ادارہ ایک چھوٹے سے مکتب
کی حیثیت سے شروع ہوا تھا، پھر آگے چل کر مولانا محمود الحسن کی کوششوں
سے جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوکر بڑے مرتبے کو پہنچے۔ وہ بڑے
باہمت اور غیر ملکی حکومت کے کٹر دشمن تھے۔ انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس
کی حمایت کی، جس کے سبب سے انھیں زندگی کا بقیہ حصہ جیل اور جلاوطنی
میں گزارنا پڑا۔

اس دارالعلوم میں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے، ان میں تفسیر
حدیث، اسلامی قانون، فلسفۂ قانون، اصول فقہ، علم الکلام، فلسفہ، ادب

---

[1] دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا تھا، اس لحاظ سے قمری حساب سے سالِ رواں ۱۳۷۷ھ
میں اس پر ۹۴ سال کی مدت گزر گئی ہے، شمسی حساب سے یہ مدت ۹۱ سال ہوتی ہے۔

علم نجوم، طب، ریاضی، تاریخ اور دوسرے متعدد مضامین شامل ہیں۔ مگر حدیث و تفسیر کی تعلیم کو یہاں خاص اہمیت حاصل ہے، اس کی بنا پر پورے مشرق میں یہ اپنی شہرت رکھتا ہے۔

یہاں طلباء سے فیس نہیں لی جاتی، بلکہ کتابیں، رہائش اور خوراک کے اخراجات بھی دارالعلوم کے ذمے ہیں، یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور ہر سال مختلف ممالک کے طلباء یہاں داخلہ لیتے ہیں۔

یہاں کی لائبریری میں تقریباً ساٹھ ہزار عربی، فارسی اور اُردو کی کتابیں ہیں، جن میں نایاب قلمی نسخے اور تاریخی دستاویزیں شامل ہیں۔[2]

١٣٨٦-٨٧ھ ایک افسوس ناک واقعہ

اس سال دارالعلوم میں مجلس مشاورت کے ایک جلسے کے موقع پر ایک بہت ہی افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ مجلس مشاورت کا یہ جلسہ شہر میں منعقد ہوا تھا۔ جلسے میں دارالعلوم کے طلبہ بھی پہنچ گئے، دوران جلسہ میں طلباء اور اہل جلسہ میں کشیدگی رونما ہو گئی جس نے بہت جلد ہنگامہ، مار پیٹ اور جھڑپ کی صورت اختیار کر لی اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جلسہ منتشر ہو گیا، جلسہ گاہ درہم برہم ہو گئی۔ طلبہ نے جلسے سے واپس آکر دارالعلوم میں اُن لوگوں کے خلاف زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا جن کا جلسے سے تعلق تھا۔ یہ صورت حال اس لئے اور زیادہ سنگین بن گئی کہ مجلس مشاورت کے قائدین میں بعض حضرات دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے۔ اہتمام نے حضرات اساتذہ کے تعاون سے بڑی مشکل کے بعد شورش پر قابو حاصل کیا۔ ایسے سنگین حالات کے پیش نظر مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا گیا

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں کتابوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

[2] ماخوذ از [illegible]

مہتمم پنجم دارالعلوم، مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا مفتی
عزیزالرحمٰن، مولانا رحیم اللہ بجنوری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا مسعود احمد صدیقی، مولانا
حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی، مولانا مفتی محمد
سہول بھاگلپوری، مولانا مرتضیٰ حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا
عبدالسمیع دیوبندی، مولانا اعزاز علی امروہی، مولانا فخرالدین احمد، مولانا بدر عالم میرٹھی
مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی
مولانا سید محمد میاں دیوبندی، مولانا محمد طاہر قاسمی رحمہم اللہ۔

مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سید احمد اکبرآبادی، مولانا منت اللہ
رحمانی، ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا قاضی زین العابدین سجاد
مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا انظر شاہ کشمیری وغیرہم
زینت مسند علم فی الدار رہے۔

مصر، شام اور اردن کے لئے امداد

عالم اسلامی میں جب کبھی کوئی اہم المناک حادثہ پیش آیا اس پر دارالعلوم کی جانب سے ہمیشہ
اظہار ہمدردی کیا گیا۔ اس کی کچھ تفصیلات اوپر گذر چکی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر اسرائیل
کا قبضہ ملت اسلامیہ کا ایک ایسا عظیم ترین حادثہ تھا جس سے پورا عالم اسلامی متاثر تھا۔ عالم
دنیائے اسلام نے مظلوم عربوں کی مدد و اعانت میں حصہ لیا تھا، دارالعلوم نے بھی اپنی سابقہ
روایت کے تحت اس موقع پر عربوں کی حمایت کے لئے اپنا دست تعاون بڑھایا۔ اس کے لئے
ملک سے اپیل کی اور ایک معقول رقم فراہم کر کے مصر، شام اور اردن کی حکومتوں کو پیش کی گئی
دارالعلوم میں چندے کی فراہمی کے لئے ایک دفتر قائم کیا گیا جس میں دارالعلوم کے کارکنوں
نے بڑے جوش و خروش سے بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کیں۔ اس دفتر کی نگرانی راقم الحروف
کے سپرد تھی۔

مسجد اقصیٰ کی بازیابی کے سلسلے میں دارالعلوم کے ایک منعقدہ جلسے کی طرف سے اس موقع پر حکومت اردن کو بھرپور امداد ... کی گئی تھی اس میں اسرائیل کی مذمت کرتے ہوئے عرب ملکوں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا گیا تھا اس کے جواب میں حکومت اردن کی جانب سے درج ذیل جواب موصول ہوا۔

"ہمیں آپ کی قرارداد موصول ہوئی جو آپ کی پرجوش جماعت دارالعلوم دیوبند نے عربوں کی حمایت اور بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے سلسلے میں بھیجی ہے ہم آپ کی اس ہمدردانہ حمایت کے لئے صمیم قلب سے آپ کے شکر گزار ہیں۔"

حضرت علامہ بلیاوی کی وفات

۱۳۸۷ھ کے رمضان المبارک میں حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین کی وفات دارالعلوم کے لئے ایک بڑا سانحہ تھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے دارالعلوم کی نصف صدی سے زیادہ کی تاریخ وابستہ تھی حضرت علامہ اکابر کی یادگار، قدیم روایات کے حامل اور بزرگوں کی دیرینہ روش کے امین تھے وہ ایک جید عالم اور بے نظیر استاذ تھے انہوں نے نصف صدی سے زیادہ دارالعلوم کی تدریسی خدمات انجام دیں اور ایک عرصے تک تدریس کے ساتھ صدارت اور نظامت تعلیمات کے فرائض بھی نہایت عمدگی سے انجام دیئے، تفسیر و حدیث کے علاوہ عقائد و کلام اور منطق و فلسفہ میں ان کو کمال حاصل تھا وہ علمی حلقوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی زندگی صرف طلبا کے لئے بلکہ عام علماء کے لئے بھی روشنی کا مینار تھی، ان کے تلامذہ جن کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے ہندوستان اور بیرون ہند میں بڑی تعداد میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں ان کا درس طلباء کے لئے بڑا گراں قدر سرمایہ ہوتا تھا، طویل مدت کی علالت کے بعد انھوں نے رمضان کے آخری ہفتے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ قبرستان قاسمی میں ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

۱۳۸۷ھ دارالعلوم کا عام الحزن

حضرت علامہ کی وفات سے دارالعلوم میں

۱۳۸۹ھ کی اسٹرائک

ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ میں طلباء نے بھی اسٹرائک کی، دارالعلوم میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔

اگرچہ اس وقت دارالعلوم کے سب طلباء شامل نہ تھے، مگر اسٹرائکی طلباء نے اس موقع پر جو مذموم طریقے اختیار کئے ان کے سبب سے طلباء کی وہ جماعت جو شریک اسٹرائک نہ تھی باوجودیکہ وہ تعداد کے لحاظ سے اسٹرائکی طلبہ سے بہت زیادہ تھی بالکل بے بس اور مجبور ہوگئی اس سے اسٹرائکی طلباء جو چاہتے تھے وہ کر گذرتے، آئے روز مار پیٹ کا ہنگامہ اور قتل و تشدد کی دھمکیاں اور ان کے ساتھ جو نا شائستہ سلوک کئے گئے، ایسے مواقع پر جو کچھ بھی کہا جائے وہ کم ہے۔

اسٹرائک کے وقت حالات جس رخ پر جا رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تحریک صرف مطالبات کے لئے نہیں بلکہ یہ دارالعلوم کے خلاف تخریب کاری کی کوئی منظم مہم اور سازش ہے جو دارالعلوم کو تباہ اور برباد کرنے پر آمادہ ہے اور جس کی قیادت بیرونی عناصر کے ہاتھوں میں ہے اور وہ طلباء کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، اس مرتبہ اسٹرائکی طلباء نے صرف تعلیمی مقاطعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ پہلے دفاتر کی کنجیوں پر قبضہ کیا اور پھر دارالعلوم کے تمام دروازوں کو اندر سے بند کر کے ان میں قفل لگا دیئے اور اس طرح سے دارالعلوم پر مکمل طریقے سے اسٹرائکی طلباء کا قبضہ ہوگیا، تمام درسگاہیں اور دارالعلوم کے جملہ دفاتر، کتب خانہ، حتی کہ دارالاہتمام اور خزانہ سب طلباء کی گرفت میں آگئے۔

تخریب کاری کی یہ سازش اتنی خطرناک اور منظم تھی کہ اس کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ دارالعلوم کی بقا خطرہ میں پڑ گئی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے ارباب اہتمام کی دست گیری اور اراکین مجلس شوریٰ کے کمال تدبر اور دوراندیشی کے نتیجہ میں چند ہی دنوں میں نہایت خوش اسلوبی سے تخریب کاری کی اس مہم پر قابو پا لیا گیا اور بہت سے طلباء کا اخراج کر دیا گیا، حالات کو درست ہونے کے لئے کچھ دنوں کے واسطے دارالعلوم کو بند کر دیا گیا اور طلباء کو ان کے وطن بھیج دیا گیا۔

معلومات کا وسیع تحمل ہے گو ہم نے بہت سے سوالات کی ایک فہرست دی حضرت مہتمم صاحب نے اپنے دولت خانہ پر ان حضرات اور علماء کو دعوت دے کر بلایا تھا تاکہ مسٹر گرہم کو تحقیقی جوابات دیئے جا سکیں۔ اس اجتماع کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے سوالات کی فہرست ہاتھ میں لے کر مسٹر گرہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے سوالات کے [illegible] توجہ میں یہ حضرات دے رہے ہیں حالانکہ اس مسئلہ کی بنیاد اور اس کی توضیحات کے بارے میں چند کچھ عرض کئے دیتا ہوں، یہ کہہ کر آپ نے ایک مفصل تقریر فرمائی جس میں خلافت کی حقیقت اس کے تاریخی دور اور اس کے تغیرات اور آثار و مابعد پر تفصیلی روشنی ڈالی یہ تقریر تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی جو ان سوالات سے متعلق جامع معلومات پر مشتمل تھی اور فرمایا کہ اب یہ اساتذہ جواب جب آپ ایک ایک سوال کرتی رہیں اور یہ جوابات دیتے رہیں گے مسٹر گرہم جو تقریر نوٹ کرتی رہی تھیں انہوں نے کہا کہ مجھے میرے سارے سوالات کے تشفی بخش جوابات مل گئے اور اب کسی سوال کی مجھے ضرورت باقی نہیں رہی۔

عرب ممالک کے زائرین کے تاثرات

رجب [illegible] میں عرب ملکوں میں سے مراکش، الجزائر اور شرق اردن کے چند حضرات دارالعلوم میں تشریف لائے، دارالعلوم کو دیکھ کر یہ لوگ بہت متاثر ہوئے اور اپنے مشاہدات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا:۔

"خداوند قدوس کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ہندوستان آنے کا موقع عطا فرمایا ہم ہندوستان کا سفر کرتے ہوئے اس جوش و خروش اور دینی جذبات کو محسوس کر رہے تھے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں موجزن تھے، ہم جب اپنی مشکلات اور تکالیف [illegible] کا جو ہمیں ایسے سفر میں پیش آتی ہیں، صحابہ کرام کی مجاہدانہ زندگی سے موازنہ کرتے ہیں تو ہماری یہ ساری جدوجہد ایک حقیر شے نظر آتی ہے، ہم نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کو گھوم پھر کر دیکھا، یہاں مسلمان باشندے بفضلہٖ شریعت نبوی کو

اپنی زندگی میں خاص مقام دیتے ہیں، اُن کی مستورات پردے کی پابند اور مذہبی احکامات
اور صوم وصلوٰۃ و نصائح سننے کی شوقین ہیں، یہاں کے دینی ادارے کسی خصوصیت کے حامل
ہیں جیسا کہ ہم ان مدارس کو چلا رہے ہیں، ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہندوستان کے
رسم و رواج پر اسلامی تعلیمات کے اثرات نمایاں ہیں، اور ہندوستان جیسے ملک میں
جہاں اطراف عالم سے لوگ آتے رہتے ہیں اسلامی تعلیمات مرکز توجہات ہیں۔

ہم دارالعلوم کے ارباب انتظام کے تہ دل سے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہمیں
دارالعلوم سے واقف کرایا اور ہماری گذارشات کو خندہ پیشانی سے سنا مزید یہ کرم کیا کہ
ہم کتاب معائنہ میں اپنی رائے کا اظہار بھی کریں۔ جزاہم اللہ خیرا۔

ہم خداوند کریم سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس دارالعلوم کو مزید ترقی و کامرانی عطا
فرمائے، اور یہاں کے رجال کار، مدرسین اور طلباء کو اُن کے مقاصد حسنہ میں فائز المرام
جائے۔

مسجد چھتہ

آپ کو یاد ہوگا کہ ١٢٨٣ھ میں دارالعلوم کا آغاز چھتہ کی ایک قدیم مسجد سے ہوا تھا اس مسجد کے شمال اور جنوب میں متعدد حجرے تھے، جنوبی حجرہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا قیام رہتا تھا اور شمالی حجرہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی قیام گاہ تھا۔ شمالی حجرہ بہت بوسیدہ ہوچکا تھا، ١٣٩٠ھ میں اسے از سر نو تعمیر کرایا گیا اور ایک وسیع کمرہ میں اس تاریخی حجرہ کو محفوظ کر دیا گیا، حجرے کے سامنے ایک وسیع برآمدہ بنا دیا گیا ہے۔ اس عمارت کی تعمیر کی سعادت خورجہ (بلند شہر) کے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر، ہمارے محترم جناب میجر احمد سعید خاں صاحب کے حصے میں آئی، اللہ تعالیٰ میجر صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، اُن کی توجہ سے یہ تاریخی مقام ایک عرصہ کے لئے محفوظ ہوگیا ہے۔

۱۳۹۰ھ نصاب تعلیم میں تبدیلی

دارالعلوم میں نصاب تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ مسئلہ مجلس شوریٰ کے زیر غور تھا جس کے نتیجے میں حسب ذیل تبدیلیاں نصاب میں کی گئیں۔

(۱) نصاب تعلیم میں درجہ بندی کو لازم قرار دیا گیا، جب کہ قبل ازیں جماعت بندی کے بجائے کتاب وار طریق تعلیم جاری تھا۔

(۲) نصاب تعلیم میں کچھ کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔

(۳) نصاب تکمیل کے سلسلے میں تکمیل تفسیر، تکمیل دینیات، تکمیل معقولات اور تکمیل ادب کا اجراء کیا گیا۔

نصاب تعلیم کی تفصیلات "نصاب تعلیم" کے عنوان میں پیش ہوں گی۔

دارالعلوم کا بیرونی ملکوں سے رابطہ

موجودہ دور میں آمد و رفت میں سہولت کے ذرائع نے سب پہلے کی طرح تمام فاصلے ختم کر دیئے ہیں۔ ان حالات میں ایک ملک دوسرے ملکوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، عربی مجلہ دعوۃ الحق، دارالعلوم کے پیام کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ مجلہ جن ممالک تک پہنچ کر دارالعلوم کی علمی اور دینی خدمات کے تعارف کا ذریعہ ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

سعودی عرب، جمہوریہ مصر، کویت، شام، لبنان، لیبیا، عراق، قطر، ابوظہبی
سوڈان، مراکش، تیونس، یمن، خلیج العربی، نائجیریا، الجزائر، ایران
انڈونیشیا، ترکی، تاشقند، حبش، امریکہ، جرمنی، ڈنمارک، سیلون۔

اس وقت دعوۃ الحق کے بجائے صحیفۃ اہل الحق شائع ہو رہا ہے۔

۱۳۹۱ھ جدید تعمیرات

اس سال دارالعلوم کی عمارتوں میں جو اضافہ ہوا، ان کی تفصیل یہ ہے: دارالشفاء جامعہ طبیہ کی عمارت مکمل ہو گئی۔ یہ عمارت دارالعلوم کے احاطے سے باہر جانب شمال مغرب تعمیر کی گئی ہے جو دارالشفاء

چودھری صاحب نے مجھ سے دورانِ ملاقات میں کہا کہ "یہ ملک آپ کا ہے۔ مسلمان اس ملک کے معزز شہری ہیں۔ ان کی خدمات سے اس دیش کی تاریخ روشن ہے۔ اس قسم کے مذہبی و اخلاقی ادارے ہندوستان کا سرمایہ ہیں۔ ہم سب ان کا احترام کرتے ہیں"۔[1]

حضرت مہتمم صاحب کا سفر یورپ

اس سال کے اہم واقعات میں حضرت مہتمم صاحب کا سفر یورپ بھی قابلِ ذکر ہے

حضرت ممدوح نے انگلستان، فرانس اور مغربی جرمنی کا سفر فرمایا۔ یہ سفر ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ سے شروع ہو کر ۱۰ شعبان ۱۳۹۰ھ کو ختم ہوا۔ انگلستان کے تمام بڑے بڑے شہروں گلاسگو، بریڈ فورڈ، بلیک برن، برسٹن، بولٹن، مانچسٹر، کونٹری، برمنگھم، ہڈرز فیلڈ، اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں جانا ہوا۔ خاص لندن میں متعدد اجتماعات میں تقریریں ہوئیں۔ ایک تقریر ایسٹ لندن یونیورسٹی میں ہوئی جس میں یونیورسٹی کے طلباء کی خواہش تھی کہ بتایا جائے کہ ایسی تقریر کی ضرورت ہے جو یورپ کے موجودہ خیالات اور غیر فطری نظام پر اثر انداز ہو سکے۔ حضرت ممدوح کی تقریر بے حد جامع، توحیدِ الٰہی، ضرورتِ رسالت، شریعتِ اسلام کے بنیادی مقاصد، مبداء و معاد وغیرہ مضامین پر مشتمل تھی۔ تقریر کے بعد طلبہ نے بتایا کہ "واقعی آج تقریر سن کر ہمارے ذہن سے تمام شبہات کا ازالہ ہو گیا جو یہاں کے مغربی ماحول نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر دیئے تھے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ٹھنڈے پانی سے ہمارے دلوں کو دھو دیا گیا ہے"۔

۲۲ ستمبر ۱۹۷۰ء تک انگلستان میں قیام رہا اور وہاں سے واپسی میں پیرس جانا ہوا۔ پیرس میں عرب بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ہوائی اڈے پر عربوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا۔ وہاں کے دو جلسوں میں عربی میں تقریریں ہوئیں جن کا عربوں پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ پیرس سے مغربی جرمنی کا سفر ہوا، اور وہاں سے ہو کر مصر میں مختصر سا ہوائی قیام [illegible]

---

[1] روداد عمل ۱۳۹۰ھ ص ۳۰

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو کر کویت میں مختصر قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی ۔

عرب ممالک کے اس دورے کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے یہ تاثر ظاہر فرمایا کہ وہاں کے لوگ اس وقت سکون قلب کے طلب گار ہیں ۔ مادیت نے وہاں کے رہنے والوں کو روحانیت سے بالکل محروم کر دیا ہے ، وہ لوگ تشنہ لب ہیں ۔ وہاں ایسے علماء دین کی سخت ضرورت ہے جو انگریزی زبان پر پوری قدرت رکھنے کے ساتھ اسلامی علوم کے بنیادی اصول وہاں کے لوگوں کو تجزیہ اور تنقید کے ساتھ سمجھا سکیں ۔ دور استقبال کے ساتھ آپ نے یہاں کچھ روز گزارے ۔ یورپ کے حالات پر حضرت مہتمم صاحب کا ایک مفصل مکتوب ہندوستانی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اور بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا ہے ۔ جس میں اعتدال کے ساتھ وہاں کے کلچر اور مذہب کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

۱۳۹۲ھ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی جدوجہد

دارالعلوم دیوبند کی سابقہ تاریخ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس کا دائرہ عمل محض تعلیمی میدان ہی تک محدود نہیں رہا ہے ۔ چونکہ اسلام دینی و دنیوی زندگی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ، اس لئے اس نے نہ صرف آخرت کے لئے بلکہ دنیوی زندگی کے لئے بھی ایک مستقل نظام عمل دیا ہے ۔ اسلام اپنے احکام کی معقولیت ، جامعیت ، روحانیت و مادیت ، انفرادیت و اجتماعیت ، عبادات و معاشرت اور روابط انسانی اور معاملات کا ایسا حسین امتزاج ہے جو انسانی عقل کی صحت مند روایات کے ساتھ ساتھ قلوب کو بھی بڑی حد تک مطمئن کر کے دعوت قبول دیتا ہے ۔ اس لئے مسلمانوں کا تعلق اسلام سے فطری طور پر قوی رہا ہے ۔ یہاں جب کبھی اسلام یا مسلمانوں پر حملہ ہوا یا مسلمانوں کو کوئی دینی یا سیاسی ضرورت پیش آئی تو ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے حتی الامکان اس کے پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے ۔ چنانچہ اکابر دارالعلوم کو جوں ہی یہ معلوم ہوا کہ حکومت ہند مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی

بھی پہلی بار ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں، معروف مسلم تنظیموں کے سربراہوں اور کئی اکابرین سے ممتاز کردہ حضرات نے حاضری کی تھی۔ چنانچہ ۲۸ ، ۲۹ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی کنونشن بڑی غیر معمولی خصوصیات کے ساتھ بمبئی میں منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں نے حصہ لیا۔

مسلمانانِ ہند کے مختلف مکاتب فکر کے اجتماع اور ہم آہنگی کے لحاظ سے یہ کنونشن جس قدر غیر معمولی تھا اسی حد تک مسلمانوں نے اسے کامیاب بھی کر دیا۔ کنونشن کے داعیوں اور مندوبین کی منتظمہ رہے جن میں سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، جماعتِ اسلامی کے علاوہ دوسری سیاسی غیر سیاسی جماعتوں کے رہنما موجود تھے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کو کنونشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف مذہبی مکاتب فکر اور جماعتوں میں سے کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں رہا جس کے نمائندے اور قائدین کنونشن کے پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو گئے ہوں۔ اس کنونشن نے اور دوسرے لفظوں میں ہندوستان کے تمام مکاتب فکر کے مسلمانوں نے متحدہ آواز کے ساتھ ایک ریزولیوشن کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ کسی حالت میں بھی مسلم پرسنل لاء میں تغیر و تبدل کو گوارہ نہیں کر سکتے۔ یہ شریعت اسلامی کا ایک حصہ ہے۔ اس متحدہ آواز کا اثر ملک اور حکومت دونوں پر پڑا اور اس مرحلے سے ہندوستان کے تمام مسلمان وحدت ملی کی بنا پر متحد ہو گئے۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک بے مثال صورت حال تھی۔

تحریک خلافت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہر مکتب فکر کے مسلمانوں نے متحد ہو کر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ملی دینی وحدت کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا دوسرا عظیم الشان اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا بورڈ کا صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کو منتخب کیا

۱۳۹۶ھ رابطۂ عالم اسلامی کے وفود

اس سال بھی سعودی عرب سے دو وفود دارالعلوم میں آئے

ایک وفد موتمر رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر رہا تھا، دسمبر سال بھی دار العلوم میں آیا، سید ابراہیم شعیب رئیس الوفد تھے، اس کے کچھ عرصے کے بعد دوسرا وفد شعبان کے اوائل میں آیا، اس میں وزارت معارف کے ڈائرکٹر اور مباحث علمیہ کے نمائندے شامل تھے، ان حضرات نے دار العلوم کو دیکھنے کے بعد اسے علم کا روشن مینار، عرفان و معرفت کا سرچشمہ اور طالبین ہدایت کی پناہ گاہ قرار دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ دار العلوم سے ایسے علماء پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں حدیث کا علم پھیلایا، جنہوں نے غلو پسندوں کی تحریف، جاہلوں اور فتنہ پردازوں کی تاویلات اور گمراہی سے دین حنیف کو محفوظ رکھا ہے۔

گورنر اترپردیش کی آمد

۱۳۹۶ھ کے اواخر میں اترپردیش کے گورنر اکبر علی خان صاحب تشریف لائے، موصوف نے دار العلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ اکابر دیوبند ہی تھے جنہوں نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے زبردست جذبات پیدا کئے، ہندو مسلم اتفاق، انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی حفاظت اور رحمۃ للعالمین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات مقدسہ کی ترویج و اشاعت کی وہ مشعل روشن کی جس سے پورے ملک کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا، علم و دانش کا یہ گہوارہ اسلامی تعلیمات کا عظیم الشان قومی مرکز، جنگ آزادی کا مضبوط قلعہ، ملک کی جمہوریت کا مرکز اور ہندوستان جیسے ملک کی عظمتوں کا امین ہے۔

اس موقع پر ریڈیو اسٹیشن بھارت ڈگری کالج کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے گورنر صاحب نے فرمایا کہ آج ہم مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند قدس سرہ کی دیو کلیان کی باقی

عبادت و ذکر کی کار و بار دیوبند کا شاندار نظارہ دیکھ کر بے تکلف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدمت کی لگن اور اخلاص سے جو دل بھر پور ہوتے ہیں ان کے درمیان صرف رائے کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے قدردان اور قدر شناس بھی ہوتے ہیں۔ اختلاف وہیں ہوتا ہے جہاں خدمت کی لگن دھیمی ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ اس موقع پر مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا شکریہ ادا کریں جو اپنا قیمتی وقت دے کر اخلاص و لگن کے ساتھ ملک اور قوم کی ذہنیتیں بڑھا رہے ہیں۔ سلف کے یہاں موجود ہیں، اس وقت جن اکابر کی یہاں موجودگی ہم سب کو محبت و اخوت سے ایک ہو جانے کا بڑا عظیم سبق دیتی ہے جسے ہمیں اپنے دلوں کی تختیوں پر لکھ لینا چاہئے اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔

دارالقضاء کا قیام

۱۳۹۲ھ میں مسلم پرسنل لا اور قوانین شریعت کے تحفظ اور بقاء کے لئے عملی طور پر محکمۂ قضاء قائم کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں اب تک متعدد مقامات پر دارالقضاء قائم ہو چکے ہیں، جن میں نکاح و طلاق وغیرہ عائلی مسائل کا شرعی طور پر فیصلہ ہوتا ہے۔

۱۳۹۵ھ حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ و حجاز اور یورپ

اوائل شعبان ۱۳۹۵ھ میں مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کے دارالحکومت نیروبی کے مقام پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک عالیشان مسجد کا افتتاح فرمایا۔ اس مسجد کا سنگ بنیاد بھی چند سال قبل موصوف ہی نے رکھا تھا۔ وہاں سے رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر اس کے رسالۃ المسجد کے اجلاس میں شرکت کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ رابطہ عالم اسلامی کے اس اجلاس کا مقصد یہ تھا کہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے کیا اقدامات بروئے کار لائے جائیں۔ اس موقع پر دنیا کے مختلف ملکوں کے ممتاز علماء اور دانشوروں کو دعوت

کے فیصلے کرنے کی روادار ہوتے تھے۔ یہیں اگر دوسری وقتوں میں ہوتے، سیاسی کی جگہ عدالتی فیصلے اور بین الاقوامی معاہدے بھی طے پاتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اسلام کی تحریک کا آغاز فرماتے ہوئے اولاً مسجد ہی کا سنگ بنیاد رکھا، گویا دعوتِ حق میں تخلیق عالم کا آغاز مسجد حرام سے ہوا اور بعد کو رسالت محمدیہ کی تحریک کا آغاز مسجد نبوی سے ہوا جس سے مسجد نبوی و شریف دونوں کا مبدأ ثابت ہوتی ہے، مسجد یہی پیغام دے رہی ہے کہ ہم عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست اور اجتماعیات کو اسی کے ذریعے سے اس رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کریں جو نماز و ذکر اور تعلق مع اللہ کا رنگ ہے، صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔

بہرحال اس مقدس شہر اور جوار ہی سے رابطۃ المسجد کی صدا کا اٹھنا اور مساجد یا مقاصد مسجد کی تنظیم کا ابھرنا خوش آئند اور اس دور کے مسلمانوں کے لئے نیک فال ہے بشرطیکہ اس صدا کو اسی حقیقت کے ساتھ آگے بڑھایا گیا جو رسالت المسجد کے اس عنوان کا حقیقی موضوع اور اس صدا کا فطری مفہوم ہے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کے بکھرے دل مل جائیں گے، اور ہر ملک کے مسلمان بالخصوص علماء دینی دعوت سے اس صدا کا خیر مقدم کریں گے، جہاں تک ہندوستان کے علماء اور فضلاء نے دارالعلوم دیوبند کا تعلق ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ خیر مقدم ہی نہیں بلکہ اپنا بھرپور تعاون بھی پیش کریں گے

وباللہ التوفیق؛

رسالت المسجد کے اس اجتماع میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اراکین مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے بھی شرکت فرمائی۔

مکہ مکرمہ سے حضرت مہتمم صاحب پیرس (فرانس) ہوتے ہوئے مسلمانانِ انگلستان کی دعوت پر لندن تشریف لے گئے، وہاں کے متعدد شہروں کے اجتماعات سے خطاب فرمایا

اور انگلستان میں مقیم بہت سے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا موقع ملا۔

شیخ الازہر اور دیگر علماء عرب کی آمد

۱۳۹۵ھ کے اہم واقعات میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر شیخ عبدالرحمن بیصار، مفتی اعظم مصر محمد خاطر اور سابق شیخ الازہر شیخ محمد الفحام تشریف لائے۔ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے فرمایا:

مجھے یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے صحیح معنی میں دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، رسوخ علم اور اخلاص و للہیت ہی کے یہ آثار یہاں اس ادارے میں دیکھے ہیں جس اداسی کا نتیجہ ہے کہ فضلائے دارالعلوم تمام شہروں اور ملکوں میں کامیابی کے ساتھ مشغول ہیں۔

شیخ محمد الفحام نے فرمایا:

"میں ایک زمانے سے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کا مشتاق تھا۔ میرا یہ اشتیاق دن بدن بڑھتا رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری موت اس وقت تک نہ آئے جب تک میں دارالعلوم کی زیارت نہ کرلوں۔ الحمدللہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں نے اپنی آنکھ سے جو کچھ یہاں دیکھا وہ اس سے بہت زیادہ ہے جتنا میں نے سنا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء کو ہر قسم کی توفیق اور ترقی سے نوازے۔ یہ ادارہ اسلام کے قلعوں میں سے ایک محفوظ قلعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اعانت فرمائے جو اس میں کام کر رہے ہیں تاکہ وہ اسلام کی خوب سے خوب تر خدمت انجام دے سکیں۔"

ان حضرات کے چند روز بعد علمائے عرب کی ایک دوسری جماعت آئی جس میں جناب یوسف السید ہاشم رفاعی وزیر حکومت کویت، استاذ عبدالرحمن مدیر ماہنامہ "البلاغ" کویت اور قطر کے شیخ عبدالعزیز عبدالستار کے ساتھ تاشقند کے نمائندے شرف الدین محمود وغیرہ شامل تھے۔ یوسف السید ہاشم الرفاعی نے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے

فرمایا کہ:۔

"عالم اسلام کو اس وقت ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے۔ یہ چیلنج پہلے تو اسلام کے دشمنوں کی جانب سے تھا وہ کہا کرتے تھے کہ اسلام اس دور کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن اب یہ چیلنج خود داخلی طور پر مسلمان نوجوانوں کے اندر سے ابھر رہا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوان مستشرقین کی کتابیں دیکھتے ہیں اور تشکیک میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں کہ اسلام موجودہ دور میں رہنمائی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر دشمن باہر سے گھر میں ہو تو اس کا مقابلہ دشوار ہوتا ہے۔ ان نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسلام کو اس کے صحیح مآخذ سے سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ اس فکری چیلنج کے لئے ایسے علمائے راسخین کی ضرورت ہے اور علمائے راسخین پیدا کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام پر اعتراضات کے رد کے لئے ہم جلیل القدر علماء کے محتاج ہیں۔ ایسے حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر جیسے علماء کی ضرورت ہے اور ہمیں فخر ہے کہ الحمد للہ اس درجے کے علماء دار العلوم میں موجود ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اپنے افکار و نظریات میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے کسب فیض کرتا ہے۔ امام غزالی نے اپنے عہد کے مطابق فلسفہ یونان کی یلغار سے اسلام کو محفوظ رکھا شاہ ولی اللہ نے کفر و شرک کی تردید کے لئے کام کیا۔ ہمیں بھی اس وقت اسی جذبے سے کام کرنا چاہئے جو اس دور کی پیداوار ہیں مستشرقین اور ان کی تقلید میں بعض نے جو شبہات مشہور کر دی ہیں ہمیں اپنے حقیقی موقف کی حفاظت کے لئے ان کے خلاف کام کرنا چاہئے۔"

شیخ عبدالعزیز عبداللہ نے فرمایا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس اسلامی قلعے کی زیارت کی توفیق بخشی جسے ہم ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کو دین حنیف

کی خدمت اور اصلاحی دعوت کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے۔ ہم چند دنوں سے برابر دارالعلوم کے بارے میں سنتے اور پڑھتے رہتے تھے اور جانتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دین کی روشنی کا مینار ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے سارے عالم اسلام کو منور کر رہا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے مستقبل کو حال سے زیادہ بہتر بنائے جیسا کہ اس نے حال کو ماضی سے بہتر بنایا ہے!

آخر میں عرض ہے کہ میں سورۂ عصر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورت اپنی جامعیت کے لحاظ سے انسانی زندگی کو سنوارنے کے لئے بہت کافی ہے، اس میں ایمان، عمل صالح، حق کو مضبوطی سے پکڑے رہنے اور مصائب پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اگر ساری دنیا کے فلسفی اور دانشور مل کر انسانی زندگی کیلئے پروگرام مرتب کریں تو ان چار چیزوں سے بہتر کوئی اور چیز پیش نہیں کر سکیں گے!

وفیات

۲۲ شوال ۱۳۹۵ھ کو حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی وفات کا المناک حادثہ پیش آیا، مولانا مرحوم متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے جمعیۃ علماء ہند میں ان کی سیاسی اور تنظیمی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی، سیاسی ہنگامہ خیزیوں میں شرکت کے باوجود ان کی علمی مشغولیت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور اوراد و وظائف کی پابندی کی مثال کم ملتی ہے، وہ عرصہ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممتاز رکن تھے اور مجالس کی جان تھے، مرحوم دینی علم پسند کیا کرتے تھے۔

[illegible] کو دارالعلوم کے شعبۂ کتابت کے استاذ حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا، مولانا مرحوم خط نسخ اور نستعلیق کے باکمال کاتب تھے، فن کتابت میں ان کے سیکڑوں شاگرد برصغیر میں موجود ہیں، مولانا مرحوم کو ایک واسطے سے مشہور خطاط منشی حامد علی میرٹھی سے تلمذ حاصل تھا، حضرت مولانا نانوتویؒ سے آپ کو ایک خاص علمی نسبت تھی، آپ نے حضرت مولانا نانوتویؒ کی کئی تصانیف کی تسہیل و تشریح فرمائی، اور دارالعلوم ہی کے زیر اہتمام ان کی اشاعت کی گئی۔

خدا کو دارالعلوم کے بانی عظیم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ نے اپنے اساسی اصول ہشتگانہ میں جمہور بالخصوص سرکار آزاد تعلیمی نظام کی اساس عوامی تعاون کو قرار دیتے ہوئے سادہ جماعتی زندگی، روحانی تربیت، حب الوطنی، قومی یک جہتی اور ملکی آزادی کی حفاظت کو اسلامی تعلیم کے ساتھ یہاں کے طلبہ کے ذہن میں پیوست کیا ہے چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم و تربیت سے بڑے بڑے مجاہدین آزادی پیدا ہوئے جن کے احترام میں یہاں کے ہندو اور مسلمان برابر کا حصہ لیتے ہیں اور خلوص کے ساتھ دل جوں کر ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ادارہ ہندوستان کے لئے اسلامی رابطہ کا سب سے قدیم اور قابل احترام ذریعہ ہے۔

آخر میں صدر محترم نے جوابی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا، ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ ملکی زندگی میں ایک مضبوط فعال اور موثر عنصر کی حیثیت سے بھرپور حصہ لیں اور اپنی قابلیتوں کو کمال پر پہنچائیں۔

صدر محترم نے اکابر دارالعلوم کو ان کی علمی اور سیاسی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ عظیم روشن ستارے ہیں جنہوں نے اپنے امتیازی کردار کے ساتھ جنگ آزادی کے ہر مرحلہ میں سو سال تک ملک اور قوم کی خدمت انجام دی ہے، انھوں نے اپنی جدوجہد کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا، بلکہ محض اپنا فرض سمجھ کر مسلمانوں کے تاریخی وقار کو بحال فرمایا ہے۔

صدر جمہوریہ ہند کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:

یہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا ایک اہم عظیم اور تاریخی دینی درسگاہ ہے، میں آپ کے خلوص اور آپ کی اسلامی سادگی اور دینی لگاؤ سے بے حد متاثر ہوا ہوں قرآن کے مجموعہ درس انسانیت کا سچا نمونہ پیش کیا ہے ہر قیمت پر رہی ہیں۔

حضرات! یہ ادارہ دارالعلوم ایک درسگاہ کے علاوہ بھی بہت کچھ رہا ہے،

جنگ آزادی میں یہ سرفروشوں اور مجاہدوں کا ایک مرکز تھا۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ وطن
عزیز کی آزادی کی جدوجہد میں دیوبند کی سیاسی، دینی اور قومی درس گاہ سے وابستہ علماء دیوبند
کا نام سرِ فہرست رہا ہے۔ اس لئے اس کے تاریخی اور مجاہدانہ کردار کو کبھی فراموش نہیں
کیا جاسکتا۔ ہمارے وطن کی آزادی کی تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف سے لکھے
جانے کا مستحق ہے۔

بانیٔ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے دوسرے مخلص ساتھیوں، عالموں
اور مجاہدوں اور ان کے جانشینوں کی مساعی اور بے لوث علمی اور دینی خدمات کا ہی یہ
نتیجہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس ادارے سے فیضیاب ہوئے۔ اور ان بزرگوں کے وسیلے اور
واسطے سے لاکھوں گھرانوں میں دینی علم و فکر کی شمعیں روشن ہوئیں۔

آج سے ایک صدی پہلے ایک طرف حضرت حاجی امداد اللہ کی زیر سرپرستی
مولانا محمد قاسم وغیرہ جیسی بزرگ ہستیوں نے دینی تعلیم کی تحریک شروع کی دوسری
طرف سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے جدید تعلیم کی تحریک چلائی۔ بنیادی طور
پر دونوں تحریکیں ایک دوسرے کا تتمہ تھیں۔ ان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہ تھا مگر دیوبند کو
خصوصی امتیاز حاصل تھا کہ اس نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس لئے یہ ادارہ
ہر محب وطن ہندوستانی کے لئے باعث فخر ہے۔

جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمات کا تعلق ہے آپ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے
ہیں کہ بیان بہت ہے۔ جیسے حضرت محمد مصطفیٰ کی ساری کی زندگی اسلام اور اسلامی تعلیمات
کو پھیلانے میں صرف ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ادارے نے ایسے اشخاص پیدا کئے جو ا
سلام کے زندہ اور پائندہ اصولوں کی دولت سے مالا مال تھے۔ اسلام نے سب سے پہلا
سبق توحید کا دیا ہے۔ دوستی اور مساوات سکھائی ہے۔ اس طرح وحدت فکر کی بنیاد پر
مستحکم ہونے کا گُر سکھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت و صفائی اور قلبی پاکیزگی کی

پانچ وقتی ڈریلنگ کا پابند بنایا ہے جہاد و تنظیم کا سبق سکھایا مرکزیت پر زور دیا اور علم
کے ساتھ عمل اور تقویٰ کی اہمیت واضح کی ہے۔ اسلامی احکام دین و دنیا دونوں کی حفاظت
کرتے ہیں۔ نماز روحانی تربیت کے ساتھ صحت جسمانی اور جہاد و نظم کا سبق سکھاتی ہے۔
اسلام نے جن بنیادی اصولوں کی تعلیم دی ہے، وہ وقتی نہیں بلکہ دائمی ہیں۔ کیا
اس ترقی یافتہ زمانہ میں اتحاد، تنظیم اور ڈسپلن کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے بانیٔ دارالعلوم کے بنیادی اصولوں کی حفاظت
اور پاسداری کی ہے اور اپنے تعلیمی نظام کو کسی قسم کے دباؤ اور بیرونی مداخلت
سے بالکل آزاد رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس تعلیم و درسگاہ میں دینی تعلیم کے ساتھ
طلبہ میں وطنی محبت، قومی یکجہتی اور ملک کی آزادی کی حفاظت کے پاکیزہ جذبات کی
پرورش کی ہے اور یہی وہ روایات ہیں جن پر ہم سب کو فخر ہے۔ در حقیقت اسی تعلیم و
تربیت کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم کے استادوں اور طالب علموں نے جنگ آزادی میں بڑھ
چڑھ کر حصہ لیا، ہمارے بزرگوں نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ مجھے اسیر مالٹا مولانا
محمود حسنؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے ساتھیوں کی یاد آ رہی ہے، ان کی پاکیزہ
زندگی کا نقشہ میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے، اور مولانا حفظ الرحمن کی جاندار زندگی میری
آنکھوں کے سامنے ہے۔

[illegible]

۱۸۵۷ء میں جب سامراجیوں نے ہندوستان پر اپنا غاصبانہ قبضہ جما لیا تو
یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی جاہ و دولت کے بعد ہم دینی آزادی
سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اسی دینی اور وطنی آزادی کے لئے جذبہ کے تحت حاجی
امداد اللہ کی سرپرستی میں ۱۸۶۶ء میں یہ دینی مرکز قائم ہوا۔ اس کے دینی تعلیم کے ساتھ
حب الوطنی کی شمع روشن کرنا بھی اس کا ایک اہم اور بنیادی مقصد رہا ہے۔ یقیناً

خوشی کی بات ہے کہ دار العلوم میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے منطق، فلسفہ، ریاضی
طب جیسے علوم، انگریزی اور ہندی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے۔ مگر مجھے زیادہ خوشی ہوگی
اگر آپ دیگر علوم کی طرف بھی توجہ دیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسرے علوم سیکھنے
میں ہمیشہ پہل کی ہے۔

آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے عظیم رہنماؤں نے بڑی دانشمندی
اور دور اندیشی سے سیکولرازم کے اصول کو اپنایا تھا۔ ہمارے دستور کے مطابق ہر شہری
کو اپنے عقیدے کی آزادی دی ہے۔ ہمارا دستور تمام شہریوں کو برابر کے حقوق دیتا
ہے۔ اس دستور کا تقاضا ہے کہ ہر بچے کی دلی امیدوں کو ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہ
بننے دیا جائے۔ عقیدہ یا مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ زبان یا
علاقے کی بنیاد پر تعصب اور تنگ نظری کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ یہ سب باتیں
دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کے عظیم اور تاریخی خطبے سے ہم آہنگ ہیں اور جسے انسانیت کا
اولین منشور کہا جا سکتا ہے۔

آپ نے سپاس نامہ میں مسلم پرسنل لا کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی نظر سے
حکومت ہند کے متعدد بیانات گذرے ہوں گے جن میں متعدد بار واضح طور پر کہا جا چکا
ہے کہ پرسنل لا میں تبدیلی لانے کا اس وقت تک کوئی سوال ہی نہیں جب تک مسلمان
خود نہ چاہیں۔ جہاں تک اسلام کا سوال ہے ہم سب کے لئے قرآن پاک اور اسوۂ رسول صلی اللہ
علیہ وسلم تمام زمانوں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ جیسا کہ ہمارا ایمان ہے تو ہمیں آج انسانی
مسائل کا حل بھی انہی میں ڈھونڈنا ہے۔ ہمارے اس مرکز میں اگر علماء یہ بتائیں تو بہتر ہوگا
کہ اسلام کی فکری اور روحانی تعلیمات اور حضور کی سیرت دنیا کے ساتھ کتنی ہم آہنگ ہیں کہ وہ انسانی
فطرت کے جذبوں اور ہر دور اور ہر ماحول میں انسانیت کے لئے اخوت، مساوات اور ترقی کا پیغام
ہیں۔ ان کی انسانیت نوازی اور فیض بخشی سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہماری

دنیا گردشِ روزگار کے سانچے میں تبدیلیوں کا ایک وسیع میدان ہے۔ حالات اور وقت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ روز مرہ زندگی نئے مسائل کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمیں اس کے ساتھ نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اب یہ کام ہمارے علما کا ہے کہ وہ اسلام کی پاکیزہ اور صحیح تعلیمات کو حالات کے پورے شعور کے ساتھ اس خوبی سے دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ان کی دل نوازی کی شمع کشش اور تاثیر میں کسی درجہ کوئی کمزوری محسوس نہ ہونے پائے، انسانیت کی صحت مند رہنمائی سے خدا کی مخلوق ہر دور میں پورا فائدہ اٹھا سکے۔

حضرت! ۱۸۶۶ء سے ۱۹۶۶ء تک کا ایک سو برس تک کا زمانہ ہے۔ اس عرصے میں دارالعلوم نے علم و فضل کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، اور دین کے لئے جو بیش بہا قربانیاں کی ہیں وہ بہت بڑا کارنامہ ہیں۔ اور میری دعا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا فیض ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے۔

×

باب سوم

دارالعلوم کا مسلک

دارالعلوم کی تحریرات میں اس کے مسلک کی یہ تشریح کی گئی ہے:-

دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت، حنفی مذہب، اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے مشرب کے موافق ہوگا۔

دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام اراکین و متعلقین دارالعلوم کا فرض ہوگا۔ کسی ملازم دارالعلوم یا طالب علم کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی ایسی انجمن یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کے لئے ضرر رساں ہو۔[1]

جہاں تک دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے دینی رخ کا تعلق ہے اسے نہایت ہی بلیغ اور جامع انداز میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے اپنے رسالہ مسلک علمائے دیوبند میں واضح کر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ کم و بیش انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

"دینی حیثیت سے یہ طبقہ پوری جماعت مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع و قیاس پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین

[1] دستور اساسی دارالعلوم دیوبند دفعہ ۲ ص ۱

منزلوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے وہیں مجسمہ تواضع و فروتنی
اور لا امتیازی کے جوہروں سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور کانّہٗ کن پہلتا ہی
محسوس ہے جہاں وہ مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے وہیں مجاہد، سرفروش اور جانباز
سپہ سالار بیرونی خدمت کے معاملات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے، غرض علم و عمل،
خلوت و جلوت، ورع و جہاد کے مخلوط جذبات و دو رنگی سے ہموار رہ کر دین
میں اعتدال اور میانہ روی اُن کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی، جو علوم کی
جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے، اسی لئے اُن کے یہاں محدّث
ہونے کے معنی فقہ سے روٹھنے یا فقیہ ہونے کے معنی حدیث سے بیزار ہو جانے یا
نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم کلام کی مخالفت کے معنی
تصوف بیزاری کے نہیں بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل
وہ جامع ہے جو بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن) اور حکیم و مربی
ثابت ہوا جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشف، حیا و انکساری کے ساتھ
عدم مداہنت، رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تبلیغ کیسوئی
کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت و انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو گئے، اور ادھر
علم و فن اور تمام ارباب علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی، حق شناسی
و ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے جن کی بنا پر دینی
شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء
صوفیاء ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولیین، امرائے اسلام ہوں یا خلفاء ان کے
نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں، جذباتی رنگ سے
کسی طبقے کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح و ذم میں حدود شرعیہ سے بے پرواہ ہو جانا
اس جماعت کا مسلک نہیں۔ اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات

سے شمال میں سائبیریا سے لے کر جنوب میں سماٹرا اور جاوا تک اور مشرق
میں برما سے لے کر مصر، سوڈان، حبش اور افریقہ تک علوم نبوت کی روشنی پھیلادی
جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔

دوسری طرف سیاسی و ملکی معاملات سے بھی ان کے سلسلہ سے کسی
وقت بھی بے تعلقی نہیں کی حتی کہ سنہ ۱۸۰۳ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد
نے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق
میں محفوظ ہیں، کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ
نہیں ڈالا جا سکتا بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے
زوال کی صدیوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ
صاحب قدس سرہ کی سرپرستی میں ان کے ان دو مریدین خاص حضرت مولانا
محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور ان ہی کے منتسبین اور متوسلین
کی مساعی انقلاب، جہادی اقدامات اور حریت و استقلال ملی کی فدا کارانہ جد و جہد
اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر ان کی قید و بند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ بھلائی
جا سکتی ہیں نہ بھلائی جا سکتی ہیں، یہ لوگ ان حالات پر بعض اسباب سے پردہ ڈالنا
چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہ سرفروشی میں قربان نہیں کئے گئے تو اس سے خود
ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا، اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ
سے باخبر اور ارباب تحقیق کے روبرو جیسی تحریریں ہوں وہ کسی دیوبندی نسبت
کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی بھی پہلا جو
فریب ہیں اور قطعاً ناقابل التفات ہیں، اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات
کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہی کی جا سکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوبیت
و حال کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک حزم و احتیاط کا مظاہرہ ہیں، ورنہ تاریخی

اور ساتھ ہی شواہد کے پیش نظر ان کی کوئی اہمیت ہے نہ وہ قابل التفات ہیں
ان حوادث کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور انہیں حوادث جنایات کے ساتھ
ان بزرگوں کے خلاف دسیسہ کاری سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی صداقت کے
سلسلہ میں آگے آتے رہے خواہ وہ تحریک خلافت ہو یا آزادی وطن، انہوں نے
بروقت ان تمام غلط الزامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔

مختصر یہ کہ علم و عرفان کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور
وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین، ملت اور قوم و وطن
کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ
اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم علوم نبوت کو حاصل رہی ہے، جب کہ یہ تمام
شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے
نمایاں رکھا اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت،
جامع عشق و محبت، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دعوت و سیاست،
جامع درایت و روایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبدیت و مذہبیت،
جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال و قال ہے، اس مسلک کو
ہر سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے
تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقۃً اہل سنت و الجماعت،
مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً ماتریدی اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل،
فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

اس سلسلے میں چونکہ "مسلک دارالعلوم" کے نام سے مستقل رسالہ لکھا
جاچکا ہے اس لئے اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی،
اس کے جامع جملے اس تحریر میں لے لئے گئے ہیں تفصیلات کے لئے اس رسالہ

سے مراجعت کی جا سکتی ہے[1]

نیز اس لئے بھی یہاں زیادہ تفصیل غیر ضروری تھی کہ اس مسلک کا واضح ترین خاکہ تاریخ کے مقدمہ میں بھی حضرت مولانا موصوف نے تحریر فرما دیا ہے۔ البتہ اس پچھلے حصے مضمون کی تکمیل کی ضرورت تھی سو وہ بھی حضرت ممدوح ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے، جو انھوں نے احقر کی فرمائش پر تحریر فرما کر بھیجے عنایت فرمائی ہے جس کا متن بلفظہ یہ ہے:

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسلک اعتدال سات اصولی بنیادوں پر قائم ہے جو مع مختصر تشریح حسب ذیل ہیں۔

۱۔ علم شریعت جس میں اعتقادات، عبادات، معاملات وغیرہ کی سب انواع داخل ہیں جو کہ حاصل ایمان اور اسلام ہے، بشرطیکہ یہ علم سلف کے اقوال و تعامل کے دائرے میں محدود ہو کر ان مستند علماء دین اور مربیان قلوب کی تعلیم و تربیت اور فیضان صحبت سے حاصل شدہ ہو، جن کے ظاہر و باطن، علم و عمل اور فہم و ذوق کا سلسلہ سند متصل کے ساتھ حضرت صاحب شریعت علیہ افضل الصلوات والتحیات تک مسلسل پہنچا ہوا ہو۔ خود رائی یا محض کتب بینی اور ترتیب مطالعہ یا محض عقلی تگ و تاز و دور رسی کاوش کا نتیجہ نہ ہو، گو وہ کتنا ہی پیرایۂ بیان اور استدلالی قوت و برہان سے خالی بھی نہ ہو کہ اس علم کے بغیر حق و ناحق، حلال و حرام، جائز و ناجائز، سنت و بدعت اور مکروہ و مندوب میں امتیاز ممکن نہیں اور نہ ہی اس کے بغیر دین میں خود رو تخیلات، فلسفیانہ نظریات اور بے محابا توہمات سے نجات ممکن ہے۔

۲۔ پیروی طریقت یعنی مستند صوفیہ کے سلاسل طاہرہ اصول مجربہ کے تحت (جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں) تہذیب اخلاق، تزکیۂ نفس اور سلوک باطن کی تکمیل، کہ اس کے بغیر اعتدال اخلاق، استقامت دین و ایمان، نور بصیرت، وسعت نگاہ

---

[1] دار العلوم کی صد سالہ زندگی ص ۲۳ — ۲۴

اور مشاہدۂ حقیقت ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعبۂ اسلام، ایمان کے ساتھ ساتھ احسان سے متعلق ہے۔

۲۔ اتباع سنت

یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں سنت نبوی کی پیروی اور ہر عقیدہ و عمل اور ہر کیفیت ظاہر و باطن میں ادب شریعت برقرار رکھ کر سنت مستمرہ کا طریق، کہ اس کے بغیر رسوم جاہلیت، بدعات و منکرات اور رواج و احوال باطل کے نفوس کے لمس ... طور پر اہل حال کے زعم کی شطحیات و کلمات کی اتقان یا انہیں شریعت کے متوازی ایک مستقل قانون عام کی صورت دے دینے کی بلا سے نجات ممکن نہیں۔

۳۔ فقہی حنفیت

اسلامی شریعت اور اجتہادیت کا نام فقہ ہے، اور اکابر دارالعلوم چونکہ حنفی ہیں اس لئے فقہی حنفیت کے معنی اجتہادی فروعات میں فقہ حنفی کا اتباع اور مسائل و فتاویٰ کی تخریج اور ترجیح میں اسی کے اصول مقررہ کی پیروی کے ہیں کہ اس کے بغیر مستنبط مسائل میں ہوائے نفس سے بچاؤ اور تلفیق کے رستے سے مختلف مذہبوں میں دوڑنے کے ساتھ خود رائی و خود پسندی یا عوام کی حسب خواہش مسائل میں قطع و برید یا ہنگامی حالات کی مرعوبیت سے ذہنی تیز روی آزادی اور علماء کے ساتھ مسائل میں بے جا تصرفات و اختراعات سے اجتناب ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعبۂ اسلام سے متعلق ہے۔

۵۔ کلامی ماتریدیت

یعنی اعتقادات میں فکر صحیح کے ساتھ طریق اہل سنت والجماعت اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے تنقیح کردہ مفہومات اور مرتب کردہ اصول و قواعد پر عقائد حقہ کا استحکام اور قوت یقین کی برقراری، کہ اس کے بغیر زائغین کی شک اندازیوں اور فرق باطلہ کے قیاسی اختراعات اور اوہام و شبہات سے بچاؤ ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعبۂ ایمان سے متعلق ہے۔

۶۔ دفاع زیغ و ضلالت

یعنی ہر گروہ متجددین اور ارباب زیغ کے اٹھائے ہوئے فتنوں کی مدافعت، مگر وقت کی رعایت و بالی

ہیں اور ماحول کی عصبیات کے ظہور کے ساتھ وقتی ہی تھے، دوسرے وسائل کے ذریعہ جس سے اشاعتِ سنت ہو، نیز کا ہر اس روح کے ساتھ ان کے استیصال کی مساعی کہ اس کے بغیر ازالۂ منکرات اور معاشرے کی دست بُرد سے شریعت کا تحفظ ممکن نہیں، اس میں ردِّ شرک و بدعت ردِّ مخالفین و مبتدعین، اصلاحِ رسومِ جاہلیت، حسبِ ضرورت تحریری یا تقریری مناظرے اور تغییرِ منکرات سب شامل ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شعبہ اعلاء کلمۃ اللہ لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا اور اظہارِ دین لیظہرہ علی الدین کلہ اور عام نظمِ امت سے متعلق ہے۔

۷۔ ذوقِ قاسمیت و رشیدیت

پھر یہی پورا مسلک اپنی پوری شان سے جب دارالعلوم دیوبند کے سربراہوں، ورثیٔ مسلک حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ کے روح و قلب سے گزر کر نمایاں ہوا تو اس نے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایک خاص ذوق اور مخصوص رنگ کی صورت اختیار کر لی جسے مشرب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ دستورِ اساسی دارالعلوم دیوبند منظور شدہ شعبان ۱۳۶۸ھ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کہا گیا ہے کہ "دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل السنت والجماعت حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہما کے مشرب کے موافق ہوگا" (دستورِ اساسی ص ۲)

اس لئے مسلکِ دارالعلوم دیوبند کے اجزاءِ ترکیبی میں یہ جزء ایک اہم عنصر ہے جس پر دارالعلوم کی تعلیم و تربیت کا کارخانہ چل رہا ہے، جو احسان کے تحت آتا ہے، جب کہ اس کا تعلق روحانی تربیت سے ہے، پس علمِ شریعت، پیرویٔ طریقت، اتباعِ سنت، فقہی حنفیت، کلامی ماتریدیت، دفاعِ ضلالت اور ذوقِ قاسمیت و رشیدیت اس مسلکِ اعتدال کے عناصرِ ترکیبی ہیں، جو منجملہ مسائل بقاء حق ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہیں ان سب ہی کو اگر حدیثی زبان میں ادا کیا جائے تو ایمان، اسلام، احسان اور اظہارِ دین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ تمہید میں اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے، انہی دفعاتِ سبعہ کا مجموعہ تفصیلات الاولہ العلوم دیوبند

کا مسلک ہے بغور کیا جائے تو یہ مسلک بعینہ حدیث جبریل کا خلاصہ ہے جس میں جبریل علیہ السلام کے سوالات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام، ایمان، احسان اور وقوع قیامت کی تفصیل ارشاد فرمائی ہے اور اس کے مجموعہ کو تعلیم دین فرمایا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ علماء دیوبند کا مسلک حدیث جبریل ہے تو بے محل نہ ہوگا۔

حدیث جبریل کا متن مع ترجمہ حسب ذیل ہے:-

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال بینا
نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض
الثیاب شدید سواد الشعر لا یری علیہ
اثر السفر ولا یعرفہ منا احد
حتی جلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ
ووضع کفیہ علی فخذیہ
وقال یا محمد اخبرنی
عن الاسلام فقال الاسلام
ان تشہد ان لا الہ
الا اللہ وان محمدا رسول
اللہ وتقیم الصلوۃ وتؤتی
الزکوۃ وتصوم رمضان وتحج
البیت ان استطعت الیہ سبیلا
قال صدقت فعجبنا لہ یسألہ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ ہم ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تھے
کہ اچانک نہایت سفید کپڑوں والا نہایت سیاہ بالوں والا
ایک شخص ظاہر ہوا، جس پر سفر کی کوئی علامت ظاہر ہوتی
تھی اور ہم میں سے کوئی شخص اس کو پہچانتا بھی نہ تھا،
یہاں تک کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا
اور اس نے اپنے دونوں زانو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
زانوؤں سے ملا دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں
پر یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھ دیئے اور یہ
سوال کیا کہ اے محمد، مجھے اسلام کے بارے میں بتلائیے؟
آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ
دیا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر قدرت ہو تو بیت اللہ
کا حج کرو۔ اس شخص نے کہا کہ آپ نے سچ فرمایا۔ حضرت
عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ آپ سے سوال کرتا

حقائق و دقائق پر مجبور کر کے عقل و روایت کو معطل کر دیا گیا ہے، ورنہ دین کے باطنی نظام اسرار و لطائف اور رقائق و نکات کو بے اعتباری اور احتمال و استعجاب کی ساری راہیں مسدود کر دی گئی ہیں، جس سے دین ایک بے حقیقت بلکہ بے حرمت غیر معقول اور جامد شے بن کر رہ جاتا ہے، اور اس کی ہمہ گیریت و وسعت افراد کو اس سے کوئی علاقہ باقی نہیں رہتا۔ پس ایک مسلک میں نقل ہی نقل رہ جاتی ہے اور ایک مسلک میں عقل ہی عقل اور مجتہدانہ، ظاہر ہے کہ یہ دونوں جہتیں افراط و تفریط اور ذاتی اغراض و تحریف کی ہیں جس سے یہ مقدس اور جامع و معتدل دین بری ہے، اس لئے دین کا جامع عقل و نقل مسلک یہی ہو اور یہی ہو بھی سکتا ہے کہ تمام اصول و فروع میں عقل سلیم نقل صحیح کے ساتھ ہمہ وقت وابستہ رہے کہ دین کے ایک مطیع و فرمانبردار خادم اور پیشکار کی طرح کہ اس کی ہر ایک کلی و جزئی کے لئے مفصل براہین، معقول دلائل اور حسی شواہد و نظائر فراہم کرتی رہے جس سے دین، امت کے ہر طبقہ کے قابل قبول اور ہر جگہ و ہر دور میں حیات ثابت ہو اور یہ امت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا کی صحیح مصداق دکھائی دے، یہی مسلک اہل السنت والجماعت کا مسلک کہلاتا ہے اور علماء دیوبند اسی مسلک کے نقیب اور علمبردار ہیں، اسی لئے وہ اس مسلک جامع اور ان تمام دینی علوم کے اجتماع سے بیک وقت مفسر بھی ہیں اور محدث بھی، فقیہ بھی ہیں اور متکلم بھی، صوفی بھی ہیں اور مجاہد و مفکر بھی اور پھر ان تمام علوم کے امتزاج سے ان کا مزاج معتدل بھی ہے اور متوسط بھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں نہ غلو ہے نہ مبالغہ، اور اسی وسعت نظری کی بدولت نہ تکفیر بازی ہے نہ دشنام طرازی، نہ کسی کے حق میں سب و شتم ہے نہ بدگوئی، نہ ضد و عناد اور طیش ہے اور نہ غلبہ جاہ و مال، اور افراط و تفریط بلکہ صرف بیان مسئلہ ہے اور اصلاح امت یا احقاق حق ہے اور ابطال باطل، جس میں شخصیات کی تحقیر اور بدگوئی کا دخل ہے، نہ طعن و تشنیع نہ استہزاء، اور ان ہی اوصاف و احوال کے مجموعہ کا نام دارالعلوم دیوبند ہے اور اسی علمی و عملی ہمہ گیری سے اس کا دائرۂ اثر دنیا کے تمام ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔

دارالعلوم کے قیام کی مشکلات

اور مشیتِ ایزدی کا فیصلہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیوبند جیسی معمولی بستی میں دارالعلوم کے قیام کا یہ عظیم الشان[1] تخیل بظاہر نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، اور اس کا موجودہ حالت تک ترقی کرنا اس سے بھی زیادہ حیرت کا باعث ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم مذہبی مرکز کے لئے کوئی بڑا اور مشہور معروف مقام تجویز کیا جانا چاہئے تھا، نیز دارالعلوم کے قیام کے مختصر بعد ہی سہارنپور میں مظاہر علوم اور مراد آباد میں قاسم العلوم اور میرٹھ میں مدرسہ اسلامی قائم ہو چکے تھے اور یہ تینوں مقام دیوبند کے مقابلے میں زیادہ مرکزیت اور اہمیت رکھتے تھے، اس کے علاوہ دیوبند جیسی چھوٹی اور غیر معروف جگہ میں تعلیم کے لوازم و اسباب کا مہیا ہونا بھی سخت دشوار تھا، دیوبند نہ کوئی غیر معمولی تجارت گاہ تھا اور نہ ہی صاحبِ ثروت لوگوں کی بستی ہے جن کی دولت کے سہارے سے اتنے بڑے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا تھا، ریل بھی جو آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اُس وقت موجود نہ تھی۔

---

[1] دیوبند سے گنگوہ شریف، [illegible]
[illegible]
جلد اول ص ۱۴۰

اس کے ساتھ ساتھ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ جس وقت دارالعلوم کا قیام ہوا تو فارسی زبان اور قدیم علوم و فنون جو اب تک ملک میں رائج تھے اور جن کے ذریعہ سے ہر قسم کی ملازمتیں اور دنیوی فوائد و اعزاز حاصل ہوتے تھے ان کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا جا چکا تھا اور اب انگریزی کے بجائے اب قدیم علوم کا حاصل کرنا گویا تمام دنیوی فوائد و اعزاز سے اپنے آپ کو محروم قرار دے لینا تھا۔ اسی بنا پر تحصیل علم کا سب سے زیادہ محرک قدیم علوم کے بجائے اب انگریزی کے حق میں تھا چنانچہ قیام دارالعلوم کے وقت اکثر لوگوں کو یہ تشویش تھی کہ پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے؟ ایک طرف تو یہ مشکلات دامن گیر تھیں اور دوسری طرف جب مسلمانوں نے خود اپنی مذہبی تعلیم کے لئے مدارس کھولے تو حکومت کی جانب سے ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ مدارس عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم کے متعلق تو انگریزوں کی یہ رائے تھی کہ یہ سرحد کے لوگوں کو تعلیم کے بہانے سے داخل کر کے آزاد قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف تیار کرنے کی سازش کا مرکز ہے۔ شروع شروع میں عرصے تک اس امر کی اعلانیہ اور خفیہ تحقیقات ہوتی رہیں (باب دوم میں صوبہ متحدہ کے گورنر کے ایک معتمد کی رپورٹ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) علماء کو عام طور پر "مذہبی دیوانے" سے تعبیر کیا جاتا تھا اور ان کو حکومت کے حق میں خطرناک گروہ آتش فشاں سمجھا جاتا تھا۔

ان حالات میں مسلمانوں کا اپنی مذہبی تعلیم کی جانب متوجہ ہونا جہاں دنیوی فوائد سے محروم ہو جانا تھا وہیں دنیا سیاسی حیثیت کو بھی مشتبہ بنا لینا تھا، چنانچہ جو سر برآوردہ طبقہ ابھی تک تعلیمی کاموں میں پیش پیش رہتا تھا حکومت سے قریب ہونے کے باعث دارالعلوم کی مدد میں شریک ہونے سے عرصے تک گریزاں رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی تھی جنہوں نے محض انگریزوں کی خاطر اپنے آقاؤں کو خوش کرنے اور اپنے مخالفین سے انتقام لینے کے لئے جھوٹے اور غلط الزام لگانے کا مشغلہ اختیار کر رکھا تھا اور مسلمان ان کے ہاتھوں مشکلات اور مصائب

کا شکار رہے۔ ہم جب دارالعلوم کے اکابر کی عظیم خدمات کا روداد پاتے ہیں دارالعلوم میں
مطالعہ کرتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ہمارے اکابر و اسلاف میں کتنی زبردست صلاحیتیں
تک، یہ دور ہی صحیح ورنہ ہیں جب کہ ان کو قبول کرنے کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ انھوں نے
نامساعد حالات کے ساتھ اس دور کے مخالف دھاروں کا مسلسل مقابلہ کیا اور دین کی حفاظت کو
مسلسل جاری رکھا۔

فلسفۂ تاریخ کا نقطۂ نظر اس بارے میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن اہل بصیرت جانتے ہیں
کہ جماعتوں کے اسباب عروج و زوال ہی نہیں ہوتے بلکہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں، دارالعلوم
کا حال بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں بارہا بے شمار مشکلات سے
دوچار ہونا پڑا مگر مشیت ایزدی ہر وقت دارالعلوم کی دست گیری کرتی رہی اور اس کا
ہر قدم ترقی کی جانب گامزن رہا۔

دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کی مسلسل جد و جہد سے اسلام کی سربلندی
اور ملت اسلامیہ کی علمی زندگی کے لئے جو بہتر نتائج پیدا ہوئے وہ کسی منصف مزاج کیلئے
لائق انکار نہیں ہیں۔ آج بھی دارالعلوم کا کارواں تمام مصروفیت اور پُرخلوص لگن و دور کے
ساتھ تیزرفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ علمی حلقوں اور دینی دائروں میں روز بروز وسعت
پیدا ہو رہی ہے، دینی لٹریچر بھی شائع ہو رہا ہے، تبلیغی مسائل اور عامۃ المسلمین تک دین کی
پیغام رسانی اور انھیں دینی قدروں سے روشناس کرانے کا سلسلہ روز افزوں ہے مثلاً
حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کے ایشیا، افریقہ اور یورپ تک کے دورے دارالعلوم
کی تاریخ میں مقبولیت کے ایک اہم باب کا اضافہ ہیں۔

یہاں یہ بات بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ جس حد تک دارالعلوم کے نقش
قدم پر قائم ہونے والے دینی مدارس صحیح خطوط پر سرگرم عمل ہیں دنیا اسلام کی حیثیت
اور مسلمانوں کی دینی خصوصیات بڑی حد تک محفوظ ہیں

دارالعلوم کی عالمگیر دینی دعوت

اور تعلیمی تحریک

دارالعلوم دیوبند ایشیا کے مسلمانوں کی ایک عظیم مرکزی اور دینی درسگاہ ہے۔ جو
ایک سو چودہ سال سے زیادہ مدت سے تفسیر و حدیث فقہ و کلام اور تہذیب و اخلاق وغیرہ
علوم دینیہ کے احیاء اور ترقی کی زبردست خدمت انجام دے رہی ہے۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کے زوال کے بعد جب انگریزوں نے اپنے سیاسی
مصالح کے پیش نظر اسلامی علوم و فنون کی قدیم درسگاہوں کو یکسر ختم کر دیا تھا، اس وقت
نہ صرف اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب کے تحفظ کے لئے بلکہ خود مسلمانوں کو مسلمان
رکھنے کے لئے ضرورت تھی کہ عظیم پیمانہ پر ایک عظیم درسگاہ قائم کی جائے، جو ہندوستان
کے مسلمانوں کی اولاد کو بے دینی کے فتنۂ عظیم سے محفوظ رکھ سکے۔ اس وقت اسلام کے
تحفظ کی تمام تر ذمہ داری علمائے کرام پر تھی۔ ہندوستان کی سرزمین شاہد ہے کہ علمائے
کرام نے بروقت، یہ فرض انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی

تحریک مسلمانوں میں مقبول ہوئی۔ چنانچہ برصغیر میں جگہ جگہ دینی مدارس جاری ہو گئے، جن کا
برصغیر میں وسیع جال پھیلا ہوا ہے اور جو روز بروز وسعت پذیر ہے۔

دارالعلوم کے ابتدائی دور سے فارغ شدہ علماء سے دارالعلوم کی نسبت یہ تصور قائم ہو گیا
تھا کہ دارالعلوم سے فراغت کے بعد اس کے فضلاء کے لیے عزت و وقار کے ساتھ حصول
معاش کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۰۰ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ
دارالعلوم سے فراغت کے بعد علماء کو معاشی پریشانی کا شکار ہونا پڑتا ہو، جیسا کہ قیام دارالعلوم
کے وقت بعض لوگوں کا خیال تھا بلکہ مشاہدہ ہے کہ یہاں کے علماء کو بڑی عزت اور قدر و
منزلت حاصل ہے۔ یہاں سے جو علماء فارغ ہو کر گئے وہ عوام و خواص میں بڑی عزت
اور عظمت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور بلحاظ معاش بھی ان کی حالت بہت بہتر ہے۔ وہ
پندرہ روپے سے لے کر پچیس روپے ماہانہ تک تنخواہ پا رہے ہیں۔[1]

دارالعلوم سے جو افراد فارغ ہوئے انھوں نے تعلیم و تبلیغ، تزکیۂ اخلاق، تصنیف
افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، سیاست، حکمت اور طب وغیرہ میں جو بیش بہا خدمات انجام
دی ہیں وہ کسی مخصوص خطہ میں محدود نہیں ہیں بلکہ ہندوپاک کے ہر ہر صوبہ کے علاوہ بیرونی
ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۳ھ تک ایک سو سال کی مدت میں اگر دارالعلوم
کی ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اس نے برصغیر میں انجام دیں تو معلوم ہو گا کہ ان ملکوں کے
ہر ہر حصے میں اس نے اپنے فرزندان رشید کو پھیلا دیا ہے جو اس خطہ میں آفتاب و مہتاب
بن کر چمکے اور مخلوق خدا کو ظلمت جہل سے نکال کر انھوں نے نور علم سے مالا مال کر دیا۔ چنانچہ
پاکستان اور بنگلہ دیش کے فضلاء دارالعلوم کی صوبے وار اور ملک وار ایک سو سال کی فہرست
از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۳ھ درج کی گئی ہے۔ ان تلامیذ کی تعداد جو ہے دارالعلوم سے

[1] روداد دارالعلوم ۱۳۰۰ھ ص ۱۵۔

استفادہ کیا مگر دستارِ فضیلت تک نہیں پہونچ سکے اس کے علاوہ ہے۔

ہندوستان

نمبر	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام	نمبر	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام
۱	اترپردیش	۱۸۹۹	۹	میسور	۷
۲	مغربی بنگال	۱۵	۱۰	مدھیہ پردیش	۲۸
۳	آسام و منی پور	۲۶۵	۱۱	مشرقی پنجاب	۱۹۹
۴	بہار و اڑیسہ	۴۰۰	۱۲	دہلی	۴۲
۵	مدراس	۳۰	۱۳	مہاراشٹر	۳۹
۶	ٹراونکور	۳	۱۴	گجرات	۱۳۸
۷	کیرالہ	۳۲	۱۵	راجستھان	۴۳
۸	آندھرا پردیش	۵۲	۱۶	جموں و کشمیر	۱۱۰

میزان ۳۶۹۲

تکمیلاتِ ۱۳۸۶ھ میں ہندوستان کے فضلاء کی مجموعی تعداد ۳۶۱۱

کل میزان ۷۳۰۳

فضلائے دارالعلوم دیوبند کی یہ وہ تعداد ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر جن ملکوں کے طالبانِ علم نے دارالعلوم سے علمی میراث حاصل کر کے فراغت پائی، اُن کے نقشے سے واضح ہوگا کہ دارالعلوم نے اپنے علمی فیوض سے صرف برصغیر ہی کو بہرہ مند نہیں کیا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے اسلامی ممالک بھی اس کی ضیا پاشیوں سے محروم نہیں رہے۔ ان غیر ملکی فضلاء

ہیں مگر تعجب خیز نہیں کہ یہی نوجوان اور بچے ہیں جو کل ہمارا مستقبل ہوں گے۔ اس سنجیدگی
اور وابستگی کو محسوس کر کے دارالعلوم دیوبند اور اس کے نقش قدم پر قائم شدہ تمام دینی مدارس
نے طلبائے علوم دینیہ کے لئے مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ خورد و نوش، لباس اور قیام کی
مفت سہولتیں بہم پہنچا کر تشنگان علم کے لئے طلب علم کی شاہراہیں ہموار کی ہیں اور
ان تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیا ہے، جو حصول تعلیم کی راہ میں حائل تھیں۔ دینی مدارس کا مقصد
یہ ہے کہ دنیا کے خزانے کی اصل کنجی دین کی کنجی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دینی مدارس میں تعلیم
پانے والے بلاشبہ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ جہاں تک برصغیر میں ان کی طلب کا
تعلق ہے وہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس لحاظ سے فضلائے مدارس دینیہ کا مستقبل روشن
اور قابل اطمینان ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر فضلائے دارالعلوم نے اپنے لئے زندگی کی جس
راہ کو بھی اختیار کیا وہ اس میں کامیاب رہے ہیں، اور بے روزگاری کی شکایت ان کے
بارے میں بہت ہی کم سننے میں آئی ہے حالانکہ اس زمانہ میں عصری تعلیم پانے والوں
میں بے روزگاری کی شکایت عام ہے۔

اپنی ایک سو دس سالہ تاریخ میں دارالعلوم نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف
اسلامی زندگی کا ترقی یافتہ شعور دیا ہے، تو دوسری طرف انہیں فکر و عمل کا توازن بخشا ہے۔
آج مسلمانوں کا جو طبقہ اسلامی نظریات کی معقول تعبیر، اسلامی افکار کی اطمینان بخش توجیہ اور
صحیح اسلامی زندگی اختیار کئے ہوئے ہے وہ دارالعلوم کی ناقابل فراموش علمی و عملی جدوجہد
کا نتیجہ ہے، عام روایات کے برخلاف یہاں کا مذہبی رجحان کبھی رجعت پسند نہیں رہا۔

دارالعلوم نے اپنے بنیادی اصولوں کی گرفت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات
میں ہمیشہ وقت کے تقاضوں کا اس حد تک ساتھ دیا ہے جس حد تک اسلامی اصول ساتھ
دینے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم ایک ایسا تعلیمی ادارہ
ہے جو قدیم و جدید کے حسین سنگم پر قائم ہے اور جس کی ناقابل فراموش ایک سو دس سالہ شاندار

روایات دین کے تابناک ماضی کی حسب اصول کے عظیم مستقبل کی پیام بر تھیں۔

دارالعلوم دیوبند کا علمی اور دینی فیضان

اس میں شک نہیں کہ مسلمان اپنی کمزوریوں کے باعث حکومت کو برباد کر کے اپنی اجتماعی زندگی کی موت کے فیصلے پر مہر لگا چکے تھے۔ مگر مشیت ایزدی ان کو باقی رکھنا چاہتی تھی اس کے لئے دینی حرارت کی ضرورت تھی جو ہمیشہ مسلمانوں کی ترقی کا سرچشمہ رہی ہے، اس سرچشمے کے لئے دیوبند کی سرزمین کو منتخب کیا گیا۔ چنانچہ صدیوں پہلے سے حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی مبارک زبانوں سے اس سرزمین کو علوم نبوت کا گہوارہ بننے کی بشارت دی جا رہی تھی اور وہ اکابر جو دارالعلوم کی تاسیس و قیام میں حصہ لینے والے حضرات صرف علوم ظاہری سے ہی آراستہ نہ تھے بلکہ ان کے قلوب انوار باطنی کی تجلیات کے بھی خزینہ بردار اور آئینہ دار تھے، انہیں الہام کے ذریعے دارالعلوم کے قیام پر مامور کیا گیا تھا۔ حضرت قاضی محمد اسمٰعیل منگلوریؒ جو کہ بڑے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں فرماتے ہیں کہ "دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور مرادآباد کا مدرسہ شاہی ان مدرسوں میں سے نہیں ہیں جن کو انتظامیہ چاہے تو ختم کر دیا جائے، یہ مدارس خاص الہامات کے ذریعے قائم کئے گئے ہیں۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم اپنی ایک یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"عالم اسباب میں اس مدرسہ کو جو کچھ بھی عزت، وجاہت، حرمت، ترقی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ محض اللہ کا انعام اور قاسمی احسان اس مدرسہ پر ہے، بجز اس کے اس مدرسہ کو پہلے مقبولان بارگاہ ایزدی کی سرپرستی اور ایسے خاصان خدا کی تربیت نصیب ہوئی جن کی توجہات

ا؎ علامہ سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم حصہ اول ص ۱۴۳

تعلیمی نظم و نسق کے لحاظ سے دارالعلوم ہمیشہ ایک مخصوص مسلک پر گامزن رہا ہے، جس کی اس کے نصاب و تعلیم کی روشنی میں وقت شناسی کا دور رہا۔ بہت دنوں سے، اور صرف اس وقت ہی نہیں بلکہ ایک عرصے بعد تک بھی ہمارے ماہرین تعلیم کا ایک بڑا گروہ اس کو پیچھے سے تھامے رہا۔ مگر آخر کار حالات کی گردش نے دارالعلوم کی صداقت عمل کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا۔ حتیٰ کہ جن حلقوں سے اب تک دارالعلوم کی شدید مخالفت کی جاتی رہی تھی ان کو بھی اس کی ضرورت اور خدمات کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک موقع پر جبکہ حیدرآباد دکن سے دارالعلوم کی امداد بند کرانے کے لئے اس کے مخالفین نے تحریک شروع کی تو ڈاکٹر راس مسعود مرحوم نے جو اس وقت حیدرآباد دکن میں وزیر تعلیم تھے، اس تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"اگرچہ میں انگریزی کی اشاعت میں کوشاں ہوں اور جس طرح معاشی دنیا کی حالت سے ہماری سعی ہوتا ہے، اسی طرح مذہبی ضرورت سے دیوبند دارالعلوم کا وجود ضروری سمجھتا ہوں۔"

بہرائچ کی مشہور درگاہ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے محافظ خواجہ خلیل احمد شاہ رقم طراز ہیں:۔

"دارالعلوم دیوبند جو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں علوم اسلامیہ کا ایک بے مثال مرکز ہے اور جامعہ ازہر کے بعد دنیا میں اس کا ثانی مشہور ہے، دینی مدرسہ ہے جس نے ہندوستان میں علوم اسلامیہ عربیہ کے دریا بہا دیئے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں یہاں کے فضلاء علوم دینیہ کی تعلیم اور اسلامی خدمات میں لگے ہوئے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند نے عرب اور علوم دینیہ

لہ مسلم [illegible]

دارالعلوم کے نقش قدم پر دینی مدارس کا قیام

تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں جب دارالعلوم قائم ہوا اس وقت ہندوستان میں دینی مدارس کا سابقہ نظام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں فرسودہ و بوسیدہ مدارس اگر باقی بھی تھے تو وہ صرف مقامی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی مرکز کی حیثیت حاصل نہ تھی اس سے قبل اسلامی حکومت نے عوام کو اس سے بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری کا خود بوجھ اٹھائیں۔ مگر اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ نسلوں کی تعلیم کس طرح انتظام کیا جائے۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں جنکو دینی مدارس سمجھا جاتا تھا انہوں میں علوم معقولہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ان علوم کی کتابیں صدرا شمس بازغہ اور شرح مطالع اور اس کے شروح و حواشی وغیرہ معیار فضیلت سمجھے جاتے تھے حدیث و تفسیر وغیرہ کی تعلیم کا بہت کم رواج تھا۔ اس کے برعکس دارالعلوم کا قیام ولی اللہی طرز فکر پر عمل میں آیا تھا اس لئے یہاں علوم معقولہ کے بجائے زیادہ اہمیت علوم منقولہ تفسیر و حدیث کو دی گئی تھی۔ آگے چل کر برصغیر میں جتنے بھی دینی مدارس قائم ہوئے ان میں بھی کم و بیش دارالعلوم کے اسی طریقے کو پسند کیا گیا

کثرت سے ایسا ماحول بھی پیدا ہو گیا جس سے عام جاری مدارس قائم ہوتے چلے گئے دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد ملک میں جس کثرت سے دینی مدارس قائم ہوئے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس وقت مسلمانوں میں دینی مدارس قائم کرنے کا شدید جذبہ موجود تھا لیکن ابتدائے مدارس کے قدیم وسائل چونکہ کم سے ختم ہو چکے تھے اس لئے ہمتیں پست ہو گئی تھیں، مگر جب دارالعلوم دیوبند نے پہل کی تو مسلمانوں کے سامنے ایک نئی شاہراہ کھل گئی، اس کے بعد بعض مدارس کے منتظمین نے دارالعلوم کی حیثیت کو مرکزی قرار دے کر مناسب سمجھا کہ اپنے اپنے مدرسوں کو دارالعلوم دیوبند کے زیر اثر ایک سلسلے میں منسلک کر دیں۔

ملتان میں مدرسہ حقانیہ جیسے صد سالہ پرانا مدرسہ ہے، اس مدرسے کے موجودہ مہتمم مولانا شفیق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "مدرسے کی کوئی مستقل یا غیر مستقل آمدنی نہیں ہے اس لئے مدرسے کو چلانا دشوار ہو رہا ہے، جب کہ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ فلاں حاکم وقت سے تعلق پیدا کرو تو تمہاری مالی پریشانی دور ہو جائے گی، اور امداد کے لئے معقول انتظام ہو جائے گا، مولانا شفیق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "میں نے اس مقصد کے لئے استخارہ کیا تو پچھلی کئی راتوں تک خواب میں اسلاف کی زیارت نصیب ہوتی رہی، علمائے کرام کی زیارت سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حکام وقت سے رابطہ پیدا کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے خدا کی مرضی یہ ہے کہ اکابر کے طریقے پر عمل کرنا چاہئے اور حکومت کی امداد کے بجائے چندے سے ہی مدرسہ کو چلانا چاہئے"۔[1]

مدارس دینیہ کے الحاق سے یہ فائدہ ہوا کہ مختلف مقامات کے مدارس ایک منظم نظام اور تعلیمی سلسلے میں منسلک ہو گئے جس سے ان مدارس کے نظام اور طریق تعلیم میں یکسانیت پیدا

---

[1] مکتوب مولانا شفیق احمد صاحب مورخہ ۸ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ بنام حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ایک مجتہدانہ حیثیت رکھتا ہے اور یہیں سے اس وقت پورے برصغیر میں دینی تعلیم کا جال پھیلا ہوا ہے۔

بہت سے حضرات مدارس دینیہ بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دینی مدارس قائم کرنے کی تمنا اپنے ساتھ لے کر نکلتے ہیں۔ انھوں نے جب سے مدارس کو وجود بخشا ہے، چنانچہ قیام دارالعلوم سے اب تک برصغیر میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس جاری ہو چکے ہیں کہ ان سب کا شمار آسان نہیں ہے۔ کلکتہ کی ایک انجمن خدام اسلام مدارس دینیہ کی فہرست شائع کرتی رہتی ہے۔ ۱۳۹۵ھ کی فہرست میں ۵۰۰ دینی مدارس کے نام درج ہیں، جن میں مختصر [illegible] کے ۲۰۰ مدارس کے نام ملتے ہیں۔[1] اس کوشش کے باوجود انجمن خدام اسلام مدارس دینیہ کا کھوج لگانے کے لئے کوشاں رہتی ہے، اس فہرست میں ہندوستان کے نصف سے بھی کم مدرسوں کے نام نظر آتے ہیں، بہت سے ایسے مدرسے جن کا وجود راقم سطور کے علم میں ہے ان کے نام اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔

پاکستان کے ۵۰۰ دینی مدارس میں دیوبندی مسلک کے مدارس کی تعداد ۳۵۰ ہے۔[2] بقیہ ۱۵۰ مدارس اہل حدیث، اہل تشیع اور بریلوی مسلک کے ہیں، مطبوعہ شمارہ ۱۹۷۶ء کے ایک جائزے سے ماخوذ ہیں، بعد کے پانچ سالوں میں یقیناً اس تعداد میں اضافہ ہی ہوگا۔

بنگلہ دیش میں بھی جابجا مدرسوں کا جال بچھا ہوا ہے، مگر افسوس ہے کہ وہاں کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکے۔

×

۱۔ ماہ نو جنتری انجمن خدام اسلام کلکتہ مطبوعہ ۱۳۹۵ھ

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ "رشید" لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر

تحفظِ دین کی مساعی

یورپ کے عیسائی ممالک شروع ہی سے مسلمانوں کے حریف رہے ہیں۔ انھوں نے بت پرست قوموں کو کبھی اپنا دشمن نہیں سمجھا، یہ قومیں مغرب کی دنیا میں مذہبی اور ملکی سیاست کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کر سکتی تھیں، لیکن مسلمانوں کو جن اولوالعزم قوم کی حیثیت حاصل تھی، انھوں نے نہ صرف ایشیا میں اپنی حکومتیں قائم کیں بلکہ یورپ کے ملک اسپین کے اندر آٹھ سو سال تک حکومت کرتے رہے، اور پھر چھ سو سال تک قدیم مشرقی روما کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور اس کے زیر نگیں ممالک پر حکمراں رہے۔ جب ترکوں کے اصل مرکز بنی عثمان ہی تھے پورے دو سو سال کی مدت میں دونوں قوموں کے مابین بڑی بڑی جنگیں ہوئیں۔ صرف فلسطین کی سرزمین پر صلیبی جنگیں لڑی گئیں جن میں یورپ کے متعدد ملکوں نے شرکت کی، اور بالآخر شکست کھائی۔ چھ سو سال تک ترکوں کا یورپ کی عیسائی قوموں سے سروکار رہا، چنانچہ عیسائی دنیا مستقل مسلمانوں سے خائف تھی، اور وہ اسی جوڑ توڑ میں لگی رہتی تھی کہ مسلمانوں کی سیاست میں لغزش کی پیدا ہو اور وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ پھر اٹھارویں صدی عیسوی میں جب انگریزوں نے غیر ملکی ملک گیری میں سبقت حاصل کی بعد ہندوستان میں قدم رکھا تو اس وقت

یہاں بھی مسلم اقتدار کا پہیہ مڑ رہا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر تسلط جما
کر عیسائیت اور ذہن کو کھلنے کی تدبیر کرتے رہے۔ انگریزوں کے نزدیک مسلمان
کسی ہمدردی کے مستحق نہ تھے۔ [illegible] کے ہنگامے کا الزام انہیں مسلمانوں کے سر تھوپا اور
انصاف کے ساتھ ان کی حیثیت سے بھی محروم کر دیا۔ چونکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور اس سے
پہلے انگریزوں کی مخالفت کی ہر تحریک میں مسلمان پیش پیش تھے اس لئے انگریزی حکومت
کے استحکام کے دوران ہی کو سب سے زیادہ معتوب بنایا گیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار
کی شکست کے بعد ہندوستان پر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط پوری طور پر قائم ہو گیا
تو عیسائی مشن کی پرجوش سرگرمیاں پورے ملک میں پھیل گئیں۔ ہندوستان میں عیسائی مشن
کی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز مغل سلطنت کے زمانے ہی میں ہو چکا تھا۔ معاصر مورخ خافی
خان نے لکھا ہے کہ "فرنگیوں نے اکثر ساحلی بندرگاہوں پر اپنے قلعے قائم کر رکھے ہیں،
ان کی رعیت میں سے جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کا مال ضبط کر لیتے ہیں اور اس کے
خورد سال بچوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنا غلام بنا کر عیسائی بنا لیتے ہیں۔[1]

انگریزوں نے عیسائیت کو پھیلانے کے لئے جو حربے اور طریقے اختیار کئے تھے ان
ہندوستانیوں میں زبردست بدگمانی پھیل گئی تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں عیسائی مشن کی سرگرمیوں نے پورے ملک
کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ۱۸۱۳ء کے ایک قانون کے ذریعے سے جب یورپ کے مشنریوں
کو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مشن اسکول کھولنے کا موقع ہاتھ
آ گیا تو پورے ملک میں مشن اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ مشن کے ہسپتال اور بائبل سوسائٹیاں

---

[1] ترجمہ اردو منتخب اللباب مصنفہ خافی خان جلد دوم ص [illegible]، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس
کراچی ۱۹۶۳ء

عام ہو گئیں۔ حکمران کے ذریعے سے ہندوستانیوں کو عیسائیت کے قریب لایا جائے۔ اس کام کے لئے انگلستان اور دوسرے یورپی ملکوں سے پادریوں کی فوج کی فوج ہندوستان آنے لگی۔ کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جانے لگا۔ مردوں کے علاوہ مشن میں بکثرت عورتیں بھی ملازم رکھی گئیں۔ تاکہ ان کے ذریعے سے عورتوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی جاسکے۔ اچھوت ذاتوں کے لوگوں پر عیسائی مبلغوں کا کافی اثر پڑا۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اپنے آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائی بننے لگے۔

۱۸۲۶ء میں کلیسائے انگلستان کے ہندوستان کے اسقف اعظم آرچ بشپ ہیبر (HEBER) نے ہندوستان میں طویل تبلیغی سفر کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو یہ رپورٹ دی کہ مدراس سے ہندوستان میں ہمارا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا ہے۔ مسلمان مرہٹے راجپوت اور سکھ سب ہمارے ماتحت بن چکے ہیں۔ اس لئے ہندوستانیوں میں عیسائیت کی تبلیغ سے اب کوئی ہنگامہ یا شورش برپا ہونے کا خطرہ باقی نہیں رہا ہے۔ انگریزوں نے پادریوں کی ہندوستان میں آمدورفت، قیام اور اشاعت و تبلیغ میں بڑی مدد پہنچائی اور مسیحیت کے مبلغوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ یہ پرجوش مبلغ ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ انہوں نے شہروں سے لے کر دیہات تک عیسائیت کی تبلیغ کا جال بچھا دیا۔ یہ لوگ صرف اپنے مذہب کے فضائل و محاسن بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق عیسائی لٹریچر شائع کرتے تھے۔ جس میں ہندوستان کے مذاہب اور بالخصوص مسلمانوں کے مذہب اسلام کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام اور مسلمان بادشاہوں، مجاہدوں اور بزرگوں کی توہین اور تذلیل کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کا مقصد غالباً یہ تھا کہ سیاسی زوال کے بعد مسلمان ہمت و حوصلہ اور بلند نظری سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس موقع پر اگر ان کے سامنے عیسائیت کے محاسن و فضائل اور ان کے اپنے مذہب و تاریخ کے معائب بیان کئے جائیں تو بہت ممکن ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کر مسیحیت اختیار کرلیں اور انگریزوں

کو ہندوستان میں اطمینان سے علانیہ طور پر حکومت کرنے کا موقع مل جائے۔ ۱۸۳۹ء میں
چرچ آف انگلستان کا مشہور مشنری کشنر سی. جی. فنڈر ہندوستان آیا یہ ایک جرمن نژاد
پادری تھا، اور عربی و فارسی دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر کی قدرت رکھتا تھا۔ اس نے
۱۸۴۹ء میں فارسی زبان میں اسلام کی تردید میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام میزان الحق
تھا، اسلام کی تردید میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہندوستان میں شائع ہوئی۔

سرسید مرحوم جیسا شخص جس نے انگریزوں کی حمایت و اعانت میں بیش از بیش
حصہ لے کر انگریزوں سے اپنی وفاداری کو غیر مشکوک بنایا تھا، وہ بھی اس ہنگامے کے اسباب
میں ایک بڑا سبب انہی پادریوں کی علانیہ اور خفیہ ریشہ دوانیوں کو قرار دیتا ہے چنانچہ
سرسید مرحوم اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں:۔

> سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ مذہب پر تو کبھی مجبور نہیں
> کرے گی، البتہ خفیہ تدبیریں کرے کی جس طرح عربی اور سنسکرت کو
> فنا کر دیا ہے اسی طرح ملک کو مفلس اور جاہل بنا کر اپنے مذہب
> کی کتابیں اور وعظ و تبلیغ کے ذریعے نوکریوں کا لالچ دیکر لوگوں
> کو بے دین کر دے گی۔
>
> ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی بنائے گئے
> وہ شمال مغربی اضلاع میں گورنمنٹ کے طرز عمل کے مثلے ایک نمونہ
> گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح سے مفلس و محتاج
> کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے، جیسے جیسے گورنمنٹ کی فتوحات
> زیادہ ہوتی تھیں ہندوستانیوں کو رنج ہوتا تھا یہاں تک کہ ان کو یقین
> تھا جب کسی دشمن اور جب یہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ
> رہیگا تو ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں لگے ہندوؤں بڑا خلاف

کیا جائے گی۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادریوں کو مقرر کیا ہے
ان کو تنخواہ دی جاتی ہے تقسیم کتب اور دیگر اخراجات کے لئے بڑی
بڑی رقمیں ادا کی جاتی ہیں۔ حکام شہر اور افسران فوج اپنے ہاتھوں سے مذہبی
گفتگو کرتے تھے اور اپنی کوٹھیوں پر بلوا کر پادریوں کا مذہبی وعظ سنواتے
تھے۔ غرض ہر ایک بات سے یہاں تک ترقی کی گئی کہ کوئی شخص سمجھتا تھا
کہ گورنمنٹ کی سرداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب ختم ہو گا
عیسائی مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب مفت تقسیم کی جاتی تھیں
جن میں اور دیگر مذاہب پر اعتراضات اور رکیک حملے ہوتے تھے۔
پادری لوگ ہر مذہب کے مجامع میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی
شخص حکام کے ڈر سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ بسا اوقات چپراسی ان کے
ہمراہ لے جاتے تھے۔ بہت سے مشنری اسکول قائم کئے گئے۔ ان
میں مذہبی تعلیم شروع کی گئی۔ بڑے بڑے حکام ان اسکولوں میں
جاتے تھے اور دوسروں کو ان میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔
امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا۔ مذہبی سوالات کے جوابات اگر
عیسائی مذہب کے مطابق دیئے جاتے تو زیادہ نمبر ملتا تھا
تھے۔ لوگ مجبوراً اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کرتے تھے کیونکہ
اس کے سوا مفلسی اور محتاجی نے اولاد کی تعلیم کے لئے
ان اسکولوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ باقی نہ رکھا تھا۔ جس کے
بسبب بیروزگاری کی شکل نکل سکے۔

عیسائی مکاتب نے یہ مضمون اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا تھا
کہ ان کا مقصد سب کو عیسائی بنانا ہے۔ انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر کو

مذہبی شغف تھا۔ اس کے لئے ۱۸۳۵ء میں ایک تعلیمی نظام مرتب کیا گیا جس کی روح لارڈ میکالے کے نزدیک جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے یہ تھی کہ:-

"ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر و عقل کے اعتبار سے عیسائیت کے سانچے میں ڈھلی ہو"

انگریزی کی تعلیم اور انگریزی تہذیب کا پہلا مرحلہ ہو کوئی شبہ نہیں کہ پہلے مرحلے سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ ظاہر ہے کہ کمپنی کی یہ سکیم اور اس کا یہ تعلیمی نظام مسلمانوں کی مذہبی زندگی، قرآنی تعلیمات اور علوم و فنون کے لئے سخت تباہ کن اور مہلک ترین حربہ تھا۔ جس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ ہوسکتے تھے اور ابھی تک وہ اپنی مذہبی زندگی اور قومی شعور کو برقرار رکھنے کا کوئی حل سوچ نہ سکے تھے کہ اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آگیا۔ جس نے رہا سہا تباہ کر دیا۔ اس ہولناک بربادی نے دل و دماغ پر ہیبت طاری کر دی، دماغوں کو ماؤف اور ذہنوں کو مفلوج کر دیا۔ پوری قوم پر جمود، بے حسی اور مایوسی کی گھٹائیں چھا گئیں، حاکمانہ عظمت و اقتدار اور دولت و شوکت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مسلمان ذرائع معاش سے یکسر محروم کر دیئے گئے تھے۔ عادات قبیحہ روز بروز ان میں جڑ پکڑ رہی تھیں اور قوم کی قوم تباہی و بربادی کے غار میں گرتی چلی جا رہی تھی۔ تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بیگانگی میں روز افزوں اضافہ تھا۔ اپنی قوت و حیثیت کا احساس فنا ہوتا جا رہا تھا۔ پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں نے حالات کو اور زیادہ تشویش ناک بنا دیا تھا اور وہ زمانہ بہت قریب تھا کہ علماء کی وہ نسل جو سابقہ درس گاہوں کی تعلیم یافتہ تھی، رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی۔

یہ حالات تھے جن کو ہمارے مفکرین اور ارباب علم و فضل کرب سے محسوس کر رہے تھے، وہ سیاسی زوال اور اقتدار حکومت سے محرومی کے ساتھ مستقبل میں مسلمانوں کا علم و مذہب اور قومی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ وہ تاریخ کے اس فیصلے سے باخبر تھے کہ جب کسی قوم نے کسی ملک کو فتح کیا اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ اور

تسلط پایا ہے، تو فاتح قوم کے اثرات وقتی نہیں، مفتوح قوم کے جسموں تک محدود نہیں رہتے،
بلکہ مفتوح قوم کے دل و دماغ اور علم و فکر بھی مسخر ہو جاتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ مفتوح قوم اپنے ملی شعائر قومی خصوصیات اور فکر و عمل کو نہ صرف یہ کہ غیر مفید سمجھتی ہے
بلکہ "حتیٰ تتبع ملتہم" کے اصول اور مدت تک جذب و کشش کا مسلسل عمل جاری رہنے
کے باعث وہ آخر کار اپنی روایات و اقدار اور فکر و عمل سے نفرت کرنے لگتی ہے، اور ان
کے لئے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید و اتباع ہی سرمایۂ افتخار ہو جاتا ہے،

ہندوستان میں مسلمانوں کی چھ سو سالہ تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک تاریک
اور خطرناک وقت تھا، ایسے تاریک اور خطرناک وقت میں جب کہ گردش لیل و نہار نے ملت
اسلامیہ کے لئے نہایت تباہ کن صورت حال پیدا کر دی تھی مسلمانوں کے تحفظ و بقا کیلئے
سب سے اہم ضرورت دینی اقدار کا احیاء اور مدارس دینیہ کا قیام تھا۔

ہمارے علماء و مشائخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ دینی و علمی اور فقہی مسائل
سے لے کر تہذیب و معاشرت اور سیاست و تمدن تک کے کسی شعبہ میں انہوں نے اسلامی
شریعت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، انہوں نے کسی گوشے میں بھی حریف طاقتوں
کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، انیسویں صدی عیسوی مسلمانوں کے عقائد و افکار اور نظریات
کے لئے ایک زبردست چیلنج تھی مغربی علوم و فنون اور فرنگی تہذیب تمام دنیا کو ایک
عظیم سیلاب کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کا
چراغ گل ہو چکا تھا، سائنس اور ٹیکنالوجی کی آب و تاب اور چمک دمک نے آنکھوں کو خیرہ
اور ذہنوں کو مرعوب بنا دیا تھا مگر علماء کرام مغربی چیلنج سے بے خبر و آزاد رہے، انہوں
نے ایک طرف تو ملک میں جا بجا دینی مدارس قائم کر کے ایک احیائی حصار تیار کیا جس
نے مسلمانوں کو سیاسی شکست کے نتائج سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا اور دوسری طرف
مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا ابو منصور اور ڈاکٹر

بھی ختم ہو چکا ہے

اس موقع پر یہ بات بھی ضروری ہے کہ عیسائی مشنری محض عیسائیت کی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے تھے، اگر وہ اتنا ہی کرتے کہ اپنے مذہب کی اچھائیاں اور خوبیاں عوام کے سامنے پیش کرتے رہتے تو مسلمانوں کی جانب سے کوئی سخت مزاحمت بھی نہ ہوتی، مگر اس کے برعکس عیسائی مشنری اسلام اور پیغمبر اسلام پر رکیک حملے اور اعتراض کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے ہرگز قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے علماء کی جانب سے شدید مزاحمت کی گئی، اور وہ اپنے امکان بھر مشنریوں کے اثرات کو زائل کرنے میں لگے رہے، اس کام میں بلاشبہ ہندوستان کے بہت سے علماء کا حصہ رہا ہے، اور اُن کی عظیم خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر اس سلسلے میں علماء دیوبند نے جو زبردست خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

(۲) عیسائی مشن کی تبلیغ کا جو خاص طریقہ تصنیف و تالیف تھا، اس میں بھی وعظ و تقریر کا وہی جارحانہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا جس میں عیسائیت کے محاسن بیان کرنے سے زیادہ اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر رکیک حملے کئے جائیں۔ علماء کی جانب سے اس میدان میں بھی عیسائی مشنریوں کو چیلنج کیا گیا جس کے نتیجے میں ان کی روز افزوں سرگرمیاں بڑی حد تک کم پڑ گئیں، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ”اظہار الحق“ کے نام سے ایک کتاب لکھ کر یہ معروف مشنریوں کے اعتراضات

لے اظہار الحق اپنے موضوع پر معلومات اور طرز استدلال کے لحاظ سے عیسائیت کے رد میں ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے جس میں قرآن کریم کی صداقت اور رسالت کے دلائل و شواہد کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے عقائد پر [illegible]

سلسلے میں سب سے پہلا قدم مدارس دینیہ کا قیام ہے چنانچہ ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند
قائم کیا گیا۔ دارالعلوم کے چند روز بعد سہارنپور میں مظاہر علوم قائم ہوا بعد ازاں اسی طرح مختلف
مظفر نگر، انبہٹہ، گلاؤٹھی، میرٹھ وغیرہ مقامات میں مدارس دینیہ جاری ہو گئے، جن میں سے دو
بعض ماشاء اللہ اب تک جاری ہیں۔ ان مدارس میں بزرگانِ دیوبند اور بالخصوص حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
کی ہی سیاست میں تھی کہ مدارس دینیہ قائم کئے جائیں چنانچہ خود حضرت جہاں بھی جاتے
تھے مدرسے قائم فرماتے تھے مراد آباد، گلاؤٹھی، انبہٹہ وغیرہ میں خود مدارس قائم کرائے
اور جہاں جہاں حضرت کے متوسلین تھے ان کو خطوط سے بھی تاکید فرماتے تھے کہ مدرسے قائم
کریں ان کی ترغیب و تحریک سے بہت سے مدرسے قائم ہوئے گویا دیکھا جائے تو یہ بانی
مدارس ہند کہلانے کے مستحق ہیں۔

اسلامی معتقدات کو مسخ کرنے کے لئے عیسائی پادری کتابیں لکھتے تھے جن میں قرآن شریف
کے علاوہ دوسری کتابیں بھی چھاپی ہوتی تھیں، ان میں بعض کتابیں عیسائیت کے رد میں
بھی چھاپی گئیں، مسلمانوں سے پوچھ کر ان کتابوں کے ذریعہ سے عام مسلمانوں کی
معلومات میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ اور عیسائی مشن کی جانب سے کئے جانے والے
اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات سے عام مسلمان مطمئن ہوتے رہے، علماء نے
دارالعلوم نے ہزاروں کتابیں اسلام پر مشتمل لٹریچر مسلمانوں کو دیا ہے۔ اسلامی موضوعات پر بہت
سی کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں، اسلامی علوم کی تعلیم اور نشر و اشاعت سے عیسائی مبلغین
کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ کھڑی ہو گئی، اس سے مشن کی تبلیغی جد و جہد کے وہ نتائج
بھی کما حقہ بار آور نہ ہو سکے۔

غرض کہ اسلامی ادارہ کی مدارس کے قیام کا مقصد اگرچہ اسلامی علوم کی بقاء و تحفظ
تھا، مگر یہ مدارس عیسائی مشن کی پر جوش تبلیغی سرگرمیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے
محفوظ ترین حصار ثابت ہوئے ان مدارس کے تعلیم یافتہ علماء ملک کے گوشے گوشے میں پھیل

پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر و بیشتر حصہ مدارس دینیہ و سلاسل اسلامیہ انہی کے انتظام و رہبری میں ہے۔ انہیں تجاویز پیش کرنے کی جماعت ہذا نے یہ تجاویز جناب کی خدمت میں بھیجی جاتی ہیں کہ انکو ملاحظہ فرمایا جائے اور ان کے علاوہ کوئی اور تجویز پیش کرنی ہو تو اس سے مطلع فرمائیں اور اس کی منظوری حاصل کی جائے تاکہ علماء دیوبند جمعیت علماء کے معاملات ہر حالت میں قابل منظوری کی ہیں جو مجموعی طور پر یا جماعت گورنمنٹ اپنے اصل حق میں ملک ہند کو دیکھتا ہے جس کا کچھ حصہ دیا جا سکے۔

ان تجاویز کی منظوری کے لئے گورنمنٹ سے عرض کرتا ہوں کہ اس حالت میں اسلامی معاملات کے تحفظ اور حسب قوانین شرعیہ بلا کسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت کے نفاذ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) جمعیت علماء بحیثیت متفقہ نمائندہ جماعت مسلمین ہونے کے کسی قسم کی تبدیلی جو مسلمانوں کے قابل قدر حقوق و فوائد سیاسی یا مذہبی کے انتقال یا تحفظ میں خطرہ پیدا کر سکتی ہو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے عام فوائد کے لحاظ سے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ کم سے کم ایک مسلمان عالم جو اسلامی دینیات میں دستگاہ کامل رکھتا ہو منجانب سرکار ہر ایک لیجسلیٹو کونسل کے لئے جماعت علماء سے نامزد کیا جائے۔

(۳) تمام معاملات فیما بینہم اہل اسلام بموجب قانون شرع محمدی کی قاضی و مفتیان کی عدالت یا ثالثی سے طے ہونے چاہئیں اور اس قسم کی عدالتیں شرع محمدی کے مطابق ملک ہند میں قائم ہونی چاہئیں

(۴) تحفظ اوقاف و مساجد و معابد و مقابر وغیرہ اہل اسلام زیر نگرانی شیخ الاسلام بموجب قواعد شرعیہ اسلام ہونا چاہئیں۔

(۵) کوئی ایکٹ رعایا سازی وقتیہ جو اس معاملے میں قوانین شرعیہ اسلام سے

تہذیب کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم عرب ہو یا عجم ہو اس سے بے تعلقی اور روگردانی اختیار کرے، ہم وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دامن نہیں چھوڑیں گے، ہم اسلامی اصول و اقدار اور اسلام کے مسلک زندگی کے معاملے میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں، ہم یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جب اس ملک میں اور اس ملک کے باہر ہر قسم پسندی کا دور دورہ اور اسلامی شعار کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ہمیں بہت سے اُن نتائج اور امور تعلیم سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی جو اس کے زمانے پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ اگر ہمارا خدا ہم سے راضی ہے ...... اور ہم خلوص و خیر کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم ہیں تو ہمارے لئے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں کوئی محرومی نہیں لکھی ہے۔[1]

علامہ حیدر جیسے مدبر مفکر کے مسلمانوں کو کیا نفع پہنچا؟ اس کا اندازہ خیال کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک مرتبہ اپنے ایک عقیدت مند حکیم احمد شجاع سے کہا تھا کہ ان مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مدرسوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس یعنی اسپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمرا کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔[2]

---

[1] خطبہ استقبالیہ مولانا ابو الحسن علی ندوی مطبوعہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۴-۶

[2] خون بہا از حکیم احمد شجاع حصہ اول ص ۴۳۹

"لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چونکہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ان کا پلہ بھاری رہا۔ انھوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطے کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگادی، محصورین میں سو آدمی مارے گئے۔ جن میں ابراہیم خان سب کمانڈر بھی تھا۔"

انگریزوں نے شاملی پر حملہ کا سخت انتقام لیا، اور تھانہ بھون کو تو پوری طرح تباہ و برباد کردیا، حضرت حاجی صاحبؒ مکہ کو ہجرت کر گئے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ چھ ماہ جیل خانہ میں رہے، حضرت مولانا نانوتویؒ کا وارنٹ گرفتاری جاری ہوا، مگر انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئے، اور دوسرے بہت سے حضرات روپوش ہوگئے۔

ان حضرات کے دلوں میں چونکہ برطانوی سامراج کی طرف سے ایک تلخ تجربہ بیٹھ سمویا ہوا، اس لئے اس جذبہ کے تحت قیام دارالعلوم ۱۲۸۳ھ سے لے کر [illegible] تک دارالعلوم کے بزرگ کسی نہ کسی طرح جنگ آزادی کی جدوجہد سے عملی دلچسپی اور ہمدردی اپنے سینوں میں رکھتے آئے ہیں، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ:

"۱۸۵۷ء کے بعد صرف یہی جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو ہندوستان میں زندہ رکھا، اور بالآخر اس تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بقول اس تصور کے سب سے بڑے حامل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، انھوں نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کی قیادت میں تلوار، شاملی اور تھانہ بھون کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اتر کر شاملی کی تحصیل فتح کر کے آگے بڑھنا چاہتے تھے

۱؎ گلشن یادگار حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ مصنفہ تنویر الحق دیوبندی قیم کراچی صفحہ
مطبوعہ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء

کہ حالات دگرگوں ہو گئے، دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

گو میدان جنگ میں شکست ہو چکی تھی مگر جماعت کا تصور آزادی ذہنوں میں تھا اس زمانہ میں چھتہ کی مسجد میں ایک بزرگ نے انگریزوں کے تسلط اور ان کی غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر کہا کہ انگریز دلوں سے بڑے گھبرائے ہوئے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑتے ہیں، اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین اول دارالعلوم دیوبند نے جو حضرت نانوتوی کے عزیز و شاگرد اور رفقا خاص میں سے تھے، بڑے پرجلال انداز میں فرمایا کہ آپ کس خیال میں ہیں، وہ وقت دور نہیں جب ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا، رات کو سوئیں گے ان کی حکومت میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں!

علمائے دیوبند ہمیشہ اولوالعزمی اور توکل علی اللہ کے ساتھ نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی صف اول میں رہے ہیں، بلکہ اکثر اوقات انہوں نے تحریک آزادی کی قیادت کی ہے اور زیادہ غور سے دیکھا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے تو اول اول یہ خیال خود انہی کا ہے اور آزادی کے جذبے میں جو حریت و حب الوطنیت پیدا ہوئی وہ انہیں کی رہین منت تھی اسی لیے متعدد حضرات نے انگریزی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، انگریزی فوجوں سے روبرو جنگ کی، متعدد حضرات ایسے تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا خاصہ حصہ جیلوں میں گزارا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ علماء اور دینی شخصیتوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل ہے، سیاسی تحریکوں نے مشکلات کا سامنا کیا، بے چارگی و مجبوری اور بے چینی و پریشانی کے عالم میں سہارا ڈھونڈا تو دارالعلوم دیوبند کے قیام سے انہیں سکون راحت اور قرار نصیب ہوا۔

۱۹۱۴ء میں حضرت نانوتوی کے تلمیذ رشید حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند نے برطانوی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی اسکیم تیار کی جو رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

پُرجوش تقریروں سے عوام کو بیدار کرنے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک کافی حد
تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ علاوہ ازیں اس وقت عام مسلمانوں میں جو آزادی کی تڑپ پیدا
کی وہ حضرت شیخ الہندؒ کی آواز تھی۔ جس نے اس وقت کے عوام و خواص کو بے چین کرکے ایک
مرکز پر جمع کر دیا تھا۔ اس وقت اقوام ہند کے سامنے صرف آزادی وطن کا مسئلہ تھا
لیکن مسلمانوں کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک وطن کی آزادی کا اور دوسرا خلافت کے بقاء و
تحفظ کا۔ اس لئے جس طرح مسلمانوں کے فرائض دوچند تھے اسی طرح اُن کی جدوجہد بھی
جملہ اقوام ہند سے زیادہ تھی۔

اسی دور تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) میں علماء کی ایک مستقل سیاسی جماعت قائم کی
گئی جو جمعیۃ علماء ہند کے نام سے موسوم ہے جس نے ہندوستان کی آزادی میں ملک کی
عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ جمعیۃ العلماء کا سواد اعظم علمائے دیوبند ہی پر مشتمل رہا
ہے، اس لحاظ سے جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ گویا دارالعلوم دیوبند ہی کی سیاسی تاریخ
ہے، دارالعلوم آزادی کے علمبرداروں کے لئے ہمیشہ قوت اور فیضان کا سرچشمہ رہا ہے
غرض کہ ملک و وقت کے کسی بھی تقاضے کو پورا کرنے میں دارالعلوم کا قدم کبھی پیچھے
نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ حق کی آواز بلند کرنے میں انھوں نے سبقت کی۔ اور سیاسی گتھیوں کو
سلجھانے میں خصوصی حیثیت سے رہنمائی کی ہے چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں دارالعلوم
دیوبند کی رائے کو مشورہ کی حیثیت سے ہمیشہ اہمیت حاصل رہتی ہے۔

دارالعلوم نے مسلمانانِ ہند کی ملی، مذہبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کو دینی مدارس
کے ذریعے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے فرزندوں نے زندگی کے مختلف میدانوں
میں مسلمانوں کی رہنمائی کی وہ عظیم خدمات انجام دی ہیں جو بالآخر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ
کی تحریک کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

دارالعلوم نے آزادی کے مجاہدوں اور قوم کے خدمت گزاروں کی ایک وسیع جماعت

کے شروع ہی سے جس طرح گذشتہ صدی میں جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی وہ دیوبندی مکتب کی دوسری احیائی وسیاسی تحریکات کی سرچشمہ تھی، اور جو انقلابی حریت پسند تھے وہ دیوبند کے مرہون منت کا فیضان تھی۔

دیوبند کے اکابر نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں پیش از پیش حصہ لیا اور اس راستے کی تمام صعوبتوں کو برداشت کیا اور ہزار آفتیں جھیلیں۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد وطنی سیاست میں حصہ لینے کا جو رجحان حضرت شیخ الہند سے شروع ہوا تھا جسے مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کی زندگی کو تحریک ولی اللہی کا ایک مستقل عہد تسلیم کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی سرکردگی میں اصحاب عزیمت کا جو قافلہ تیار ہوا تھا اس میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا فضل ربی اور کئی بہت خیبر افغانستان، مولانا سیف الرحمن کابلی، مولانا محمد صادق کراچوی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد علی لاہوری اور دوسرے بہت سے اکابر شامل تھے۔ آج بھی ہندوستان سے پاکستان تک دارالعلوم دیوبند کے فضلا سیاسی میدان میں بھی ملک و ملت کی خدمات کر رہے ہیں۔ دیوبند کے ایک نامور عالم حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی نے بعض مسائل میں جو روش اختیار کی اس سے تحریک پاکستان کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھایا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی تو تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں شامل تھے اور انھوں نے اپنی بہترین عالمانہ صلاحیتوں سے مسلم لیگ کو اسلامی ریاست کے نصب العین پر مستحکم کرنے اور مستحکم رکھنے کی کوشش کی پھر قیام پاکستان کے بعد دیوبند کے ہندوستانی رہنماؤں نے نہایت خلوص و محنت سے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھا۔ اور پاکستان میں اس سلسلے کے بزرگوں نے ملک و ملت کی تعمیر و خدمت کا ایک نئے عزم کے ساتھ بیڑا اٹھایا اور پاکستان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ملت کی رہبری کی۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر علماء اس کے فرزند علمی و دینی خدمت کے میدان میں بھی
کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اس کے بانیوں میں حاجی امداد اللہؒ اور مولانا محمد قاسمؒ دونوں کے
بہترین ادیب اور صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ دیوبند کے امام
حیثیت علماء کے دو ناؤں میں تھے۔ وہ بہت بڑے صاحب قلم بزرگ تھے۔ ان کا ترجمہ
قرآن مجید ان کے ادب کا شاہکار ہے۔ ان کے علاوہ علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی
مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا سید محمد میاں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید
احمد اکبر آبادی، مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تحریریں عالمانہ اور محققانہ ہیں حتیٰ کہ زبان
و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی وقت کی معیاری علمی تحریریں ہیں۔ ماہر
عجیب آبادی، مولانا ظفیر الدین بجنوری، حامد الانصاری غازی، شاکر احمد عثمانی تو ادب و
شعر کی دنیا میں معروف ہیں ادبی حیثیت سے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا
حسین احمد مدنی اور بہت سے اکابر دیوبند اگرچہ ادبی حیثیت سے مشہور نہیں ہو سکے لیکن
وہ اپنی تصانیف کی کثرت یا تصانیف کی علمی، تاریخی، سیاسی حیثیت کی بنا پر علمی و ادبی
دنیا کی معروف شخصیت ہیں۔ ان کی خدمات سے ہر شخص واقف ہے۔ اگر ندوۃ العلماء لکھنؤ کو
اس امر کا حق پہنچتا ہے کہ وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسے ادارے سے علمی کام لے سکے
باعث افتخار ہے تو دارالعلوم دیوبند کو بھی اس کا حق ہے کہ
اس کے عظیم فرزندوں نے ندوۃ المصنفین دہلی جیسا بڑا علمی و ادبی اور تصنیف
و تحقیق کے جو بہترین نمونے پیش کیے ہیں وہ ان پر فخر کرے، یا اس کے فرزندوں نے علم و
ادب کے جس میدان میں بھی اور کسی علمی ادارے کے گوشۂ عزلت میں یا کسی مسجد و خانقاہ
میں کوئی علمی و صحافتی اور ادبی خدمت انجام دی ہو تو اسے اپنی تاریخ و تذکرے
میں بیان کرے۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان کا ایک عظیم مرکزی اسلامی درسگاہ ہے جس میں

فضلائے دارالعلوم کی تصنیفی خدمات

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی اور تدریسی خدمات ایک معروف حقیقت ہے اور دنیا نے اس کا اعتراف کیا ہے، مگر فضلائے دیوبند نے درس و تدریس اور وعظ و تقریر اور دوسرے دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں وہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لئے بلکہ دنیائے اسلام کے لئے بھی ایک قابل فخر سرمایہ ہے۔ علوم دینیہ سے متعلق کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں ان کی تصنیفات و تالیفات موجود نہ ہوں۔ ان میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے بھی ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر تو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہیں، مگر ان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے دو رخ ہیں، ایک اندرونی جس کا تعلق طلبا کی تعلیم و تدریس سے ہے۔ اس کا دوسرا رخ بیرونی ہے جو عام مسلمانوں اور ملک سے متعلق ہے جو عوام سے رابطہ، وعظ و تبلیغ، فتویٰ اور ملکی معاملات میں قوم کی ترجمانی و رہنمائی، تذکیر و تزکیہ اور تصنیف و تالیف اس کے اہم عنوانات ہیں۔ اس سلسلے میں دارالعلوم سے جو قابل قدر خدمات انجام پائیں وہ برصغیر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں

حاصل ہے۔ صرف مذکورہ مصنفین کی تصانیف کے ذکر کے لئے بھی ایک ضخیم جلد درکار ہوگی، یہ موضوع ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ دارالعلوم کے فضلاء مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے ہیں اور سو سال سے دنیا کے مختلف خطوں میں علمی اور دینی خدمات میں منہمک ہیں، ان کے حالات آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ یہاں محدود صفحات میں ان تمام کتابوں اور مصنفین کے نام لکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے صرف چند مصنفین کی کتابوں پر اکتفا کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ تاہم اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علمائے دیوبند نے کیا کیا تصنیفی خدمات انجام دی ہیں اور درس و تدریس کے علاوہ، تحریر و تصنیف کی صورت میں بھی کتنا قیمتی ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ یہ کتابیں علم و حکمت کے دریائے ناپیدا کنار کی پہنائیوں کا جائزہ لیتی اور اس کی گہرائیوں سے گوہر نایاب نکال کر علوم و معارف کو عام کرنے کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔

لے دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی ص ۹۰ طبع ۱۹۶۶ء یہ تعداد صرف ایک سو سال کے بعد عربی ہ ۱۴ سال کے اعداد و شمار، ابھی فراہم کرنا باقی ہیں۔ کتب خانہ دارالعلوم کے ایک نئے ہال میں مصنفین دارالعلوم دیوبند کی کتابوں کو مولانا ظہیر الدین صاحب مدیر کتب خانہ ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب تک دو ہزار سے زائد کتابیں جمع ہو چکی ہیں اس کے ساتھ مولانا موصوف کے پیش نظر ان کتابوں کی تعارفی فہرست تیار کرنا بھی ہے۔ یہ فہرست عنقریب شائع ہونے والی ہے کتابوں کے یکجا جمع ہونے اور ان کی تعارفی فہرست کے بعد فضلائے دارالعلوم دیوبند کی تصانیف کا مجموعہ تفصیل کے ساتھ سامنے آ سکے گا۔ اور اس وقت صحیح اندازہ ہوگا کہ علمائے دارالعلوم دیوبند نے اس علمی میدان میں کیسی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اور یہ کتابیں موجودہ دور کے لئے کتنا قیمتی سرمایہ ہیں۔ تفسیر، حدیث، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، کلام، تصوف، اخلاق، تاریخ، ادب، سیاست وغیرہ علوم و فنون کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر علمائے دیوبند نے کئی کئی جلدیں نہ لکھی ہوں جن سے ملک و ملت کو عظیم فائدہ پہنچا ہے۔

سید محبوب رضوی

قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر

اور متعلقات

۱۶ حاشیہ سنن ابن ماجہ (عربی) — حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

۱۷ حجیت حدیث — حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

۱۸ حدیث رسول کا قرآنی معیار — حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

۱۹ اردو ترجمہ بستان المحدثین — حضرت مولانا عبد السمیع دیوبندیؒ

۲۰ سنن سعید بن منصور (عربی) — مولانا حبیب الرحمن اعظمی

۲۱ شرح ترمذی — حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی

۲۲ العرف الشذی علی جامع الترمذی (عربی) — حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

۲۳ فتح الملہم شرح صحیح مسلم (عربی) — حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

۲۴ فضل الباری شرح صحیح بخاری — حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

۲۵ فیض الباری علی صحیح البخاری (عربی) — حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

۲۶ القول الفصیح — حضرت مولانا سید فخر الدین احمد

۲۷ کتاب الزہد والرقائق — تعلیق و تحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی

۲۸ الکوکب الدری — حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

۲۹ مسند حمیدی (عربی) — تعلیق و تحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی

۳۰ مشکوٰۃ الآثار — حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ

۳۱ مصنف عبدالرزاق (عربی، گیارہ جلدیں) — تعلیق و تحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی

۳۲ المطالب العالیہ (عربی، چار جلد) — حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی

۳۳ مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح (جدید) — مولانا عبداللہ جاوید

۳۴ معارف الحدیث (۸ جلد) — حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

۳۵ معارف السنن شرح جامع ترمذی — حضرت مولانا محمد یوسف بنوری

احسان وتصوف

۴۹ شہید کربلا — حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمی

۵۰ شہید کربلا — حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی

۵۱ شہید کربلا — قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

۵۲ شہدائے اسلام — مولانا خورشید حسن قاسمی

۵۳ صدیق اکبر — حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی

۵۴ عربی کتابوں کے تراجم — مولانا عبدالسبوح پشاوری

۵۵ علمائے حق — حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی

۵۶ علمائے ہند کا شاندار ماضی — ایضاً

۵۷ غلامانِ اسلام — حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی

۵۸ فتحِ مصر — مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی

۵۹ مشاہیرِ امت — حضرت مولانا محمد طیب قاسمی

۶۰ منتخبِ اسلام — مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی

۶۱ مرقعِ مستقیم — مولانا مفتی جمیل الرحمن سیوہاروی

۶۲ مسلمانوں کا عروج و زوال — حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی

۶۳ مولوی معنوی — حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن دیوبندیؒ

۶۴ میری ڈائری — حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

۶۵ النبی الخاتم — حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

۶۶ نشر الطیب — حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

۶۷ نقشِ حیات — حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

۶۸ وفات النبی — مولانا اخلاق حسین قاسمی

۶۹ ہزار سال پہلے — حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ترتیب جدید

ماخذ و مراجع

۱ البدایہ والنہایہ ۔ حافظ ابن کثیرؒ ۔ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۵۱ھ

۲ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین ۔ نواب صدیق حسن خاں ۔
مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ۔

۳ آثار رحمت ۔ مرزا حیرت دہلوی ۔ مطبوعہ یونین پریس دہلی ۔

۴ آثار الصنادید ۔ سر سید احمد خاں ۔ نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ ۔

۵ اخبار الاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی مجتبائی دہلی ۱۳۳۲ھ

۶ اردو کا ابتدائی مجموعہ حکایات ۔ امیر شاہ خاں ۔ مطبوعہ آزاد پریس دیوبند ۔

۷ اسلامک ایجوکیشن ان انڈیا ۔ گورنمنٹ پریس دہلی ۔

۸ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ۔ مطبوعہ گورنمنٹ پریس ۱۹۰۸ء ۔

۹ انتصار الاسلام ۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۔ مطبوعہ دیوبند ۱۳۵۲ھ ۔

۱۰ آئین اکبری شیخ ابوالفضل ۔ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ

۱۱ الیانع الجنی فی اسانید شیخ عبدالغنی ۔ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۸ھ

۱۲ بانی دارالعلوم دیوبند (رسالہ مصاحبت) حضرت مولانا محمد طیب صاحب
مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۔

۱۳ پروفیسر ہمایوں کبیر دار العلوم دیو بند میں۔ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دار العلوم دیو بند

۱۴ پریچنگ آف اسلام پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء۔

۱۵ تاریخ دیو بند سید محبوب رضوی مطبوعہ آزاد پریس دیو بند ۱۹۵۲ء

۱۶ تاریخ سہارن پور۔ منشی نند کشور۔ مطبع [illegible] ۱۸۹۶ء۔

۱۷ تاریخ شاہجہاں پور۔ میاں فصیح الدین۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۲ء۔

۱۸ تاریخ صحافت اردو۔ امداد صابری۔ مطبوعہ دہلی۔

۱۹ تاریخ فرشتہ۔ ابو القاسم فرشتہ۔ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ۔

۲۰ تاریخ الکامل۔ علامہ ابن اثیر جزری۔ مطبوعہ مصر۔

۲۱ تاریخ مظاہر علوم سہارنپور۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب۔ شائع کردہ کتب خانہ اشاعت العلوم سہارنپور

۲۲ ترجمہ الثورۃ الہندیہ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔

۲۳ ترجمہ خطبات گارساں دتاسی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۵ء۔

۲۴ ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔

۲۵ تذکرۃ الخلیل۔ مولانا عاشق الہی میرٹھی۔ الخلیل مشین پریس میرٹھ۔

۲۶ تذکرہ طبقات شعرائے ہند۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ء۔

۲۷ تذکرہ علمائے فرنگی محل۔ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مطبوعہ لکھنؤ۔

۲۸ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمان علی مترجمہ محمد ایوب قادری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ مطبوعہ کراچی۔

۲۹ تذکرہ فرائد الدہر۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۷ء۔

۳۰ ترجمہ تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف مطبوعہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

۴۹ روداد ہائے دارالعلوم دیوبند از [illegible] تا [illegible] و [illegible] تا [illegible] شائع کردہ دارالعلوم دیوبند۔

۵۰ روداد ہائے مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ (غیر مطبوعہ) محفوظ محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند۔

۵۱ رئیس الاحرار، ہندوستان کی جنگ آزادی، مرتبہ [illegible] عباسی مطبوعہ [illegible]۔

۵۲ سفرنامہ ابن حوقل۔ مطبوعہ لائیڈن

۵۳ سفرنامہ افغانستان۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب۔ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی [illegible]

۵۴ سفرنامہ برما۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب، مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی [illegible]۔

۵۵ سنن ابن ماجہ۔ حافظ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی۔ مجتبائی دہلی [illegible]۔

۵۶ سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی مصنفہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی مطبوعہ صادق الاخبار بہاولپور و مطبع مجتبائی دہلی۔

۵۷ سوانح قاسمی۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ [illegible] پریس دیوبند۔

۵۸ سیر المتأخرین۔ غلام حسین طباطبائی۔ نول کشور لکھنؤ [illegible]۔

۵۹ سیرۃ النبی۔ علامہ شبلی نعمانی۔ مطبوعہ نامی پریس کانپور طبع اول۔

۶۰ شاہان افغانستان دارالعلوم دیوبند میں۔ مرتبہ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند۔

۶۱ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ مرکنٹائل پریس لاہور [illegible]۔

۶۲ صحیح بخاری۔ امام محمد بن اسمعیل بخاری۔ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی [illegible]۔

۶۳ صدر جمہوریہ ہند دارالعلوم دیوبند میں (۱۹۵۷ء) مرتبہ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

۶۴ طبقات ناصری۔ منہاج سراج۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

۶۵ [illegible] ۔ مرتبہ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

۶۶ علی گڑھ یونیورسٹی گزٹ۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۳۰ء۔

۶۷ علم کے چند طلبہ۔ مصنف غلام رسول شہابی۔ شائع کردہ مکتبہ کتاب گھر دہلی۔

۶۸ قرونِ وسطیٰ کی علمیات و حکمائے اسلام کے ادبیات۔ خواجہ خلیل احمد شاہ۔ وکیل پریس امرتسر۔

۶۹ فہرست انجمن ہدایت اسلام کلکتہ۔ مطبوعہ ۱۲۹۲ھ۔

۷۰ کتاب الخطط۔ علامہ تقی الدین مقریزی۔ مطبوعہ مصر۔

۷۱ کشف الظنون۔ ملا کاتب چلپی۔ مطبوعہ استنبول ۱۳۱۱ھ۔

۷۲ کمالات عزیزی۔ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۹۶ھ۔

۷۳ مآثر الکرام۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء۔

۷۴ ماڈرن اسلام ان انڈیا۔ ڈاکٹر کانٹویل اسمتھ۔ میک گل یونیورسٹی کناڈا۔

۷۵ مدرسے، مسلمانوں کا زریں ماضی و مستقبل۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب۔ مطبوعہ افضل المطابع دہلی ۱۹۱۹ء۔

۷۶ مرحوم دہلی کالج۔ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۵ء۔

۷۷ مذہب منصور۔ مولانا حکیم منصور علی خان۔ مطبوعہ محمودی پریس حیدرآباد دکن۔

۷۸ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ مولوی طفیل احمد منگلوری۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۸ء۔

۷۹ مشکوٰۃ المصابیح۔ حافظ ولی الدین الخطیب البغدادی۔ مطبوعہ اصح المطابع دہلی۔

۸۰ مفتاح کنوز السنۃ۔ علامہ سید رشید رضا۔ مطبوعہ مصر ۱۳۵۲ھ۔

۸۱ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ مطبع ہاشمی میرٹھ۔

۸۲ مولانا محمد احسن نانوتوی۔ از پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ جاوید پریس کراچی ۱۹۶۶ء۔

۸۳ نزہۃ الخواطر۔ مولانا حکیم عبدالحی۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

۸۴ نظرۃ اجمالیۃ فی الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند و الباکستان۔ مولانا مسعود عالم ندوی۔

۸۵ ہزار سال پہلے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ شائع کردہ انجمن خدام الحدیث مدرسۃ العلوم [illegible]

۸۶ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور سنہ ۱۹۴۴ء۔

۸۷ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ مولانا ابو الحسنات ندوی۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

۸۸ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

۸۹ واقعات دار الحکومت دہلی۔ بشیر الدین احمد۔ مطبوعہ شمسی پریس آگرہ۔

اخبارات و رسائل

۹۰ الجمعیۃ دہلی (روزنامہ)

۹۱ "الرشید" لاہور کا دار العلوم دیوبند نمبر (ماہنامہ) مدیر عبد الرشید ارشد۔

۹۲ "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر (ماہنامہ) مولانا محمد منظور نعمانی سنہ ۱۳۵۹ھ۔

۹۳ "القاسم" (ماہنامہ) مطبع قاسمی دیوبند۔

۹۴ برہان دہلی (ماہنامہ) مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔

۹۵ حیات نو (ماہنامہ)

۹۶ دار العلوم دیوبند (ماہنامہ) مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

۹۷ "دعوت" دہلی (سہ روزہ) سنہ ۱۹۶۹ء۔ مولانا محمد مسلم

۹۸ زبان و ادب (ماہنامہ) شائع کردہ آزاد کتاب گھر دہلی سنہ ۱۹۶۳ء۔

۹۹ زمیندار لاہور (روزنامہ) سنہ ۱۹۲۳ء۔

۱۰۰ سیاست لاہور (روزنامہ) سنہ ۱۹۲۳ء۔ سید حبیب۔

۱۔ "عصر جدید" کلکتہ (روزنامہ) ۱۹۳۶ء

۲۔ "قومی آواز" لکھنؤ (روزنامہ) مضمون مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی مطبوعہ لکھنؤ

۳۔ "تجلیات" مسعرب کویت ۱۹۷۲ء

۴۔ مجلہ علوم اسلامیہ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بابت ۱۹۶۱ء

۵۔ "مدینہ" بجنور (اخبار) ۱۹۳۶ء

تاریخ
دار العلوم دیوبند
برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ
دار العلوم دیوبند کی عظیم دینی و ملی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ
مقدمہ
مصنف
المیزان

تاریخ دارالعلوم دیوبند

برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ

اسلامی علوم و ثقافت اور ملت کی نشأۃ ثانیہ کا سرچشمہ
دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی، ملی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا آئینہ دار

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

مصنف

سید محبوب رضوی

المیزان ناشران و تاجران کتب

الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور پاکستان فون: ۷۲۳۰۲۶۸، ۷۱۲۲۹۸۱-۰۴۲

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ

سلسلہ مطبوعات - ۱۰۰

سن اشاعت [illegible]

محمد شاہد عادل نے

حاجی حنیف پرنٹرز سے چھپوا کر

المیزان اردو بازار لاہور سے شائع کی۔

فہرست مضامین

باب چہارم

ارباب اہتمام ۲۲۱

دارالعلوم کے مفتیانِ کرام ۲۴۵

باب ششم

باب ہفتم

باب ہشتم

پیش لفظ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ، مہتمم دار العلوم دیوبند

تیرھویں صدی ہجری کے برصغیر میں مسلمانوں کے سامنے دو اہم مسئلے تھے جن کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عہد سے ہو چکا تھا۔ ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کے تحفظ کا تھا اور دوسرے کی نوعیت سیاسی تھی جس کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ شاہ صاحب کے بعد حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اسلامی قدروں کی حفاظت کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہ حضرات اعتقادی اور معاشرتی اصلاح کی زبردست جد و جہد میں مصروف رہے۔ انہوں نے تباہ کن رسم و رواج کی مخالفت کی اسلامی عقائد و مسائل کو عقلی دلائل سے واضح کیا، بیواؤں کے نکاح، عورتوں کے حق وراثت اور معاشرتی اونچ نیچ کو درست کرنے کی بھرپور کوشش کی اور دوسرے مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے دینی مدارس قائم کئے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی مساعی کا برصغیر کے ہر گوشے پر خاطر خواہ اثر پڑا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد اس سے متاثر ہوئی

بایں ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ باہر کی دنیا بالخصوص ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ دار العلوم کی ان خصوصیات سے بڑی حد تک ناواقف ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ دار العلوم خود اپنے حسن خدمات کے اظہار میں سلف کا اصول یہ تھا کہ کام زیادہ ہو اور اظہار کم لیکن اس مصالح کا

کرا ایک پہلی جلد کی تکمیل کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے کہ دوسری جلد ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے۔ اداکاس کی اس محنتِ شاقہ پر اللہ تعالیٰ انھیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ اس پر وہ ہم سب کی طرف سے یقیناً خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ جلدِ اول کی طرح دوسری حصہ بھی اربابِ نظر کے لئے ایک وقیع علمی سوغات ثابت ہوگی۔

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۵ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

چراغ کو بادِ مخالف کے پیہم تھپیڑوں کے باوجود روشن رکھا اور برِ اعظم ایشیا کے طالبانِ علم نبوی کو اپنی آغوش میں لے کر انہیں علمی انتشار اور پراگندگی کی حالت سے نکال کر اس قابل بنا دیا کہ وہ علمی حیثیت سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دے سکیں!

دارالعلوم دیوبند محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر دینی تحریک ہے جو اپنے عظیم مقصد اور طریقۂ تعلیم میں انفرادی شان لئے ہوئے ہے۔ علمائے دارالعلوم دیوبند ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "علیکم بسنتی" پر عمل پیرا رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ "ما انا علیہ واصحابی" کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے اس طریق کو اپنایا ہے جو اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

دارالعلوم دیوبند دینی علوم میں کامل رسوخ اور اتباعِ سنت میں پختگی کی بناء پر برِ صغیر میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ خصوصاً علم حدیث کی تعلیم و تدریس میں اس کا ایک منفرد اسلوب ہے جو اسے تمام دوسرے مدارسِ دینیہ سے ممتاز بناتا ہے۔ اس کا درسِ حدیث بین الاقوامی شہرت اور عظمت کا حامل رہا ہے، چنانچہ آج بیشتر اسلامی مدارس طریقِ تعلیم و نظم و نسق میں دارالعلوم دیوبند ہی کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں!

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کے تہذیبی ماضی کو زندہ رکھنے، حال کو دینی توانائی بخشنے اور مستقبل کو اسلامی قدروں کے مطابق روشن اور تابناک بنانے کے لئے جو قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ اس کا ایسا سرمایۂ افتخار ہے جسے ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دارالعلوم دیوبند برِ صغیر میں اسلامی زندگی کا بے خوف علمبردار، امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا داعی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کا

مسلح، شاہ عبدالعزیزؒ کے علم کا شارح اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے جذبات حریت کا
سب سے بڑا امین رہا ہے۔ دار العلوم دیوبند دینی علوم کی ایک موثر اور فعال تحریک
ہے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کے خس و خاشاک کو علیحدہ کر کے جنہیں
وہ اس عالم سے وراثت میں پایا، شرک، بدعات کے رسم و رواج اور باطل توہمات
سے انہیں نجات دلائی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں سے برطانوی حکومت کا
ڈر و خوف و ہراس دور کر کے انہیں سیاسی اعتبار سے اس لائق بنانے میں مدد دی
جس سے وہ آزادیٔ ملک کی تحریک میں نمایاں طور پر حصہ لے کر مسلمانوں کے ملی وقار کو
بلند کر سکیں۔ غرض تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی ہر لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ
ایسا نہیں جس میں دارالعلوم نے دینی گرانقدر خدمات کا نقش نہ چھوڑا ہو۔ اسی کے ساتھ
یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ اس تحریک کا دائرہ صرف برصغیر تک ہی محدود نہیں رہا
بلکہ دور دور تک اس کا حلقہ اثر وسیع ہو گیا چنانچہ دارالعلوم دیوبند صرف برصغیر ہی کا نہیں
بلکہ پورا ایشیا کا علمی اور دینی مرکز بن گیا ہے

دارالعلوم دیوبند کے فیض تعلیم سے ہزاروں علماء، شیخ، مفکر و مبلغ، قائد و مصنف
اور اہل قلم پیدا ہوئے۔ جنہوں نے برصغیر کی اسلامی تاریخ میں انقلاب آفریں مقام حاصل
کیا ہے۔ ان کے علمی، دینی، تعلیمی، تصنیفی، تبلیغی اور اصلاحی کارنامے بڑی اہمیت رکھتے
ہیں۔ خصوصاً تفسیر و حدیث، تعلیم و تدریس اور وعظ و تبلیغ کے میدانوں میں یہ سب
سے آگے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا
ان کی عظیم خدمات مسلمانوں کی زندگی کے کسی خاص گوشے یا کسی ایک پہلو میں محدود نہیں
ہیں بلکہ اس نے دارالعلوم دیوبند نے ہر سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی گرانقدر خدمت انجام
دی ہے۔ یہ ہر دور میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے سرگرم رہے ہیں۔ اسلام کو دیئے
جانے والے ہر چیلنج کا انہوں نے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند والوں کے

نقش قدم پر چلنے والے دوسرے دینی مدارس سے جن کا پورے برصغیر میں جال پھیلا ہوا
ہے ملت اسلامیہ کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں انھیں ہمیشہ قوم میں غیر معمولی
مقبولیت اور عظمت حاصل ہے۔

علمائے دارالعلوم دیوبند کے مخصوص سوانح کا اس موضوع کو چند محدود اوراق میں
سمیٹنا بڑا مشکل ہے۔ ان خدمات کی تفصیل کے لئے کئی ضخیم جلدیں چاہییں۔ خصوصاً اس
سلسلے میں فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ لکھے جانے کی بڑی ضرورت ہے جن کی
تعداد بارہ ہزار کے قریب ہے۔

ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور علمائے دارالعلوم
کے سب نہیں تو کم از کم اہم پہلو ضرور سامنے آ جائیں۔ اب جب کہ دارالعلوم دیوبند پر
لکھنے کا آغاز ہو چکا ہے تو امید رکھنی چاہیے کہ آئندہ اس موضوع پر وقتاً فوقتاً اور
بھی مفید تحریریں سامنے آتی رہیں گی۔ اہلِ قلم فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہ اہم
فریضہ ہے کہ وہ اپنی مادرِ علمی کو اپنی نگارشات کا موضوع بنائیں اور دارالعلوم دیوبند
کے مختلف گوشوں کو زیادہ بہتر طور پر پیش کرنے کی کوشش کریں۔ امید ہے کہ اس موضوع پر کام
کرنے والوں کے لئے یہ کتاب نقشِ اول ثابت ہوگی۔ نیز یہ کہ تمام مدارس عربیہ کی ایک جامع تاریخ مدون ہونی چاہئے
جس میں مدارس عربیہ کے کارناموں کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جا سکے۔ یہ ایک بہت ضروری
کام ہے جس پر مدارس دینیہ کے ارباب علم حضرات کو توجہ دینی چاہئے۔

اس جلد کے آخر میں شوریٰ روداد کا ایک طویل اقتباس شامل ہے اس شوریٰ کی حیثیت
دستاویز کی ہے کہ یہ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی ایک قدیم ترین مسلمہ تاریخ ہے۔
مگر یہ عجیب بات ہے کہ مدت سے یہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ شوریٰ روداد دارالعلوم
دیوبند کے ابتدائی حالات کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ اور چشم دید شہادت ہونے کی وجہ سے
مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ شوریٰ روداد اس وقت لکھی گئی تھی جب دارالعلوم دیوبند

ابھی عمر کے ابتدائی دنوں سے گزر رہا تھا حتیٰ کہ مدرسہ اسلامی عربیہ کے نام سے موسوم تھا مگر اس زمانے ہی میں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مدرسہ ایک عظیم دارالعلوم کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے، شوریٰ کے معتمد صاحب کا اظہار شوریٰ کے ایک مصرعے میں یوں کیا گیا ہے:

دیوبند اب ہو گیا دارالعلوم

شوریٰ کی قراردادوں سے دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی زمانے کے حالات، درس و تدریس، تعلیم و تعلّم کی کیفیت، اس کی شہرت و مرکزیت کے علاوہ اکابر دارالعلوم کے علم و فضل، تقویٰ و تدین، کارکنوں کی امانت و دیانت کی نسبت عام مسلمانوں کے دلوں میں جو تصورات اس وقت قائم تھے ان کا ایک ایسا مرقع اس میں نظر آتا ہے جو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا، اس لئے شوریٰ کی قراردادوں کے ضروری حصے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

آخر میں دارالعلوم دیوبند کے سالانہ آمد و خرچ، تعمیرات، اساتذہ اور کارکنوں کے گوشوارے دیئے گئے ہیں، اعداد و شمار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے امید ہے کہ یہ گوشوارے کارآمد اور معلومات افزا ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور قارئین کے لئے مفید کارآمد اور نفع بخش بنائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

مولانا عبدالحق صاحب معتمد دفتر اہتمام نے تاریخ دارالعلوم دیوبند کی جلد اوّل و دوم کی کاپیوں کی تصحیح جس محنت اور توجہ سے کی ہے اس کے لئے میں مولانا موصوف کا بصمیم قلب ممنون و شکر گزار ہوں۔

سید محبوب رضوی
دارالعلوم دیوبند

۲۶ محرم الحرام ۱۳۹۷ھ - ۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء

انھوں نے ہندوستان میں اسلامی اور دینی زندگی کے قیام اور بقاء و استحکام کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کا سبھی نے اعتراف کیا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے مصنف سید محمد الحسنی لکھتے ہیں:-

"اس حقیقت سے کوئی ہوش مند اور منصف مزاج انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے علماء نے ہندوستان کے گزشتہ سو برس میں دین و ایمان کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقاء و استحکام میں بڑی مدد ملی ہے، اور آج جو کچھ اسلامی عقائد، دینی علوم، ایمان کی حرارت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے، اس میں بلاشبہ اس کا خاصا بلکہ بنیادی حصہ ہے۔"[1]

اگر یہ سچ ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ دار العلوم کے پھل اپنے ذائقے میں لذت آفریں اور ماہیت میں صحت بخش ثابت ہوئے ہیں۔ مقصد یہ کہ دار العلوم نے ملت کی مردہ رگوں میں صالح خون اور جسم کو نئی توانائی دی ہے ان حضرات نے دلوں میں قلوب میں عزم و اعتماد کی شمع روشن کی ہے، اور ان کی دینی و دنیوی زندگی کے لئے حیات تازہ بخشی ہے، در حقیقت دار العلوم دیوبند ایک ایسا فانوس ہے جس کی روشنی ایشیا سے گزر کر براعظم افریقہ تک پہنچ چکی ہے، عالم اسلام کا اگر کوئی ادارہ یہ فخر کر سکتا ہے کہ وہ گزشتہ سو سال میں دینی علوم کا مرکز رہا ہے تو وہ صرف دار العلوم دیوبند اور اس کے فرزندانِ رشید ہیں جن کا بہت ہی مختصر تذکرہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے علمی و دینی اور اصلاحی کارناموں اور سیاسی خدمات کی تفصیل کیلئے ایک مستقل کتاب کا انتظار کرنا ہوگا۔

---

[1] حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۰۰، مطبوعہ ندوہ پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء

تذکرہ فضلائے دار العلوم دیوبند

مولانا میر باز خاں تھانویؒ

مولانا میر باز خاں ۱۲۶۰ھ میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد بخش احمد اور مظفر تھانوی۔ مولانا محمد مظہر نانوتوی وغیرہ علماء سے تحصیل علم کی۔ اوائل ۱۲۸۳ھ میں دار العلوم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے دار العلوم سے فراغت حاصل کی۔ زمانۂ تعلیم کے ہونہار رہے تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں پڑھانے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ انہیں تعلیم و تدریس کا اچھا ملکہ تھا۔ انہوں نے سالانہ امتحان میں شرح وقایہ، ہدایہ اولین، مسلم شریف بیضاوی، شرح عقائد نسفی، مقامات حریری اور سبعہ معلقہ کی تعلیم دی۔ ان کی سند میں لکھا ہے کہ یہ تحصیل میں بعہدۂ شائستگی کام کرتے رہے۔ روداد میں مرقوم ہے:

"نتیجہ اس مدرسہ میں چند طلباء ایسے قریب اتمام تحصیل کے ہیں کہ کار مدرسی عربی کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں چنانچہ حسب طلب مہتمم صاحب مدرسہ عربی سہارنپور، مولوی میر باز خاں طالب علم مدرسہ ہذا مدرس دوم مدرسہ عربی سہارنپور بھیجے گئے۔

روداد ۱۲۸۶ھ ص ۲

۱۲۸۸ھ کی روداد میں مدرسین کی علمی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل و مولوی میر باز خاں و مولوی فتح محمد و حافظ احمد حسن نے بھی سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا۔ (روداد ۱۲۸۸ھ ص ۲)

مولانا فتح محمد تھانویؒ

مولانا فتح محمد تھانویؒ بھی قیام دارالعلوم کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۲۸۵ھ میں پہلی مرتبہ جن تین طلبہ نے دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ان میں سے ایک مولانا فتح محمد صاحب بھی تھے۔ دارالعلوم سے ان کو جو سند دی گئی وہ حسب ذیل ہے۔

"۱۲۸۳ھ میں داخل ہوئے، بلاغت میں مختصر معانی، منطق میں قطبی، میر قطبی، حکمت میں میبذی، کلام میں شرح عقائد، اصول میں شاشی، نورالانوار، فقہ میں ہدایہ، حدیث میں نسائی، مسلم، بخاری شریف، مؤطا، تفسیر میں بیضاوی شریف، ہیئت میں تصریح، شرح تشریح، ادب میں نفحۃ الیمن، مقامات حریری، دیوان متنبی یہاں تحصیل کیں، سالانہ امتحان میں عمدہ کامل حاصل کر کے انعام پایا، استعداد قابل مناسبت تام، طبع سلیم، فکر صائب، ذہن رسا رکھتے ہیں، بعد عہدۂ نیابت پر کارگزاری خوبی تمام کرتے رہے۔ ان کی خوبیٔ اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسین اور مہتمم راضی اور سب طلبہ سبق یاب و ہم سبق مداح ہیں۔"

مولانا فتح محمد دارالعلوم میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، جیسا کہ سند کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے۔ روداد میں مزید اس کی صراحت ملتی ہے۔ مدرسین کی تعلیمی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل و مولوی میر باز خان و مولوی فتح محمد و ملا محمد حسن نے بھی بہت سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا۔"[1] روداد میں ان کے کھانے کا چندہ دہندہ چودھری

---

[1] روداد سال اوّل ۱۲۸۳ھ ص ۶

مولانا شیخ محمد صاحب آخر تک تھانہ بھون کے مدرسہ سے وابستہ رہے۔ مشہور یہ ہے کہ
اُن کے بعض تصنیفات کا پتہ نہیں چل سکا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ السامی ان کے
تلامذہ میں شامل ہیں۔

مولانا قاضی محی الدین خاں مراد آبادی

حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ اور جلیل القدر علماء میں سے تھے۔ ریاست بھوپال[۱]
میں قضاء کے عہدے پر فائز رہے۔ تذکرہ دارالعلوم میں اُن کی نسبت لکھا ہے کہ:۔
"جناب مولانا قاضی محی الدین خان صاحب مراد آبادی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم
قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ کے قدیم تلامذہ میں سے تھے، اور
حضرت نانوتویؒ کے مخصوص لوگوں میں شمار ہوتے تھے، آپ عرصہ دراز تک ریاست بھوپال
کے عہدۂ قضاء پر فائز رہے۔ نہایت وقار اور حشمت کے ساتھ عمر پوری فرمائی۔"
اُن کے والد ماجد بہادر شاہ ظفر کے مصاحبین خاص میں تھے۔ حضرت نانوتویؒ سے
اُن کو ارادت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ نے شاملی کے معرکہ میں اُنہی کے ذریعے سے
بہادر شاہ ظفر تک اپنی تجاویز پہنچائی تھیں۔
۱۳۱۳ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، اور آخر تک مجلس
شوریٰ کو اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرماتے رہے۔ ۱۳۴۲ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبدالحق پورقاضوی

قصبہ پور قاضی[۲] ضلع مظفر نگر وطن تھا، تقریباً ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۲۳ھ میں

۱؎ تذکرہ علماء مطبوعہ ۱۳۴۹ھ ص ۵ ۲؎ پورقاضی مظفر نگر کے شمال میں ترخواہ کی جانب ایک قدیم بستی ہے

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹویؒ

انبہٹہ ضلع سہارنپور وطن تھا [illegible]ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور [illegible]ھ میں یہاں سے فراغت حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے وقت کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے حاصل کی۔ مکہ مکرمہ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں ایک عرصے تک مقیم رہے۔ اسی دوران میں حضرت شیخ المشائخ سے مثنوی مولانا روم پڑھی۔ حضرت شیخ المشائخؒ سے انھیں خلافت حاصل تھی۔

[illegible]ھ میں جب گلاؤٹھی میں منشی مہربان علی مرحوم نے مدرسہ منبع العلوم قائم کیا تو اس کے صدر مدرس بنائے گئے۔ بعد ازاں [illegible]ھ میں سرسید مرحوم نے ان کو علی گڑھ بلا کر اس وقت کے ایم اے او کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) میں ناظم دینیات مقرر کیا، جہاں وہ آخر تک اس منصب پر فائز رہے۔ ان کے بعد ان کے فرزند مولانا احمد میاں انصاری ناظم دینیات مقرر ہوئے۔ ان کے دوسرے فرزند مولانا محمد میاں منصور انصاری حضرت شیخ الہندؒ کی آزادی ہند کی سیاسی تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کے فرزند مولانا حامد الانصاری غازی صاحب ہندوستان کے مشہور صحافی ہیں۔

مولانا عبداللہ انصاری نے [illegible] انبہٹہ میں وفات پائی۔ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں ان کا سال وفات [illegible]ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے انتقال کا صحیح سن معلوم نہیں ہو سکا مگر اتنی بات یقینی ہے کہ [illegible]ھ سے بہت پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ انبہٹہ میں اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی صاحبزادی اکرام النساء انہی سے منسوب تھیں۔

مولانا محمد مراد قدوسی مظفر نگری

۱۲۴۸ھ میں پاک پٹن کے ایک قریبی گاؤں اسب میں پیدا ہوئے، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں چشت میں تھے۔ چار سال کی عمر تھی کہ یتیم ہوگئے۔ اُن کے ماموں اُن کی والدہ کے ساتھ اُن کو اپنے یہاں لے گئے۔ سن شعور کو پہنچے تو ماموں نے تعلیم سے بے توجہی پر سرزنش کی، اس پر کبیدہ خاطر ہو کر بلا اجازت ۱۲۶۰ھ میں لاہور چلے گئے، وہاں اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، لاہور سے دہلی پہنچ کر حافظ غلام رسول ویرانی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر علی گڑھ جاکر حضرت مفتی لطف اللہ علیہ الرحمۃ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے، رام پور میں مولانا ارشاد حسین صاحب سے بھی بعض کتابیں پڑھیں، آخر میں دارالعلوم کی کشش یہاں کھینچ لائی، مولانا مراد دارالعلوم کے ابتدائی طلبا میں سے تھے، یہاں پانچ سال رہ کر علوم کی تکمیل کی، اور ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

انھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی میں اپنی خداداد ذہانت، حصولِ علم میں غیر معمولی محنت و کاوش و علمی استعداد کے لحاظ سے ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی، حضرت نانوتویؒ سے بیعت و خلافت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ نے ۱۲۹۱ھ میں جب مظفر نگر کی جامع مسجد حوض والی میں مدرسے کا افتتاح فرمایا تو اس کا صدر مدرس انہی کو بنایا گیا، چنانچہ آگے چل کر یہ مدرسہ مرادیہ کے نام سے موسوم ہوگیا اور اب تک جاری ہے۔

مولانا محمد مراد صاحب نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس اور مدرسہ مرادیہ کی بقا و ترقی کے لئے وقف کر دی تھی، مظفر نگر ہی کے سادات بارہہ کے خاندان میں اُن کی شادی ہوگئی تھی، مدرسہ مرادیہ میں ۴۰ سال تک اُن کی مسند درس بچھی رہی، ۲۴ رجب ۱۳۳۳ھ کو عین جمعہ کی اذان کے وقت وفات پائی، مظفر نگر میں مسجد شاہ اسلم کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ اُن کے چھوٹے صاحبزادے مولوی محمد رشید فریدی

کے لئے چلے گئے، واپسی کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے ان کو بہاولپور بھیج دیا ۱۲۹۳ھ میں آپ نے دوبارہ حج کا ارادہ فرمایا۔ اس موقع پر حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ سے آپ کو شرف بیعت حاصل تھا حضرت حاجی صاحب کو گنگوہیؒ نے لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہو رہے ہیں آپ ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے جب آپ کی باطنی حالت دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور حضرت سے دستار لے کر آپ کے سر پر رکھ دی اور اسی کے ساتھ اپنی جانب سے تحریری خلافت عطا فرمائی۔ بعد میں اسی اجازت نامہ پر حضرت گنگوہیؒ نے بھی دستخط فرمائے۔

حج سے واپسی کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے ان کو مدرسہ مصباح العلوم بریلی کا صدر مدرس مقرر فرمایا۔ ۱۳۰۷ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر کیا گیا۔ ۱۳۱۴ھ میں یہاں سے بحیثیت صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۵ھ میں آپ کو مظاہر علوم کا ناظم منتخب کیا گیا، اور آخر میں ۱۳۴۴ھ میں بقصد ہجرت مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔

آپ کو اگرچہ تمام علوم متداولہ میں مہارت تامہ حاصل تھی لیکن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا۔ اسی شغف کے سبب سے آپ نے ابوداؤد کی شرح فرمائی جو بذل المجہود کے نام سے پانچ جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ بلاشبہ یہ علم حدیث میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بذل المجہود کا آغاز ۱۳۳۵ھ میں سہارنپور میں ہوا تھا اور ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں اختتام کو پہنچا اور اسی کے ساتھ آپ کی عمر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ اور ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو بعمر ۷۸ سال مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے جوار میں آسودۂ خواب ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اُن ہی کی نسبت کہا گیا ہے

کہ جس نے سب سے پہلے استاد کے سامنے کتاب کھولی وہ محمود حسن، حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ میں بریلی میں ہوئی جہاں ان کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی۔ قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ آپ اس میں داخل ہو گئے۔ نصاب دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔ فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں ۱۲۹۰ھ میں حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی۔[1] زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا۔ اور حضرت نانوتویؒ خاص طور سے شفقت فرماتے تھے۔ چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر دارالعلوم کی مدرسی کے لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ کے اوپر پڑی اور ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا جس سے بتدریج ترقی پا کر ۱۳۰۵ھ میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم و فضل کی طرح باطن بھی آراستہ تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی۔ دارالعلوم میں صدارت تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپیہ تھا مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے۔ بقیہ ۲۵ روپے دارالعلوم کے چندے میں شامل فرما دیتے تھے۔ آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد ۳۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلباء نے حدیث نبویؐ سے فراغت حاصل کی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض تعلیم نے مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا منصور انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخرالدین احمد، مولانا محمد

---

[1] معارف دارالعلوم ستمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۰۔

اعزاز علی امروہی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت تیار کی

بہت سے ذی استعداد اور ذہین و ذکی طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اپنے شکوک و شبہات کے کافی و شافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی اور مطالب سن کر سر نیاز خم کرکے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی میں نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں دیکھا۔

آخر عمر میں جب جنگ طرابلس و بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ایک اسکیم تیار کی، یہ ۱۹۱۲ء کا زمانہ تھا۔ انہوں نے مسلح انقلاب کے ذریعہ سے برطانوی گورنمنٹ کا تختہ الٹ دینے کا نقشہ تیار کیا اس کے لئے انہوں نے نہایت منظم طریقہ پر اپنا پروگرام مرتب کیا۔ تلامذہ کے شاگردوں اور رفقاء کار کی ایک بڑی جماعت جو ہند و بیرون ہند کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، ان کے مجوزہ پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہایت سرگرمی اور جانبازی کے ساتھ کوشاں تھی۔ شاگردوں میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری اور دوسرے بہت سے تلامذہ اس میں شامل تھے، جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ طاقت کے بغیر ہندوستان سے انگریزوں کا نکلنا ممکن نہیں ہے، اس لئے سپاہ اور اسلحہ کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کی فراہمی کے لئے افغانستان اور ترکی کا انتخاب کیا گیا

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے پیرانہ سالی کے باوجود ۱۹۱۵ء میں حجاز کا سفر فرمایا۔ وہاں کے ترکی گورنر غالب پاشا اور انور پاشا سے جو اس وقت ترکی کے وزیر جنگ تھے ملاقات (اور بعض اہم خطوط لے کے) آپ حجاز سے براہ بغداد و بلوچستان ہوتے

ہوئے سرحد کے آزاد قبائل میں پہنچنا چاہتے تھے کہ اچانک جنگِ عظیم کے دوران میں شریف
حسین والیٔ مکہ نے انگریز حکام کے ایما پر آپ کو گرفتار کر کے اُن کے حوالے کر دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ
کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گل، حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کی گرفتاری
بھی عمل میں آئی۔ ان کو پہلے مصر اور پھر وہاں سے مالٹا لے جایا گیا، جو برطانوی قلمرو میں جنگی
مجرموں کے لیے محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔ جنگ کے ختم ہونے پر آپ کو ہندوستان
آنے کی اجازت ملی اور رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو آپ نے ساحلِ بمبئی پر قدم رکھا۔ جزیرہ
مالٹا سے واپسی کے بعد صحت بگڑ چکی تھی اور قویٰ پیرانہ سالی کے باعث نہایت ضعیف ہو گئے
تھے مگر اس پر بھی آپ نے شد و مد کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصہ لیا۔ طبیعت اس بارِ گراں
کی متحمل نہ ہو سکی۔ جب حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی تو بغرضِ علاج ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے
یہاں دہلی لے جایا گیا۔ حکیم اجمل خاں بھی شریکِ علاج تھے۔ مگر وقتِ موعود آ چکا تھا۔ ۱۸ ربیع الاول
۱۳۳۹ھ کی صبح کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ دیوبند لایا گیا اور حضرت نانوتوی
قدس سرہٗ کی قبر مبارک کے قریب یہ گنجینۂ فضل و کمالات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔

*

له حضرت شیخ الہندؒ کے مفصل حالات کے لیے 2 ضمیمہ ملاحظہ ہو۔

مولانا فخرالحسن گنگوہیؒ

وطن گنگوہ تھا، حضرت نانوتویؒ کے شاگردوں میں تین حضرات بہت مشہور ہیں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ اور تیسرے حضرت مولانا فخرالحسن گنگوہیؒ، وہ ۱۲۸۲ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۰ھ میں انھوں نے حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کے ساتھ دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، سفر اور حضر میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ کے ساتھ رہتے تھے، مناظرے سے بڑی دلچسپی تھی، دہلی میں حکیم محمود خاں صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، گفتگو اور تقریر پر شیریں اور دل کش تھی۔

فراغت کے بعد [illegible]ھ میں خورجہ کے مدرسے میں صدر مدرس مقرر ہوئے، پھر دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں چلے گئے، حضرت نانوتویؒ کی بعض تصانیف شائع کرائیں، مباحثہ شاہجہان پور انہی کا مرتب کیا ہوا ہے، اس کا اصل نسخہ دارالعلوم میں موجود ہے، انھوں نے حدیث میں ابوداؤد کا ایک جسوط حاشیہ "التعلیق المحمود" کے نام سے لکھا ہے، یہ حاشیہ مطبع مجیدی کانپور میں چھپا ہے، اور عام طور پر متداول ہے، اس کے علاوہ انھوں نے ابن ماجہ کا بھی حاشیہ لکھا ہے جو مطبع نامی کانپور میں چھپا تھا، ان کا ایک حاشیہ "تلخیص المفتاح" پر بھی ہے، انھوں نے اپنے استاذ حضرت مولانا نانوتویؒ کی ایک مفصل سوانح حیات بھی لکھی تھی جو کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔

حضرت مولانا فخرالحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے گنگوہ کی سکونت ترک کر کے کانپور چلے گئے تھے، اور وہیں مطب اور مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی تھی، کانپور میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں کتابوں کے ساتھ سوانح حیات کا مسودہ بھی جل گیا۔ [illegible]ھ میں کانپور میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہیں، اُن کے حالات تفصیل سے دستیاب نہیں ہیں۔

مولانا صدیق احمد انبہٹوی

حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے چچیرے بھائی تھے۔ انبہٹہ وطن تھا ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے ساتھ دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۵ھ میں یہاں سے فراغت حاصل کی۔ کچھ مدت تک دارالعلوم کی معین مدرسی پر رہے۔ ان کا طرز تعلیم بہت سہل اور آسان تھا چنانچہ ایک ہفتہ میں نحو میر اپنے شاگردوں کو حفظ یاد کرا دیا کرتے تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ خصوصاً صرف و نحو میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی اور مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں مدرس رہے، آخر میں مالیر کوٹلہ میں ریاست کی جانب سے قضا کا عہدہ تفویض ہوا، ان کا شمار مشاہیر علماء میں ہوتا تھا، مالیر کوٹلہ میں زندگی بھر افتاء کے منصب پر فائز رہے۔

حضرت گنگوہیؒ سے سلوک و معرفت کے مقامات طے کئے، حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

"طریق سلوک میں اصل مقصود احسان ہے، سو وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کو حاصل ہے،" اس مکتوب سے آپ کے مقامات کی طرف اشارہ ہوتا ہے، بالآخر حضرت گنگوہیؒ سے اجازت بیعت حاصل ہوئی، صاحب بیعت و ارشاد اور صاحب کشف بزرگوں میں سے تھے، ان کا زہد و تقویٰ مسلم تھا، صاحب نسبت صاحب اسرار و معارف سمجھے جاتے تھے۔ مدت تک مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند کے ممتحن رہے، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد انہی سے تربیت باطنی حاصل کی۔

تاریخ وفات ۲۸ صفر ۱۳۲۲ھ شب جمعہ ہے، مالیر کوٹلہ میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا عبدالقدیر دیوبندیؒ

مولانا عبدالقدیرؒ دیوبند میں پیدا ہوئے دیوبند کے مشہور بزرگ شاہ [illegible] رحمۃ اللہ [illegible] کی اولاد میں سے تھے [illegible]ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ، حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی وغیرہ اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور [illegible]ھ میں فراغت پائی، پھر سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے حدیث پڑھی۔

لکھنؤ میں نول کشور پریس میں تصحیح کے کام پر مامور تھے۔ علم الحیوانات میں علامہ کمال الدین دمیری کی مشہور کتاب حیات الحیوان کا دو جلدوں میں ترجمہ کیا ہے جو مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا ہے، [illegible]ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

مولانا سید احمد حسن امروہیؒ

امروہہ کے مشہور خاندان سادات رضویہ سے تعلق تھا۔ ان کے اجداد میں حضرت شاہ ابن کبیر اپنے دور کے مشائخ میں سے تھے [illegible]ھ میں پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم امروہہ کے بلند پایہ عالم مولانا سید رافت علی، مولانا کریم بخش اور مولانا محمد حسین جعفری سے حاصل کی۔ طب کی کتابیں امروہہ کے مشہور طبیب حکیم امجد علی خان سے پڑھیں۔ بعد ازاں حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث اور دوسرے علوم و فنون کی تکمیل کر کے [illegible]ھ میں فراغت پائی۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا عبدالقیوم بھوپالی سے بھی اجازت حدیث حاصل کی، بعد آخر میں مدینہ منورہ جا کر حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے سند حدیث حاصل کرنے کا شرف پایا۔ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت و خلافت بھی حاصل تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً خورجہ کے مدرسہ میں درس دیا، پھر سنبھل اور دہلی کے
مختلف مدارس میں صدر مدرس رہے۔ جب ۱۲۹۳ھ میں مراد آباد میں حضرت نانوتوی کے ایماء سے
مدرسہ شاہی کا قیام ہوا تو اس کے صدر مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی سے مستعفی
ہو گئے، اور اپنے وطن امروہہ کی جامع مسجد میں ایک بڑے مدرسہ کی تشکیل جدید کی، یہ مدرسہ
پہلے معمولی حیثیت میں تھا، آپ نے اس کو باقاعدہ طور پر قائم کر کے اس میں جملہ علوم و فنون کی
تعلیم جاری کی۔ مولانا امروہی کی شخصیت کی بناء پر بہت جلد دور و نزدیک کے طلبہ سے مدرسہ
معمور ہو گیا۔ انھوں نے جامع مسجد میں مدرسہ کے لئے مزید عمارت تعمیر کرائی جو دارالحدیث، درسگاہ
اور درسگاہیں و طلباء کے لئے حجرے بنا کر اسے سنوار دیا۔ انھوں نے امروہہ کی قدیم دور کی علمی
روایات کو از سر نو تازگی و تابندگی بخشی۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ علم الابدان
کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے طب کی تعلیم حاصل کی جو آگے چل کر ملک
میں طبیب حاذق کی حیثیت سے مشہور ہوئے، چنانچہ مشہور حکیم فرید احمد عباسی انہی کے تلامذہ
میں سے تھے۔

حضرت مولانا امروہی کی تقریر نہایت جامع، شستہ اور پُر مغز ہوتی تھی، جس سے
طلبا کا دامن طلب گلہائے مقصود سے بھر جاتا تھا، تقریر میں وہ اپنے استاذ کا مکمل نمونہ تھے
اور اپنی خصوصی صلاحیتوں کے لحاظ سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک وہ مجسم تصویر تھے، علوم قاسمی کی
ترویج میں عمر بھر مشغول رہے، ان کا علمی فیضان دور دور تک پہنچا اور سیکڑوں طالبانِ علم
ان کے درس سے فاضل ہو کر نکلے۔ صاحب تذکرۃ الکلام نے ان کے طریقۂ تعلیم اور مادۂ درس کا
تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ ان جملہ علوم کی جو درس نظامیہ کے نظام تعلیم میں شامل ہیں تعلیم دیتے، لیکن زیادہ
شغل حدیث و تفسیر و فقہ کی تدریس سے تھا۔ آپ کے تلامذہ سے سنا گیا کہ بیان ایسا واضح
اور پُر شوکت ہوتا کہ دقیق سے دقیق مسائل طلباء کی سمجھ میں بہت سہولت سے آجاتے تھے۔"

اور اس کے ساتھ مضمون کی عظمت بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ہر شخص جس کو کچھ بھی تجربہ ہے یہ جانتا ہے کہ دنیا میں بہت کم علماء ایسے ہوتے ہیں جن کو علمی شعبوں کی ہر شاخ میں پوری قدرت کاملہ حاصل ہو، مثلاً جن حضرات کو وعظ کہنے کا ملکہ ہوتا ہے وہ تدریس پر پورے قادر نہیں ہوتے، اور جو تدریس کے کام میں مشغول ہوتے ہیں اکثر کسی مجمع میں وعظ یا تقریر کرنا مشکل ہوتا ہے، دینیات میں انہماک رکھنے والے اکثر معقول اور فلسفہ سے نا آشنا ہوتے ہیں، اور معقولات کے ماہرین کو علوم دینیہ سے بے خبری ہوتی ہے لیکن قدرت نے اپنی فیاضی سے ہمارے مولانا میں یہ سب اوصاف اعلیٰ طور پر جمع کر دیے تھے، مولانا کی تقریر، تحریر، ذہانت، تبحر، اخلاق اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل دستگاہ ضرب المثل تھی، اور سب سے زیادہ قابل قدر اور ممتاز کمال مولانا کا یہ تھا کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے دقیق اور غامض علوم کو ان ہی کے سے لب و لہجہ اور طرز ادا میں صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔[1]

[illegible] میں مناظرہ نگینہ میں جو مولانا ثناء اللہ امرتسری نے فریق مخالف سے مناظرہ کیا تھا، اس مناظرہ میں مولانا امروہیؒ نے جو تقریر فرمائی نادرۂ عدیم ہے یہ تقریر دعوت الاسلام[2] کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس میں توحید، رسالت، مقصود زندگی، تخییر، صوم اور سیرت صحابہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس تقریر میں حضرت نانوتویؒ کی تقریروں کا پورا پورا رنگ جھلک رہا ہے، تقریر کا یہ اثر تھا کہ مجمع میں بعض مشرکوں نے تقریر سن کر کہا کہ اگر کسی تقریر

۱؎ تذکرۃ الکرام بحوالہ رسالہ العلوم دیوبند جلد دوم شمارہ اول ۱۳۳۰ھ ص ۴۴ ۔

۲؎ مجلہ القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ

مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ

سالِ ولادت ۱۲۷۵ھ ہے، تاریخی نام ظفر الدین ہے۔ والد ماجد کا اسمِ گرامی حضرت مولانا فضل الرحمن تھا۔ ۱۲۸۳ھ کے اواخر میں جب دارالعلوم میں درجۂ قرآن شریف جاری ہوا تو حضرت مفتی صاحب کو درجۂ حفظِ قرآن میں داخل کیا گیا اور ۱۲۸۴ھ میں انہوں نے پورا قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس وقت درجۂ قرآن شریف کے استاد حافظ نامدار خاں صاحب تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں انہوں نے بخاری شریف و مسلم شریف اور شرح عقائد کا امتحان دے کر دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

اس وقت دارالعلوم کے اساتذہ یہ تھے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبدالعلی۔ علم سے فراغت کے بعد ۱۲۹۷ھ کے جلسۂ دستار بندی میں آپ کو سند و دستار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دستِ مبارک سے عطا ہوئی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد کچھ عرصے دارالعلوم میں معین المدرس رہے، اور اسی کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات بھی حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صدر المدرسین کی نگرانی میں انجام دیتے رہے، پھر ان کو میرٹھ بھیجا گیا، جہاں مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ میں کئی سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۳۰۹ھ میں اکابر دارالعلوم نے نائب مہتمم کے عہدے کے لئے ان کا انتخاب کیا، پھر ایک سال کے بعد ان کو مفتی مدرسہ مقرر کیا گیا۔ ۱۳۱۰ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ :-

"مولوی عزیز الرحمن صاحب نے فراغت کے بعد بطور معین المدرس دارالعلوم میں

ؔ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۵ھ ص ۱۳

فتویٰ نویسی علوم شرعیہ میں بڑا مشکل کام ہے۔ اس کام میں حالات کے بدلنے سے
جس قدر نزاکتیں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یوں تو فتاویٰ کی بہت سی جلدیں
میں لکھے گئے ہیں، مگر فتویٰ نویسی کا جو کمال حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا، یوں کہنا چاہئے کہ جماعت
دیوبند میں صرف تین ہی شخصوں کے حصے میں آیا ہے۔ ایک حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور
دوسرے حضرت مفتی صاحبؒ اور تیسرے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ۔ فتویٰ نویسی
میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے کبھی
صرفِ نظر نہیں کرتے تھے، اس پر اُن کی نظر بہت گہری پڑتی تھی۔ اگر کسی مسئلہ کے دو مختلف
مفتیٰ بہ پہلو ہیں تو ایسے موقع پر وہ آسان پہلو کو اختیار کرتے اور اسی پر فتویٰ دیتے تھے۔
ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے تھے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہو۔ اُن
کے فتاویٰ میں جابجا اس کی مثالیں موجود ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ صرف عالم اور مفتی ہی نہ تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحبِ باطن اکابر
میں سے تھے۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی مستقل قائم رہتا تھا، ہزارہا بندگانِ خدا [illegible]
میں آپ کی باطنی تلقین و تربیت سے فیضیاب ہو کر مراد کو پہنچے۔

نقشبندیت کے مشہور معمولات میں ختم خواجگان ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی مسجد میں
(جو دیوبند میں چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور ہے) پابندی کے ساتھ روزانہ صبح کی نماز کے
بعد ہوتا تھا، اسی کے ساتھ جذبۂ خدمتِ خلق بدرجۂ کمال تھا۔ محلے کی بے سہارا، بیوہ اور ضعیف
عورتوں کا سودا سلف بے تکلف لا دیا کرتے تھے۔

ان عملی مجاہدات کے ساتھ درس کی علمی باریک بینیاں مستزاد تھیں۔ فتاویٰ کے ساتھ
درس کا شغل مستقل رہتا تھا، خصوصاً حدیث اور تفسیر کے اونچے اسباق آپ کے یہاں ہوتے تھے
بڑی بڑی اہم تحقیقات جو آپ کے ذہن رسا کی پیداوار ہوتی تھیں کسی بھی اپنی طرف منسوب
کرکے دعوے کے انداز میں ان کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ مستقل تصانیف کا موقع کم ملا

جلالین شریف کا درس شروع کیا اور اپنے شاگرد مولانا قاضی بشیر الدین مالک مطبع مجتبائی میرٹھ کی فرمائش پر حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے رسالہ "میزان البلاغہ" کا حاشیہ لکھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ بھی دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تھے۔

۱۳۵۲ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ علالت کے باعث جب دیوبند تشریف لائے تو بخاری شریف کے چند پارے باقی تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت مفتی صاحبؒ وسط ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کا درس شروع کرا دیا اور صرف ڈیڑھ ماہ کی قلیل ترین مدت میں بخاری شریف کے باقی ماندہ چودہ پارے ختم کرا دیئے۔

جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ کے اوائل میں آپ دیوبند تشریف لائے تھے کہ طبیعت علیل ہو گئی، دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہو سکا وقت موعود آ چکا تھا، بالآخر ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۵۲ھ کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۱۰ بجے دن میں حضرت مفتی صاحب کے جنازے کی نماز حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ نے پڑھائی اور ۱۱ بجے آپ دارالعلوم کے قبرستان قاسمی میں سپرد خاک کئے گئے۔

مولانا حکیم محمد حسن دیوبندیؒ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے چھوٹے بھائی تھے، شروع سے آخر تک دارالعلوم دیوبند میں پڑھا۔ ۱۲۹۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، بعد ازاں دہلی میں حکیم عبد المجید خاں صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

۱۳۰۷ھ میں دارالعلوم میں مدرس عربی و طبیب کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور تعلیم و مطب کا کام تفویض ہوا، طلبائے دارالعلوم کو طب کی تعلیم کے ساتھ طلباء کے علاج و

اُن کی بیعت و ارشاد کا سلسلہ بہت وسیع ہے برصغیر اور اس کے باہر بھی بزرگوں اشخاص
نے ان سے اصلاح و تربیت حاصل کی چنانچہ حکیم الامت کے لقب سے آپ کی زبردست
شہرت تھی، اُن کی تصانیف دو ہزار سے زائد ہیں، لاکھوں افراد کو علمی و عملی فیض پہنچا۔ عوام اور
خواص کا جتنا بڑا طبقہ بیعت و ارشاد کی راہ سے اس دور میں ان سے مستفیض ہوا اس کی
مثال کم ہی ملے گی، اُن کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر پاکستان
کے بڑے بڑے صاحب علم و فضل علماء اُن کی حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ اُن کی ذات
والا صفات علم و حکمت، معرفت و طریقت کا ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے نصف صدی
تک برصغیر کے مسلمان سیراب ہوتے رہے۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اُن کی
عظیم خدمات نظر نہ آئیں۔ اور تبلیغی خدمت میں شایانِ شان ہیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے
الفاظ ہیں:-

"اصلاحِ امت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشے پر ان کی نظر تھی، بچوں
سے لیکر بوڑھوں تک، عورتوں سے لیکر مردوں تک، جاہلوں سے لیکر عالموں تک، عامیوں
سے لے کر صوفیوں تک، درویشوں اور دنیاداروں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک اُن کی
نظر معروف اصلاح و تربیت رہی، پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور دوسری تقریبوں اور
اجتماعوں تک کے ایک ایک پہلو پر اُن کی نظر پڑی، اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا
کھوٹا الگ کیا، رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراطِ مستقیم کی
داغ بیل ڈالی۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، اخلاق و عبادات اور عقائد میں دین خالص
کے سب رستے جہاں تک ان کی نظر گئی اُس کی اصلاح کی، امت کے نئے مسائل اور مسلمانوں
کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیا کر دیا، اور خصوصیت کے ساتھ
احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے، تجدید فرمائی۔ ان کے سامنے دین کی صحیح
تشکیل تھی، اسی کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ زندگی کی تصویر جہاں جہاں ناقص تھی

اُن کے دوست کہے میں عمر بھر مشغول رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اسی میں صرف کر دی کہ
مسلمانوں کی تصویرِ حیات کو اُس منصوبے کے مطابق بنا دیں جو دینِ حق کے مُرقع میں قرآنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو استغنا کے ساتھ فیاضی کے جوہر سے بھی نوازا تھا۔ ان کے قیام
کانپور کا ایک واقعہ راقم سطور نے والد مرحوم سے سنا ہے، جو حضرت تھانویؒ کے بے تکلف دوستوں
میں سے تھے، چونکہ اس واقعے کا عام طور پر لوگوں کو علم نہیں ہے، اس لئے اس کا ذکر کر دینا
ضروری معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کانپور میں حضرت تھانویؒ کو جامع العلوم سے
پچیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی، مگر اس میں سے وہ پانچ روپے ہر مہینے والد مرحوم کو دیا
کرتے تھے تاکہ وہ اپنے طور پر اس رقم کو طلباء پر صرف کر دیں۔ اس رقم کے ساتھ یہ تاکید
بھی تھی کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو کہ یہ کس کا عطیہ ہے، یہ ایک راز دارانہ بات تھی، حضرت
تھانویؒ کی زندگی میں والد مرحوم کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ انھوں نے یہ واقعہ حضرت
تھانویؒ کی وفات کے بعد اُن کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے راقم سطور کو سنایا تھا۔

حضرت حکیم الامتؒ کی زندگی بڑی منظم تھی، کاموں کے اوقات مقرر تھے اور
ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا تھا، متوسلین کے بہت سے خطوط آتے تھے مگر بلا تاخیر
ہر ایک کا جواب خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے۔

۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب میں تھانہ بھون میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا، تھانہ بھون
میں حافظ ضامن شہیدؒ کے مزار کے قریب انہی کے باغ میں جسے انھوں نے خانقاہ امدادیہ
کے نام سے وقف کر دیا تھا دفن کیا گیا۔

مولانا عبدالمومن دیوبندیؒ

دیوبند کے ممتاز علمی خاندان شیوخ عثمانی کے رکن تھے، اور حضرت شیخ الہند

۱؎ جامع المجددین ص ۲۶ و ۲۸

مولانا محمود حسنؒ کے ہم درس تھے۔ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۵ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوبؒ سے دورۂ حدیث پڑھا۔ ۱۲۹۹ھ کے چوتھے جلسے دستار بندی میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی۔

اہل میرٹھ کی خواہش پر آپ وہاں تشریف لے گئے اور تمام عمر وہیں درس و افتاء کی خدمات انجام دیں۔ پہلے مدرسہ قومیہ کے صدر مدرس ہوئے پھر مدرسہ دارالعلوم میرٹھ میں صدر مدرس رہے۔

بڑے ذہین و ذکی اور وسیع النظر عالم تھے۔ آخر عمر تک حدیث و فقہ و تفسیر کی کتابیں نوک زبان پر تھیں۔ اپنے شیخ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے انداز پر مختصر جامع و دل نشین تقریر فرماتے تھے، صاحب نسبت بھی تھے، زندگی کا انداز متوکلانہ تھا۔ میرٹھ میں ان سے بڑا علمی فیض جاری ہوا، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مترجم قرآن کریم نے ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں۔ حضرت مولانا عزیز گل مرحوم بھی اور حضرت مولانا سراج احمد میرٹھی بھی ان کے شاگرد رہے۔ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، دارالعلوم دیوبند کے درجات حدیث کے ممتحن ہوتے تھے۔

[illegible]ھ میں دہلی میں جہاں بغرض علاج مقیم تھے وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ میں مدفون ہوئے۔

مولانا حکیم جمیل الدینؒ

نگینہ ضلع بجنور وطن تھا۔ دارالعلوم میں ۱۲۹۰ھ و ۱۲۹۵ھ میں تحصیل علوم کی، دہلی کے مشہور اطباء میں سے تھے۔ طبیہ کالج دہلی کے ممتحن تھے۔ ایک عرصے تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن رہے۔ مطب کے مشغلے کے ساتھ ادبی ذوق شعر کے بڑے پختہ کار

تھا جب حضرت حاجی محمد عابدؒ اہتمام سے مستعفی ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے، مگر ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ کر سکے۔ مدرسے کے تغیرات کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا تو ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں حضرت گنگوہیؒ نے اہتمام کے لئے حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا۔ حافظ صاحب نہایت منتظم اور صاحب اثر و وجاہت تھے، وہ بہت جلد دارالعلوم کے نظام پر قابو یافتہ ہو گئے، اور تقرر کے وقت آپ سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں وہ بہ اتم اُن کے اہل ثابت ہوئے۔ حضرت شیخ الہندؒ جو صدر مدرس تھے خود استاذ ہونے کے باوجود حافظ صاحبؒ کے استاد زادہ ہونے کی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ادب کے ساتھ ہمیشہ اُن کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔

آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے نہایت عظیم الشان ترقی کی جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ ہو سکی تھی، ہر چند دارالعلوم معنوی حیثیت سے "دارالعلوم" بن چکا تھا، مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسہ سے دارالعلوم بنا، شعبہ جات اور دفاتر کی تشکیل عمل میں آئی، مشاہرہ میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا، غرض کہ ہر حیثیت سے دارالعلوم کا قدم روز افزوں ترقی کی جانب گامزن رہا، چنانچہ آپ کا پینتیس سالہ دور اہتمام دارالعلوم کی تاریخ میں ترقیوں کا خوب صورت تابناک اور زریں دور سمجھا جاتا ہے۔

دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت جو اپنی نوعیت کی ہندوستان بھر میں اکیلی عمارت ہے آپ ہی کے عہد میں تیار ہوئی، جدید دارالاقامہ موسوم بہ دار جدید کا آغاز اور مسجد و کتب خانہ کی تعمیر بھی حافظ صاحبؒ ہی کے زمانے کی یادگار ہیں۔ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء کے اس عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کی یاد اب تک لوگوں کے قلوب میں تازہ ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد فضلاء کی دستار بندی ہوئی تھی، وہ آپ ہی کے زیر انتظام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔
برطانوی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا تھا، مگر

کے زبردست ادیب تھے۔ آپ کا تدبر و استقلال دارالعلوم کی تاریخ میں ضرب المثل سمجھا جاتا ہے۔ دارالعلوم کی ترقی میں اُن کی صداقت، اخلاص اور صلاحیت کو بڑا دخل حاصل ہے۔

۱۳۲۵ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب [illegible] کی معروفیتوں اور [illegible] کے باعث دارالعلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور مستقل شخص کی مجلس شوریٰ کو ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حافظ صاحب کا ہاتھ بٹا سکے۔ اس کے لئے مجلس کے نزدیک آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔ چنانچہ انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر کے نیابت اہتمام کا منصب سپرد کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ جیسا کام کرنے والا جیسا مستقل مزاج اور منتظم ہاتھ آگیا۔ اہتمام کے کاموں میں انکو اس قدر شغف تھا کہ شب و روز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا حتیٰ کہ ان کی سکونت بھی دارالعلوم کے دارالاہتمام ہی میں تھی، اور اسی میں وفات بھی ہوئی۔ انھوں نے دارالعلوم کے شعبۂ انتظام و معاملات کو اتنا منظم اور مستحکم کر دیا تھا کہ جب حکومت آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیوبند آئے تو اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور ذرہ ذرہ آمدنی کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو۔ حافظ صاحب کے عہد [illegible] اہتمام کی ترقی بلحاظ تعداد و تنظیم درحقیقت آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے۔ آپ چونکہ اُن کے دستِ راست، معتمد علیہ اور نائب رہے۔

۱۳۴۴ھ میں جب حافظ صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باعث حیدرآباد کے مفتی اعظم کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو اُن کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی۔ عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اتنا ہی شغف ہوتا جیسا کہ دارالعلوم کے

ساتھ تھی تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے۔

مطالعے کی کثرت نے آپ کو نہایت وسیع المعلومات بنا دیا تھا حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔

"اگر مجھ پہ کسی کے علم کا رشک آتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔"

ویسے ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا، دوسرے علوم میں ان کی وسیع النظری مسلّمہ تھی۔ متعدد تصانیف علمی یادگار ہیں۔ ان کی تصانیف میں، اشاعتِ اسلام المعروف بہ "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا؟" بڑی معرکہ آرا کتاب سمجھی جاتی ہے۔ "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" اس سوال کے جواب میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ان تدریجی واقعات کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی قدرتی کشش کے اعتبار سے اسلام کی اشاعت اور ترقی کا باعث ہوئے۔

آپ نہایت نحیف البدن تھے، خوراک حیرت انگیز طور پر کم تھی، مگر ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت کے مالک تھے۔ حضرت مولانا صاحبؒ کے انتقال کے ٹھیک چودہ ماہ بعد ۴ رجب ۱۳۴۸ھ کی شب میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا ماتم چھوڑ گئے۔

ان کی ایک اور کتاب تعلیماتِ اسلام کے نام سے ہے جس میں اسلام کے طرزِ حکومت کو بیان کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ شوریٰ امیر جماعت کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اس ضمن میں آپ نے بتلایا ہے کہ امیر کی ذات پر اگر کلی اعتماد ہو تو کثرت یا قلت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر امیر کو یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

حکیم عبدالوہاب معروف بہ حکیم نابینا

مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور میں قصبہ یوسف پور وطن تھا۔ ہندوستان کے

مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی تھے۔ بچپن ہی سے بینائی جاتی رہی تھی۔ دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ ابتدائی صرف و نحو کی تعلیم وطن میں پائی۔ [illegible]ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ ادب عربی مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی سے پڑھا۔ دہلی میں طب حکیم محمود خاں سے پڑھی۔ معقول اور منقول کے ممتاز علماء سے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ اور مرشد کی صحبت میں رہ کر باطنی کمال حاصل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ:

"ایک مرتبہ میں نے حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ گو میں نے ذریعۂ معاش کے لئے طب پڑھ لی ہے، لیکن اطباء نبض کے علاوہ مریض کا چہرہ، قارورہ اور دیگر مشاہدات کی مدد سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور میں بوجہ عدم بصارت اس سے محروم ہوں، آپ دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری اس مشکل کو آسان فرما دے۔ اس پر حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائے گا، جس سے تم مریض کے مزاج پر مطلع ہو جاؤ گے، جنکو دیگر اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں۔"

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ میں شیخ کی اس کرامت کا روز مشاہدہ کرتا ہوں اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھکو مریض اور مرض کی تمام کیفیتیں منکشف ہو جاتی ہیں۔

اُن کی نبض شناسی کے عجیب و غریب واقعات سننے میں آئے ہیں۔ تشخیص مرض اور تجویز دونوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ علم النبض پر اُن کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف "اسرار شریانیہ" کے نام سے ہے جس میں نبض کے موضوع پر بڑی حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان بھر میں اُن کے مطب کی شہرت تھی، دُور دُور سے لوگ اُن کے مطب میں آتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے۔ بمبئی اور شولاپور میں مطب کیا۔ ایک مدت نظام دکن کے معالج خصوصی رہے۔ آخر میں دہلی میں مقیم ہو گئے

تھے جامع مسجد کے قریب اُن کا مطب تھا ۔ جو بعد میں کتابت جس میں مشغول ہو گئے تھے ۔ دائم
معلوم کو بھی اُن کا مطب ۔ طبیعت کا مذاق ہوتا ہے عقل اور مرض کی تشخیص میں اپنا جواب
نہیں رکھتے تھے ۔ اس سلسلے میں اُن کے عجیب و غریب قصے مشہور ہیں ان کے سامنے دوا
کا ایک بڑا صندوقچہ کھلا رہتا تھا ۔ حسب ضرورت سب سے جاتے تھے ۔ جب تک کل گردش سے دو
نکال لیتے تھے ۔ اُن کا ہاتھ کسی دوا کے ڈبے پر پڑتا جس کی ضرورت ہوتی ۔ اسی وجہ سے
خود ہی شیشیوں کے سہارے بیٹھے تھے ۔

مطب میں مریضوں کے بے پناہ ہجوم کے باوجود وہ علوم سے برابر شغف رہا ۔ نہایت
عبادت گزار اور پرہیزگار تھے دیوبند، گنگوہ اور یوسف پور کے کسی مریض سے خواہ امیر ہو
ہو یا مفلس، مطلقاً دوا کی قیمت نہیں لیتے تھے ۔ یوسف پور وطن تھا ۔ دیوبند میں
تعلیم پائی تھی اور گنگوہ میں تربیت باطنی حاصل کی تھی ۔ اسی طرح سہارنپور سے بھی قیمت
نہیں لیتے تھے ۔ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ میں دہلی میں وفات پائی ۔ وصیت کے مطابق ان کا جنازہ
دہلی سے گنگوہ لے جایا گیا اور حضرت گنگوہی کے مزار کے قریب اُن کو دفن کیا گیا ۔

مولانا غلام رسول ہزاروی

ضلع ہزارہ (پاکستان) کے رہنے والے تھے ۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی ۱۳۱۵ھ میں
دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ۱۳۲۰ھ میں اُن کو دارالعلوم میں مدرس مقرر کیا گیا ۔ علوم نقلیہ
و عقلیہ کے حافظ اور جامع علوم تھے ۔ طبقہ مدارس میں ان کی بڑی عزت سے تھی ۔ طلباء بڑے شوق
سے اُن کے درس میں داخل ہوتے تھے ۔ اُن کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت کے باعث
مختلف مقامات سے اُن کو گراں قدر مشاہرہ پر طلب کیا گیا مگر دارالعلوم سے اتنا تعلق
تھا کہ اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے ۔ زندگی نہایت سادہ تھی ۔ تیس سال
تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں ۔ ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے نامور علما

تفویض کی گئی۔ تبلیغ کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ حضرت مولانا شیخ الہند صاحب سے شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ آخر عمر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی طرف رجوع کیا اور مجازِ بیعت ہوئے

یکم رمضان [illegible] کو دارالعلوم سے مستعفی ہو کر وطن مالوف چاند پور میں قیام فرمایا اور وہیں ۲ ذی الحجہ [illegible] مطابق دسمبر [illegible] کو رحلت پائی

مولانا محمد یٰسین سرہندی ثم بریلوی

بستی متصل سرہند کے رہنے والے تھے۔ مولانا احمد حسن کانپوری سے پڑھا۔ پھر دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں تھے۔ پہلے مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس رہے۔ پھر [illegible] میں بریلی چلے گئے۔ وہاں مدرسہ اشاعت العلوم قائم کیا۔ نہایت نیک نفس اور منکسر مزاج مگر بے حد صاحبِ عزم تھے۔ ساری عمر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ روہیل کھنڈ میں ان کا علمی فیض مدتوں تک جاری رہا۔ اور آج بھی ان کا جاری کیا ہوا مدرسہ تشنگانِ علوم کو سیراب کر رہا ہے۔

ان کے بڑے صاحبزادہ مولانا عبدالرشید مرحوم کا بیان ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا ابتدائی کتب میں ان کے شاگرد تھے۔ اور مولانا کو بڑے مؤدبانہ آمیز لہجہ میں خطوط لکھا کرتے تھے جو مولانا عبدالرشید مرحوم کے پاس محفوظ تھے۔ مولانا خیر محمد جالندھری بھی ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے

۲ صفر [illegible] میں وفات پائی اور بریلی ہی میں جس کو انہوں نے وطن بنا لیا تھا، مدرسہ ہی میں مدفون ہوئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ سیالکوٹ (پنجاب) کے ضلع سیالکوٹ میں ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے
اُن کے والد ہندو سے سکھ ہو گئے تھے۔ مولانا سندھیؒ نے ابتدائی تعلیم جام پور کے مڈل
اسکول میں پائی، دورانِ تعلیم ہی میں اپنے مطالعہ سے حقانیتِ اسلام سے متاثر ہو کر مشرف
باسلام ہو گئے تھے، قبولِ اسلام کے بعد جام پور سے سندھ چلے گئے، وہاں حافظ محمد صدیقؒ
کی خدمت میں کچھ مدت قیام کیا، حافظ صاحب ایک بڑے صاحبِ نسبت بزرگ اور
درویش کامل تھے، مولانا سندھیؒ نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے کہ "حافظ صاحبؒ کی
صحبت کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی معاشرت میری طبیعت ثانیہ بن گئی"۔ مولانا سندھیؒ ۱۸۸۸ء
میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۰ء میں دورۂ حدیث میں شریک ہوئے، مگر تکمیل
کی نوبت نہیں آئی، کچھ عرصہ کے بعد سندھ چلے گئے، ۱۹۰۹ء میں پھر دیوبند تشریف لائے اور
یہاں استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے کتبِ حدیث کی اجازت حاصل کی، تعلیمی امور کے ساتھ سیاسی مشاغل
میں بھی حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ ہو گئے، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم میں جمعیۃ الانصار کا قیام
اُنہیں کی کوشش کا نتیجہ تھا، مولانا سندھیؒ اس کے ناظم بنائے گئے، جمعیۃ الانصار کے دو بڑے
جلسے مرادآباد اور میرٹھ میں منعقد ہوئے تھے، مولانا سندھیؒ ہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھے،
آپ دارالعلوم کو سیاسی اندازے کی تنظیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے جس کا پہلا نقش جمعیۃ الانصار
کا قیام تھا، اسی دوران میں مولانا سندھیؒ صدر دارالعلوم کے مسلک، ساتھ کے مابین بعض علمی
مسائل میں شدید اختلاف رونما ہو گیا، جس کے سبب سے انہیں دیوبند چھوڑنا پڑا، حضرت
شیخ الہندؒ نے ان کو دہلی بھیج دیا، وہاں انہوں نے نظارۃ المعارف القرآنیہ[1] کے نام سے ایک

---

[1] نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے یہ ادارہ مولانا سندھیؒ نے [illegible] (ملاحظہ ہو [illegible])

ادارہ قائم کیا جس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور نواب وقار الملک جیسی متعدد شخصیتیں شامل تھیں۔

۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سندھی کو افغانستان بھیجا۔ اُس وقت یہ خیال عام تھا کہ طاقت کے بغیر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینا ممکن نہیں جس کے لئے سپاہ اور اسلحہ کی ضرورت ہے۔ اس تحریک کا مرکز حضرت شیخ الہندؒ نے یاغستان کے آزاد علاقے کو بنایا تھا۔ مولانا سندھی نے کابل پہنچ کر متعدد اہم سیاسی کام انجام دیئے۔ کابل میں کانگریس کمیٹی قائم کر کے انڈین نیشنل کانگریس سے اُس کا الحاق کیا۔ یہ ملک کی حدود سے باہر پہلی کانگریس کمیٹی تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے "جنود اللہ" کے نام سے ایک فوج مرتب کی۔ [illegible] راجہ مہندر پرتاپ کی سربراہی میں جو آزاد حکومت قائم کی گئی تھی اس کے ایک اہم رکن رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں گرفتاری کے بعد روس چلے گئے اور وہاں رہ کر سوشلزم کا مشاہدہ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ترکی کا سفر کیا اور وہاں سے ۱۹۲۶ء میں حجاز چلے گئے جہاں چودہ سال کے قریب مقیم رہے۔ ۱۹۳۹ء میں جب صوبوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۱۹۱۳ء میں مسجد فتح پوری دہلی کے ایک کمرے میں قائم کیا تھا جس میں مدارس عربیہ کے فضلا اور گریجویٹ طلبہ کو تعلیم و تربیت دی جاتی تھی تاکہ ان کو قرآن مجید کے حقائق و معارف سے روشناس کرانے کے علاوہ حالات وقت کے مطابق تبلیغی اور سیاسی کاموں کی انجام دہی کے طریقے بھی سکھائے جاتے تھے۔ مولانا سندھی کے افغانستان چلے جانے کے بعد دو سال تک مولانا احمد علی لاہوری جو ان کے شاگرد رشید تھے، نظارۃ المعارف القرآنیہ کے منتظم رہے۔ انکی گرفتاری کے بعد یہ ادارہ ختم ہو گیا۔ اس ادارہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات اور علماء کرام خصوصاً فضلاء دیوبند کے درمیان دوری کو مٹایا جائے اور جدید و قدیم کی درمیانی خلیج کو پُر کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے پھر بعد میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیت الحکمت قائم کیا تھا۔

کانگریس کی حکومت قائم ہوئی تو یو۔ پی کی حکومت نے مولانا سندھی سے برطانوی دور کی پابندی کو اٹھا لیا اور وہ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آ گئے

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ریاست بہاولپور کے قصبہ دین پور میں انھوں نے زندگی کے آخری لمحات بسر کئے۔ مولانا سندھیؒ عہد حاضر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کے سب سے بڑے داعی اور علم بردار تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں شاہ صاحبؒ نے جو تجدید فرمائی ہے، مولانا سندھی اُس کے ایک عظیم شارح تھے، ہر چند ان کے بعض افکار سے اہل علم کو اختلاف بھی رہا مگر اختلاف رکھنے کے باوجود اُن کی علمی فضیلت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل تھے

"حکمت ولی اللہی" کی روشنی میں کتاب و سنت کی تشریح اور عہد حاضر کے مسائل کا حل نکالنے کے لئے ہی انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیت الحکمہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور بعض معرکۃ الآراء مضامین بھی لکھے۔ جن میں الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کا مضمون بڑا عمیق اور فکر انگیز ہے۔

۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو دین پور میں جہاں مولانا سندھی آخر عمر میں مقیم ہو گئے تھے انتقال فرمایا، افسوس ہے کہ وہ ملک کی آزادی کے لئے انتیس ۲۹ سال ہندوستان سے باہر وطن رہ کر مصائب و آلام کی زندگی گزارنے والے ہیں اس ملک کو اپنی زندگی میں آزاد نہ دیکھ سکے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری

آپ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، گو جائے امرتسر (پنجاب) آپ کا وطن تھے۔ مگر اصل کے اعتبار سے کشمیری ہیں، ان کے آباؤ اجداد قدیم زمانے میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

پھر دو دن مولانا احمد اللہ امرتسری سے تعلیم حاصل کی، حدیث کی کتابیں شیخ عبدالمنان وزیرآبادی سے پڑھیں۔ پھر ۱۳۰۸ھ میں دیوبند پہنچ کر منطق، حکمت، اصول اور فقہ کی تعلیم حاصل کی کانپور میں مولانا احمد حسن کانپوری سے پھر کتابیں پڑھیں۔ مگر ان کا دیوبند سے وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ فراغت کے بعد امرتسر میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث تھے۔ ایک "مطبع اہل حدیث" بھی اسی کے نام سے قائم کیا۔ ۱۳۲۱ھ میں ایک ہفت روزہ اخبار "اہل حدیث" کے نام سے جاری کیا جو چالیس سال تک نکلتا رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے رد میں آپ کی بہت سی بیش قدر کتابیں ہیں۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں۔

(۱) تفسیر القرآن بکلام الرحمن — عربی، انھوں نے قرآن کی تفسیر قرآن سے کی ہے

(۲) تفسیر ثنائی اردو۔

(۳) تقابل ثلاثہ اردو میں ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام، وید اور انجیل کا تقابلی موازنہ کیا ہے۔

آپ قوی الحافظہ اور سریع الجواب تھے مناظرہ میں ہمیشہ کامیاب رہے فریق مخالف کو شکست دینے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ شیر پنجاب کے لقب سے ملقب تھے۔
تصنیف و تالیف سے بڑھ کر تھا صحت کے تحفظ اور کپڑوں کی ستھرائی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ اوقات کے پابند، بلند اخلاق اور وسیع المعلومات تھے

ہندوستان کی تحریک آزادی کی جد و جہد میں ہمیشہ شریک رہے جمعیۃ خلافت کی فہرست میں انھیں ممبر جنرل لکھا ہے جمعیۃ العلماء کی تاسیس میں بھی آپ کا حصہ ہے ملک کی آزادی کی تحریک میں جمعیۃ العلماء ہند کے رفیق کار رہے۔ اختلاف مسلک کے باوجود اکابر دیوبند کے ہمیشہ گرویدہ رہے۔

انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو ۱۹۰۷ء میں یہ چیلنج دیا تھا کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہوگا وہ پہلے مر جائے گا۔ جسے مرزا صاحب نے منظور کر لیا تھا، چنانچہ مرزا غلام احمد ہیضہ میں مبتلا ہو کر ۱۹۰۸ء ہی میں انتقال کر گیا۔ مولانا اس کے بعد ۴۰ سال تک بقید حیات رہے تقسیم ہند کے بعد آپ امرتسر سے گوجرانوالہ (پاکستان) منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۳۶۷ھ میں ۲۹ جمادی الاولیٰ کو سرگودھا میں وفات ہوئی۔ ۸۰ برس کی عمر پائی۔

مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ

ان کے آباؤ اجداد قندھار سے آکر پشاور کے مضافات میں آباد ہو گئے تھے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے علوم ریاضی کی تکمیل کی۔ حدیث کی تکمیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر کی۔ مدت تک ٹونک میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ اور ان کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ بڑے عالی ہمت ذہین و ذکی اور متبحر عالم تھے۔ ہندوستان میں ان کے بہت سے شاگرد تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد فرمانے پر ہجرت کر کے یاغستان کے آزاد علاقے میں چلے گئے۔ وہاں کے لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعے سے ہندوستان کی آزادی کے لئے تیار کرتے رہے۔ مقرر بہت اچھے تھے، ان کے وعظ و تقریر سے یاغستان کے لوگوں میں غیر معمولی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں ان کا عہدہ میجر جنرل کا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں جب ۱۹۱۵ء میں حاجی ترنگ زئیؒ نے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو مولانا سیف الرحمٰن

۱؎ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں حاجی ترنگ زئی صوبہ سرحد کی ایک زبردست اور مشہور شخصیت تھے۔ ضلع پشاور کے ایک گاؤں ترنگ زئی کے رہنے والے تھے (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

نیز شکر ہے کہ بھیڑیوں میں باہم جنگ شروع ہو گئی جس سے مظلوم قوموں کے بچ جانے کی امید ہو گئی ہے۔ اور مجھے اب اپنے مرنے کا غم نہیں ہے۔"

امیر امان اللہ خاں کے عہد حکومت میں افغانستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پشاور واپس آگئے۔ جمادی الاولیٰ [illegible] کو اپنے آبائی وطن میں وفات پائی۔

مولانا حکیم محمد اسحٰق کٹھوریؒ

کٹھور ضلع میرٹھ کے خاندانی سادات سے تھے۔ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں اپنے چچا مولانا محمد [illegible] سے حاصل کی۔ پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں پڑھ، بعد ازاں امروہہ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر [illegible] میں علوم سے فراغت حاصل کی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دورِ صدارت تدریس کے اولین تلامذہ میں سے تھے۔ طب کی تعلیم حکیم عبدالمجید خاں صاحب دہلوی اور حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی سے حاصل کی۔

شروع میں کچھ مدت کٹھور میں اُن کا مطب رہا، پھر میرٹھ شہر میں منتقل ہو گئے۔ مطب کے ساتھ طب کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا، بہت سے لوگوں نے اُن سے طب پڑھی۔ طب کے موضوع پر متعدد رسائل لکھے ہیں، ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے جو طبع نہیں ہو سکی۔

اپنے وطن کٹھور میں عیدگاہ اور جامع مسجد تعمیر کرائی۔ میرٹھ شہر میں بھی ایک نہایت خوشنما سنگین مسجد انہوں نے بنوائی ہے۔ میرٹھ کے اطراف میں متعدد عیدگاہوں کو رواج دینے میں حکیم صاحب کی جدوجہد کا بڑا حصہ ہے۔ ملی اور سیاسی کاموں میں بھی شریک رہتے تھے۔

[illegible] میں جب دارالعلوم کے لئے دیہات سے مال فراہم کرنے کی تجویز ہوئی تو

سب سے پہلے حکیم صاحب نے اس پر لبیک کہا اور کٹھور اور اس کے اطراف سے دارالعلوم کے لئے غلہ فراہم کرنے پر توجہ دی اور غلہ کی خاصی مقدار ان کی جدوجہد سے فراہم ہو گئی۔ روداد دارالعلوم میں لکھا ہے کہ:

"سب سے پہلے اس آواز پر کان دھرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے حضرات کٹھور اور اس کے نواح کے ہیں جو توجہ خاص جناب حکیم مولوی محمد اسحٰق صاحب اس پر عمل پیرا ہوئے، سالہا سال حکیم صاحب کی توجہ سے ضلع میرٹھ سے گیہوں فراہم ہوتا رہا۔"[1]

روداد میں حکیم صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ: "اوصاف حمیدہ کے حامل تھے، خلوص کے ساتھ دارالعلوم کے معاملات میں فکر و تدبر اور بہی خواہی کا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔"[2]

صاحب نسبت اور پابند اوقات بزرگ تھے، حضرت گنگوہیؒ سے خلافت حاصل تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بڑی بے تکلفی تھی، جب دونوں ملتے تو مولانا مدنیؒ ان کی جیب سے بٹوہ کھینچتے، دیر تک چھینا جھپٹی ہوتی رہتی، آخر مولانا کامیاب ہوتے اور بٹوہ سے کر جو رقم نکلتی، اس کی مٹھائی منگاتے، بڑے خوش اخلاق، خندہ جبیں، اور جامع شخصیت تھے، جمعیۃ العلماء ہند سے بھی گہرا تعلق تھا۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۶۵ھ تک ممبر رہے، ۲۱ [illegible] ۱۹۵۱ء میں وفات پائی، وطن مالوف میں دفن کیا گیا۔

مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

شاہ صاحب کشمیر کے رہنے والے تھے، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء کو سادات کے ایک معزز علمی خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی، یہ خاندان اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کشمیر میں

---

[1] روداد تحصیل ۱۳۲۲ھ ص۔ [2] روداد ۱۳۷۰ھ ص ۱

حافظہ و ذہانت سمجھا جاتا تھا۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد محترمؒ اور مولانا سید معظم
شاہؒ سے قرآن مجید شروع کیا۔ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوت حافظہ ابتدا ہی
سے موجود تھی، چنانچہ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی
کتابیں ختم کر کے علوم متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہو گئے اور ابھی بمشکل ۱۴ سال کی عمر تھی کہ
حصول علم کے جذبہ بے پایاں نے ترک وطن پر آمادہ کر دیا۔ تقریباً تین سال ہزارہ کے مدارس
میں رہ کر مختلف علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی، مگر دیوبند کی شہرت نے مزید تکمیل کے لئے
بے چین بنا دیا۔ چنانچہ ۱۳۱۰ھ میں دیوبند تشریف لائے۔ حضرت شیخ الہندؒ مسند صدارت
پر متمکن تھے، استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا،
تفسیر و حدیث کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت و مقبولیت
کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کر لی۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم[1] سے فارغ ہو کر آپ حضرت
گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے
اور خلافت حاصل کی۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں کچھ دنوں فرائض
تدریس انجام دیئے۔ ۱۳۲۰ھ میں کشمیر چلے گئے، وہاں اپنے علاقے میں فیض عام کے نام
سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۳۲۳ھ میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، کچھ مدت
تک حجاز میں قیام رہا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں
آپ دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو یہاں روک لیا۔ کئی سال تک بغیر
مشاہرے کے کتب حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور جب تک
دارالعلوم سے تنخواہ نہیں لی حضرت حافظ محمد احمد صاحبؒ کے مہمان رہے۔ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء کے

---

[1] روداد بابتہ سنہ ۱۳۱۴ھ۔

دوران میں حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فرض شاہ صاحبؒ کو سونپا۔
دارالعلوم کی مسند صدارت پر تقریباً ۱۲ سال تک جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء کے اوائل میں
اہتمام دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ مع جماعت صدارت سے دست کش ہو کر
جنوبی ہند کے مدرسہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء تک وہاں درس حدیث
کا سلسلہ جاری رہا۔

قدرت کی جانب سے حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی
کتاب کے مضامین و مطالب سب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے بار بار حافظہ
دوران تقریر میں بے تکلف حوالے پر حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ مطالعہ
کا اس قدر شوق تھا کہ بعض علوم کے ذخیرے اُن کے دامن جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگی علم
کو سیراب نہ کر سکتے تھے۔ کثرت مطالعہ اور قوت حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک و متکلم
کتب خانہ تھے۔ صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی کثرت سے کتابیں تقریباً نوک زبان تھیں۔ تحقیق
طلب مسائل جن کی مستند تحقیق میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ مسائل کے استفسار پر چشم
زدن میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو
تشنگی باقی رہتی تھی اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت۔ پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے
ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلا دیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایک علم و فن پر اس
طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو یہ تمام علوم مستحضر ہیں۔ وہ ابھی ابھی
ان کا مطالعہ کیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحبؒ کی وفات پر معارف میں لکھا تھا:
"اُن کی مثال اُس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں
کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور
کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم

مولانا محمد صادق کراچوی

کراچی کے باشندے تھے۔ دارالعلوم سے ۱۳۲۱ھ میں حدیث کی تکمیل کی۔ حضرت
شیخ الہند کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی ؎ سے ان کے بہت
گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جب انگریزوں نے عراق پر
حملہ کیا جو ترکی کے قلمرو میں شامل تھا تو انہوں نے سندھ میں نقل جا کے بلوچی قبائل
میں بغاوت کرادی، جس کی وجہ سے انگریز عراق میں بروقت کمک نہ بھیج سکے اور وہاں
انگریزی فوجوں کو محصور ہو کر ترکوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ مولانا محمد صادق
کو بغاوت برپا کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے صوبہ سرحد میں نظر بند کر دیا گیا، جنگ ختم
ہو جانے پر رہا کئے گئے۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں ان کا عہدہ کرنل کا تھا۔

تحریک خلافت کے زمانے میں اہم سیاسی خدمات انجام دیں، خلافت کمیٹی اور
جمعیۃ العلماء سندھ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی
کے آخر تک رکن رہے۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۲ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن
رہے۔

مولانا محمد صادق نے کراچی کے کھڈہ محلہ میں مدرسہ قائم کیا، اور بقیہ عمر اسی کے نظم و

؎ مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا منصور انصاری نے قیام افغانستان کے زمانے میں ہندوستان
کی آزادی کے لئے عارضی حکومت کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس کی فوج کا نام جنود ربانیہ تھا، جس لشکر کا صدر مقام
مدینہ منورہ تجویز کیا گیا تھا۔ اس لشکر خدائے ہند کے عہدوں کے لئے بہت سے افراد نامزد
کر دیئے گئے تھے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ان سب کے نام اور عہدے بیان کئے
گئے ہیں

العوام اور درس حدیث و قرآن میں بسر کیا۔ یہ مدرسہ آج بھی مرجع فیض بنا ہوا ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب جب بھی پاکستان تشریف لاتے ہیں تو مولانا لاہوری اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ حضور عالی کو اسی مدرسے میں دعوت دیتے ہیں

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

۱۲۹۲ھ میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور ابتدائی تعلیم وطن میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔ پھر کچھ کتابیں مدرسہ اعزازیہ شاہجہاں پور میں پڑھیں بعد ازاں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہو گئے۔ وہاں مولانا عبدالعلی میرٹھی تلمیذ حضرت نانوتویؒ اور دیگر اساتذہ سے پڑھا۔ آخر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

حضرت مفتی صاحب نے مراد آباد اور دارالعلوم میں فراغت کے باوجود طالب علمی کا زمانہ نہایت خودداری سے گزارا۔ وہ کروشیا سے ٹوپیاں بُن کر اس کی آمدنی سے اپنے تمام اخراجات پورے کرتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے فتویٰ نویسی کا آغاز کیا اور قادیانیت کی تردید کیلئے ۱۳۲۱ھ میں ایک ماہنامہ البرہان جاری کیا۔

۱۳۲۱ھ کے اواخر میں آپ مولانا امین الدین صاحب کے اصرار پر مدرسہ امینیہ دہلی کی مسند صدارت تدریس پر متمکن ہو گئے، جس سے تادم زیست وابستہ رہے۔ مفتی صاحب ایک محدث، فقیہ، مفتی، مجاہد اور محترم شیخ علماء میں سے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کو اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ اس لئے شروع ہی سے آپ سیاسیات میں دلچسپی لینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں آپ نے دوسرے علماء کے ساتھ مل کر جمعیۃ العلماء ہند قائم کی

جس کے ایک طویل مدت تک آپ صدر رہے۔ اور جمعیۃ علماء اور کانگریس کی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں آپ کو قید و بند سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر جیل میں بھی آپ کے علمی مشاغل جاری رہتے تھے چنانچہ ملتان جیل میں مولانا احمد سعید دہلوی نے آپ سے دیوانِ حماسہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اور ہندوستان کے مشہور لیڈر رنگا ایشر بندھو نے آپ سے عربی پڑھی۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ حج کیا اور دوسری بار مصر کے اجتماعات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے۔ حضرت مفتی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسہ امینیہ دہلی ہے، جس کو آپ کی انتھک جدوجہد سے غیر معمولی ترقی دی اور ہندوستان کے مشہور دینی مدارس میں اس کا شمار ہونے لگا۔

مفتی صاحب کے فتاویٰ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے فتاویٰ مختصر ہوتے ہیں، اور ان کی زبان صاف اور واضح ہوتی ہے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ کے فرزند مولانا حفیظ الرحمن واصف آپ کے فتاویٰ کو کفایت المفتی کے نام سے مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ اب تک چھ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ تصانیف میں تعلیم الاسلام آپ کی مشہور تصنیف ہے جو انہوں نے اسلامی مدارس کے بچوں کے لئے نہایت سلیس اردو زبان میں بطور سوال و جواب چار حصوں میں لکھی ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے کہ انگریزی اور ہندی میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے [illegible]۔ سنا ہے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ جب میں افریقہ گیا تو دیکھا کہ وہاں کے مدارس میں تعلیم الاسلام نصاب تعلیم میں شامل ہے۔

حضرت مفتی صاحب ۱۳۳۸ھ سے ۱۳۶۸ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ آخر میں ملک کے تشویشناک حالات نے آپ کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ صاحبِ فراش ہو کر طویل علالت کے بعد ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو دہلی میں راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے حضرت مفتی صاحب کی وفات پر
ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

"حضرت مفتی صاحب اپنے علم و فضل تقویٰ و طہارت اور صدق و کمالات کے لحاظ سے طبقۂ علماء کی ایک بے نظیر شخصیت تھے آپ دارالعلوم کے ایک ممتاز فاضل اور اس کی مجلس شوریٰ کے ایک قدیم اور موقر رکن تھے۔ ان کی وفات ملت اسلامیہ اور علمائے کرام کے حلقوں کا ایک ایسا خلا ہے جو بظاہر اسباب جلد بھرنے والا نہیں ہے، وہ وقت کے اُن چیدہ اور منتخب روزگار علماء میں سے تھے جو بیک وقت عالم باعمل، فقیہ و محدث ادیب و شاعر ناظم و ماہر، محقق و نقاد غیور و مجاہد، اور اسی کے ساتھ ذکاوت و ذہانت میں بے مثل تھے۔ ان کی شخصیت نہ صرف معاصرین میں بلکہ اساتذہ و اکابرین میں قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھی، سب ہی اُن کے علم و فضل، اعتدال مزاج اور دیانت و امانت کے قائل تھے۔"

مولانا ماجد علی جون پوری

جون پور کے رہنے والے تھے سنہ ۱۳۰۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی، شروع میں چند سال علی گڑھ اور گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں مدرس رہے۔ کچھ مدت تک دہلی کے مدارس میں درس دیا، آخر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ مشرقی ہندوستان کے مشاہیر علم و فضل میں سے تھے۔ اور اپنے دور کے زبردست معقولی عالم سمجھے جاتے تھے۔ معقولات کی تحصیل مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری سے کی تھی۔ حضرت گنگوہیؒ کے درس حدیث میں دو سال تک شریک رہے۔ قیام گنگوہ کے زمانے میں بات بات پر حضرت گنگوہیؒ کی تقریر قلم بند کرتے۔ بعض وقت تو یہاں تک استغراق ہوتا کہ خبر نہ ہوتی اذان ہو جاتی۔

حضرت مولانا عبد الغنی پھولپوری جو حضرت تھانوی کے خلفاء میں سے تھے۔ اور حضرت مولانا سید حسین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مدنی کا وطن موضع الہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے۔ ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو ضلع اناؤ کے ایک قصبہ بانگرمئو میں جہاں آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے پیدا ہوئے۔ ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان آیا تھا۔ اپنے علم و تقویٰ کے لحاظ سے سادات کا یہ خاندان ہمیشہ ایک خاص عظمت رکھتا ہے۔ شاہی زمانے میں ایک بڑی جاگیر کا مالک رہا ہے۔

ابتدائی تعلیم پرائمری سکول میں حاصل کرنے کے بعد بعمر ۱۳ سال ۱۳۰۹ھ آپ دیوبند تشریف لائے۔ ابتدائی درجہ میں داخل ہوئے۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت و عنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی۔ سات سال یہاں کے علمی ماحول میں گزارنے کے بعد جب وطن مالوف تشریف لے گئے تو والد ماجد شوق ہجرت میں مدینۃ الرسول کے لئے رخت سفر باندھ چکے تھے۔ آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ روانگی ہونے سے قبل آپ حضرت گنگوہی سے بیعت ہو چکے تھے۔ مکہ مکرمہ میں پیر و مرشد کی ہدایت کے بموجب کچھ عرصہ تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ سے کسب فیض کیا۔ بعد ازاں مدینہ منورہ میں والد ماجد کے ساتھ مقیم ہوگئے۔ ہرچند آپ نے ہندوستان سے ہجرت کا قصد نہیں فرمایا تھا تاہم والد صاحب کی حیات تک ان کی خوشنودی کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنا پسند نہیں فرمایا۔

قیام مدینہ کے زمانے میں تقریباً ۱۸ سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث کی خدمت

تنگی اور عسرت کے باوجود توکلاً علی اللہ کام جاری رہا۔ عموماً روزانہ ۱۲ ۔ ۱۴ گھنٹے تک مسلسل درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مختلف جماعتیں یکے بعد دیگرے حاضر ہو کر آپ کے فیضانِ علمی سے سیراب ہوتی تھیں۔ مسجد نبوی میں آپ کا درسِ حدیث وہاں کے تمام شیوخ حدیث سے زیادہ دلچسپ، مفید اور مقبول تھا اور اس کی شہرت نے مختلف اسلامی ممالک کے طالبانِ علم کی ایک بڑی تعداد کو آپ کے گرد جمع کر دیا تھا۔ حجاز کی مقدس سرزمین اور خاص مسجد نبوی میں ایک ہندوستانی عالم کی جانب سے اس قدر کشش اور قبولِ عام کا باعث آپ کے طریقۂ درس کی اس خصوصیت کو سمجھنا چاہیے جو آپ کو دارالعلوم کے اساتذۂ حدیث میں ملی تھی۔

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے ان رفقاء میں شامل تھے جن کو حجاز میں گرفتار کیا گیا تھا، چنانچہ ساڑھے تین سال تک آپ کو بھی مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑا۔ [illegible] میں جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو آپ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے۔ مالٹا سے واپسی کا زمانہ تحریکِ خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ آپ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں ملک کی سیاست میں شریک ہو گئے۔ اس زمانے میں آپ کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ قربانیوں نے مسلمانوں کے دلوں کو آپ کی عظمت و محبت سے لبریز کر دیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر متفقہ طور سے آپ کو ان کا جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ سیاسی کاموں میں شرکت و انہماک کے باعث آپ کو متعدد مرتبہ کئی کئی سال تک جیل میں بھی رہنا پڑا، اور ملک کی آزادی کے لئے قید و بند کی ہوشربا صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ عرصۂ دراز تک جمعیۃ العلماء ہند کے صدر رہے۔

۱۳۴۶ھ میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تو آپ کے سوا [illegible] دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو اس کے شایانِ شان پُر کر سکے۔ اس لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ ہی پر پڑی، تب سے زمانۂ صدارت

تھے۔ ۱۳۱۲ھ میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ مدینہ منورہ چلے گئے، وہاں ساری عمر علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ آنحضرت نے ۱۳۴۰ھ میں مسجد نبوی کے متصل مدرسۃ الشرعیہ قائم کیا۔ اس وقت مدینہ منورہ میں دینی تعلیم کا کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ مدرسے کے اخراجات ایک عرصے تک برصغیر کے دینی خیر مسلمانوں کی امداد و تعاون سے پورے ہوتے رہے ہیں ایک وقت سے یہ مدرسہ ایک آزاد و مختصر مدرسہ کی طرح علمی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔

حضرت مولانا سید احمدؒ کو حضرت شیخ الہندؒ سے خلافت حاصل تھی۔ انھوں نے ۱۸ شعبان ۱۳۵۸ھ میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

مولانا کریم بخش سنبھلیؒ

متوسطات تک کتابیں اپنے وطن سنبھل میں پڑھ کر مرادآباد چلے گئے۔ وہاں حضرت مولانا احمد حسنؒ سے بعض اسباق پڑھے، بعد ازاں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر

۱؎ ۱۳۹۲ھ میں سفر حجاز کے دوران خود راقم سطور کو مدرسۃ الشرعیہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ کسی زمانے میں حجاز کے بڑے دینی مدارس میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ اب اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ۱۳۹۲ھ میں اس کے مختلف درجات میں ... کے قریب طلبہ زیر تعلیم تھے۔ مدرسۃ الشرعیہ کی جائے وقوع عظیم الشان عمارت مسجد نبوی کے قریب باب مجیدی پر واقع ہے۔ حضرت مولانا سید احمدؒ کے بھتیجے سید حبیب صاحب آج کل مدرسۃ الشرعیہ کے نگران ہیں۔

مگر اکابر دیوبند اور اسلاف کرام کا علمی فیضان مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ اور مدینہ منورہ میں مدرسۃ الشرعیہ کے ذریعے سے تشنگان علوم نبوت کو سیراب کر رہا ہے۔ اس زمانے میں یہ ایک ایسی عظیم سعادت ہے جو پورے عالم اسلام میں ہر فرد و جماعت کے حصے میں آسکتی ہے۔

[illegible] میں حضرت شیخ الہند سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

جید الاستعداد عالم تھے، مختلف مدرسوں میں مدرس رہے، ان کے زمانۂ تدریس میں حضرت مولانا سید فخر الدین، حضرت نے بھی ان سے پڑھا تھا۔ مدرسہ مصباح العلوم کا پنجرہ تک صدر مدرس رہے۔ پھر مدرسہ دار العلوم مئو اعظم گڈھ کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ اس زمانے میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا مفتی عبد اللطیف اعظمی، اور مولانا محمد منظور نعمانی نے حدیث کی کچھ کتابیں ان سے پڑھی ہیں۔ [illegible] میں وفات پائی۔

مولانا عبد المجید سنبھلی

ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل میں مولانا مفتی عبد السلام اسرائیلی سے حاصل کی۔ حدیث کی تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور [illegible] میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ابتدائی دور میں وہاں مدرس رہے، اس زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی ان سے کچھ کتابیں پڑھیں، پھر سنبھل کے مدرسہ شریعہ میں صدر مدرس ہو گئے، اور آخر عمر تک اسی سے وابستہ رہے۔ مولانا عبد المجید سے حدیث اور معقولات کی کتابیں پڑھنے کے لئے طلباء بخارا جیسے دور دراز مقامات سے آتے تھے۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے معقولات کی تکمیل ان ہی سے کی ہے۔ سن وفات معلوم نہ ہو سکا۔

مولانا عبد السمیع دیوبندی

[illegible] میں دیوبند میں پیدا ہوئے، چہل قدمی محمد تاریخی نام ہے، شروع سے آخر تک دار العلوم میں تعلیم پائی اور [illegible] میں تکمیل علوم سے فراغت حاصل کی۔

فتح گڈھ ضلع فرخ آباد میں کئی سال تک مدرس رہے، پھر مدرسہ اسلامیہ رڑکی

ضلع سہارنپور اور مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۲۲ھ کے اواخر میں دارالعلوم کی ابتدائی درجات کی تعلیم کے لئے ان کا تقرر کیا۔ انہوں نے ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث کی موقوف علیہ کتابوں تک ۳۰ سال دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیں۔ آپ کے مشکوٰۃ المصابیح اور مختصر المعانی کے سبق بڑی شہرت رکھتے تھے۔ طلبہ ان کے درس اور انداز بیان کو بہت پسند کرتے تھے۔ دارالعلوم کے ایک نامور استاذ اور یگانۂ روزگار عالم اور طلباء پر بے حد شفیق تھے۔

ان کا وعظ بھی بہت مؤثر اور پسندیدہ ہوتا تھا۔ مناظرہ کے فن میں بھی ان کو درک تھا۔ تقریر کی طرح تحریر پر بھی ان کو قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ بستان المحدثین کا فوائد جامعہ کے نام سے اُردو میں نہایت سلیس اور شگفتہ میں ترجمہ کیا ہے، دوسرا ایڈیشن ۱۳۲۲ھ میں مطبع قاسمی دیوبند میں چھپا ہے۔

۱۱ صفر ۱۳۴۳ھ کو دیوبند میں وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا عبدالاحد صاحب دارالعلوم میں طبقۂ علیا کے مدرسین میں سے ہیں۔

مولانا عبدالعزیز گوجرانوالویؒ

پنجاب کے مشہور عالم اور محدث ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۶ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ علم حدیث میں نبراس الساری علیٰ اطراف البخاری آپ کی مشہور تالیف ہے۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ آپ کے علم و فضل کے مداح تھے اور ان کی تصنیف نبراس الساری کو بہت پسند فرماتے تھے۔ جامع مسجد گوجرانوالہ میں خطیب تھے۔ پنجاب کے علمی اور دینی حلقوں میں اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔ افسوس ان کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔

مولانا محمد یحییٰ سہسرامیؒ

۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ابتداءً مدرسہ مصباح العلوم مظاہر علوم سہارنپور میں کچھ مدت تک مدرس رہے، پھر ۱۳۲۲ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں عربی زبان کے استاذ مقرر ہوئے۔ مشہور عالم اور ذی استعداد فاضل تھے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے قیام سے اُن کا علمی فیضان بنگال میں بہت زیادہ پھیلا۔

مولانا عبدالرزاق پشاوریؒ

۱۳۱۳ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ افغانستان میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے۔ افغانستان میں اُن کا خاص وقار تھا، وہاں کی پریوی کونسل کے صدر بھی تھے۔ شرعی احکام میں اُن کا فیصلہ آخری درجہ رکھتا تھا۔ اور پورے افغانستان پر اُن کے علمی اثرات چھائے ہوئے تھے۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ان کی نسبت لکھا ہے:-

"کابل یونیورسٹی کا سربراہ ہے جس میں وہ دینیات پر لیکچر دیتا ہے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ سردار نصر اللہ خاں کا لیکچرار ہے۔ کابل میں ہندوستانی انقلابی پارٹی کا پشت پناہ ہے۔ سرحد پار جو کچھ بھی برطانوی حکومت کے خلاف کارروائیاں ہوتی ہیں اُن سب کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے[1]۔"

[1] تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب ص ۳۰۹ —

مولانا محمد سہولؒ بھاگلپوری

پورینی ضلع بھاگلپور (بہار) وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بھاگلپور میں مولانا اشرف عالم کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ وہاں سے کانپور پہنچے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت حق نوازؒ اور مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی سے تعلیم حاصل کی۔ اور مدرسہ فیض عام میں رہ کر مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے تحصیل علم کی۔ کانپور سے طلب علم کا شوق انہیں حیدرآباد لے گیا۔ جہاں کا سفر پیدل دو ماہ میں پورا کیا۔ حیدرآباد کے دوران قیام میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب اور اصول فقہ کی تحصیل کی۔ حیدرآباد سے دہلی پہنچکر مولانا نذیر حسین صاحب کے درس میں شریک ہوئے آخر میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث کی تکمیل کی۔ بعد فراغت دارالعلوم میں سات آٹھ سال تک مدرس رہے۔ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے۔ ۱۳۳۸ھ میں پٹنہ کے مدرسہ عالیہ شمس الہدیٰ میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ غرض کہ ۴۶ برس تک یوپی، بہار بنگال اور آسام کے بڑے بڑے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۳۴۸ھ سے ۱۳۶۶ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ ۲ رجب ۱۳۶۷ھ کو وصال ہوا۔ مزار پورینی میں ہے۔

دراز قد اور وجیہ تھے۔ جب دیوبند آتے اور اپنے استاذ شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تو حضرت شیخ الہندؒ معانقہ فرماتے چونکہ حضرت پستہ قد تھے اس لئے مزاحاً فرماتے کہ بھائی مولوی سہول آ گئے معانقہ کے لئے سیڑھی لگانی پڑے گی۔ بے حد رقیق القلب تھے۔ اسلاف کرام، صحابہ عظام کا ذکر آتا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور بات کرنا مشکل ہو جاتا تھا

مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی

۱۲۹۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں ان کا خاندان تقدس و بزرگی میں
مسلّم اور ممتاز رہا ہے۔ والد بزرگوار شاہ محمد حسن (وفات ۱۳۰۰ھ) سے قرآن شریف اور
فارسی میں گلستاں تک پڑھ کر دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۳۰۹ھ میں فارسی کی تکمیل
کے بعد عربی شروع کی اور ۱۳۲۰ھ تک دارالعلوم میں ان کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۲۰ھ کے اواخر میں حضرت شیخ الہندؒ نے جونپور
کی اٹالہ مسجد کے مدرسے کی صدر مدرسی کے لئے ان کا انتخاب کیا، جہاں سات سال تک
تشنگان علوم دینیہ اور عام باشندگان جونپور کو اپنے علوم ظاہری و باطنی سے سرفراز فرماتے
رہے۔ ۱۳۲۸ھ میں جب ارباب دارالعلوم نے دیوبند سے ایک ماہنامہ رسالہ "القاسم"
جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ کو جونپور سے بلا کر القاسم کے کام پر مامور کیا گیا۔ اس کے
ساتھ مختلف کتابوں کے اسباق بھی ان کے سپرد کئے گئے۔ ان کے درس میں عموماً تفسیر و حدیث
کی کتابیں رہتی تھیں۔ ۱۳۳۰ھ کی روداد میں ان کی نسبت لکھا ہے۔

"مولوی صاحب کو علوم دینیہ حدیث، تفسیر، فقہ، فرائض وغیرہ میں خاص مہارت اور لیاقت
و استعداد حاصل ہے۔ آپ صاحب تصانیف بھی ہیں، اردو میں ایک مستقل کتاب علم
میراث شائع و مقبول ہو چکی ہے۔ دارالعلوم کی جانب سے آپ کو دورۂ حدیث کی ایک جماعت
و تفسیر و فقہ کی کتاب مثل ہدایہ، جلالین وغیرہ سبق رہتی ہیں۔ آپ علاوہ صاحب درس و
تقویٰ کے عالم باعمل اور سلف کا نمونہ دنیا کے لئے ہیں۔"

علم و عمل کی جامعیت کے ساتھ حضرت میاں صاحب کو تعویذات کے فن میں مہارت
تامہ حاصل تھی، مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی ان کے تعویذات سے
فیض حاصل کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی مرجعیت خلق کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ علم و فضل

زہد و تقویٰ، نیکی اور پرہیزگاری نے اُن کی ذات کو مرجعِ خلائق بنا دیا تھا۔

حضرت میاں صاحبؒ کو اپنے بزرگ ماموں حضرت میاں جی منے شاہ صاحبؒ، اور شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اجازت و خلافت حاصل تھی، غرضیکہ اپنے زمانے کے بڑے باعمل بزرگ تھے۔

حضرت میاں صاحبؒ نے دیوبند میں دار المسافرین کے نام سے ایک مسافر خانہ کی تعمیر کرائی اور اپنے خاندانی مکتب کو جو ان کے والد ماجد کی وفات کے بعد بند ہو گیا تھا دوبارہ جاری کیا۔ اُردو زبان میں فقہ و تفسیر اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ۵۰ کتابیں آپ کی تصنیف و تالیف ہیں۔

۱۳۶۴ھ کے اوائل میں اپنے متوسلین کی دعوت پر گجرات تشریف لے گئے، راندیر میں قیام تھا کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو گئی اور ۲۲ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ بروز دوشنبہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، وہیں دفن ہوئے۔

مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے اور مولانا عبداللہ انصاریؒ کے (تنہا) لڑکے تھے، انبیٹھہ وطن تھا، ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں پائی جہاں اُن کے والد صدر مدرس تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں دار العلوم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، دار العلوم معینیہ اجمیر میں کچھ وقت صدر مدرس رہے، حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمۂ قرآن کے کام میں اعانت کے لئے اُن کو دیوبند بلا لیا تھا۔ ۱۳۲۷ھ میں جب دار العلوم میں جمعیۃ الانصار قائم ہوئی تھی تو مولانا سندھیؒ کے ساتھ اس کے ناظم مقرر ہوئے، نہایت صاحب الرائے اور ذکی و مستعد عالم تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے آخری سفرِ حج میں جو ۱۳۳۳ھ میں ہوا تھا اُن کے ساتھ رہے، مدینہ منورہ سے گورنر غالب پاشا

سے حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے کے واسطے جو ریشمی خط
ہندوستان سے باہر آزاد قبائل کے عوام کے لئے لکھوایا تھا اور جو ہندوستان کی سیاسی
تاریخ میں غالب نامے کے نام سے مشہور ہے، اُس کو حجاز سے ہندوستان اور آزاد قبائل
تک پہنچانے کا جو اہم کام آپ ہی کے سپرد ہوا تھا جسے آپ نے کمال ہوشیاری کے
ساتھ انجام دیا اور ہندوستان کی خفیہ پولیس کی نظروں سے بچ کر یاغستان کے آزاد
علاقے میں پہنچ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں گرفتاری کے وقت چونکہ مولانا منصور
انصاریؒ وہاں سے یاغستان روانہ ہو چکے تھے اس لئے وہ گرفتاری سے بچ گئے۔ اُن کا
اصل نام محمد میاں تھا جب غالب نامہ لے کر ہندوستان آئے تو برطانوی پولیس سے
آپ کو بچانے کے لئے منصور انصاری نام رکھ دیا تھا، پھر آپ آخر تک اسی نام سے مشہور رہے
ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ریشمی خطوط کے نام سے جو خطوط مشہور ہیں اُن میں مولانا
منصور انصاری کا خط بھی شامل تھا، جو زرد ریشمی کپڑے پر لکھا گیا تھا جنود ربانیہ میں اُن کا عہدہ
لفٹیننٹ جنرل کا تھا۔

جو زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد افغانستان چلے گئے اور وہیں مستقل
طور پر مقیم ہو گئے تھے، حکومت افغانستان پر اُن کے علم و فضل اور سیاست و تدبر کا
بڑا اثر تھا۔ چنانچہ حکومت افغانستان نے ایک سفارتی مشن ترکی بھیجا تھا اس میں مولانا
منصور انصاریؒ کو دوسرے درجہ کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا، اسی طرح روس کے سیاسی مشن
میں اُن کو سیاسی مشیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ بچہ سقہ نے بر سر اقتدار آنے کے بعد اُن کو افغانستان
سے جلا وطن کر دیا تھا، اس کے دور حکومت میں چند ماہ کے لئے روس چلے گئے۔ اور جب
نادر خان بچہ سقہ کو شکست دے کر افغانستان کے حکمران بنے تو مولانا منصور انصاریؒ
کو واپس بلا لیا گیا

قیام افغانستان کے زمانے میں آپ نے متعدد سیاسی کتابیں تصنیف فرمائیں

حکومت الٰہی، سیاسی انقلاب، دستور ریاست اور الوزاع الدّول اُن کی اعلیٰ ذہنی اور فکری
صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ صحافت ان میں مختلف علمی عہدوں پر فائز رہے۔ آخر عمر میں
صحافت سے الگ ہوکر مشہور مقام عبداللہ پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۱۹ صفر ۱۳۶۳ھ مطابق
۱۹ جنوری ۱۹۴۴ء کو وفات پائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ
مولانا منصور انصاری کو ہندوستان واپس بلالیں گے مگر افسوس کہ ہندوستان کی
آزادی سے ایک سال قبل وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اور جس ملک کی آزادی کے لئے
انھوں نے ۴۰ سال جلاوطنی کی زندگی گزاری اس کی آزادی کو نہ دیکھ سکے۔

مولانا حامد الانصاری غازی سابق ایڈیٹر مدینہ بجنور، جو ہندوستان کی
صحافت میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، وہ بھی مولانا منصور انصاری کے بڑے
صاحبزادے ہیں۔ ان کے دوسرے فرزند حمید انصاری جلال آباد میں مقیم ہیں۔

مولانا اعزاز علی صاحب امروہیؒ

دارالعلوم دیوبند کے نہایت ممتاز علماء میں سے تھے۔ ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت
کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ پورنی ضلع بھاگلپور (بہار) کے لئے منتخب
فرمایا جہاں آپ تقریباً سات سال اس علاقے میں درس دیتے رہے۔ پھر آپ شاہجہانپور
تشریف لائے اور ایک مدرسہ افضل المدارس کے نام سے قائم کیا۔ جس میں ۱۳۴۰ھ تک
جماعت رہے۔ یہاں تقریباً تین سال آپ نے بہت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔ ۱۳۴۳ھ
میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ہوا، اور چھ سال میں آپ کو عربی کی
ابتدائی کتابیں نفحۃ العرب اور نور الایضاح وغیرہ پڑھانے کے علاوہ کتابیں بھی وقت کی دعا
میں حضرت شیخ الادب کی نسبت لکھا ہے۔

فائدہ پہنچایا اور آج تک آپ کے شاگرد آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ کی پابندیٔ اوقات ضرب المثل
تھی۔ درس و اوقاتِ درس کی پابندی میں آپ خود ہی اپنی نظیر تھے حتیٰ کہ بعض اساتذہ دارالعلوم
نے درس میں اوقات کی پابندی کا سبق حضرت شیخ الادب ہی سے حاصل کیا۔

بے نفسی اور تواضع میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ
چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں بھی آپ کو عار نہ ہوتا تھا۔ ترمذی و بخاری کا درس بھی
دے رہے ہیں اور بچوں کو میزان الصرف، علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ بھی پڑھا رہے
ہیں۔ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب طالب علم وہ ہوتا تھا جو یک سوئی کے ساتھ
پڑھنے لکھنے میں لگا رہے، اور سب سے زیادہ مبغوض وہ ہوتا تھا جو غیر تعلیمی مشغلوں میں لگ
کر پڑھنے میں تساہل کرے۔

حضرت شیخ الادب کو جس طرح عربی نظم و نثر پر قدرت حاصل تھی، اسی طرح اردو
نظم و نثر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو نثر میں ان کا ایک خاص انداز تھا۔ انھوں
نے عربی ادب میں نفحۃ الیمن کے معیار کے مطابق نفحۃ العرب کے نام سے ایک کتاب مرتب
فرمائی تھی، جس میں تاریخی حکایات، قصص اور اخلاقی مضامین درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب
عربی مدارس میں بہت مقبول ہوئی، چنانچہ دارالعلوم، ندوہ جیسے بہت سے مدارس کے
نصاب میں داخل کی گئی۔ اس کے علاوہ آپ نے فقہ میں نور الایضاح، شرح نقایہ، کنز الدقائق
اور ادب عربی میں دیوان حماسہ اور دیوان متنبی پر مفید حواشی تحریر فرمائے ہیں، جو اساتذہ
اور طلبہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ کے
عربی قصیدہ لامیۃ المعجزات کے اشعار کی اردو میں سلیس شرح فرمائی ہے۔

انتظامی امور میں بھی آپ کو مہارت مسلّم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارۂ اہتمام میں بھی
آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ غرض آپ ایک بے نظیر استاذ اور
متبحر عالم دین اور ایک جامع شخصیت تھے۔ دارالعلوم میں آپ کی علمی خدمات کا دور چالیس

مولانا انور شاہ کشمیری کو اور دوسرے حضرات کو ڈابھیل لے جانے کا کارنامہ انھوں نے ہی انجام دیا تھا۔

مولانا احمد بزرگ اگرچہ سیدھے سادے بزرگ تھے۔ مگر ان میں انتظامی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں ڈابھیل کے معمولی مدرسۂ تعلیم الدین کو جامعہ اسلامیہ میں تبدیل کردینا اُن کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ اُن کے دور میں تمام برصغیر کے مختلف مقامات کے علاوہ افغانستان، بخارا اور یمن و موزنبک کے طلبا جامعۂ ڈابھیل میں جمع ہوگئے تھے۔

بڑی عمر میں قرآن شریف بھی حفظ کرلیا تھا ۱۳۲۹ھ و ۱۳۴۹ھ میں پے درپے دو حج کئے۔

۵ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کو ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا محمد سعید بزرگ آپ ہی کے صاحبزادے اور قائم مقام تھے۔ مدرسہ ڈابھیل کے مہتمم تھے اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن۔

مولانا رسول خان ہزارویؒ

۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں چھتریاں ضلع ہزارہ (پاکستان) کے سواتی پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ضلع ہزارہ کے مدارس میں حاصل کی۔ ۱۳۲۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ منطق و فلسفہ میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی سے خاص طور سے استفادہ کیا۔ ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم سے فراغت کے فوراً بعد مدرسہ اسلامیہ میرٹھ کے صدر مدرس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے جانے کے بعد مدرسہ جامعہ اسلامیہ کی شکل اختیار کرلی۔ مرکزی گجرات میں دینی علوم کا یہ سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ ـــ سید محبوب رضوی

دارالعلوم میں بلا لیا گیا۔ یہاں عرصے تک درجۂ علیا کی مختلف کتابیں پڑھائیں۔ مولانا عثمانیؒ
کے درس صحیح مسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر ان کی خاص نظر تھی۔
ایک عرصے تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم کے
بعض اختلافات کے سبب سے حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن وغیرہ
حضرات کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث
مقرر ہوئے۔ ۱۳۵۴ھ میں حضرت تھانویؒ اور بعض دوسرے اکابر کے ارشاد پر دارالعلوم
میں تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ تک بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے
اس دوران میں جامعہ ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا۔

علم و فضل، فہم و فراست، تدبر اور اصابت رائے کے لحاظ سے علامہ عثمانیؒ کا شمار
ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں ہوتا تھا، وہ زبان و قلم دونوں کے یکساں شہسوار
تھے۔ اُردو کے بلند پایہ ادیب اور بڑی سحر انگیز خطابت کے مالک تھے۔ فصاحت و
بلاغت، عام فہم دلائل، پُر اثر تشبیہات و انداز بیان اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے ان کی تحریر
و تقریر دونوں منفرد تھیں۔ حالات حاضرہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، اس لئے ان کی تحریر
اور تقریر عوام و خواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ عظیم الشان جلسوں
میں ان کی فصیح و بلیغ اور پُر مغز تقریروں کی یاد آج بھی اہل ذوق کے دلوں میں موجود ہے۔ حضرت
شیخ الہندؒ نے اپنی حیات کے آخری دور میں جامعہ ملیہ کی تاسیس کے وقت جو خطبہ لکھا تھا
اس کے لکھنے اور جلسے میں پڑھنے کا شرف مولانا عثمانیؒ ہی کو حاصل ہوا تھا۔

علم الکلام، العقل والنقل، اعجاز القرآن، حجاب شرعی اور الشہاب لرجم الخاطف
وغیرہ ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن مجید پر مولانا
عثمانیؒ کے تفسیری حواشی کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ ان حواشی میں سلف کے نقطۂ نظر

کے دائرے میں محدود رہ کر قرآن کریم کے اسرار و معارف کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ذہن و فکر کے سب کانٹے نکلتے چلے جاتے ہیں اور قلب کو انشراح و اطمینان کی عجیب کیفیت حاصل ہوتی ہے حکومت افغانستان نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا ہے جسے بطور ہدیہ دارالعلوم میں بھی بھیجا ہے علم حدیث میں ان کی گرانقدر عربی تصنیف فتح الملہم جو علامہ نووی کے بعد صحیح مسلم کی پہلی شرح ہے اُن کا یہ ایک ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے جس نے ان کے علم و فضل کو تمام عالم اسلام میں روشناس کرا دیا ہے۔ علامہ زاہد کوثری نیز مصر و شام کے دیگر علماء نے ان کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔

علامہ عثمانی خلافت کمیٹی کے ایک اہم رکن رہے ہیں ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں مجروحین زخمیوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا مولانا عثمانی ۱۹۴۵ء تک جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے صف اوّل کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ آخر میں ان کو متحدہ قومیت اور کانگریس کے ساتھ جمعیۃ کے تعاون کے مسئلے پر جمعیۃ العلماء ہند سے اختلاف پیش آیا اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر منتخب کئے گئے۔ تقسیم ہند سے قبل رمضان ۱۳۶۶ھ میں مولانا عثمانی پاکستان تشریف لے گئے وہاں کراچی میں مقیم ہو گئے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن اور دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ پاکستان میں انھوں نے بہت سی دینی و ملی خدمات انجام دیں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر اُن کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا خصوصاً ان کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی۔ اور ان کی دینی و سیاسی کے ساتھ ساتھ سیاسی کارروائی بھی منظم ہی چلی تھی۔

پاکستان کی سیاسیات میں انھیں جو زبردست اثر و رسوخ حاصل تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی نے مرحوم ہی کی پیش کردہ قرارداد مقاصد متفقہ طور پر منظور کی جس میں یہ یقین دہانی کی گئی تھی کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد کتاب و سنت پر ہوگی

ہو گئی۔ درحقیقت حضرت علامہ عثمانیؒ کی بروقت توجہ ربانی اور جدوجہد کا نتیجہ تھی۔

پاکستان میں جامعہ عباسیہ بہاولپور ایک قدیم دینی تعلیم گاہ ہے۔ اس کا انتظامی اور تعلیمی نظام بہت خراب ہو گیا تھا۔ ریاست بہاولپور کی وزارت تعلیم نے مولانا عثمانیؒ سے درخواست کی کہ وہ بہاولپور تشریف لا کر جامعہ عباسیہ کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے مشورے سے ریاست کو نوازیں۔ چنانچہ آپ بہاولپور تشریف لے گئے۔ وزارت تعلیم سے بھی گفت و شنید ہو رہی تھی کہ اچانک ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ (۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء) کو چند گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ بہاولپور سے کراچی لایا گیا اور قیام گاہ واقع محمد علی روڈ کے قریب آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

۱۳۳۲ھ کی روداد میں مولانا عثمانی کے بارے میں لکھا ہوا ہے:

"مولوی شبیر احمد صاحب ماشاء اللہ ان ذی استعداد اہل علم میں سے ہیں جن کو علوم اکابر کا حامل قرار دیا جائے۔ تمام علوم معقول و منقول میں کامل استعداد رکھتے ہیں۔ تقریر و تحریر میں بے مثل ہیں۔ خصوصاً علم حدیث میں ایسا ملکہ ہے جو معمر اور تجربہ کار مشائخ حدیث کو ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہ نوجوان اپنے علم و صلاحیت اور ہر قسم کی قابلیت سے دارالعلوم کے شاندار اضافات میں ہونے کے ساتھ اپنے سلف کے سچے خلف ثابت ہوں گے۔ مولوی صاحب گذشتہ زمانے میں کہ جب کہ خود تحصیل علم میں مشغول تھے مدرسہ کو درس دینے میں اپنا بہت سا وقت صرف کرتے تھے۔ منتہی طلبہ تمام علوم و فنون میں آپ سے بہت نافع پڑھتے تھے۔ ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ فتح پوری دہلی کے مدرس اول مقرر ہو کر گئے، مگر چونکہ مدرسہ کو یہ امر پسند نہ تھا کہ ایسے لائق شخص کو دارالعلوم سے علیحدہ رکھے اس لئے ۱۳۳۰ھ میں دیوبند بلا لئے گئے۔ دارالعلوم کی خدمت درس اور ہر قسم کی خدمات کو نہایت خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے بیانات اور تقریروں کا ملک میں بہت اثر ہے۔"

سرپرستان مدرسہ نے کم وقت کے اکابر سے جو توقعات قائم کی تھیں ان توقعات کی تکمیل

مذکورہ بالا حالات سے پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

مولانا مظہرالدین شیرکوٹیؒ

شیرکوٹ ضلع بجنور وطن تھا۔ ۱۳۲۲ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ کچھ دنوں تک دارالعلوم میں مدرس رہے۔ پھر جریدۂ مدینہ بجنور کے ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں دہلی سے پہلے سہ روزہ "الامان" اور پھر روزنامہ "وحدت" جاری کیا۔ ملک کے مشہور مقرر اور صحافی تھے انھوں نے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی ہیں جو اس زمانے میں بڑے مقبول تھے۔

تحریک خلافت کے زمانے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ "الامان" اپنے وقت کا ایک معتبر اخبار سمجھا جاتا تھا۔

۱۳۵۸ھ میں دفتر "الامان" میں رات کو قاتلانہ حملہ ہوا اور اسی میں جاں بحق ہو گئے۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ان کی نسبت لکھا ہے "کہ انھوں نے کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے تحت دارالارشاد میں بحیثیت استاد اور "البلاغ" میں بحیثیت مدیر ملازمت قبول کی۔ وہ مولانا محمود حسن کا مرید ہے اور پرجوش قسم کے خفیہ جلسوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔"[1]

مولانا فضل ربی پشاوری

ضلع پشاور کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کرکے اپنے وطن میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ہجرت کرکے یاغستان چلے گئے اور وہاں کے لوگوں کو انگریزی حکومت کے خلاف جنگ آزادی کے لیے تیار کرتے رہے۔ جب حاجی ترنگ زئی نے انگریزوں کے

---

[1] تحریک شیخ الہند ص ۲۴۴۔

خلاف علم جہاد بلند کیا تو یہ بھی اُن کے ساتھ جنگ میں شریک رہے۔ تحریک ختم ہو جانے کے بعد افغانستان چلے گئے وہاں اپنی علمی استعداد کی بنا پر حکومت افغانستان کے محکمہ تعلیمات میں ملازم ہو گئے اور مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ مولانا موصوف جمعیۃ علماء افغانستان کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اُن کی عمر کا بیشتر حصہ علمی اور سیاسی خدمات میں گزرا۔

تحریک شیخ الہند میں لکھا ہے کہ مولانا محمود حسن نے اسے مولوی سیف الرحمٰن کے ہمراہ جہاد کی تبلیغ کے لئے آزاد علاقے میں بھیجا تھا، شملہ کی بہت سی لڑائیوں کے 2. ذمہ دار رہے، جنود ربانیہ کی فہرست میں درج کیا ہے۔[1]

علامہ محمد ابراہیم بلیاوی

تاریخی نام غلام کبریا ہے۔ ۱۳۰۴ھ میں مشرقی یوپی کے شہر بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان پنجاب کے ضلع جھنگ سے جون پور آیا اور پھر کچھ مدت کے بعد بلیا میں آباد ہو گیا۔ جون پور میں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی، اور معقولات کی کتابیں مولانا فاروق احمد چریا کوٹی اور مولانا ہدایت اللہ صاحب (تلمیذ مولانا فضل حق خیر آبادی) سے پڑھیں۔ ریاضیات کی تعلیم کے لئے مولانا عبد الغفار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر اقلیدس اور جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں، اور ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اسی سال میں مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم ہو گئے

---

[1] تحریک شیخ الہند ص ۳۰۹، ۳۱۰

بھی طلباء اُن کے درس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے تھے اور اُن کے علوم
عالیہ سے مستفید ہونے کے مشتاق رہتے تھے۔ درس میں اختصار کے ساتھ بڑی جامعیت کی
شان تھی۔ درس کا انداز نہایت باوقار ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ لطائف و ظرافت
دقیقہ سنجی اور اعلیٰ نظری سے اہم مسائل کو حل کرنے میں خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ قصص
و حکایات کو مسائل پر اس طرح منطبق کر دیتے تھے کہ مسئلے کے تمام پہلو واضح اور منقح ہو جاتے
تھے۔ اُن کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تلامذہ میں فن سے گہری مناسبت پیدا ہو جاتی
تھی اور اُن پر علم و دانش کی راہیں کھل جاتی تھیں۔ وہ اپنے عہد میں عقائد و کلام اور [illegible]
و فلسفہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حدیث میں روایت سے زیادہ درایت سے کام لیتے
تھے۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر اُن کی گہری نظر تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ کے علاوہ
بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

علامہ بلیاویؒ کی تصانیف میں رسالہ مصافحہ اور رسالہ تراویح اُردو میں ہیں، ایک
رسالہ نور الحکمت فارسی میں ہے۔ یہ رسالہ منطق و فلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ سلم العلوم
پر اُن کا عربی میں حاشیہ ضیاء النجوم ہے۔ میبذی اور خیالی پر بھی انھوں نے حاشیے لکھے
تھے جو افسوس ہے کہ ضائع ہو گئے۔ آخر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے
پورے ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

اُن کی صحت عرصے سے خراب ہو گئی تھی، ۲۳ رمضان ۱۳۸۷ھ کی دوپہر کو [illegible] سال
کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ قبرستان قاسمی میں مدفون ہیں۔

مولانا سید فخر الدین احمد

وطن مالوف ہاپوڑ ہے، آپ کے آباء و اجداد میں سید قطب اور سید [illegible] مدنی
دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ [illegible] کے عہد میں ہجرت سے دہلی آئے۔ حضرات آپ

زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے شاہجہاں نے آپ کے بزرگوں کو درس و تدریس کے لئے ہاپوڑ میں ایک مدرسہ تعمیر کرادیا تھا۔ سید عالم کا سلسلۂ نسب ۳۹ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔

۱۳۰۷ھ میں آپ کی ولادت اجمیر میں ہوئی جہاں آپ کے دادا سید عبدالکریم محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا قرآن شریف والدہ ماجدہ سے پڑھا۔ فارسی کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی۔ عمر کے بارھویں سال اپنے خاندانی عالم مولانا خالد سے عربی صرف و نحو شروع کی۔ اسی دوران میں آپ کے والد ماجد کو اپنے آبائی مدرسہ کے احیاء کا خیال پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب کی نذر ہوگیا تھا۔ چند سال اس میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیج دیا گیا۔ وہاں مولانا ماجد علی سے مختلف کتابیں پڑھیں، بعد ازاں اپنے استاد مولانا ماجد علی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ دہلی کے مدارس میں معقولات کی کتابیں پڑھیں ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم دیوبند میں آئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے امتحان داخلہ لیا، امتحان میں امتیازی نمبروں سے سرفراز ہوئے حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق ایک سال کے بجائے دو سال میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے تھے ۱۳۲۸ھ میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد اکابر دارالعلوم نے شوال ۱۳۲۹ھ میں آپ کو مدرسہ شاہی مراد آباد بھیج دیا مراد آباد میں تقریباً ۴۸ سال قیام رہا تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں بہت سے طلباء حدیث نے آپ سے اکتساب فیض کیا ہے۔

مولانا ممدوح چونکہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے خاص

لہ ایضاً الکلام ی جلد اول ص ۱۳

تلامذہ میں سے تھے اس لئے آپ کے درس حدیث میں دونوں جلیل القدر استادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی تھی چنانچہ آپ کا درس بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا تھا، جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد حنفی مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں، بہت پر زور دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کا ذہن پوری طرح مطمئن ہو جاتا تھا اور اس میں کوئی ادنیٰ خلش نہ باقی نہیں رہتا تھا، اثنائے درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف بھی پیش فرماتے رہتے تھے، درس حدیث میں آپ کی تقریر جیسی مبسوط و مفصل ہونے کے علاوہ سہل اور دلنشین بھی ہوتی تھی اس لئے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادہ کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا انداز بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا، جس میں آپ کے جمال ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں اس بناء پر آپ کے درس بخاری کو شہرت تام اور قبول عام حاصل تھا، چنانچہ [illegible]ھ میں پونے تین سو کے قریب طلباء آپ کے درس حدیث میں شریک تھے اور کم و بیش ہر سال یہی تعداد دورۂ حدیث کے طلباء کی رہتی تھی۔

[illegible]ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے دارالعلوم دیوبند کے منصب شیخ الحدیث کے لئے آپ کا انتخاب کیا، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی و ملی سیاست سے بھی آپ کو تعلق تھا، اور اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتوں کو بھی انہیں جھیلنا پڑا، حضرت مولانا مدنیؒ کی جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت کے زمانے میں دو مرتبہ نائب صدر رہے، بعد ازاں جمعیۃ علماء ہند کی مسند صدارت پر فائز ہوئے اور تادم زیست صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

پیدا علم کی تحقیر جتلایا ہے کہ اگر قرآن کریم کی ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اب بھی مسلمان معراج ترقی پر پہنچ سکتے ہیں، خواجہ صاحب اس امر پر زور دیتے کہ قرآن حکیم کے حقائق و معارف پر غور و فکر کی دعوت دیتے تھے، انھیں قرآن مجید کی تفسیر سے خاص شغف تھا، انھوں نے قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی علیحدہ علیحدہ حصوں میں تفسیر لکھی ہے، یہ تفسیر زبان و بیان کے لحاظ سے بہت سہل، آسان اور طرز نگارش سلیس اور شگفتہ ہے۔

۱۹۱۶ء میں انھیں حضرت شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے لاہور میں نظر بند کر دیا گیا جہاں سے ۱۹۲۰ء میں رہائی ملی، جنوبی ایشیا میں ان کا نام کرنل کی فہرست تک شامل ہے۔

خواجہ صاحب مدت تک جامعہ ملیہ دہلی میں تفسیر کے استاذ اور شعبہ دینیات کے ناظم رہے، وہ آخر میں پاکستان چلے گئے تھے، وہاں علماء کا ایک بورڈ بنا کر درس قرآن کے نام سے قرآن مجید کی متعدد جلدوں میں تفسیر لکھی ہے، یہ تفسیر بھی بہت سہل اور آسان ہے، اس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے، سیرت نبوی پر ان کی ایک کتاب "جمال رسول" کے نام سے معروف ہے، جو بچوں کے لئے آسان اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

مولانا عبدالشکور دیوبندیؒ

دیوبند کے شیوخ خاندان سے تھے، ان کے پردادا مولانا حسن الدین حضرت سید

ۓ مولانا عبدالخالق صاحب نے دیوبند کی جامع مسجد کی تعمیر میں زبردست حصہ لیا تھا، مولانا حسن الدین [illegible] اور شب گزار تھے، جامع مسجد دیوبند کی امامت [illegible] (رسالہ [illegible])

کی خدمت میں گزری قرآن شریف کے حافظ تھے ایسے دل گداز اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں قرأت کرتے کہ سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

مولانا حکیم عبد العلی لکھنویؒ

وطن رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ تھا، مگر لکھنؤ میں قیام کی وجہ سے لکھنؤ کی نسبت سے شہرت تھی ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئے مولانا حکیم عبد الحیؒ ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ مصنف نزہۃ الخواطر کے فرزند اکبر تھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی جب چند سال دیوبند گزارے پھر ۱۳۲۹ھ میں حضرت شیخ الہند اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نیز دوسرے اساتذہ سے علم حدیث کی تحصیل کی بعد ازاں انگریزی کی جانب متوجہ ہوئے اور کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۳۳۲ھ سے بی ایس سی کے امتحان میں فرسٹ آئے، حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے استفادہ کے لیے دہلی چلے گئے، آخر میں لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا ۱۳۴۱ھ میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کرکے لکھنؤ میں مطب شروع کر دیا۔

انگریزی تعلیم اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود ان کی زندگی سادہ، وہ اپنے اسلاف کا نمونہ تھی مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھا تھا اس لئے تعلیم میں رجحان رکھنے کے باوجود اس کے سخت ناقد تھے، ان میں قدیم و جدید تہذیب و ثقافت، و مشرقی و مغربی علوم کا نہایت حسین اور دلآویز امتزاج تھا، انگریزی اور ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران میں بھی ان کی وضع قطع اور معاشرت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حضرت مولانا مدنیؒ سے بیعت حاصل تھی۔

۱۳۵۰ھ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے، اپنے ذاتی مطب کے

کے ساتھ نظامت کے فرائض تادم واپسیں انجام دیتے رہے۔ [illegible] سے [illegible] تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

[illegible] ذی قعدہ [illegible]ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں سپرد خاک کیا گیا۔ ممتاز عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے برادر خورد اور تلمیذ رشید ہیں۔

مولانا مبارک حسین سنبھلیؒ

[illegible]ھ میں سنبھل ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن ہی میں پائی پھر ان کے والد صاحب نے ایک پٹھان ذی علم کو مکان پر رکھ کر تعلیم کا انتظام کیا، استاذ کو چونکہ معقولات پر زیادہ عبور تھا اس لئے وہی رنگ شاگرد میں سرایت کر گیا، منطق و فلسفہ کی سبھی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں، [illegible]ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر دورۂ حدیث پڑھا اور [illegible]ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفروں میں رہے مناظرہ اور مجادلانہ سرگرمیوں کا ذوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، عمر کی ترقی کے ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی گئی، [illegible]ھ میں بریلی کے ایک مناظرے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ شریک ہو کر زبردست کامیابی حاصل کی اور "شیر اسلام" کے خطاب سے نوازے گئے۔

[illegible]ھ میں انہوں نے قاسم العلوم کے نام سے میرٹھ میں ایک مدرسہ قائم کیا [illegible]ھ میں جب مولانا قاضی بشیر الدین اور حاجی محمد علی صاحبان نے دیوبندی مسلک کی اشاعت کے لئے "دارالعلوم" کے نام سے مدرسہ قائم کیا تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹوی کے مشورے سے صدر مدرس کی حیثیت سے ان کا انتخاب کیا گیا، یہ تحریک خلافت

برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں کتابوں کا کاروبار شروع کر دیا علاوہ ازیں
کی عربی تفسیر مظہری آٹھ جلدوں میں عربی ٹائپ میں شائع کیں۔ بیان القرآن اور بہشتی زیور کو نہایت
اعلیٰ پیمانے پر طبع کرایا۔ پاکستان میں تصنیفی صدمے کر گئے تھے اور آخر تک اس کے لئے برابر
کوشاں رہے۔

۲۸ رجب [illegible] / ۱۰، ۱۱ نومبر [illegible] کو کراچی میں وفات پائی۔ اور ناظم آباد کے
قبرستان میں حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا احسان اللہ خاں تاجور

[illegible] میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ روہیلہ افغان خاندان سے تعلق رکھتے تھے
ابتدائی تعلیم اپنے وطن نجیب آباد میں پائی۔ بعد ازاں مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں
داخلہ لیا اور [illegible] میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی میں عربی ادب سے
شغف ہو گیا تھا مگر اردو ادب میں تبدیل ہو گیا۔ مولانا تاجور نے زمانۂ طالب علمی ہی میں
شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شاعری میں اگرچہ رسا رامپوری کے تلمیذ تھے۔ مگر دارالعلوم
کے زمانۂ طالب علمی میں حبیب حسن وحشیؒ دیوبندی سے بھی اصلاح لیتے رہے۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد وہ لاہور چلے گئے وہاں اس زمانے کے مشہور
رسالہ "مخزن" کی ادارت میں شریک ہو گئے۔ لاہور سے جب "ہمایوں" جاری ہوا تو مولانا
تاجور "ہمایوں" میں چلے گئے۔ اسی زمانے میں وہ لاہور کے دیال سنگھ کالج میں اردو

ل حبیب حسن وحشی دیوبندی بڑے باکمال شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ آپ کا کلام
دست برد زمانہ سے ضائع ہو گیا۔ [illegible] میں دیوبند میں انتقال ہوا۔ شاہ ولایت صاحب
کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

ور فارسی کے لکچرار مقرر ہو گئے۔

لاہور میں جلد ہی نوجوان شعراء اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے بہت سوں نے آگے چل کر شہرت اور ناموری حاصل کی۔ مولانا تاجور نے لاہور میں انجمن ارباب ادب قائم کی جس کے اہتمام میں جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے۔ انھوں نے اُردو شاعری میں متعدد تجربات بھی کیے ہیں۔ انجمن ارباب ادب کے بعد انھوں نے "اُردو مرکز" کے نام سے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں مولانا تاجور کی زیر نگرانی منشی گورکھپوری گویا جہاں اُدنیٰ مجنوں گورکھپوری، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی اور ثاقب میرٹھی جیسے پاک باطن شعراء نے اُردو کے تمام مشہور نثر نگاروں اور شعراء کے کلام کا انتخاب کئی جلدوں میں مرتب کیا۔

۱۹۳۱ء کے اواخر میں انھوں نے "ادبی دُنیا" کے نام سے ایک معیاری رسالہ جاری کیا اور کچھ عرصے کے بعد ایک اور رسالہ "شاہکار" کے نام سے نکالا۔ مولانا تاجور کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کے ادبی کمالات کا شہرہ پنجاب سے گزر کر پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ آخر میں انھیں برطانوی حکومت کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ اور ہندوستان کے ادبی حلقوں نے انھیں ادیبِ ملک کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ساٹھ سال کی عمر میں مولانا تاجور کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔

مولانا عزیر گل پشاوری

قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندے تھے۔ ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر کے حضرت شیخ الہند کی تحریک آزادی کے ممبر بن گئے تھے۔ تحریک کے بہت سے اہم و عظیم الشان کام انھوں نے بڑی قابلیت سے انجام دیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کے پرجوش اور سرگرم کارکن تھے۔

حاجی ترنگ زئی اور تحریک کے دوسرے ارکان تک خطوط اور پیغامات پہنچانا بھی

کے رفقاء تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص ہونے کے ساتھ خوش گلو بھی تھے۔ ۱۳۳۳ھ میں
حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حجاز گئے۔ اور جب حضرت شیخ الہندؒ گرفتار کرکے مالٹا میں نظر
بند کیے گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ مالٹا میں نظر بند رہے۔ بعد رہائی ساتھ ہی ہندوستان واپس آئے
حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار خادم تھے۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں ان کا عہدہ کرنل بتایا
گیا ہے۔

تحریک خلافت کے زمانے میں صوبہ سرحد کی خلافت کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔ دوسری
جنگ عظیم سے قبل رڑکی کے مدرسہ رحمانیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ قیام رڑکی کے
دوران ایک نومسلم انگریز خاتون سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ انگریز خاتون مدت سے رڑکی کے
قریب رہائش پذیر تھیں، انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اور اسلام کا
مطالعہ کر رہی تھیں، اس سلسلے میں اپنے ذہنی اشکالات رفع کرنے کے لیے ان کی آمد و
رفت مولانا عزیر گل صاحب کے پاس رہتی تھی۔ مشرف بہ اسلام ہو کر تصوف کی جانب
ان کا میلان بڑھ گیا تھا۔ انھیں محسوس ہوا کہ نکاح کے بغیر انھیں تصوف کی راہ میں مشکلات
درپیش ہیں۔ انھوں نے اپنی اس پریشانی کا مولانا سے تذکرہ کرتے ہوئے ان سے نکاح
کی خواہش کا اظہار کیا۔ جسے خاتون کے اصرار پر مولانا عزیر گل صاحب نے منظور کر لیا۔

تقسیم ملک کے زمانے تک مولانا عزیر گل صاحب اپنی اس نومسلمہ اہلیہ اور بچوں
کو لے کر اپنے وطن پشاور چلے گئے۔ اور ہنوز وہیں مقیم ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

حضرت مولانا گیلانی بہار کی مردم خیز سرزمین کے فرزند ارجمند تھے۔ ۹ ربیع الاول
۱۳۱۰ھ کو اپنی ننھیال استھانواں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیلان
میں اپنے چچا حکیم سید ابوالنصر سے پائی۔ ان کے خاندانی بزرگوں پر معقولات کا رنگ

غالب تھا۔ ۱۳۲۴ھ میں اعلیٰ مزید تعلیم کے لئے مولانا برکات احمد مرحوم سے پڑھنے کے لئے
ٹونک بھیج دیا گیا۔ مولانا برکات احمد معقولات کے مشہور عالم تھے۔ سات سال تک
ان سے معقولات کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں۔

مولانا گیلانیؒ نے اپنی تعلیم کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ٹونک
میں معقولات کی تعلیم کے بعد انہیں احساس ہوا کہ علم و حقیقت کی دنیا صرف یہی نہیں
ہے جو ان کے گرد و پیش نظر آرہی ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے جس تک رسائی
حاصل کرنا ان کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے والدین سے اصرار کیا کہ وہ دیوبند جانا چاہتے
ہیں۔ خاندانی بزرگوں پر چونکہ معقولیت کا غلبہ تھا اس لئے بڑی مشکل اور اصرار کے بعد بالآخر
انھیں دیوبند جانے کی اجازت دی گئی۔ انھوں نے جب دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا تو
اُن کے ذہن و فکر پر اپنے خاندان اور اپنے استاذ مولانا برکات احمد ٹونکی کی معقولیت
کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔

۱۳۳۲ھ میں انھوں نے دورۂ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۳ھ میں دورۂ
حدیث میں شریک ہو کر دارالعلوم سے کتب حدیث کی سند حاصل کی۔ دارالعلوم
میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت شاہ صاحب، حضرت علامہ عثمانی رحمہم اللہ اور دوسرے
اساتذہ کے علمی اور روحانی فیضان و تربیت سے اُن کی زندگی کا رُخ معقولات کے بجائے
تفسیر و حدیث اور سلوک و معرفت میں تبدیل ہو گیا۔ اور فکر و نظر کی وہ تمام بنیادیں
متزلزل ہو گئیں جو خاندانی تعلیم اور گرد و پیش نے اُن کے اندر پیدا کی تھیں۔

مولانا گیلانی تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ مدت تک رسالہ "القاسم" اور
"الرشید" کے معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے
اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور دلنشین طرزِ نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام
حاصل کر لیا تھا۔ مولانا کی النبی الخاتم، ابوذر غفاریؓ اور کائناتِ روحانی یہ دو ان رسالوں میں اُن کی

ابھی تک چھپی نہیں ہے البتہ اس کا کچھ حصہ ہمارے "نظام" کانپور میں بالاقساط شائع ہوا ہے۔

فراغت کے بعد شوال ۱۳۲۳ھ میں مظاہر علوم میں مدرس مقرر ہوئے، اور بڑی کامیابی اور ناموری کے ساتھ عرصہ دراز تک تدریس کے فرائض انجام دیتے۔ ۱۳۴۴ھ میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کا قصد فرمایا تو آپ ہی کو مظاہر علوم میں اپنی جگہ پر صدارت تدریس کے لئے انتخاب کیا تھا۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہندوستان و بیرون ہند میں ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد وطن واپس چلے گئے وہاں خیر المدارس ملتان، جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک وغیرہ کی بڑی بڑی درسگاہوں میں شیخ الحدیث رہے۔ تقریباً پچاس برس علوم دینیہ اور حدیث کے درس و تدریس میں گزارے۔

حضرت تھانویؒ سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل تھا۔ درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و سلوک میں بھی خاص مقام رکھتے تھے، بہت سے لوگوں نے آپ سے سلوک و طریقت کی منزلیں طے کیں۔

۱۴ ربیع الآخر ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء کو اپنے وطن میں راہی عالم جاودانی ہوئے۔

مولانا خیر محمد جالندھریؒ

پنجاب میں جالندھر کے رہنے والے تھے ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء سال پیدائش ہے۔ وطن اور مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں تعلیم پائی، حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ سے دہلی میں حدیث کی تکمیل کی مگر ہمیشہ دارالعلوم سے وابستہ رہے، جالندھر میں اپنی صدارت میں ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء میں خیر المدارس جاری کیا۔ حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے، علم و عمل، زہد و تقویٰ اور دانشوری، حق گوئی علمی صفات جیسی اُن کی ذات میں بدرجہ اتم جمع تھیں، ہزاروں لوگ آپ کے درس اور رشد و ہدایت سے فیض یاب ہوئے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ایک مدت

ریاست قلات کا وزیر تعلیم مقرر کیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد وزارت سے مستعفی ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے وہاں صدر مدرس بنائے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد اپنے وطن پاکستان چلے گئے۔ وہاں جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ التفسیر کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ جامعہ اسلامیہ سے سبکدوش ہو کر اب وطن میں مقیم ہیں۔ مولانا افغانی کی قدر و قیمت ان کی تحریرات، بیانات، مواعظ اور شگفتہ مزاجی سے ہے۔ وہ جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تصانیف میں تفسیر المفصل عربی زبان میں ہے۔ شرعی ضابطہ دیوانی، علوم القرآن، تحقیق العالم اور اسلام، سوشلزم اور اسلام، اسلام دین فطرت ہے، اسلام عالمگیر مذہب ہے، احکام القرآن، معارف القرآن وغیرہ ان کی اہم تصنیفیں ہیں۔ شرعی ضابطہ دیوانی میں فقہ کے تمام دیوانی قوانین کو قانونی دفعات کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ یہ کتابیں اہل علم و دانش میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی

حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی اس وقت دنیائے اسلام میں علم حدیث کے بلند پایہ عالم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اُن کی پیدائش تقریباً ۱۳۱۹ھ کی ہے۔ ابتدائی عربی تعلیم اپنے وطن مئو (ضلع اعظم گڑھ) کے مشہور مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی۔ پھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مشہور شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے گورکھپور اور بنارس میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔ اسی کے ساتھ علوم شرقیہ کے مختلف عربی کے امتحانوں میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ فاضل ادب کا امتحان الہ آباد سے پاس کر کے ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۴۰ھ کے اوائل تک مظہر العلوم بنارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۳۴۹ھ کے اواخر میں دوبارہ دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث میں شرکت کر کے سماعت کی۔

۱۳۴۱ھ میں مدرسہ دارالعلوم مئو میں آپ کا تقرر بحیثیت صدر مدرس ہو گیا جہاں آپ دو سال تک دورۂ حدیث اور فنون کی دوسری اونچی کتابیں پڑھاتے رہے۔ دارالعلوم مئو سے علیحدہ ہو کر پھر بحیثیت صدر مدرس مظہر العلوم بنارس آ گئے۔ یہاں کئی سال آپ نے درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ وہاں سے دوبارہ ۱۳۴۹ھ میں پھر اپنے وطن مئو آ گئے۔ یہاں آپ کو مفتاح العلوم مئو کا شیخ الحدیث اور صدر مدرس بنا دیا گیا۔ ۱۳۷۹ھ تک وہ مفتاح العلوم مئو کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے۔ آخر میں تحقیقی شغف کی وجہ سے آپ نے مفتاح العلوم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ البتہ بحیثیت سرپرست نگرانی فرماتے ہیں۔ آپ دینی علوم کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دے رہے ہیں اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر قائم ہے۔ بہت سے علماء کو آپ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

آپ کی عربی اور اردو تصانیف کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ استدراک و تعلیق شرح مسند امام احمد بن حنبلؒ
۲۔ تعلیق و تحقیق سنن سعید بن منصورؒ (۲ جلد)
۳۔ تحقیق و تعلیق مسند حمیدی (۲ جلد)
۴۔ تحقیق و تعلیق کتاب الزہد والرقائق عبد اللہ بن مبارکؒ
۵۔ تحقیق و تعلیق المطالب العالیہ (۴ جلدوں میں)
۶۔ تحقیق و تعلیق مختصر کتاب الترغیب والترہیب لابن حجر عسقلانیؒ
۷۔ تعلیق و تحقیق مصنف عبد الرزاق گیارہ ضخیم جلدوں میں۔ یہ سب عربی میں لکھی گئی ہیں۔ اردو کی کتابیں یہ ہیں:۔

(۸) نصرۃ الحدیث (۹) الاعلام المرفوعہ (۱۰) الازہار المربوعہ (۱۱) ابو دل کی دل آویز باتیں (۱۲) ارشاد الثقلین (۱۳) شارع حقیقی (۱۴) التنقید السدید

فی التفسیر المجید (۱۵) تحقیق اہلِ حدیث (۱۶) رہبر حجاج (۱۷) احکام الشرائع اللہ (۱۸) البلاغ عزیز (۱۹) ... (۲۰) مجموعہ بیست رکعات تراویح اور بھی متعدد تصانیف ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔

اس وقت فنِ حدیث، رجالِ حدیث و متعلقاتِ حدیث میں آپ کا ایک امتیازی مقام ہے جس کو اہلِ علم تسلیم کرتے ہیں۔

کئی سال سے حکومتِ کویت کی خواہش ہے کہ آپ وہاں آجائیں مگر اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے نہیں جا سکے۔ جامعہ ازہر قاہرہ کے شیخ الجامعہ کا تقاضہ بھی ہے کہ آپ مصر تشریف لائیں۔

۱۳۸۲ھ سے دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں۔

مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی

۱۳۴۱ھ میں کاکوری ضلع لکھنؤ کی مردم خیز سرزمین میں ولادت ہوئی، بچپن میں اپنے نانا حضرت محسن کاکوروی کے پاس مین پوری میں رہ کر ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کئے، پھر ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا، ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کی ترغیب سے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ "دارالعلوم میں اپنے اساتذہ کی درسی تقریریں اب تک میرے کانوں اور آنکھوں میں محفوظ ہیں" دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی صحبت میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا، اس زمانے میں دیوبند میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب اُن میں نعتیہ اشعار سناتے تھے۔ اُسی زمانے کا اُن کا ایک شعر یہ ہے ؎

ایمان کی کہتا ہوں مجھے شوق بہت ہے ۔ طیبہ کے لئے قافلہ سب جمع ہوا ہے

اسی زمانے میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی صحبت میں تحریر نگاری کا شوق ہوا۔

۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر دارالعلوم میں بلا معاوضہ معین مدرس رہے، پھر مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں کچھ دنوں پڑھا کر لکھنؤ چلے گئے۔ یو۔ پی یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا۔ اٹاوہ مسلم ہائی سکول میں دینیات کے معلم اور بعد ازاں بنارس کے کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر اگست ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ کے کالج میں تقرر ہو گیا۔ دوران ملازمت ۱۹۳۳ء میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۴۲ء میں ملک شاہ سلجوقی اور اس کے عہد پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۶۰ء میں آپ کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے ہندوستان میں عربی کی ممتاز شخصیت کے عنوان سے سند اعزاز (CERTIFICATE OF HONOUR) دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے پر آپ کو ریسرچ پروفیسر مقرر کیا گیا جس پر اب تک فائز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تین درجن سے زیادہ عربی فارسی اور اردو زبان کی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے اکثر کتابیں اسکولوں اور کالجوں کے نصاب اور اسٹرک کے امتحانات میں شامل ہیں۔ ان کی ۱۰ کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ۳۰ کتابیں ہنوز طبع نہیں ہوئیں۔

۱۳۸۲ھ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔

عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کا ذوق بھی ہے، اشعار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہے، مجلس میں اگر شعر و شاعری کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو مسلسل اشعار یادداشت سے سناتے ہوئے تھکتے نہیں ہیں۔

مولانا شاہ وصی اللہ اعظمیؒ

اپنے وطن موضع فتح پور تال نرجا ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، قرآن شریف وطن

ہی میں حافظ ولی محمدؒ سے حفظ کیا، پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور میں فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں دارالعلوم میں داخل ہو کر ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی صدارت تدریس کا یہ ابتدائی زمانہ تھا آپ کا حافظہ بہت قوی تھا، تمام علوم مستحضر رہتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت تعلیم کے بعد حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، اور باقاعدہ وہیں کے ہو رہے۔ دوران تعلیم ہی میں اصلاح اعمال اور ذوق عبادت سے سرشار تھے، زمانۂ طالب علمی ہی سے خلوت نشینی کے عادی تھے۔ خانقاہ امدادیہ میں دوران قیام کے زمانے میں منقطع عن الخلق رہے اور متوکل علی اللہ ہو کر سیر سلوک اور تحصیل نسبت میں اپنے آپ کو غرق کر دیا اور بہت جلد تربیت باطنی اور تصوف کے مراحل طے کر کے خلعت خلافت و اجازت اور بیعت و تلقین سے آراستہ و پیراستہ ہو گئے۔ سالہا سال کے بعد بحکم حضرت حکیم الامت ۱۳۴۲ھ میں نکاح کیا لیکن اس کے باوجود آپ کا قیام زیادہ تر خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں رہا۔

۱۳۵۲ھ میں وطن مالوف پہنچ کر تعلیم و تربیت و اصلاح الخلق میں مشغول ہو گئے آپ کا شمار حضرت تھانویؒ کے اجلۂ خلفاء میں تھا۔ آپ کا طرز اصلاح و تربیت بھی اپنے مرشد کے طرز پر تھا۔

ایک مدت وطن میں قیام رہا، پھر ۱۳۶۲ھ میں گورکھپور چلے گئے۔ اور آخر میں الہ آباد قیام فرمایا وہاں خانقاہ تعمیر کرائی۔ بڑے بڑے علماء اور صاحب جاہ و ثروت آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، اور ہزاروں بندگان خدا نے آپ سے روحانی فیض حاصل کیا، اکابر کے زمانۂ قیام میں جن حضرات نے اپنے طریق مشائخ پر احیاء سنت کی زبردست خدمات انجام دیں اس دور آخر میں ان کی ذات گرامی مغتنمات میں سے تھی۔ آخر کے چند سال [illegible] آمد و رفت رہی، اس شہر میں گویا ایک حلقہ قائم ہو گیا اور کتنے ہی لوگ مسلک صالحین پر مستقیم ہو گئے۔

۲۸ العلم علی خیر الامم

۲۹ النصیحۃ للمسترشد منہا

۳۰ وصیۃ السالکین

مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے محمد شفیع نام تجویز فرمایا۔ اصلاً دیوبند کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۳۶ھ میں ۲۲ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم میں درجہ ابتدائی کے مدرس مقرر ہوئے اور بہت جلد تدریس ترقی کی منزلیں طے کر کے طبقۂ علیا کے اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ فقہ اور ادب سے شروع ہی سے مناسبت رہی۔ ۱۳۵۰ھ میں منصب افتاء پر فائز ہوئے۔ ۱۳۶۷ھ میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں دستور ساز اسمبلی کے بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن کی حیثیت سے اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دی۔ ۱۳۷۰ھ میں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے ایک دینی درس گاہ قائم کی جو اس وقت کراچی میں علوم اسلامیہ کا ایک اہم اور بڑا مرکز ہے۔

مفتی صاحب کا مطالعہ وسیع اور گہرا تھا۔ وہ جماعت دیوبند کے ممتاز لوگوں میں سے تھے اور تقریباً تمام متداول دینی علوم میں عمدہ صلاحیت کے مالک تھے۔ وہ بہت سی دینی کتابوں کے مصنف ہیں۔ شروع ہی سے تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے دینی مباحث میں مختصر و مفصل تصانیف کا ذخیرہ ان کے قلم سے نکلا ہے۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ صرف فقہ میں ان کی تصانیف کی تعداد ۵۰ ہے۔ فقہ میں عصر حاضر کے مسائل کو تفصیل سے اور مدلل طور پر موضوع بحث بنایا ہے، جو عوام و خواص دونوں کے لئے علوم و معارف کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد دو لاکھ بتائی جاتی ہے

ایک زمانے میں ہندوپاکستان سے بریں اُن کی تفسیر معارف القرآن کے براڈ کاسٹ کئے جاتے تھے جن کو عام طور پر پسند کیا جاتا تھا۔ یہ تفسیر معارف القرآن کے نام سے ۸ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ تفسیر معارف القرآن مفتی صاحب کا عظیم کارنامہ ہے۔ آپ کے سیکڑوں شاگرد علاوہ برِصغیر کے علاوہ مختلف ممالک میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ابتدا حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانویؒ سے رجوع کیا۔ اور حضرت مرشد تھانویؒ سے خلافت حاصل کی۔ حضرت تھانویؒ کو مفتی صاحب کے علم و فضل پر بڑا اعتماد تھا۔ اُن کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا اور بسا ہوا تھا۔ وہ ہر ہر جزئی میں بزرگوں کے اتباع کو ضروری سمجھتے تھے۔ دینی علوم کی تدریس و تصنیف کے ساتھ ساتھ اصلاحِ باطن میں بھی مصروف ہو گئے۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو میں قصائد، مرثیوں اور متعدد نظموں کا مجموعہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ پاکستان میں ان کو مفتیِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی۔ اور اسی لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

۱۰ شوال [illegible]ھ (۶ اکتوبر [illegible]ء) کی شب میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

فقیہ الامت جناب الحاج مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے سنِ وفات [illegible] نکلتا ہے۔

مولانا مفتی اسمٰعیل بسم اللہؒ

[illegible]ھ میں ڈابھیل ضلع سورت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن اور قریبی قصبہ کٹھور میں پائی، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم بیماری کی وجہ سے وطن چلے گئے۔ بعد ازاں مدرسہ امینیہ دہلی میں رہ کر حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ سے فتویٰ نویسی کی مشق کی۔ [illegible]ھ میں دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصے تک دھابیل میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) چلے گئے، مگر جلد ہی وہاں سے واپس آگئے، مدرسہ تعلیم الدین یعنی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرس مقرر ہوگئے۔ ۱۳۴۳ھ میں یہاں مفتی بنائے گئے۔ وہاں فتویٰ نویسی کے علاوہ انہوں نے مولانا احمد اشرف رانڈیری کی معیت میں جمعیۃ علماء قائم کی، اور کئی دینی مدرسے مختلف مقامات میں جاری کئے، اس طرح انہیں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی دینی اور سیاسی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔

۱۳۸۰ھ میں صحت کی خرابی کے باعث وطن چلے گئے، وہاں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے تعلیمی امور کے نگراں بنائے گئے اور پھر جلد ہی مہتمم مقرر ہوگئے۔ گجرات میں ان کی ذات مرجع خلائق تھی، گجرات کے نہ صرف عوام بلکہ علماء میں بھی آپ کے فتاویٰ کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ ان کے فتاویٰ پینتیس سال کے قریب گجرات کے ہفت روزہ اخبار "مسلم گجرات" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان فتاویٰ کی تین جلدیں گجراتی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے، ان میں کچھ فتاویٰ اردو زبان میں بھی ہیں۔ مفتی بسم اللہ صاحب مرجع خلائق تھے، سادگی پسند اور اوراد و وظائف اور معمولات کے پابند تھے، روزانہ قرآن شریف کی ایک منزل تلاوت کا معمول تھا۔ ۱۳۹۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا سید میرک شاہ کشمیریؒ

ان کا وطن کشمیر ہے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ منقولات و معقولات میں ذی استعداد عالم تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد دربھنگہ اور مرادآباد کے مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ ۱۳۴۳ھ میں ان کو دارالعلوم میں مدرس بنایا گیا۔ تدریس کے علاوہ شدھی و سنگٹھن کی تحریک کے موقع پر ان کو دارالعلوم کی جانب سے آگرہ کے علاقہ

ملکانہ راجپوتوں میں تبلیغ کے لئے مامور کیا گیا۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کی جانب سے آگرہ کے قرب و جوار میں جو مبلغ بھیجے گئے تھے وہ آپ ہی کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت اور تن دہی کے ساتھ کام کیا ۱۳۴۲ھ کے اواخر میں وہ لاہور چلے گئے۔ اور وہاں اورینٹل کالج کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ آخر میں جامعہ مدرسہ لاہور کے صدر مدرس رہے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے لئے صدر الدین شیرازی کی کتاب اسفار اربعہ کی چوتھی جلد کا ترجمہ کیا۔

ابھی چند سال ہوئے لاہور میں راہی ملک بقا ہوئے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب

حضرت نانوتویؒ کے پوتے ہیں ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے تاریخی نام "مظفرالدین" ہے۔ ۷ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کیا گیا دو سال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کیا۔ پانچ سال فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کرکے عربی کا نصاب شروع کیا۔ جس سے ۱۳۳۷ھ میں فراغت اور سندِ فضیلت حاصل کی۔ دورانِ تعلیم میں آپ کی خاندانی نسبت کے سبب سے اساتذہ نے علمی پیمانے اور مخصوص طور پر تعلیم و تربیت میں حصہ لیا۔ حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء و اساتذہ سے حاصل ہوئی۔ علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب علم حدیث میں آپ کے خاص استاذ ہیں۔ ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ سے بیعت کی۔ حضرت کی وفات کے بعد مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ کی طرف رجوع کیا اور تربیت حاصل کی۔ ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔

۱؎ تفصیل کیلئے دیکھئے دارالعلوم دیوبند کی تحریکات کا باب دوم

سے خاص طور پر محفوظ ہو جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسری یونیورسٹیوں میں آپ کی
تقریریں خاص طور پر مقبول ہیں۔ ان میں سے بعض معرکۃ الآرا تقریریں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے
شائع ہو چکی ہیں۔ ملک کا کوئی صوبہ اور خطہ ایسا نہیں جہاں آپ کی تقریروں کی گونج نہ
پہنچی ہو۔

بیرونی ممالک میں افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، زنجبار، کینیا،
روڈیشیا، ری یونین، مدینہ، کویت، حجاز، نیروبی، سلطنتِ حبش (ایتھوپیا)، مصر، انگلینڈ، فرانس
اور جرمنی وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے ہیں۔ حضرت مولانا محمد سعید صاحب مرحوم مہتمم
جیند کا ان کے بارے میں یہ مشہور مقولہ ہے کہ اب تک کے مہتمم دارالعلوم حافظ تھے اور مولانا
محمد طیب مبلغ ہیں بہرحال آپ کو سب ستائے دیے گئے اور لوگوں کو دارالعلوم سے
دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے مسلک کی اشاعت ہوئی۔

دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو خاص دلچسپی ہے وہ تعلیم
و تدریس اور دعوت و تبلیغ اسلام ہیں ان کی وجہ سے ملک میں آپ کو امتیازی مقام
حاصل ہے۔ تقریر کے ذوق کے ساتھ تصنیف و تالیف سے ہے۔ آپ کا یہ مشغلہ دارالعلوم
کے انتظامی معاملات اور اوقاتِ درس و تدریس کے علاوہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ بالعموم
دورانِ سفر کے فارغ اوقات اسی میں صرف ہوتے ہیں۔ نمازِ عصر سے مغرب
تک مردانے میں عمومی مجلس کا معمول رہتا ہے جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے
ہوتے ہیں۔ شاعری سے بھی مناسبت ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ عرفانِ عارف کے نام سے
شائع ہو چکا ہے جس میں اردو فارسی اور عربی کا کلام جمع کر دیا گیا ہے

ان گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی سفر و حضر میں جاری
رہتا ہے۔ آپ کے تحریرات کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ جو رسائل بیرون چند سال پہلے ہوئے ہیں
تصانیف کا عدد سو کے قریب ہے جو مختلف اسلامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں

ان میں سے پچاس سے زائد شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی معروف ترین تصانیف سائنس اور اسلام، التشبہ فی الاسلام، خاتم النبیین، اسلام میں اخلاق کا نظام، فطری حکومت، اسلام اور مسیحی اقوام، حدیث کا قرآنی معیار، کلمات طیب وغیرہ ہیں۔

۱۳۴۳ھ سے ہر جمعہ کو جامع مسجد دیوبند میں تقریر کا معمول تھا جو تقریباً بیس بائیس برس تک جاری رہا، بعد میں کثرت اسفار کی وجہ سے متروک ہو گیا اور تقریریں ملک گیر ہو گئیں۔ ۱۳۷۳ھ میں جبکہ شاہ ابن سعود مرحوم پر قاتلانہ حملہ ہوا، مکہ میں وہ بال بال بچ گئے۔ ہندوستان کے علماء و عمائد ملت کی طرف سے مبارکباد کا جلسہ فرنگی محل میں منعقد کیا گیا، جس کا صدر مولانا محمد طیب صاحب کو بنایا گیا۔ علمائے ہندوستان کے وفد نے شاہ ابن سعود کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقع پر مولانا نے عربی کی مختصر تقریر کے بعد جلسہ کی تجویز پڑھ کر سنائی تھی۔

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بمبئی نے جس میں تمام فرقوں کے علماء اور تمام موثر تنظیموں کے سربراہ شریک تھے، آپ کو اپنا صدر منتخب کیا۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے آپ کو دعوت دے کر بلایا اور پرسنل لا کے موضوع پر گفتگو کی۔ بیرون ملک و قوم میں آپ کا ایک خاص علمی وقار مسلم ہے۔ کئی کمپنیاں ان کی تالیفات کی طباعت و اشاعت کا کام انجام دے رہی ہیں۔ موتمر عالم اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں متعدد مرتبہ شریک ہو چکے ہیں۔

مولانا محمد چراغ گوجرانوالوی

۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے جلیل القدر استاد حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کی ترمذی شریف کی تقریر العرف الشذی مرتب کی۔ حدیث کے علاوہ دیگر علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ پہلے مولانا عبد

بھی ہے۔ معارف القرآن کے نام سے انھوں نے کئی جلدوں میں قرآن شریف کی تفسیر
لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے۔ ہر وقت درس و
تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ یہ ذوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ دنیوی
مشاغل سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

مقامات حریری پر عربی میں حاشیہ لکھا ہے، جو صاحب درس و تدریس علماء اور
طلبہ میں بہت مقبول اور مشہور ہے۔ علم عقائد میں عقائد الاسلام اور عقیدۂ ختم نبوت کے
موضوع پر ختم المصطفیٰ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ عیسائیت اور قادیانیت کے رد و ابطال
میں بھی انھوں نے کئی مختصر کتابیں لکھی ہیں۔

مدرسہ امینیہ دہلی سے انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، مگر چند روز کے بعد
دارالعلوم نے ان کو کھینچ لیا۔ مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔
[illegible] سے [illegible] تک دارالعلوم میں مدرس رہے۔ پھر حیدرآباد چلے گئے، وہاں
بارہ سال تک دارالعلوم میں رہ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ [illegible] میں دارالعلوم
میں بلا لیا گیا اور تفسیر و حدیث کے اسباق ان کے سپرد کیے گئے۔ ان کا درس تفسیر و حدیث
اہل علم میں مقبول و مشہور تھا۔ اس طرح ۱۰ سال تک انھوں نے دارالعلوم میں مسند تدریس
کو رونق بخشی۔ [illegible] میں لاہور چلے گئے۔ وہاں جامعہ عباسیہ بہاولپور میں
شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ اور [illegible] سے آخر تک جامعہ اشرفیہ میں بحیثیت شیخ الحدیث
۲۲ سال فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ لاہور میں ہر جمعہ کو ان کا وعظ ہوتا تھا، جس میں
بڑے ذوق و شوق سے لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ پاکستان کے ممتاز اور بلند پایہ
عالم سمجھے جاتے تھے۔

اپنے بعد اولاد کے علاوہ ایک بڑا کتب خانہ بھی چھوڑا۔

۶ رجب ۱۳۹۴ھ کو لاہور میں وفات پائی۔ اور وہیں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی

نانوتہ کے صدیقی شیوخ سے تھے۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ عمر کا بڑا حصہ مہو چھاؤنی (مالوہ) میں گزارا۔ وہیں دارالافتاء قائم کر کے مسلمانوں کی علمی اور دینی رہنمائی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مالوہ اور راجپوتانہ میں ان کے فتاوی بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ تفسیر، فقہ اور افتاء پر گہری دسترس تھی۔ اس کے ساتھ سیاست اور قومی مسائل سے بھی پوری دلچسپی تھی۔ ان اطراف میں ان سے بڑا علمی فیض پہنچا۔ مفتی اور کے منصب سے منسلک تھے۔ اپنی سادہ مزاجی کے لحاظ سے بڑی عظمتوں کے حامل تھے۔ مدھیہ پردیش میں ان کا وجود علم و ہدایت کا نشان راہ تھا۔

ان کی ایک کتاب مختصر طیبہ سیرت نبوی کے موضوع پر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے سیرت نبوی کو ایسے عام فہم انداز سے لکھا ہے کہ کم استعداد کے لوگ بھی اس سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مختصر طیبہ میں کم سے کم الفاظ میں سیرت نبوی کے زیادہ سے زیادہ گوشوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ اس کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو دوسری کتابوں میں یکجا طور پر نہیں ملتیں۔

۱۳۸۲ھ سے تادم آخر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔ ۱۴ شوال ۱۳۸۷ھ (۱۴ جنوری ۱۹۶۸ء) کو ۶۶ سال کی عمر میں وفات پائی، وہیں مہو میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا غلام غوث ہزاروی

پاکستان کے ضلع ہزارہ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل

ہوئے دارالعلوم کے درسی استعداد اور ممتاز فضلاء میں سے ہیں اور قادر الکلام خطیب ہیں۔ قادیانیت کے خلاف سرگرمی سے کام کیا ہے۔ ملک کی تحریک آزادی میں شریک رہے اور قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے۔ ملک کی تقسیم کے بعد جمعیۃ العلماء پاکستان کے پہلے ناظم و پھر صدر ہوئے۔ اپنی علمی شہرت کے بنا پر موتمر عالم اسلامی میں علماء پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کر چکے ہیں۔ پاکستان کے ممتاز علماء میں اُن کا شمار ہے پچھلے دنوں جمعیۃ العلماء اسلام صوبۂ سرحد میں اپنی وزارت بھی بنا چکے ہیں۔ مولانا مفتی محمود صاحب جس کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ اس وقت مشاہیر ملک میں اُن کا شمار ہے۔

مولانا اطہر علی بنگالی

وطن بنگال تھا ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت پائی۔ حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ تقسیم سے پہلے مشرقی پاکستان میں دستکاری پیمانے پر علمی و تدریسی اور قومی خدمات انجام دیں۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان میں جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر اور پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے۔ بنگلہ دیش کے اکابر علماء میں اُن کا شمار تھا۔ آخر عمر میں نظام اسلام پارٹی کی تشکیل کی، وزارتوں کے انقلاب میں بالخصوص بنگلہ دیش بننے کے سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بنگلہ دیش میں آپ کو خاص شہرت و امتیاز حاصل تھا۔ استقامت میں حق پرست علماء کا نمونہ تھے۔ کشور گنج میں اپنے مخلصوں سے بڑے پیمانے پر مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ بنگال کا دارالعلوم دیوبند کہا جاتا ہے۔ مولانا اطہر علی خود بھی مدرسہ میں درس دیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی طرح کشور گنج کے اس مدرسہ میں بھی ذریعۂ تعلیم اُردو زبان تھی۔

مولانا اطہر علی ۱۳۰۹ھ میں سلہٹ میں پیدا ہوئے۔ مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ شوال ۱۳۹۶ھ کو مرض فالج سے وفات پائی۔

مولانا نجم الدین جہلمی

پنجاب میں جہلم کے رہنے والے تھے۔ [illegible] میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ عرصے تک اورینٹل کالج لاہور میں عربی زبان کے استاد رہے۔ پنجاب کے علمی حلقوں میں اُن کے علم و فضل اور نیکی اور تقویٰ کی بڑی شہرت تھی۔ عربی ادب کے ساتھ تفسیر و حدیث میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ [illegible] میں وفات پائی۔

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ

وطن میرٹھ تھا۔ [illegible] میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ وہاں اُن کے والد ماجد حافظ جمیل مرحوم محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ ابتدائی تعلیم الٰہ آباد کے انگریزی اسکول میں پائی۔ دورانِ تعلیم حضرت تھانویؒ کا ایک وعظ سننے کے بعد انھیں علوم دینیہ کی طرف توجہ ہوئی تو والد صاحب نے [illegible] میں انھیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی کی خدمت میں سہارنپور بھیج دیا۔ مولانا بدر عالمؒ نے [illegible] میں مظاہر علوم سے حدیث کی تکمیل کی اور پھر وہاں [illegible] میں معین المدرس مقرر ہو گئے مگر جلد ہی مدرسی چھوڑ کر مزید طلبِ علم کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔ اور یہاں دورۂ حدیث میں شریک ہو کر [illegible] میں صحیح بخاری حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ سے پڑھی اور پھر [illegible] میں دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ اوائل [illegible] میں انھیں معین المدرس مقرر کیا گیا۔ [illegible] کے وسط میں وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے۔ وہاں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ پانچ سال تک حضرت شاہ صاحبؒ کے درس صحیح بخاری میں پورے التزام کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ [illegible] سال تک جامعہ ڈابھیل میں علم حدیث کی تدریسی خدمات انجام دیں۔ آخر میں جامعہ کے صدر مدرس بنائے گئے مگر

صحت کی خرابی کی وجہ سے ڈابھیل سے بہاول پور چلے گئے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے استاد کے علوم و معارف کو فیض الباری علیٰ صحیح البخاری کے نام سے چار جلدوں میں مرتب کیا۔ جس میں اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کی نادر علمی تحقیقات اور تفردات کو پیش کر کے انھوں نے ایک عظیم الشان علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔

۱۳۵۷ھ میں موصوف ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستہ ہو گئے، جہاں آپ کو ترجمان السنۃ کے نام سے اردو زبان میں حدیث کی ایک جامع کتاب کی ترتیب کا کام سپرد ہوا۔ انھوں نے یہ کام بڑی شان سے شروع کیا چار جلدیں لکھ چکے تھے کہ حیاتِ مستعار کی مدت پوری ہو گئی۔

مولانا بدر عالمؒ نے اولاً حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا، پھر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے دامنِ عقیدت کو تھاما، اور آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ کے جانشین حضرت قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان ہی سے خلافت حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ان کو علومِ اسلامیہ کا ایک دارالعلوم قائم کرنے کا کام سپرد فرمایا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی محنت سے اس کا نظامِ عمل تیار کیا اور اس میں ماہرِ فن اساتذہ کو جمع کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر چند ہی سال کے بعد عشقِ نبوی کی کشش نے مدینہ منورہ کھینچ بلایا۔ اور آخر عمر تک یہیں وہ پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ علمی و عملی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ قیامِ مدینہ کے دوران میں بکثرت افریقی حضرات ان کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے اور اس طرح افریقہ میں ان کا فیض کافی پھیلا۔ وہ بڑے زاہد، ذکی، فقیہ، تقی الدین اور صاحبِ معرفت عالم تھے۔ بالآخر طویل علالت کے بعد رجب المرجب ۱۳۸۵ھ کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے جنت البقیع میں آسودۂ خواب ہو گئے۔

فیض الباری اور ترجمان السنۃ کے علاوہ انھوں نے کئی اور کتب بھی جو ہر علم

وغیرہ بھی لکھی ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی کتاب زبدۃ المناسک جو حج کے مسائل پر مشہور کتاب ہے، خلاصۃ المناسک کے نام سے اُس کا خلاصہ کیا ہے۔

مولانا محمد یوسف شاہ کشمیریؒ میر واعظ

کشمیر کے معروف میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ کشمیریؒ ۲۴ شعبان ۱۳۱۲ھ کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان کشمیر میں "میر واعظ خاندان" کہلاتا ہے، اور بڑی عظمت و عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میر واعظ کا لقب اس خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آتا ہے۔

مولانا یوسف شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا غلام رسول شاہ ثانی اور مولانا حسین وفائی سے حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند میں چند سال رہ کر ۱۳۳۳ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

مولانا یوسف شاہ نے تعلیم سے فراغت کے بعد سری نگر میں ایک دینی درس گاہ "اورینٹل کالج" کے نام سے قائم کی۔ اس کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ کشمیر جو اب تک حکومت کی بے توجہی سے جہالت کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اُن کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور اس درس گاہ کے ذریعے سے معلم، مدرس، مبلغ اور مساجد کی امامت و خطابت کے لئے لائق افراد تیار کئے جائیں۔ مولانا یوسف شاہ خود بھی اس کالج میں درس دیتے تھے۔ اس درس گاہ نے دینی علوم کی خاصی خدمت انجام دی۔ اورینٹل کالج میں پنجاب یونیورسٹی کے عربی کے امتحانات کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔

مولانا موصوف دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں تحریک خلافت سے بہت متاثر تھے۔ اُنھوں نے کشمیر میں اورینٹل کالج کے علاوہ عام لوگوں میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے لئے ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی قائم کی، آگے یہی سیاسی جد و جہد آگے

چل کر مسلم مجلس میں تبدیل ہو گئی۔ اُنھوں نے کشمیر کے پسماندہ مسلمانوں کی آواز کو
مؤثر بنانے کے لئے "اسلام" کے نام سے ایک سہ روزہ پرچہ نکالا اور پھر اردو سہ روزہ
اخبار "رہبر" کے نام سے جاری کیا، اور اخبار کے چھاپنے کے لئے پریس
لگایا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم سے قبل مولانا یوسف شاہ کسی ضرورت سے پاکستان
گئے ہوئے تھے کہ اسی دوران میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہ پھر وطن واپس نہ آ سکے
کچھ عرصے بعد ان کو پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے حصے میں عارضی حکومت کا صدر بنایا
گیا۔ قیام پاکستان کے زمانے میں اُنھوں نے قرآن شریف کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا
اور مختصر تفسیر لکھی۔ کشمیری زبان میں پورے قرآن شریف کا یہ پہلا ترجمہ اور تفسیر ہے اس کی
پہلی جلد شائع ہو گئی ہے جو سورۂ توبہ تک کے ترجمے اور تفسیر پر مشتمل ہے ترجمے کا رسم الخط
نستعلیق ہے۔

میر واعظ صاحب علمی حیثیت سے اپنے ہم عصر علماء میں ممتاز تھے اور عملی زندگی
میں عبادت و ریاضت اور صدق مقال کے لحاظ سے اُن کی زندگی اسلاف کرام کا عمدہ
نمونہ تھی۔ اہل کشمیر کی دینی اور سیاسی بیداری میں اُن کی مساعی جمیلہ کا بڑا حصہ
ہے۔

۱۴ رمضان ۱۳۸۸ھ (۵ دسمبر ۱۹۶۸ء) کو روزے کی حالت میں عین افطار کے
وقت راولپنڈی میں وفات پائی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کا خاندان اپنے علم و عمل کے لحاظ سے پنجاب میں
مرجع خواص و عوام رہا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس خاندان کے علماء برابر انگریزوں

کے خلاف صف آرا رہے ہیں۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کے مصائب کو انگیز کرتے رہے۔

مولانا حبیب الرحمن ۱۳۱۰ھ (۳ جولائی ۱۸۹۲ء) کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید اور اردو کی تعلیم مدرسہ رحیمیہ کے مدرسے میں پائی پھر کوچہ مسجد جامع مراد امرتسر کے مدرسوں میں پڑھے، ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ یہاں حضرت شاہ صاحب کی صحبت میں انہیں فہم قرآن سے شغف پیدا ہوا، جو سیاسی مصروفیتوں کے باوجود ساری عمر جاری رہا۔

مزاج شروع ہی سے سیاست آشنا واقع ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کے دور میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ تحریک خلافت کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ اسی زمانے میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا مشہور خونی واقعہ پیش آیا، جس نے ان کے جذبۂ حریت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ سرکار کی نافرمانی کے جرم میں گرفتار ہوئے اور پھر ہندوستان کے آزاد ہونے تک قید و بند کا سلسلہ چلتا رہا۔

۱۹۲۹ء میں جب پنجاب میں مجلس احرار قائم ہوئی تو وہ اس میں شامل ہو گئے اور کچھ ہی عرصے کے بعد انہیں مجلس احرار کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ مولانا لدھیانوی مختلف سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ وہ شروع ہی سے جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ ہو گئے تھے اور ۱۹۴۷ء تک برابر جمعیۃ علماء کے رکن رہے۔ ان کی پوری زندگی سیاسی مشاغل میں گزری۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد انہیں انتہائی مجبوری کے عالم میں لدھیانہ چھوڑنا پڑا اور پناہ گزینوں کے ساتھ لاہور چلے گئے اور پھر وہاں سے دہلی آکر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ اور عمر کے آخری دس سال اُن کے یہیں گزرے۔ اس مدت میں فرقہ وارانہ

استحکام کے لئے وہ مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔ مشرقی پنجاب میں مساجد اور اسلامی اوقاف کی واگزاری کی کوشش میں لگے رہے۔ مظلوموں اور ضرورت مندوں کی خدمت گزاری اُن کا جزو زندگی مشغلہ تھا۔

ابھی عمر کی چوتھی منزلیں ہی طے کرنے پائے تھے کہ ۱۱ صفر ۱۳۸۲ھ کو راہی ملک بقا ہو گئے۔ انہیں جامع مسجد شاہجہانی کے متصل قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے خلف الرشید ہیں۔ ۱۳۱۹ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے تاریخی نام لطف الحق ہے۔ نو برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ شروع سے آخر تک دارالعلوم کے اساتذہ سے پڑھا۔ ۱۳۳۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ۱۳۳۸ھ سے ۱۳۵۰ھ تک دارالعلوم میں معین المدرس رہے۔ اسی کے ساتھ افتاء کا کام بھی کرتے رہے۔ ۱۳۵۳ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے۔ وہاں پانچ سال تک مفتی اور مدرس رہے۔ اور ۱۹۳۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک نمک سازی کے زمانے میں سیاسی دلچسپی لے۔ غرض اپنے رفیق حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہو گئے اور پانچ سال تک کلکتہ میں تفسیر، افتاء اور تبلیغ کی خدمات انجام دیں۔ وہاں مفتی صاحب کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ندوۃ المصنفین کا خاکہ تیار کیا۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں ان کی جد و جہد سے یہ ادارہ قرول باغ دہلی میں قائم ہو گیا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی گراں قدر خدمات انجام دی جائیں۔ چنانچہ ندوۃ المصنفین سے اب تک ایک سو سے زیادہ گراں قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو تفسیر و حدیث، تاریخ، لغت، اخلاق اور سیاسیات کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ندوۃ المصنفین سے ایک بلند پایہ ماہنامہ

زبان بھی لکھتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب شروع ہی سے کراب تک ندوۃ المصنفین کے ناظم اور روح رواں ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز تباہی کے باوجود نہ صرف اس ادارہ کو زندہ رکھا بلکہ اپنی ہمت مردانہ سے اس میں از سر نو جان ڈالی اور اجڑے ہوئے گلستان کو دوبارہ گلستان بنا دیا۔

مفتی صاحب کا شمار ملک کے ممتاز اور بالغ نظر ارباب علم و فضل میں ہے۔ بہت سے علمی اور دینی اداروں کے ممبر ہیں۔ عرصے سے مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ کے ممبر بھی ہیں۔ جمعیۃ العلماء ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ کے ہمیشہ دست راست رہے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد جمعیۃ العلماء کے ورکنگ صدر بنائے گئے۔ آج کل مجلس مشاورت کے صدر ہیں۔ قومی اور ملی کاموں سے انہیں ابتدا ہی سے تعلق رہا ہے۔

تحریر اور تقریر دونوں پر انہیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ ندوۃ المصنفین اور قومی و ملی کاموں کی مصروفیت کے باعث اگرچہ خود ان کی کوئی تصنیف سامنے نہیں آسکی۔ مگر ندوۃ المصنفین سے شائع ہونے والی کتابیں درحقیقت انہیں کے ذوق تصنیف اور حسن تدبیر کی آئینہ دار ہیں۔ خودداری و آزادی ضمیر، حریت نفس، معاملہ فہمی، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی ان کے مخصوص اوصاف ہیں۔

۱۹۶۳ء سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔ مجلس میں آپ کی رائے کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

۱۹۰۱ء میں اپنے وطن سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حفظ الرحمن جامع صفات کے ساتھ، ان کا تاریخی نام ہے۔ ان کے والد ماجد

شمس الدین صاحب بھوپال اور پھر میکانیکل یا [illegible] اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے
پر مامور تھے مولانا کے دو بھائی اور تھے والد صاحب نے ان دونوں کو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم
دلائی، دینی علوم کے حصول کی سعادت اپنے خاندان میں صرف ان ہی کے حصے میں
آئی آپکی تعلیم زیادہ تر سیوہارہ کے مدرسہ فیض عام اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں
ہوئی، ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم میں داخل ہو کر صدرا اور شمس بازغہ وغیرہ فلسفہ کی انتہائی
کتابیں پڑھیں اور ۱۳۴۲ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل سے فراغت حاصل کی۔

بعد اس کے ایک مدرسہ کی طلب آنے پر دارالعلوم کی جانب سے ان کو مدراس
بھیجا گیا وہاں پر [illegible] میں ایک سال درس و تدریس اور تبلیغ کاموں میں گزارا،
اس دوران میں ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا، اور دو کتابچے لکھے، جن کے نام یہ ہیں۔
"حفظ الرحمن لمذہب النعمان" اور "اعلام [illegible] اسلام" اسی زمانے میں آپ حج و
زیارت سے بہرہ ور ہوئے، حجاز سے واپسی پر آپ دارالعلوم میں آگئے اور ۱۳۴۸ھ تک
میں دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، بعد ازاں حضرت شاہ صاحب
کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے وابستہ ہو گئے اور تقریباً پانچ سال تک درس
و تدریس میں مشغول رہے۔

۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں آپ انجمن تبلیغ الاسلام کلکتہ کی دعوت پر جس کے سرپرست مولانا
ابو الکلام آزاد تھے کلکتہ چلے گئے، وہاں پانچ سال تک درس قرآن کی خدمت انجام دی
انہوں نے وہاں جس دل نشیں انداز میں قرآن شریف کے مطالب و معارف کو لوگوں
تک پہنچایا اس سے کلکتہ میں بہت جلد آپ کی عظمت قائم ہو گئی، کلکتہ میں ان کی یہ مقبولیت
آخر تک باقی رہی۔

۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں جب دہلی میں ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا تو آپ اپنے
دیرینہ رفیق حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے ساتھ دہلی چلے آئے۔

ندوۃ المصنفین میں انھوں نے بڑی گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیں۔ "اسلام کا اقتصادی نظام"، "اسلامی اخلاق اور فلسفۂ اخلاق"، اور "قصص القرآن" جیسی بلند پایہ اور محققانہ کتابیں لکھیں۔ ندوۃ المصنفین کے قیام سے پہلے وہ سیرت نبوی میں "رسول کریم" اور ۱۹۳۲ء میں دہلی کی ڈسٹرکٹ جیل میں بلاغ مبین لکھ چکے تھے۔

۱۹۴۵ء میں آپ کو جمعیۃ علماء ہند کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علمی شغف کے ساتھ ساتھ انھیں سیاست کے خارزار سے بھی گہری دلچسپی تھی، چنانچہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ ملک و ملت کی خدمت اور تحریک آزادی کی جد و جہد میں بسر ہوا، اور اس سلسلے میں متعدد بار قید و بند کے مرحلوں سے بھی گزرنا پڑا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک میں ہر طرف فسادات پھوٹ پڑے اور کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا، اور جب دہلی میں بھی اس آگ کے شعلے پوری شدت سے بھڑک اٹھے تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ایسے نازک حالت میں انھوں نے غیر معمولی جرات و ہمت اور پامردی سے اُس وقت کے سنگین ترین حالات کا مقابلہ کیا، لیڈروں کو جھنجوڑا اور حکام پر زور دے کر امن و امان کو بحال کرانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا، خوف زدہ مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کیا، غرض کہ اُن کی ان تھک جد و جہد سے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے۔ درحقیقت اُن کا یہ ایسا انتیازی اور زبردست کارنامہ ہے جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اُس کو تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔

اس زمانے میں جب دہلی میں ہر طرف کشت و خون اور لوٹ مار کی گرم بازاری تھی مولانا کے ہندو دوستوں نے اُن سے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ شہر میں آپ کی حفاظت

مشکل ہو گئی ہے، اس لئے ہماری درخواست ہے کہ آپ پناہ گزینوں کے محافظتی کیمپ میں منتقل ہو جائیں۔ مگر انھوں نے بڑی جرأت اور سختی کے ساتھ کیمپ میں چلے جانے کے مشورے کو یہ کہکر ٹھکرا دیا کہ: "ہمارے لئے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزین بن کر رہیں۔ بے شک یہ سخت آزمائش کا وقت ہے مگر ہمیں ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہئے"۔

مولانا حفظ الرحمن کی ان ہی خدمات سے متاثر ہو کر ملت کی بارگاہ سے اُن کو "مجاہد ملت" کے لقب سے نوازا گیا۔ انھوں نے پورے ملک میں دورے کر کے ملت کے شعور کو بیدار کیا اور اس کو وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تحفظ کی زبردست کوشش کی۔ اُن کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک طرف تو انھیں ملت کا اعتماد حاصل تھا اور دوسری طرف حکومت بھی انھیں عظمت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد جن گراں بار ذمہ داریوں سے انھیں دوچار ہونا پڑا انھوں نے ان کی صحت کو خراب کر دیا۔ غیر معمولی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا رہا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص سے پتہ چلا کہ کینسر ہے، علاج کے لئے بمبئی لے جایا گیا۔ مگر مرض کا ازالہ نہ ہو سکا۔ بالآخر علاج کی آخری کوشش یہ کی گئی کہ اُن کو امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ڈھائی مہینے کے علاج سے افاقہ محسوس ہونے پر واپس آگئے مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ بالآخر ۲ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ (۲ اگست ۱۹۶۲ء) کو ملت اسلامیہ کا یہ جانباز مجاہد اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ نئی دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مشہور قبرستان "مہندیوں" میں اُن کی ابدی آرام گاہ ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمن بہت سے دینی مدارس اور اسکولوں اور کالجوں کے رکن رکین تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکیٹو کونسل اور کورٹ کے عرصے تک

ممبر رہے، اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۱۳۴۳ھ سے تا وفات ۱۳۸۲ھ رکن رہے۔

مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

تاریخی نام منظور میاں ہے۔ دیوبند کے مشہور خاندان سادات رضویہ سے تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد بسلسلۂ ملازمت محکمۂ شرعیات تھے۔ تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ قرآن شریف ضلع مظفر نگر کے ایک میاں جی سے پڑھا۔ ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں کے درجۂ فارسی میں داخل ہوئے، اور دارالعلوم سے ۱۳۴۲ھ میں فراغت حاصل کی۔ اولاً صوبہ بہار کے مقام آرہ، شاہ آباد میں مدرس رہے، پھر مدرسۂ شاہی مراد آباد میں مدت تک مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد ازاں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم مقرر ہوئے، اور ایک سال تک ناظم اعلیٰ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ جمعیۃ علماء کے مخلص اور کارگزار لیڈروں میں سے تھے۔ انھیں برطانوی دور میں کئی مرتبہ قید و بند سے گزرنا پڑا۔

مولانا سید محمد میاں صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فقہ اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، وہ نامور مصنف و مؤرخ تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں ان کی سیاسی اور تصنیفی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ علماء ہند کا شاندار ماضی، علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے، سیرت محمد رسول اللہ، تاریخ اسلام، عہد زریں، پانی پت اور بزرگان پانی پت، تحریک شیخ الہندؒ، اور حدیث میں مشکوٰۃ الآثار جو دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں شامل ہے، ان کی اہم تصانیف ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کا تعلیمی نصاب جو دینی تعلیم کا رسالہ کے نام سے موسوم ہے انہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ رسالے اسلامی مدارس و مکاتب کے نصاب میں شامل ہیں۔ جمعیۃ علماء کی سیاسی تاریخ اور

اُن کے ریکارڈ پر اُن کی تقریریں بڑی وسیع ہیں۔ علماءِ ہند کی سیاسی خدمات سے عوام کو روشناس کرنے کے لئے مفتی صاحب نے عظیم تصنیفی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ہندوستان کے آخری عہدِ اسلامی کی تاریخ پر اُن کی بڑی گہری نظر تھی۔ خاتم الملتیں اور اکابرِ دیوبند کی علمی و سیاسی اور دینی و تبلیغی خدمات پر اُن کی تحریریں بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے مصنفین بھی اُن کے حوالے دیتے ہیں۔ اُن کی تصانیف کو قبولِ عام حاصل ہے۔

سیاسی ہنگاموں میں شرکت کے باوجود اپنی سادگی، خلوت نشینی اور اوراد و وظائف کی پابندی، اور علم و فضل میں کامل دستگاہ کے ساتھ تواضع و انکسار، زہد و قناعت، ریاضت و عبادت اور صلاح و تقویٰ میں بزرگانِ سلف کا نمونہ تھے۔

زندگی کے آخری دور میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور ادارۂ مباحثِ فقہیہ کے معتمد رہے۔ [illegible] سے دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔

[illegible] شوال المکرم [illegible] ([illegible] اکتوبر [illegible]) کو [illegible] سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی۔ دہلی میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا محمد بن موسیٰ افریقیؒ

آبائی وطن ضلع سورت میں قصبہ سملک تھا۔ مگر چند پشتوں سے اُن کے خاندان نے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ کو مستقل اقامت بنا لیا تھا۔ وہیں تقریباً [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے والد صاحب نے ہندوستان بھیج دیا۔ یہاں پالن پور میں مولانا نذیر احمد پالن پوری سے پڑھا۔ [illegible] میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور [illegible] میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم میں آنے کے ساتھ ہی حضرت شاہ صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی کا رنگ اُن پر ایسا

غالب آ گیا کہ نشست و برخاست، چال ڈھال، بات چیت اور تمام طور طریق میں ہو بہو اپنے استاذ کا نمونہ بن گئے تھے۔ دولت مند ہونے کے باوجود مزاج، رہن سہن سب میں انتہائی سادگی اور تواضع تھی۔ اور عام طلبہ کی طرح نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے مگر امور خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور نہایت فیاضی سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر جوہانسبرگ چلے گئے، وہاں اپنے وسیع ترین تجارتی کاروبار کے ساتھ بڑے پیمانے پر دینی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اسلامی اور عصری علوم کی تعلیم کے لئے جوہانسبرگ میں وارڈزلی سلوی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، اس کے لئے عالیشان عمارت تعمیر کرائی انسٹی ٹیوٹ کے تمام مصارف اپنے پاس سے پورے کرتے تھے دارالعلوم دیوبند کے طریقے کے مطابق مفت تعلیم کے ساتھ طلباء کے خورد و نوش کا انتظام بھی اُن ہی کی جانب سے تھا۔ جمعیۃ العلماء ٹرانسوال کے ہمیشہ صدر رہے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تعمیر و ترقی میں اُن کی زبردست مالی امداد کا بڑا حصہ ہے۔ علمی کاموں سے بھی ہمیشہ شغف رہا، ڈابھیل میں مجلس علمی[1] کے نام سے ایک تصنیفی ادارہ قائم کیا، جس میں اہم علمی کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا، اور اس کے بھی تمام مصارف اپنے ذمے رکھے۔ علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (وفات ۱۳۲۲ھ) کی کتاب آثار السنن پر حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے دستِ خاص سے لکھے ہوئے حواشی کی، عکس و فلم لے کر اہل علم کے لئے اس کے نسخے شائع کئے۔

---

[1] مجلس علمی ڈابھیل نے حضرت شاہ صاحبؒ اور دوسرے علماء کی نہایت اہم کتابیں شائع کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے علامہ زیلعی کی نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ اور فیض الباری علیٰ صحیح البخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ دونوں کتابیں مصری ٹائپ سے قاہرہ میں طبع کرائی گئی ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے مصنف ابن عبدالرزاق کو آپ ہی کے صاحبزادے کی مالی اعانت سے ایڈیٹ کر کے شائع کیا ہے۔

۲ اپریل ۱۹۶۳ء (۱۰ ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ) کو جوہانسبرگ میں وفات پائی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

تقریباً ۱۳۲۶ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بچھرایوں ضلع مراد آباد ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھا۔ آخر میں دارالعلوم میں ۱۳۴۴ھ میں تکمیل کی۔ بعد ازاں اورینٹل کالج لاہور سے مولوی فاضل کیا۔ پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں دو سال تک مدرس رہے۔ وہاں سے دہلی آ کر مدرسہ عالیہ فتحپوری میں السنۂ شرقیہ کے استاد مقرر ہوئے۔ اسی دوران میں سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے کیا اور شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن کی جگہ سینٹ اسٹیفن کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ پھر ۱۳۶۸ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل بنائے گئے۔

۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کے صدر کے منصب کے لئے آپ کا انتخاب کیا گیا۔ یونیورسٹی میں اس سے پہلے دینیات کا شعبہ بہت معمولی حالت میں تھا۔ مولانا اکبرآبادی نے کمال جدوجہد سے اپنے زمانے میں علمی اور انتظامی دونوں حیثیتوں سے اس شعبے کو ترقی دے کر یونیورسٹی کے دوسرے اعلیٰ معیار کے شعبوں کے برابر پہنچانے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اور اب دینیات کا یہ شعبہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کی طرح معیاری شعبہ بن چکا ہے۔ دینیات (فیکلٹی آف تھیالوجی) میں پی ایچ ڈی کے شعبہ کا اجراء بھی مولانا اکبرآبادی ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

علی گڑھ میں اپنے عہدے کی مدت پوری ہو جانے کے بعد مولانا اکبرآبادی اب

تحقیقات علمیہ (ریسرچ انسٹیٹیوٹ) تغلق آباد نئی دہلی میں علمی کاموں میں معروف ہیں۔

مولانا موصوف ۱۹۳۸ء سے ندوۃ المصنفین دہلی کے بلند پایہ علمی ماہنامہ "برہان" کے مدیر ہیں۔ ان کے رشحات قلم بڑے مدلل، پُرمغز اور فکر انگیز ہوتے ہیں اور جدید و قدیم حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ وہ کئی بلند پایہ اور مختلف کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں اسلام میں غلامی کی حقیقت، غلامان اسلام، وحی الٰہی، فہم قرآن، مسلمانوں کا عروج و زوال اور صدیق اکبر وغیرہ معرکۃ الآراء تصانیف ہیں۔ صاحب قلم ہونے کے علاوہ وہ ایک کامیاب مقرر بھی ہیں۔

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں کناڈا کی مشہور آفاق میک گل یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے جا چکے ہیں۔ ایشیا، روس، افریقہ اور یورپ کے مختلف ملکوں کے دورے کر چکے ہیں، انھوں نے کئی بین الاقوامی سیمیناروں میں بھی شرکت کی ہے۔ موتمر عالم اسلامی قاہرہ میں بھی شرکت کر چکے ہیں، اور بین الاقوامی شخصیت کے حامل ہیں، ۱۹۶۲ء سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی

آپ کا وطن سنبھل ہے، وہیں ۱۵ر شوال ۱۳۲۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پہلے سنبھل ہی میں اور کچھ دن مدرسہ عبدالرب دہلی میں پائی پھر دارالعلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں پڑھا۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند میں دو سال رہ کر ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث کے امتحان میں سب سے زیادہ کامیابی کے نمبر حاصل کئے۔

فراغت کے بعد امروہہ کے مدرسہ چلہ میں تین سال درس و تدریس میں گزارے چار سال تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بحیثیت شیخ الحدیث کے درس دیا [illegible]

میں بریلی سے "الفرقان" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ "الفرقان" کی دو خاص
اشاعتیں "مجدد الف ثانی نمبر" اور "شاہ ولی اللہ نمبر" کے نام سے شائع کیں۔ ابتداءً
"الفرقان" کا رخ مناظرے کی جانب رہا۔ پھر ۱۹۴۲ء سے الفرقان ایک علمی اور دینی مجلے
میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء سے تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ
کے بھی رکن ہیں۔

مولانا نعمانی اردو کے کامیاب مضمون نگار اور مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف عام
فہم ہوتی ہیں۔ طرز نگارش سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ عوام اور خواص دونوں حلقوں میں ان کی
کتابیں مقبول اور پسندیدہ ہیں۔ معارف الحدیث جس کی اب تک چھ جلدیں شائع ہو چکی
ہیں احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب اور شاہکار ہے جس میں احادیث کی تشریح
میں عصر حاضر کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

اسلام کیا ہے؟ دین و شریعت اور "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟" ان کی نہایت
معرکہ آرا تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ کلمہ طیبہ کی حقیقت، نماز کی حقیقت، آپ حج کیسے
کریں؟ برکات رمضان، تحقیق مسئلہ ایصال ثواب، تصوف کیا ہے؟ تذکرہ امام ربانی،
ملفوظات مولانا محمد الیاس، بوارق الغیب (دو جلدوں میں)، معرکۃ القلم، حضرت شاہ
اسمٰعیل شہید پر معاندین کے الزامات، خاکسار تحریک، قرآن مسلم کی روشنی میں، اسلام
اور کفر کے حدود ورقاد، بہشت وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

۱۹۶۲ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ مجلس
کے سب سے پرانے ممبر ہیں اور صحت با قاعدگی کے ساتھ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے
اجلاسوں میں شرکت کرتے ہیں۔

مولانا حامد انصاری غازی

آپ حضرت مولانا منصور انصاری کے پسر، حضرت نانوتوی کے [illegible] رشید ہیں
۱۳۲۷ھ میں انبہٹہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ میں پھر وقت کے مشہور
استاد اور اپنے نانا حضرت مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی سے حاصل کی۔ ۱۳۴۰ھ سے
۱۳۴۲ھ تک دارالعلوم میں پڑھے۔ اردو زبان کے شگفتہ نگار اور صاحب طرز ادیب اور
ممتاز صحافی اور مقرر ہیں۔ "الجمعیۃ" دہلی "مدینہ" بجنور اور "جمہوریت" بمبئی وغیرہ اخبارات
کے مدیر مسئول رہ چکے ہیں۔ اسلام کا نظام حکومت اُن کی مشہور تصنیف ہے جو ندوۃ المصنفین
دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ سیرت نبوی پر "[illegible] عظیم" کے نام سے بھی آپ کی ایک قابل قدر
کتاب ہے۔ شاعری پر بھی کافی قدرت حاصل ہے۔ سیاسیات پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے
سیاسی لحاظ سے مدت تک جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ رہے۔ اور جمعیۃ علماء مہاراشٹر
کے صدر رہ چکے ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۱۳۸۳ھ سے ممبر ہیں۔

۱۳۵۵ھ میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے ہیں۔ اُن کی بارونق اور
پرکشش شخصیت خلق، تواضع اور وقار کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ دارالعلوم کی تقریب
صد سالہ کے انتظامات کے لئے مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے آپ کو منتخب کیا ہے،
جنہیں آپ نہایت خوش اسلوبی اور تن دہی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

شہر میرٹھ کے خاندان قضات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کا خاندان محمد تغلق (۷۲۵ھ
۷۵۲ھ) کے عہد سے میرٹھ میں قضات کے اہم منصب پر فائز اور علم و فضل میں ممتاز
رہا ہے۔ قاضی صاحب اسی خاندان کے چشم و چراغ اور [illegible] روایات کے

۱۳۶۳ھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، اس کے علاوہ مجلس منتظمہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند دہلی کے رکن بھی ہیں اور آل انڈیا دینی تعلیم بورڈ کے صدر ہیں۔

مولانا شمس الحق فریدپوری

ضلع فرید پور (بنگلہ دیش) کے رہنے والے تھے۔ تقریباً ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے، پہلے مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم پائی پھر دارالعلوم میں داخلہ لیا اور یہاں سے ۱۳۴۴ھ میں فراغت حاصل کی۔

مولانا فریدپوری نے اپنی علمی اور تبلیغی خدمات کے لئے ڈھاکہ میں جامعہ قرآنیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، مدرسہ کے لئے عالی شان عمارتیں بنوائیں اور مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مدرسہ ڈھاکہ کے دینی مدارس میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔

مولانا شمس الحق بنگلہ زبان کے بڑے اچھے مصنف تھے، انہوں نے بنگال کے مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دیوبند سے ہی متعلق رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں سب سے پہلے ناظم دینیات مولانا عبدالرشید صدیقی تھے، پھر ان کے فرزند رشید مولانا محمد میاں انصاری نے اس منصب کو سنبھالا اور اب مولانا سعید احمد اکبرآبادی صدر شعبہ دینیات ہیں۔ شعبہ دینیات کو جیسے موجودہ حالات میں مسلم یونیورسٹی کی دوسری علمی فیکلٹیوں کے مساوی کی حیثیت دی گئی ہے اور دینیات کے شعبہ کو یونیورسٹی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو دوسری فیکلٹیوں کو ہے۔

جامعہ ملیہ دہلی میں پہلے مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم ناظم دینیات رہے ہیں۔ اب پھر قاضی زین العابدین سجاد اس منصب پر فائز ہوئے۔ یہ کتنا ایک بڑا اعزاز ہے کہ یہ تینوں عظیم ادارے مسلک کے لحاظ سے ایک مرکز سے مربوط ہو گئے ہیں۔

کو دینی تعلیم سے روشناس کرانے کے لئے بڑی خدمت انجام دی۔ بہشتی زیور کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا جو بنگال میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ بھی حضرت تھانوی کی اور کئی کتابوں کو بنگلہ زبان میں منتقل کیا ہے۔

اخلاص و رجوع الی اللہ کے ساتھ حق گوئی و بے باکی ان کی خاص صفت تھی مشرقی پاکستان کے حکام کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے لیکن جب دین کا معاملہ آجاتا تو پوری بے باکی اور جرأت کے ساتھ اپنی بات کہنے سے چوکتے نہ تھے۔ آخر عمر میں صحت خراب ہو گئی تھی، مگر دینی خدمات کے سلسلے میں ان کے عزم و حوصلے میں کمی نہیں آئی۔

ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا سید فخر الحسن

ماہ رجب ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن قصبہ عمری ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ مظہر حسین تاریخی نام ہے۔ قرآن شریف، اردو دینیات اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حافظ نسیم الدین اور حافظ عبد القادر عمروی سے حاصل کی۔ آپ کے والد، مدرسہ شاہی مراد آباد میں کتب خانہ کے ناظم تھے۔ اس لئے تقریباً ۱۳۳۱ھ میں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہو گئے۔ یہاں فارسی کی تکمیل کی اور درس نظامی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ پھر مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور متوسطات کی تحصیل کی۔ ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۶ھ میں دورہ حدیث کی تکمیل کرکے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس مقرر ہوئے۔ وہاں سے آپ بہار چلے گئے اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صحاح کی بعض کتابیں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ مگر ڈیڑھ سال کے بعد پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں واپس آگئے اور ۸ برس تک مدرسہ

عالیہ کے صدر مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۶۲ھ میں آپ کو دارالعلوم میں بلا کر طبقہ علیا کا مدرس مقرر کیا گیا اور صحیح مسلم اور اصول عشرہ وغیرہ کتابیں درس کی گئیں۔ دارالعلوم میں آپ کے درس صحیح مسلم اور تفسیر بیضاوی کو خاص شہرت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ بیضاوی کی آپ کی درسی تقریر التقریر البیضاوی کی جلد اول شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ وعظ و تقریر میں بھی بہت کمال حاصل ہے۔

۱۳۸۳ھ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی کی وفات کے بعد آپ کو دارالعلوم کا صدر المدرسین بنایا گیا۔ جس پر آپ اب تک فائز ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے آپ کو اجازت و خلافت حاصل ہے۔

مولانا قاضی سجاد حسین کرتپوری

۱۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ کرت پور ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں۔ ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ الہ آباد بورڈ سے مولوی عالم اور فاضل ادب کے امتحانات اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔

مدرسہ عالیہ فتح پوری میں پہلے مدرس مقرر ہوئے، پھر صدر مدرسین بنائے گئے۔

حضرت مولانا مدنیؒ سے بیعت کا شرف حاصل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستان و بوستان کریما، مامقیماں، دیوان حافظ شیرازی کی ملاحسن، گلزار دبستاں، عمید دی، اور پند نامہ وغیرہ فارسی کی درسی کتابوں پر آپ نے اردو میں مفید اور مکمل حواشی لکھے ہیں۔ اور ان کتابوں کو نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ طبع کرایا ہے۔ سبعہ معلقہ کی ایک شرح بھی اردو میں انہوں نے توضیحات کے نام سے لکھی ہے۔

حکومت ہند نے ان علمی خدمات کے اعتراف میں آپ کو فارسی کا ایوارڈ دیا ہے۔

روزنامہ الجمعیۃ وغیرہ میں ان کے بعض مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اردو تحریر و تقریر دونوں پر انھیں اچھی قدرت حاصل ہے۔ علم و فضل کے ساتھ بعض متواضع اور بلند اخلاق ہیں۔ مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے مدتوں سے رکن ہیں۔ دینی تعلیمی بورڈ دہلی کے جنرل سکریٹری کے فرائض کئی سال سے انجام دے رہے ہیں۔ جامع مسجد فتحپوری دہلی (وقف) کے نائب متولی ہیں۔

مولانا مسیح اللہ خان

آپ کا تعلق ضلع علی گڑھ کے مشہور شروانی خاندان سے ہے۔ ۱۳۲۹ھ میں اپنے وطن سرائے برلہ ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتداً سرکاری اسکول میں درجہ ششم تک پڑھا، بچپن ہی سے ذکر و اذکار، اوراد و وظائف اور دینی تعلیم حاصل کرنے کا شوق دامنگیر تھا، اس لئے سرکاری اسکول سے بددل ہو کر تعلیم چھوڑ دی۔ بالآخر مجبور ہو کر والد صاحب نے دینی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ مشکوٰۃ المصابیح تک اپنے وطن میں پڑھا۔ ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا، اور ۱۳۴۷ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے مزید دو سال تک دارالعلوم میں رہ کر معقولات کی کتابیں، امور عامہ، قاضی مبارک، صدرا، شرح چغمینی، سبع شداد وغیرہ پڑھیں۔

زمانۂ تعلیم ہی میں حضرت تھانویؒ سے بیعت کا شرف حاصل کر لیا تھا، اور پھر جلد ہی ۱۳۵۱ھ میں خلافت سے سرفراز ہو گئے۔ حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ اپنے چیدہ مخصوص خلفاء کے نام ایک اعلان میں تحریر فرمایا جسے النور میں شائع کیا۔

"اپنے چند مجازین کے نام لکھتا ہوں، جن کے طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے، ان میں سے جس سے چاہیں اپنی تربیت متعلق کر لیں:"

ان گیارہ مخصوصین میں مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

۱۳۵۷ھ میں حضرت تھانویؒ نے انھیں جلال آباد کے ایک مدرسہ میں مدرس بنا کر

سمجھو یا۔ اُس وقت یہ مدرسہ صرف ایک مکتب کی حیثیت میں قائم تھا۔ مگر چند ہی سالوں میں آپ کی مخلصانہ جدوجہد اور خون جگر کی آبیاری سے اس مدرسے کا شمار جو اب مفتاح العلوم کے نام سے موسوم ہے، ہندوستان کے بڑے مدارس میں ہوتا ہے۔ مولانا موصوف کی مسلسل جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے مدرسہ میں عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں مدرسے کا مدرسہ نہایت وسیع اور مسجد دیدہ زیب ہے۔

آپ کے یہاں جمعرات بعد نماز جمعہ ایک عام مجلس ہوتی ہے جس میں مدرسے کے اساتذہ و طلباء کے علاوہ گرد و نواح کے قریہ جات کا ایک بڑا مجمع ہوتا ہے۔ مکیا حضرت تھانوی کے ملفوظات و مواعظ خود پڑھ کر سناتے ہیں۔ آپ کے قریبیں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ پیچیدہ مسائل و مباحث کو آسان اسلوب میں مثالوں اور واقعات و حکایات کے ذریعے سے سمجھانے میں انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔

فن تصوف پر آپ کی ایک کتاب شریعت و تصوف ہے، جو حضرت تھانوی کی تصوف سے متعلق کتابوں سے ماخوذ ہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں تصوف کے مسائل و مضامین کو نہایت سہل اور آسان انداز میں اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ ایک عام آدمی بھی ان مسائل کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مولانا کا فیضان عام ہے اور ہند سے گزر کر بیرون ہند تک پہنچ رہا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوری

ضلع پشاور کے ایک اہل علم اعتقادانہ سادات کے فرد ہیں۔ اُن کے والد ماجد مولانا محمد زکریا صاحب بلند پایہ عالم اور معروف شخصیت تھے۔ اُن کا خاندان حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے صوبہ سرحد کا واجب الاحترام خاندان رہا ہے۔ اگرچہ مولانا بنوری نے باقاعدہ دارالعلوم میں داخلہ نہیں لیا مگر ان کا تعلیمی تعلق دیوبند دارالعلوم کے اساتذہ ہی سے رہا ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی

۹ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد علیؒ (وفات ۱۳۴۶ھ) اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عالم اور حضرت شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ (وفات ۱۳۱۳ھ) کے اجلّ خلفاء میں سے تھے۔ قرآن شریف اور فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ دس سال کی عمر میں حیدرآباد دکن چلے گئے، وہاں ایک سال رہ کر مفتی عبداللطیف صاحب (وفات ۱۳۷۹ھ) سے عربی صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہو کر چار سال تک زیرِ تعلیم رہے۔ اسی دوران میں اُس وقت کے نامور عالم مولانا حفیظ اللہ (وفات ۱۳۶۲ھ) سے تفسیر اور اصول کا درس لیا۔ ندوۃ العلماء کے ممتاز طلبہ میں مولانا رحمانی کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۳۴۸ھ میں تکمیلِ علوم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۵۲ھ میں دارالعلوم سے سندِ فراغ حاصل کی۔ حضرت مولانا مدنیؒ کے مخصوص تلامذہ میں ہیں۔ انگریزی زبان سے بھی بقدرِ ضرورت واقفیت ہے۔ تقریر و تحریر دونوں میں بہرہ ور ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا طرزِ نگارش سادہ، عام فہم اور دلکش ہے۔ انھیں زبان و بیان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے۔

۱۹۳۶ء میں بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین بنائے گئے۔ خانقاہ رحمانی کو اُن کے والد ماجد نے مشرقی ہندوستان میں ایک بڑا علمی دینی اور تبلیغی مرکز بنا دیا تھا۔ مسندِ سجادگی پر متمکن ہونے کے بعد خلقِ خدا کی اصلاح کی طرف متوجہ

---

[۱] حضرت مولانا سید محمد علیؒ کے حالات کے لئے سیرت مولانا سید محمد علی دیکھئے۔ [۲] تفصیل کے لئے تذکرہ مولانا فضل رحمن مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مراجعت کی جائے۔

ہو گئے بہار، اڑیسہ اور بنگال میں اُن کے مریدین و مسترشدین کا ایک وسیع حلقہ ہے ۱۹۶۲ء سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں مجلس میں ان کی اصابت رائے کو اہم مقام حاصل ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کو امارت شرعیہ صوبہ بہار و اڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا گیا اور ماضی کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رہتا ہے غرض کہ ان کی ذات شریعت و تصوف کے ایک حسین سنگم کی حیثیت رکھتی ہے

جامعہ رحمانی کا از سر نو قیام اور اس کی غیر معمولی ترقی اُن کا ایک اہم علمی اور انقلابی کارنامہ ہے، جامعہ رحمانی کا شمار اس وقت بہار کے بڑے دینی مدارس میں ہوتا ہے، جامعہ رحمانی کے کتب خانے نے اُن کے زمانے میں بڑی ترقی کی ہے کتب خانے میں قدیم و جدید علوم کی منتخب کتابوں کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔

مولانا رحمانی کے زمانے میں امارت شرعیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے، بہار اور اڑیسہ میں جابجا اس کی شاخیں قائم ہیں، یہ ادارہ شرعی قوانین کو اپنے حلقہ اثر میں قائم کئے ہوئے ہے۔

مولانا رحمانی ۱۹۶۴ء میں موتمر عالم اسلامی قاہرہ (مصر) میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت فرما چکے ہیں۔ سفرنامہ مصر ان کی سعی اور ثقافتی سفر کی تاریخی یادگار ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مسلمانوں کے عائلی قوانین کے سلسلے میں اُن کی زبردست خدمات ہیں، ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ جن مختلف مسالک کے نمائندگان مذہب کو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب (صدر مسلم پرسنل لا بورڈ) نے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تھا، مولانا رحمانی کو ان سب مختلف المسالک جماعتوں کا اعتماد حاصل ہے۔

مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

دیوبند کے ... تھے ۱۴ اگست ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے اور حافظ عبدالحق مرحوم سے قرآن شریف حفظ کیا، پھر تین سال تک فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بہٹ (ضلع سہارنپور) کے مدرسہ میں رہ کر پڑھیں۔ بعد ازاں دارالعلوم میں داخل ہو کر درس نظامی کے نصاب کی تکمیل کی۔ ۱۳۶۳ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوال ۱۳۶۳ھ میں مدرسہ امداد العلوم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ انھیں جملہ علوم و فنون میں کامل دست گاہ حاصل تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے حدیث اور اسناد سے خاص مناسبت پیدا ہوئی۔ تقریباً ۱۳۶۵ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے صدر المدرسین بنائے گئے۔ وہاں درس حدیث کے ساتھ افتاء کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۹ سال کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (ضلع سورت) میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، وہاں صحیح بخاری و جامع ترمذی زیر درس رہیں۔

۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں بلا لیا گیا۔ علم حدیث سے خاص شغف تھا، حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ کے بعد بخاری شریف کے درس کو سنبھالنا اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہے۔ ... مستقلاً شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور علوم دینیہ کے طلباء کی خدمت میں گذری، اُن کا درس علمی رنگ لیے ہوئے ہوتا تھا، طلباء حدیث ان کے درس سے مطمئن ہو کر اٹھتے تھے، وفات سے چند گھنٹے قبل تک یہ علمی فیضان جاری رہا۔

مولانا شریف حسن صاحب علم و عمل، تقویٰ و طہارت اور محاسن اخلاق و

شمالی بہار کے علماء اکابر کی یادگار تھے، وہ اپنے علمی تبحر اور علم حدیث سے خصوصی تعلق و شغف اور اپنی پاکیزہ نفسی کے باعث اپنے معاصرین علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے ظاہر و باطن دونوں پاک تھے، طبیعت نہایت مرنجان مرنج پائی تھی۔

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ کی درمیانی شب میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں بعارضۂ قلب چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد واصل بحق ہو گئے، رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً قبرستان چنداکس میں ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

مولانا اشرف علی کمرلائی

بنگلہ دیش کے ضلع کمرلا کے رہنے والے ہیں ۱۳۷۲ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، درس و تدریس کے علاوہ تقریر و خطابت، وعظ و تلقین، دینی و سماجی اصلاح اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے بنگال میں قابل قدر علمی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، مدرسہ لالوڑی، دارالعلوم جبرہ ٹاکر پور، سینیئر مدرسہ بیت نگر کے مدرسہ عالیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں، درس نظامی کی قریب قریب ساری ہی کتابیں پڑھانے کا ان کو اتفاق ہوا ہے، بنگال میں سیکڑوں طلباء ان سے دینی و علمی فیض حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے علاقے میں فتویٰ نویسی کا اہم کام بھی انجام دیتے ہیں، اور میدان مناظرہ میں اپنی صلاحیتوں کے غیر معمولی جوہر دکھا کر اہل علم سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

بنگلہ زبان کے فصیح بیان اور پرجوش مقرر ہونے کے ساتھ وہ ایک کامیاب مضمون نگار، مترجم اور مصنف بھی ہیں، عرصہ ہوا جب انھوں نے شمائل ترمذی اور صحیح البخاری کے ترجمے بنگلہ زبان میں شروع کئے تھے، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ترجمے پورے ہوئے یا نہیں۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب سے بیعت ہیں، عالم باعمل ہیں

نظامِ اسلام پارٹی کے قائم ہی اپنے ملک میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے پیش کوشاں رہے ہیں۔

مولانا مفتی محمود

ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ضلع میں کلاچی کے رہنے والے ہیں، سالِ پیدائش تقریباً ۱۹۱۹ء ہے۔ ابتدا وطن اور بلوچستان میں تعلیم پائی، شروع ۱۹۳۸ء میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ نجم المدارس کلاچی وغیرہ میں درس و تدریس کی خدمات پانچ چھ سال تک انجام دیں۔ کوٹ اعظم میں قرآن شریف اور اُردو کا ایک مدرسہ جاری کیا۔

انھیں حدیث اور فقہ میں اچھی بصیرت حاصل ہے۔ پاکستان میں ان کے فتاوی قدر و قیمت اور اعتبار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، پاکستان کے ممتاز علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دینی علوم میں بصیرت کے ساتھ ساتھ عصری علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ حق گوئی میں جری اور بے باک ہیں۔ جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کی نظامت کے منصب پر فائز ہیں۔ ایک زمانے میں پاکستان اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، صوبہ سرحد میں کچھ عرصے تک وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں، اور اپنے دورِ حکومت میں بہت سے شرعی منکرات کو آپ نے مٹا دیا تھا۔ مؤتمر عالم اسلامی میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

آج کل ان کی علمی اور سیاسی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔ قادیانی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے میں آپ کی مساعی اہمیت رکھتی ہیں۔ آج کل پاکستان کے متحدہ محاذ کے صدر ہیں، پاکستان کی سیاسیات میں انھیں نمایاں مقام حاصل ہے۔

۞

باب پنجم

صدر مدرسین

دارالعلوم دیوبند اپنے آغاز ہی سے ہندوستان میں علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ اسی خصوصیت کی کشش تھی کہ ہندوستان کے علاوہ دور دراز ملکوں سے طلبہ بھی یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ دارالعلوم میں صدارت تدریس کی مسند پر ہمیشہ ایسے علماء فائز رہے ہیں جو اپنے علم و فضل خصوصاً علم حدیث کے ساتھ زہد و تقویٰ اور سلوک و معرفت میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ طالبان علم اُن سے علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

دارالعلوم کے اس عظیم منصب پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فائز ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مملوک علیؒ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے تحصیل علوم کی تھی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ منظور علی، غلام حسین اور شمس الضحیٰ اُن کے تاریخی نام ہیں۔

قرآن مجید نانوتہ میں حفظ کیا۔ اسی طرح ۱۲۳۰ھ تک جب کہ ان کی عمر گیارہ سال کی تھی ان کے والد ماجد اُن کو دہلی لے گئے۔ میزان منشعب اور گلستاں سعدی سے ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ تمام علوم متداولہ اپنے والد ماجد سے حاصل کئے۔ البتہ علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے کی۔ علوم منقول و معقول میں اپنے والد ماجد کے مثل تھے۔ ذہن نہایت رسا پایا تھا۔

ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ میں حضرت مولانا مملوک العلی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے ایک سال بعد تک دہلی میں قیام رہا۔ بعد ازاں اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں منشی کا تقرر ہوگیا۔ مکتوبات یعقوبی میں لکھا ہے:

"اجمیر میں ۳۰ روپے پر ملازم ہو کر تشریف لے گئے۔ اُس وقت آپ بہت کم سن تھے۔ پرنسپل اجمیر کالج نے دیکھ کر کہا "مولوی تو اچھا ہے، مگر لڑکا سا اور کم سن ہے"۔ پرنسپل کی سفارش پر آپ کو ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ دیا گیا، مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔ بعد ازاں آپ کو ۶۰ روپے ماہوار پر بنارس بھیجا گیا۔ وہاں سے ڈیڑھ سو روپے کی تنخواہ پر ڈپٹی انسپکٹر بنا کر سہارنپور میں تقرر ہوا۔ یہیں غدر کا واقعہ پیش آیا۔"[1]

اُس زمانے میں نانوتہ میں قیام رہا۔ سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر سبکدوش ہوگئے۔ اور میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں ملازم ہوگئے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب کو نیز اُن کی دوستی کے سبب سے اس کی تصحیح کی خدمت تھی۔ یہ کام برائے نام تھا۔ مقصود اُن کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا۔ پھر اس زمانے میں دہلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں

---

[1] مکتوبات یعقوبی ص ۵ مطبوعہ مجتبائی میرٹھ ۱۳۲۲ھ

اسی چھاپے خانہ میں نوکر ہو گئے۔ ۱۲۸۳ھ میں دیوبند تشریف لائے اور یہاں صدارت تدریس کی مسند پر فائز ہوئے۔ دارالعلوم کے پہلے شیخ الحدیث تھے۔ ان کے فیض تعلیم و تربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کئے، جو آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ۱۹ سالہ کی مدت میں ۹۰ طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تکمیل کی، جن میں مولانا عبدالحق پورقاضوی، مولانا عبداللہ انبہٹوی، مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علی خاں مراد آبادی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حافظ محمد احمد، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ———— رحمہم اللہ جیسے مشاہیر روزگار عصر علماء شامل ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اور اُن کے تلامذہ کے فیض تعلیم کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوپاک بنگلہ دیش، افغانستان اور وسط ایشیا میں جتنے علماء موجود ہیں ان کی بڑی تعداد اسی خوان علم کی زلّہ ربا ہے۔ اُن کے طرز درس کی نسبت اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ جو علاوہ ہر فن میں ماہر ہونے کے بہت بڑے صاحب باطن اور شیخ کامل بھی تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا ممدوح سے بڑے بڑے فیوض و برکات حاصل کئے ہیں اور زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ انہیں سے حاصل فرمائے ہیں، اور مولاناؒ کے اکثر اقوال و احوال و حقائق و معارف نہایت لطف لے کر بیان فرمایا کرتے ہیں، اور اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت درس کیا دیتے تھے حلقۂ توجہ ہوتا تھا، یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے، آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار

۱۔ سوانح قاسمی، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

آسمان جاہ کی پیش کش

حضرت مولانا محمد یعقوب نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے سلوک و معرفت کے مقامات طے کئے تھے۔ اکثر جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی۔ دنیوی علائق کی جانب مطلق توجہ نہ تھی۔ انھوں نے جو خطوط اپنے ایک مرید منشی محمد قاسم نیانگری کے نام لکھے ہیں وہ سلوک و معرفت کا مرقع اور حقائق تصوف کا دستور العمل ہیں۔ سالک کے لئے وہ ایک جامع ہدایت نامہ ہیں۔ راقم سطور کے فاضل دوست محمد ایوب صاحب قادری کی رائے ہے کہ مکتوبات یعقوبی چشتی سلسلے کے مشہور شیخ مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی (وفات ۸۰۸ھ) کے مکتوبات کا مختصر اردو ایڈیشن معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوط کا مقصود حیات تابع شریعت اور اطاعت خداوندی ہے۔[1]

باوجودیکہ مزاج میں جلال اور جذب کا غلبہ تھا اور اس کے رعب و اثر کا یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق و تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح مزاج میں بڑا استغنا تھا جس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب نے جن کو مولانا کے مزاج میں بڑا دخل تھا عرض کیا کہ فلاں نواب صاحب کی بڑی خواہش ہے کہ ایک مرتبہ آپ اُن کے یہاں تشریف لے جائیں۔ مولانا نے فرمایا "ہم نے سُنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے یہاں جاتا ہے۔ نواب صاحب اُسکو سو روپے دیتے ہیں۔ اور ہم تو خود بلائے ہوئے ہیں اس لئے شاید دو سو روپے دے دیں۔ سو دو سو روپے ہمارے کس کام کے۔ ہم وہاں جا کر مولویت کے نام کو دھبہ نہ لگائیں گے"[2][3]

---

[1] اشرف السوانح جلد اول ص ۴۳ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی۔

[2] مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۰۶ مطبوعہ جاوید پریس کراچی

[3] ارواح ثلاثہ یعنی حکایات ۳۵۳ و ۳۴۴ ۔

مکتوبات یعقوبی کے دیباچہ نگار حکیم امیر محمد عشرتی لکھتے ہیں۔

"آپ کے صدہا شاگرد و مرید اور شاگردوں کے شاگرد و مرید ہندوستان، کابل و بخارا وغیرہ میں موجود ہیں۔ آپ جامع علوم معقول و منقول یعنی فاضل اجل اور عالم متبحر ہونے کے علاوہ سالک و صوفی بھی تھے اور جیسے کہ آپ روحانی طبیب تھے اسی طرح امراض ظاہری کا بھی علاج کرتے تھے۔

آپ نہایت خوش وضع خوش خلق خوش خو، خوش لہجہ و خوش گفتگو تھے، بڑے صاحب کمال و مکاشفات تھے۔ آپ سے بہت پیشین گوئیاں صادر ہوئیں، جن میں بعض کا صدور ہو چکا ہے جو باقی ہیں ان کا انتظار ہے۔"

مولانا کے کشف کے حیرت انگیز واقعات سننے میں آئے ہیں۔ ایک مرتبہ جامع مسجد میں یہ ذکر چھڑا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسا زبردست تسلط حاصل کر لیا ہے کہ ان کا اکھڑنا آسان نہیں، مولانا اس مجلس میں موجود تھے چونک کر بولے کیا کہا ـــــ رات کو ان کی حکومت ہوگی اور دن کو ان کی، ہندوستان شطرنج کے صف کی طرح پلٹ جائے گا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۴، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں ایسا ہی نہیں ہوا!

دوسرا واقعہ اور اما ملاحظہ ہیں ایک ایسے شخص کی روایت سے درج ہے جو خود اس وقت موجود تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کا جشن ہوا، حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ دہلی میں مقیم تھے اور دن میں اکثر غائب رہتے تھے، راوی کا کہنا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ آپ کہاں غائب رہتے ہیں، فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ روزانہ دہلی میں گشت کروں جو جگہ بار قدم جائے گا وہ جگہ آباد کر دی جائے گی، اس لئے شب کے وقت میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران شدہ مقامات پھر سے آباد ہو جائیں۔

ــــه امروز جمال قریشی مقالہ ۱۹۶۳ء = ۴۴

اپنے بھانجے مولانا خلیل اختر اجیٹھوی کو بھوپال بھیج دیا۔

مولانا محمد یعقوب شعر و شاعری سے ذوق رکھتے تھے۔ تخلص تخلص تھا۔ انھوں نے دہلی میں بزمانہ طالب علمی غالب، مومن، ذوق، صہبائی اور آزردہ جیسے یگانۂ روزگار شعراء کو دیکھا تھا۔ اور ان کی مجالس سخن کے ہنگاموں سے اُن کے کان آشنا تھے۔ اپنے ایک خط میں اپنے مرید منشی محمد قاسم بنگلوری کو مشورہ دیا ہے کہ وہ درد، سودا اور ذوق کے کلام کو پڑھا کریں۔ اس میں درد و اثر ہے۔ مولانا کا فارسی اور اُردو کلام بیاض یعقوبی میں درج ہے۔ اشعار میں قدرت کلام کے ساتھ سوز و گداز اور درد و اثر پایا جاتا ہے۔

تصانیف میں تین رسالے اُن کی یادگار ہیں۔ سوانح قاسمی اگرچہ بہت مختصر سوانح حیات ہے مگر زبان و بیان اور معلومات و واقعات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

ان کا دوسرا مجموعہ مکتوبات یعقوبی ہے جو ۴۰ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط، مستفسرات کے جوابات میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں تصوف و سلوک کی دشواریوں کا حل، مسائل شرعیہ کا ذکر اور طریقت و سلوک کا دستور العمل بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا مجموعہ بیاض یعقوبی ہے۔ یہ سفر حج کے حالات، کتب احادیث کی اسانید، متفرقات علمیہ پر مشتمل ہے۔ آخر میں چند نسخے درج ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے دونوں مجموعوں پر حسب ضرورت حواشی تحریر فرمائے ہیں۔

وفات سے چند دن پہلے دہلی سے وطن نانوتہ تشریف لے گئے تھے، وہیں بمرض ہیضہ ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ داعی اجل کو لبیک کہا۔

مکتوبات یعقوبی کی یادداشت میں لکھا ہے:

شب شنبہ یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ جناب مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۱؎ مکتوبات یعقوبی ص ۹۰

چنانچہ آپ کی علمی و دینی صلاحیتوں کے پیش نظر دارالعلوم کی مسند تدریس کے لئے اکابر کی
نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر
عمل میں آیا۔ اس کے بعد بتدریج ترقی کرتے ہوئے ۱۳۰۵ھ میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔
ظاہری علم و فضل کے ساتھ باطنی کمالات سے بھی آراستہ تھے۔ ۱۲۹۴ھ میں اپنے استاد حضرت
نانوتوی کی معیت میں حج سے مشرف ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ
سے شرف بیعت حاصل کیا۔ اس سفر حج میں علماء کا ایک بڑا قافلہ بن گیا تھا جس میں حضرت
نانوتوی کے علاوہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ حضرت
مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ، مولانا احمد حسن
کانپوری جیسے علماء شریک تھے۔ قافلے کے جملہ حضرات کی تعداد سو کے قریب تھی۔
حضرت شیخ الہندؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت بھی حاصل تھی۔ دارالعلوم میں
صدارت تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۱۰۰ روپے تھا مگر آپ نے ۷۵ روپے سے زیادہ کبھی
قبول نہیں فرمائے۔ بقیہ ۲۵ روپے دارالعلوم کے چندے میں شامل فرما دیتے تھے۔ آپ کی
زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ آپ کے
زمانے میں ۸۶۰ طلباء نے دورۂ حدیث نبوی سے فراغت حاصل کی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض تعلیم نے
حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا منصور
انصاری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا
شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخر الدین احمد، حضرت
مولانا محمد اعزاز علی امروہی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا سید مناظر احسن
گیلانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت
تیار کی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس کی خصوصیت کی نسبت مولانا میاں اصغر حسین

نے لکھا ہے:

"حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن و حدیث حضرت کی نوکِ زبان پر تھا، اور ائمہ اربعہ کے مذاہب اور صحابہ و تابعین، فقہا و مجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں دریا کی لہریں پھوٹتی تھیں، درس میں لطف آتا تھا، نہ صرف مختلف الفاظ سے تقریر کو جامع الفصول اور مختصر کی جاتی تھی، شستہ اور سہل الفاظ با محاورہ اردو میں، بڑی روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی نحیف اور منکسر المزاج ایک مشتِ استخوان ضعیف الجثہ، مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالبِ علم معلوم ہوتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی، لیکن درس گاہ کے دروازے تک بے تکلف قابلِ فہم آواز آتی تھی، لہجہ میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دل نشین ہو جاتی تھی۔ اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ وہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔

بہت سے ذکی، مستعد اور ذہین و فطین طالبِ علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے شکوک و شبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے معانی اور مطالبِ عالیہ سن کر سب پیاس ختم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور ان کے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابو حنیفہؒ کا مذہب آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجے میں جوش پیدا ہو جاتا

شعلہ بھڑک اٹھا یہ دور حضرت شیخ الہندؒ کے لئے بڑی بے چینی اور اضطراب کا تھا۔ انڈین
نیشنل کانگریس کا منصب ابھی اسی وقت تک حقوق طلبی کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی تھی یہ حالات
تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو ایک انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں
نے مسلح انقلاب کے ذریعہ سے برطانوی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا ایک منصوبہ تیار کیا جیسا کہ
آگے چل کر معلوم ہوگا یہ بڑا منظم منصوبہ تھا۔

۱۹۱۴ء کا زمانہ دنیائے اسلام کے لئے سخت ابتلا کا زمانہ تھا یورپ کی حکومتوں
نے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعے یہ طے کیا کہ ترکی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کا
آغاز ترکی کے مقبوضہ علاقے طرابلس پر اٹلی کے حملے سے ہوا۔ فرانس نے مراکش پر غاصبانہ قبضہ
کر لیا بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ترکوں پر پے در پے حملے شروع کر دیے۔ اس
کا مدعا ان کے پس پردہ تمام تر برطانوی سیاست کار فرما تھی۔ یہ واقعات ہندوستانی مسلمانوں
کے لئے تشویشناک تھے۔ ترکوں کے خلاف انگریز اور دوسری یورپی قومیں جس طرح برسر
جنگ تھیں اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا تہیہ کر چکی تھیں اس سے مسلمانوں کے جذبات بے حد
مشتعل تھے۔ اس لئے انگریزوں سے نفرت بڑھ رہی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں
میں بڑا جوش اور ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ ساری دنیا کے مسلمان خلافت عثمانیہ کو اسلام کا پشت
پناہ سمجھتے تھے اور اسے عظمت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کے حکمرانوں کو خلیفۃ المسلمین
اور خادم الحرمین الشریفین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اسی زمانے میں ہندوستان کے اندر مسلح انقلاب کے ذریعے
انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس کے لئے انہوں نے
نہایت منظم طور پر اپنا پروگرام مرتب کیا تھا۔ اُن کے شاگردوں، دوستوں اور رفقائے کار کی ایک بڑی
جماعت جو ہندو بیرون ہند کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، ان کے مجوزہ پروگرام کو کامیاب
بنانے کے لئے نہایت سرگرمی اور جانبازی کے ساتھ کوشاں تھی۔ شاگردوں میں مولانا

عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری وغیرہ وہ حضرات بہت سے تلامذہ اس میں شامل
تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف
کر دیں۔ یہ بڑی منظم تحریک تھی۔ اس نے آزادی کے لئے آئندہ پورے ہندوستان میں
فضا ہموار کر دی۔ یہ کام دو محاذوں سے شروع کیا گیا تھا۔ ایک محاذ اندرون ملک کا تھا
اور دوسرا ملک سے باہر۔ دونوں محاذوں پر مسلح جدوجہد کی تیاری کی جا رہی تھی۔

اس وقت عام خیال تھا کہ طاقت کے بغیر انگریزوں کا ہندوستان سے نکال دینا
ممکن نہیں ہے۔ اور چونکہ ہندوستانیوں سے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں اس لئے جنگ آزادی
شروع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلحہ اور سپاہ کی غیر ملکی امداد و اعانت حاصل کی جائے۔
اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ کی نظر سب سے پہلے افغانستان پر گئی۔ ہندوستان اور
افغانستان کی سرحدیں ملی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہاں سے مدد اور اسلحہ کا حصول سب سے زیادہ
آسان تھا۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کی سرحد پر بسنے والے آزاد قبائل سے مدد مل سکتی
تھی۔ اسلحہ اور سپاہ کا مرکز یاغستان کے آزاد علاقے کو بنایا گیا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے صوبہ سرحد کے ان علماء سے جو دارالعلوم کے طالب علم رہ چکے
تھے رابطہ قائم کیا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان سے لے کر ہندوستان تک انگریزوں
کے خلاف ایک جال بچھا دیا جائے اور کسی مناسب موقع پر ہندوستان اور آزاد قبائل کی
منظم طاقت بیک وقت ہند پر حملہ آور ہو اور دوسری طرف ملک بھر میں جنگ آزادی کا آغاز
کر دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسی صورت ہوگی جس کا انگریز مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

ہندوستان کی آزادی کے لئے باہر کی حکومتوں سے بھی اس سلسلے میں مدد لینا ضروری
تھا۔ اس بنا پر آپ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو ایک خاص مشن پر کابل جانے کا حکم دیا اور
مولانا محمد میاں منصور انصاری کو آزاد قبائل میں جہاد کی تلقین کے لئے بھیجا اور ترکوں سے
مدد حاصل کرنے کے لئے خود حجاز کا سفر کیا۔ انگریز اس زمانے میں جرمنی سے جنگ میں مصروف تھے

رولٹ کمیٹی[1] کے پیراگراف ۱۴۴ میں سرکاری طور پر ریشمی خطوط کی تحریک کے متعلق جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان کا ملخص یہ ہے:۔

اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے وجود کا انکشاف ہوا۔ یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں ہی مرتب کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحد پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے مولوی عبید اللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبید اللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا۔ اس نے دیوبند میں مذہبی تعلیم حاصل کی۔ عبید اللہ نے جن لوگوں کا پتا چلایا ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی۔ جو مدتوں اس مدرسے کے صدر مدرس رہے ہیں۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے فارغ التحصیل علماء کے ذریعے سے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی تحریک چلائے۔ مولانا محمود حسن کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوتے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے ہندوستان چھوڑ دیا اور حجاز پہنچ گئے عبید اللہ اور مولانا محمود حسن کا اہم مقصد یہ تھا کہ بیک وقت ہندوستان پر باہر سے بھی حملہ کرایا جائے اور ہندوستان میں بھی بغاوت پھیلائی جائے۔ عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت مجاہدین سے ملاقات کی پھر کابل پہنچے۔ وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترک جرمن مشن سے ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں بھی اس

---

[1] ہندوستان میں عام سیاسی بے چینی کا سیلاب روکنے کے لئے برطانوی حکومت نے ۱۹۱۷ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی جس نے بہت سی خفیہ جماعتوں کے حالات کا سراغ لگایا۔ اس تحقیقاتی کمیٹی کا صدر ایک انگریز جج رولٹ تھا، انہی کے نام پر یہ کمیٹی موسوم ہے (تاریخ جمعیۃ علماء ہند۔ ج ۱۔ ص ۱۴۴)

میں برطانوی حکومت کا تختہ الٹ کرنے کے لئے امداد طلب کی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ
کے دستخط تھے۔ زار روس کو جو خط لکھا گیا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ اس میں عارضی حکومت
کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ زار کی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے
کے لئے عبیداللہ نے ۹ رمضان ۱۳۳۴ھ کو مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا۔ اس کے ساتھ
دوسرا خط محمد میاں انصاری کا تھا جس میں غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا۔ عارضی حکومت
اور جنود اللہ کے نام سے فوج کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی بھرتی ہندوستان
سے کرنے کی تجویز ہوئی تھی۔ عارضی حکومت کا کام اسلامی حکومت کے درمیان اتحاد کا سلسلہ
قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ
تک پہنچا دیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر لکھے گئے تھے۔[1]

عبیداللہ کے خطوط میں جنود اللہ کا مکمل و مرتب نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم
ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن کو اس کا سالار اعلیٰ بننا تھا۔ ثانوی مرکز مقامی سالاروں کے
ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے۔ کابل کا سالار عبیداللہ کو بننا تھا۔ اس
فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جنرلوں اور کئی اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ یہ
ریشمی خطوط برطانوی حکومت کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان خطوط میں جو اطلاعات درج ہیں ان کی
وجہ سے چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں۔ ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار ساتھی
برطانوی حکومت کے قبضے میں آ گئے۔ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب
نامہ پر دستخط کرنے والے غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہیں۔ انہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن
پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا جس پر میں نے دستخط کئے تھے۔[2]

۱؎ ان ہی خطوط کی وجہ سے حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی خطوط کے نام سے موسوم ہے

۲؎ رولٹ کمیٹی رپورٹ ... ص ۱۷۸ ... بحوالہ نقش حیات جلد دوم ص ۲۲۳ – ۲۲۴

مالٹا میں مولانا حسین احمد مدنی کو بھی نظر بند رکھا گیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر آپ کو ہندوستان
آنے کی اجازت ملی اور ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو آپ نے ساحل بمبئی پر قدم رنجہ
فرمایا۔ دیوبند پہنچ کر آپ سب سے پہلے دارالعلوم میں تشریف لائے، بعد ازاں مکان
تشریف لے گئے۔

ہندوستان پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ تحریک خلافت میں شریک ہو گئے۔
برطانوی حکومت کے خلاف آپ نے ترکِ موالات کا فتویٰ دیا، جس سے ملک میں زبردست
ہیجان پیدا ہو گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے منصوبے کے انکشاف کے بعد اگرچہ ریشمی خطوط کی
تحریک بظاہر ختم ہو گئی، مگر حضرت شیخ الہندؒ کے جذبۂ حریت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہندوستان
پہنچنے پر برطانوی حکومت نے مختلف ذریعے سے آپ کو سیاسیات سے کنارہ کش رہنے پر
آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ بمبئی میں جہاز سے اترنے پر مولانا
شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں سے ملاقات ہوئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی
لکھنؤ سے اور گاندھی جی احمد آباد سے آکر بمبئی میں ملے، دوسرے لیڈروں سے بھی باتیں
ہوئیں۔[1] حضرت شیخ الہند خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ آزادی وطن کی تحریک

---

[1] سید محمد میاں [illegible] ۔ [illegible] کے ملاقات میں [illegible]
مالٹا سے [illegible] برطانوی حکام کو [illegible] مستقبل کے لئے ساحل بمبئی پر [illegible]
تھے انہوں نے مختلف ذریعوں سے اس کی کوشش کی کہ حضرت شیخ سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار
کر لیں، مگر حضرت نے قطعی انکار فرما دیا۔

مولوی محمد رحیم بخش [illegible] کے [illegible] سے تعلق رکھتے
[illegible]
سیاست کے بیچ پڑے تھے [illegible]

جب حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی تو برائے علاج ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں دہلی لایا گیا حکیم اجمل خاں بھی شریک علاج تھے مگر وقت موعود آچکا تھا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کی صبح کو عازم ملک بقا ہو گئے۔

جنازہ دیوبند لایا گیا اور دوسرے روز حضرت نانوتوی قدس سرہ کی قبر مبارک کے قریب یہ گنجینۂ فضل و کمالات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔

شاگردوں میں بے شمار علماء و فضلاء کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ، ادلۂ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، جہد المقل، الابواب والتراجم اور مختلف فتاویٰ اور رسائل خطبات تصنیفی یادگار ہیں۔

مندرجہ ذیل کتابوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیلی حالات ملتے ہیں:-

(۱) حیات شیخ الہندؒ، مصنفہ مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ
(۲) نقش حیات، مصنفہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
(۳) اسیر مالٹا، مصنفہ مولانا مدنیؒ
(۴) تذکرہ شیخ الہندؒ، مصنفہ مولانا عزیز الرحمن بجنوری
(۵) تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا سید محمد میاںؒ

ایک بے بنیاد الزام

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے لئے بعض لوگوں نے اہتمام دارالعلوم کو ذمہ دار قرار دیا ہے، افسوس کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تحریک نہایت راز دارانہ اور خفیہ تھی کہ مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا، برطانوی حکومت کو، مخبروں کے ذریعے سے تحریک کے خفیہ رازوں کا پتہ چلا جس کے نتیجے میں گرفتاری عمل میں آئی۔ گرفتاری کے اسباب کا جائزہ لینے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ گرفتاری کے سلسلے میں جو واقعات پیش آئے ان کا

غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تاکہ وہ نبی کی اصلیت کا پتہ چل سکے

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کو جو صورت میں زمانی اس کو دیکھتے ہوئے اس امر کی صحت پر یقین کرنا مشکل ہے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ جو اس گرفتاری کی ہم عصر سرکاری دستاویز ہے کہیں نہیں لکھا ہے کہ ۲ مارچ کا انکشاف اگست ۱۹۱۶ء میں ہوا۔

یہاں واقعاتی صورت یہ ہے کہ اگست ۱۹۱۶ء مطابق شوال ۱۳۳۴ھ کا یہ وہ زمانہ ہے جس میں حضرت شیخ الہند حجاز میں مقیم تھے اور غالب ایک ماہ قبل اگست ۱۹۱۵ء میں حج کے لئے تشریف لے جا چکے تھے۔ اور حج کے بعد اپنے سیاسی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے سرحد کے آزاد قبائل کو انگریزوں کے خلاف جنگ برپا کرنے کے لئے غالب پاشا گورنر حجاز سے وہ مشہور تحریر خط لکھوا لیا جا چکا تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں "غالب نامہ" کے نام سے موسوم ہے۔ "غالب نامہ" کے حصول کے بعد حضرت شیخ الہند خود آزاد قبائل میں پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے کہ مکہ مکرمہ میں اچانک ان کو مع رفقاء کے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ تمام تفصیل حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی خود نوشت سوانح نقش حیات سے ماخوذ ہے۔[۱]

حیات شیخ الہند جو حضرت مولانا میاں اصغر حسین کی تالیف ہے اور جب ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہند کے انتقال (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ) کے تین چار ماہ بعد لکھی گئی ہے۔ حضرت میاں صاحب فرماتے ہیں کہ:

"سفر حج کے وقت تک حضرت کے طرز عمل پر گورنمنٹ کو کوئی شبہ نہ تھا۔ آپ کا سفر حج محض مذہبی سفر حج سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے حضرت کی روانگی اور بمبئی

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھئے نقش حیات جلد دوم ص ۲۲۸ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس

۲؎ ۱۳۳۹ / ۱۹۲۱

بمبئی پہنچنے کے بعد روانگی جہاز تک کوئی غیر معمولی تفتیش و جستجو نہیں ہوئی اور نہ کسی قسم کے خاص سوال و جواب کی نوبت آئی۔ بمبئی میں پاسپورٹ حاصل کرنے کے وقت حضرت والا کے رفقاء سے کچھ زیادہ تفتیشات و سوالات نہیں کئے گئے بلکہ دیگر حجاج کی طرح معمولی اُمور دریافت کر کے پاسپورٹ دے دیا گیا۔[1]

حضرت مولانا مدنی نقشِ حیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ عام لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ مولانا (شیخ الہندؒ) دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں اور اب ہمیشہ حرمین شریفین ہی میں عمر بسر فرمائیں گے۔ اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوفِ وفات اپنی جائیداد شرعی طریقے پر ورثا میں تقسیم کر دی تھی، اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال سے تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصے تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا۔[2]

واقعۂ سفر کی اس نوعیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت حضرت شیخ الہندؒ کے سفرِ حجاز کے وقت تک اُن کی سیاسی تحریک سے بے خبر تھی یا کم از کم اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ کوئی قانونی کاروائی کر سکتی۔ اگر مہتمم دارالعلوم کے ذریعے سے برطانوی حکومت کو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا علم ہو چکا تھا جیسا کہ بعض حلقوں کی جانب سے کہا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع سفرِ حج سے پہلے ہی حکومت کو مل جانی چاہئے تھی اور اُسی وقت سے تحقیق کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کی تردید حکومت کی اُس روش سے ہوتی ہے جو اس نے ایک سال کے بعد اختیار کی۔ نقشِ حیات میں لکھا ہے کہ بعد روانگی ہندوستان ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ (ستمبر ۱۹۱۵ء) سے لے کر ایک سال سے کچھ زائد عرصے تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا[3] گویا حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقاء و متوسلین کی

---

[1] حیات شیخ الہندؒ ص ۲۰۳ [2] نقشِ حیات حصہ دوم ص ۲۱۵

[3] نقشِ حیات حصہ دوم ص ۲۲۰ تا ۲۲۲

گرفتاری اور تحقیقات کا سلسلہ ستمبر ۱۹۱۶ء میں اُس وقت شروع ہوا جب وہ حجاز میں مقیم تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر برطانوی حکومت کو اہتمام دارالعلوم کے ذریعے سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا علم ہو گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت ہرگز اُن کو سفرِ حج کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اور پھر ایک ایسے ملک میں جانے کے لئے جہاں ترکوں کی حکومت قائم تھی، اور جن سے انگریزوں کی وہ جنگ چھڑی ہوئی تھی جو پہلی جنگِ عظیم کے نام سے موسوم ہے۔ حکومت کے نزدیک حضرت شیخ الہندؒ کا جرم بھی بڑا سنگین تھا یعنی انگریزوں کے خلاف "بغاوت" برپا کرنا اور ترکوں کی امداد سے برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹ دینا۔ ان حالات میں برطانوی حکومت کی جانب سے کسی کارروائی کا نہ کیا جانا اور ان کو وقتی مصلحت سفرِ حجاز کی اجازت دے دینا سمجھ میں نہیں آسکتا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرنے کا موقع تو برطانوی حکومت کو بعد میں بالکل اتفاقی طور پر ہاتھ آگیا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ شریف مکہ نے جنگِ عظیم کے دوران ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ انگریزوں کا حلیف بن گیا۔ انگریزوں نے شریف مکہ سے حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مجرم کی حیثیت سے طلب کیا تو شریف مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے برطانوی حکام کے حوالے کر دیا۔ اس لئے کہ برطانوی حکومت نے شریف مکہ کو ترکوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے میں مدد دی تھی۔ اگر شریف مکہ ترکوں سے بغاوت نہ کرتا تو ترکی حکومت کی حدود میں حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔

اس وقت کے برطانوی دفتر کا جو خفیہ سرکاری ریکارڈ "ریشمی خطوط سازش کیس" کے عنوان سے ابھی حال میں منظر عام پر آیا ہے اس سے بھی اس کے غلط ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ سرکاری ریکارڈ میں حضرت شیخ الہندؒ کے سفرِ حج کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اگست ۱۹۱۶ء میں برطانوی حکام کو جب ریشمی خطوط ملے تھے اُس وقت اس تحریک کا علم ہو سکا کہ

رپورٹ میں ہے کہ:-

"محمود حسن اور خلیل الرحمٰن[1] کے بارے میں پی۔ سی۔ آئی۔ ڈی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں کو غیر وفادار سمجھا جاتا ہے نیز محمود حسن کو مسلمانوں سے چندے کی بڑی بڑی رقمیں مل رہی ہیں اور یہ کہ وہ ڈاکٹر انصاری (ڈاکٹر مختار احمد انصاری) کا حلیف اور شریکِ کار ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی شبہ ہے کہ سرحد پار کے مخالف اور منحرف لوگوں سے رابطہ ہے اور اس مشن کے سامنے سیاسی مقاصد ہیں[2]"

آگے چل کر لکھا ہے:-

"یہ بھی افواہ تھی کہ وہ حجاز میں چند خاص ترک افسروں سے ملاقات کریں گے، لیکن بروقت کوئی ایسی اطلاع نہیں مل سکی جس سے ان کو ہندوستان ہی میں روکا جا سکے[3]"

"۱۹۱۶ء کے موسم خزاں میں اور ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں ان پارٹیوں کے بعض اراکین ہندوستان واپس آ گئے، لیکن جب تک ریشمی خطوط کے ذریعے ایس عبیداللہ کی سازش اور محمود حسن کے اس سے تعلق کے بارے میں قابل اعتماد واقفیت حاصل نہ ہوئی ان سے پوچھ تاچھ نہیں کی گئی[4]"

اس سرکاری خفیہ رپورٹ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ سفرِ حجاز کے ایک سال بعد تک برطانوی حکام کو حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں صرف شبہات تھے اور ان کے علم میں کوئی قابل وثوق اطلاع نہ تھی۔ برطانوی حکام کو تحریک کا پتہ اس وقت چلا جب ان کو ریشمی خطوط دستیاب ہو گئے۔

---

[1] صحیح نام خلیل احمد ہے۔ اس سے مراد ہیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری۔

[2] تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب ص ۔۔۔ مطبوعہ مکتبہ محمودیہ ۔۔۔ ۱۹۷۵ء

[3] صفحہ ۲۰۰ [4] ایضاً ص ۲۰۲

گویا علم حدیث میں وہ عدیم النظیر محدث تھے علوم فقہ میں فقیہ اعظم اور تاجِ شریعت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ تو معرفت الٰہی میں جنید وقت اور شبلی عصر۔ اُن کا وجود شریعت کے لئے بھی موجبِ تقویت تھا اور طریقت کے لئے بھی۔ وہ مجاز تھے حضرت گنگوہیؒ سے شرفِ خلافت حاصل کیا تھا۔

اسلامی دُنیا نے کس قدر وسیع العلم اور باعمل علماء بہت کم پیدا کئے ہیں۔ شاہ صاحبؒ اگر ایک طرف اپنے معاصرین میں تبحرِ علمی کے لحاظ سے عدیم النظیر تھے تو دوسری جانب زُہد و تقویٰ میں بھی اُن کی ذات بے مثل تھی۔ وہ ایک باکمال مفسر، محدث اور فلسفی تھے۔ آدمی میں ایک کا ایسا ہونا بھی کم نہیں ہے۔ مگر فن کی وسعت اور کمال میں متعدد علماء اور فضلاء تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے وجود سے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ تشنگانِ علوم کی جس کثیر تعداد نے اس بحرالعلوم سے سیرابی حاصل کی وہ آپ اپنی مثال ہے۔ مشرقِ وسطیٰ سے لیکر چین تک اُن کے فیضانِ علم کا سیلاب موجیں مارتا رہا اور ہندو بیرونِ ہند کے ہزاروں تشنگانِ علوم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ غیر منقسم ہندوستان، عرب، ایران، عراق، افغانستان، چین، مصر، جنوبی افریقہ، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بکثرت آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں۔ دارالعلوم میں آپ کے زمانۂ قیام میں ۸۰۹ طلباء نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

حضرت شاہ صاحب کو قدرت کی جانب سے حافظہ بھی ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عرصہ تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتی تھیں۔ جو بات ایک مرتبہ کان یا آنکھ کے راستے سے دماغ تک پہنچ گئی وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں بر نظر بر محل بے تکلف حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ جملہ علوم کے ذخیرے اُن کے دامنِ جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگیٔ علم کو سیراب نہ کر سکے تھے۔ کثرت مطالعہ اور قوتِ حافظہ کے باعث

گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے۔ صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں بحرف
بر نوک زبان تھیں۔ تحقیق طلب مسائل کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ مسائل
کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دے دیتے تھے کہ پھر اس موضوع
پر مسائل کو نہ تو سوال باقی رہتا، نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت۔ پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں
کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلا دیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایک علم و فن پر اس
درجہ جستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو تمام علوم مستحضر ہیں۔ علاوہ ازیں تقریر بے شمار
کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے حتیٰ کہ اگر کسی کتاب کے پانچ پانچ اور دس
دس حواشی ہوتے تو ہر ایک کی عبارت مع صفحہ و سطر یاد ہوتی تھی۔ احادیث کا تمام ذخیرہ
اور ان کی صحت و سقم کے متعلق طویل و عریض بحثیں، رواۃ کے حالات و مراتب بر نوک
زبان تھے۔ مشہور و معروف کتب خانوں کے اکثر مخطوطات نظر سے گزر چکے تھے، اور اس
طرح ذہن میں موجود تھے کہ گویا آج ہی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

پھر مطالعہ صرف علوم شرعیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جس فن کی بھی کتاب ہاتھ آتی
اس کا شروع سے آخر تک ایک مرتبہ مطالعہ ضرور فرما لیتے تھے اور جب کبھی اس فن کے متعلق
بحث چھڑ جاتی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرما دیتے کہ
سننے والے حیران و ششدر رہ جاتے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے علم طب کے مشکل ترین مسائل
حل کرنے کے لئے پیش کئے۔ شاہ صاحب نے حسب معمول برجستہ جواب کے ساتھ متعدد کتب
کے حوالے دے کر متحیر کر دیا کہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کا حافظہ غضب کا تھا۔ شیخ ابن ہمامؒ کی مشہور کتاب فتح القدیر جو آٹھ
ضخیم جلدوں میں ہے اس کا مطالعہ صرف ۲۰ دن میں اس طرح کیا تھا کہ فتح القدیر کی کتاب الحج
کی تلخیص بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے تھے اور ابن ہمام نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات
کئے ہیں ان کے جوابات بھی لکھتے گئے۔ دورۂ حدیث میں ایک مرتبہ فرمایا کہ جب سے ۲۶ سال

پہلے ہی سے صحیح شعور کا مطالعہ کر چکا تھا۔ تحریرات اسے تنگ دوبارہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور آج بھی اس کا جو مضمون اور بحث پیش ہوں گا اگر تم مراجعت کرو گے تو تفاوت بہت کم پاؤ گے۔

یہ ایک واقعہ ہے۔ اس طرح کے واقعات ان کی زندگی میں بے شمار ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کو شاہ صاحب سے بڑا تعلق تھا۔ اور اکثر علمی مباحث میں آپ سے رجوع کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی مسائل کی تدوین جدید کے لئے شاہ صاحب سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔

علاوہ ازیں علوم تفسیر و حدیث اور فقہ کی جس قدر خدمات آپ نے انجام دیں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ متعدد معرکۃ الآرا مسائل پر کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں۔ درس حدیث کی تقریر کیا تھا، جس کا اندازہ "فیض الباری" سے کیا جا سکتا ہے جو صحیح بخاری کی تقریر ہے اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ روایت میں زبردست کمال حاصل تھا۔ وہ مختلف مسالک و اقوال میں اپنی قوت استنباط کے زور سے بلا تکلف ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے تھے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ کے علاوہ علم تصوف پر بھی ان کی نظر مجتہدانہ تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے شاہ صاحب کی وفات پر معارف میں لکھا تھا۔

"ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن، لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ مستانہ بلند کیا۔"

مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا جب دیوبند تشریف لائے اور شاہ صاحبؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بول رہے تھے:

"ما رأيت مثل هذا الاستاذ الجليل" میں نے اس جلیل القدر استاد جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

بہر حال دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد صدارت تدریس کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ آپ کے زمانے میں طلباء کی استعداد میں بڑا انقلاب ہو رہا تھا۔ پختہ استعداد طلباء آپ کے حلقہ درس سے مستفید ہو کر اٹھے۔

ملکی سیاست میں شاہ صاحبؒ اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کے پیرو تھے۔ مسلمانان ہند میں صحیح اسلامی زندگی پیدا کرنا علماء کا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے مشہور سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کا بصیرت افروز خطبہ صدارت اس کا روشن ثبوت ہے۔

علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصہ تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے متاہلانہ زندگی اختیار فرمائی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے۔ ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں مرض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطن اقامت بنا لیا تھا چلے آئے تھے اور یہیں ۳ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ کو ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ قبر مبارک عیدگاہ کے قریب ہے۔

حضرت کوثریؒ نے نفحۃ العنبر کی تقریظ میں لکھا ہے۔

"میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہؒ کا وجود بھی ہے۔ اگر اسلام میں کوئی کجی ہوتی تو مولانا انور شاہؒ یقیناً اسلام کو ترک کر دیتے۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے تعزیتی تقریر میں فرمایا تھا کہ:

"مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین ابن دقیق العیدؒ اور سلطان العلماء شیخ عز الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں! دیکھا ہے کیونکہ زمانے کا تقدم و تاخر ہے۔ اگر شاہ صاحبؒ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو ان خصوصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے اُن کے ہی مرتبے میں ہوتے۔"

شاہ صاحب کا قد درمیانہ، رنگ سفید، خوبصورت خد و خال، پیشانی کشادہ، اور آنکھیں ستاروں جیسی کشش رکھتی تھیں۔

علامہ اقبال مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا اُس میں شاہ صاحبؒ کے فیضانِ صحبت کو بھی بڑا دخل حاصل ہے، علامہ موصوف نے اسلامیات میں شاہ صاحبؒ سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا چنانچہ علامہ اقبال مرحوم آپکا بیحد احترام کرتے تھے اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی رائے کے آگے تسلیم خم کر دیتے تھے۔

مختلف اسلامی مباحث پر عربی اور فارسی میں ایک درجن سے زائد تصانیف جو نہایت معرکۃ الآراء مسائل پر مشتمل ہیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور اس سے کہیں زیادہ کتابیں طباعت کی منتظر ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوری نے نفحۃ العنبر میں شاہ صاحبؒ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ دوسری کتاب حیات انور ہے۔ یہ اُردو میں ہے۔ حیات انور مختلف حضرات کے مضامین کا گراں قدر مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں نقشِ دوام بھی آپ کی سوانح حیات ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مدنیؒ کا وطن موضع الہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے۔ ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء کو ضلع اناؤ کے ایک قصبہ بانگر مئو میں جب آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے پیدا ہوئے۔ ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان آیا تھا۔ چونکہ علم و تقویٰ کے لحاظ سے سادات کا یہ خاندان ممتاز تھا۔ ایک خاص عظمت اور شاہی زمانے میں ایک بڑی جاگیر کا مالک رہا ہے۔

ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کرنے کے بعد بعمر ۱۳ سال ۲ جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ کو آپ دیوبند تشریف لائے اور ان معرفت میں داخلہ لیا۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت و عنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل اور سات سال یہاں کے علمی ماحول میں گزارنے کے بعد جب وطن کی طرف تشریف لیگئے تو والد ماجد شوقِ ہجرت میں مدینۃ الرسول کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے۔ آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ روانگی ہونے سے قبل آپ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہو چکے تھے۔ مکہ مکرمہ میں پیر و مرشد کی ہدایت کے بموجب کچھ عرصے تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے بھی کسب فیض کیا۔ بعد ازاں مدینہ منورہ میں والد ماجد کے ساتھ مقیم ہوگئے۔ ہر چند آپ نے ہندوستان سے ہجرت کا قصد نہیں فرمایا تھا تاہم والد صاحب کی حیات تک آغوشِ پدری کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنا پسند نہیں کیا۔

قیام مدینہ کے زمانے میں تقریباً دس سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث کی خدمت تنگی اور عسرت کے باوجود توکلاً علی اللہ انجام دی۔ روزانہ ۱۲، ۱۴ گھنٹے تک مسلسل درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہتا تھا۔ مختلف علوم و فنون کے جویا دور دراز سے حاضر ہو کر آپ کے چشمۂ علمی سے سیراب ہوتے۔ خصوصاً مسجد نبوی میں آپ کا درسِ حدیث وہاں کے تمام شیوخ حدیث سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول تھا۔ درس کی شہرت سے مختلف اسلامی ممالک کے طالبانِ علم کی

بڑی تعداد کو آپ کے گرد جمع کر دیا تھا۔ حجاز کی مقدس سرزمین اور خاص طور پر مسجد نبوی میں ایک ہندوستانی عالم کی جانب اس قدر کشش اور قبول عام کا باعث آپ کے طریقِ درس کی اس خصوصیت کو سمجھنا چاہئے جو آپ کو دارالعلوم کے اساتذہ سے ورثہ میں ملی تھی

مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے میں آپ کئی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے اور حضرت گنگوہیؒ سے خلافت حاصل کیا۔ ۱۳۱۶ھ میں تقریباً ایک سال دیوبند میں قیام فرما کر تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت شیخ الہند حجاز تشریف لے گئے تو آپ جو کہ وہاں پہلے سے مقیم تھے رفیق سفر ہوئے اور آپ ہی کے ذریعے سے ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات فرما کر اپنی انقلابی اسکیم ان کے سامنے پیش کی تھی۔ جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور شریف حسین نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کیا تو آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے رفقاء میں شامل تھے چنانچہ تین سال تک آپ کو بھی مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑا۔ ۱۳۳۸ھ میں جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو آپ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے۔ مالٹا سے واپسی کا زمانہ تحریک خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ آپ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں سیاست میں شریک ہو گئے۔ اس زمانے میں آپ کی بے پناہ اور مخلصانہ قربانیوں نے مسلمانوں کے دلوں کو آپ کی عظمت و محبت سے لبریز کر دیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر متفقہ طور سے آپ کو ان کا جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ سیاسی کاموں میں شرکت و انہماک کے باعث آپ کو متعدد مرتبہ کئی کئی سال تک جیل میں رہنا پڑا اور ملک کی آزادی کے لئے قید و بند کی بے شمار صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

۱۳۴۶ھ میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی مسند حدیث کو سنبھال سکے اور اس کی جانشینی کا حق ادا کر سکے۔ اس لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ ہی پر پڑی۔ آپ کے زمانۂ صدارت میں طلباء کی تعداد

ء نے بروقت ڈاکٹروں سے تشخیص کی کہ قلب کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے مقامی اور بیرونی ڈاکٹروں کا
علاج ہوتا رہا مگر افاقہ نہ ہوا۔ آخر ہومیوپیتھک علاج شروع کیا گیا جس سے مرض میں قدرے
تخفیف محسوس ہوئی۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ دسمبر) کو طبیعت کافی پرسکون رہی۔ ۱۳
جمادی الاولیٰ (۶ دسمبر) کی صبح کو طبیعت کافی نشاط ہوگئی کئی روز کے بعد دوپہر کو اسٹول
پر بیٹھ کر غسل کیا۔ ۲ بجے کے قریب خادم نے جب بیدار کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ حضرت
مدنیؒ واصل بحق ہوچکے ہیں۔ ۸ بجے شب میں جنازہ دار الحدیث میں لاکر رکھا گیا۔ حضرت مولانا
محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۱۳، ۱۴ جمادی الاولیٰ
۱۳۷۷ھ (۶، ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء) کی درمیانی شب میں اس مخزنِ علم و معرفت کو سپرد خاک کردیا
گیا جس نے ۳۲ سال تک دار العلوم میں حدیث نبوی کی شمع کو روشن رکھا تھا اور جس کے خرمن
فضل و کمال سے خوشہ چینی کرنے میں طالبانِ علم نبوت نے ہمیشہ فخر محسوس کیا ہے۔

حضرت مولانا مدنیؒ کے تفصیلی حالات کے لئے خود ان کی خود نوشت سوانح "نقش حیات"
الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر اور انفاس قدسیہ مصنفہ مفتی عزیز الرحمن بجنوری سے
مراجعت کی جاسکے۔

منصبِ صدارت کی تقسیم

دار العلوم میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ابتداءِ دار العلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، کے
زمانے سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ صحیح بخاری کا سبق صدر مدرس سے متعلق ہوتا تھا، صدر ہی
جب تعلیمات کے انتظامی امور بڑھے تو ان کا تعلق بھی صدر مدرسی ہی سے کردیا گیا۔ حضرت
مولانا مدنیؒ کی وفات سے منصب تدریس بخاری شریف میں جو عظیم خلا پیدا ہوا اس کو پُر
کرنے کے لئے مجلس شوریٰ نے وقتی طور پر اس منصب کو دو جگہ تقسیم کردیا۔ صدر مدرسی اور تعلیمی امور
کی نگرانی حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کے حصے میں آئی اور صحیح بخاری کے سبق کے لئے
حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ کا انتخاب کیا گیا۔ مجلس شوریٰ کی تجویز کے الفاظ

ہوئی۔

مجلس شوریٰ اس صورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ صاحب کو تحمل کے بعد از خلوص کے لئے ان کا اصل و جامع شخصیت کا مثل میسر نہیں ہے اس لئے مجلس شوریٰ دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کیلئے باتفاق رائے یہ طے کرتی ہے کہ دارالعلوم کے صدر المدرسین اور ناظم تعلیمات کے منصب پر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کو فائز کیا جائے۔ اور علم حدیث کی عظمت و جلالت کی امتیازی شان کے پیش نظر حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا جائے۔

مجلس شوریٰ کی تجویز میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ "شیخ الحدیث کا یہ مخصوص اور ممتاز عہدہ دارالعلوم کے دستور میں مستقل حیثیت نہیں سمجھا جائے گا: چنانچہ حضرت علامہ بلیاوی کی وفات کے بعد منصب صدارت تدریس حضرت مولانا فخر الدین احمد کو تفویض کر دیا گیا۔

(تجویز نمبر ۳ مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۷ رجب ۱۳۷۷ھ)

یہ پہلا موقع تھا کہ صحیح بخاری پڑھانے والے استاذ کے لئے شیخ الحدیث کا منصب قائم کیا گیا۔ اور اختلاف امور صدر المدرسین سے متعلق کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اختلاف کی امور بخاری شریف کے درس کو فوقیت اور عظمت حاصل ہے وہ علوم دینیہ کا درس دینے والے کی نسبت سے ممتاز اور نمایاں رہا ہے۔

اس لحاظ سے صدر المدرسین کے عنوان میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کی وفات سے قبل حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ کا تذکرہ پیش کیا جانا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ اساتذہ بخاری کی ترتیب کا سلسلہ جو مسند حدیث کی جانب ہے منقطع نہ ہو سکے۔

مولانا سید فخر الدین احمد | وطن مالوف ہاپوڑ ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سید قطب اور سید عالم پہلے دوسرے

مولانا موصوف چونکہ حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ اس لئے آپ نے درسِ حدیث میں دونوں جلیل القدر اساتذہ کے رنگ و امتیاز کو پا لیا تھا۔ چنانچہ آپ کا درسِ بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا تھا جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ حدیث کے مذاہب کو بیان کرنے کے ساتھ احناف کے مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں ایسے پختہ دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کے ذہن میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا تھا۔ اثنائے درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف کا بھی بجا طور پر پیش فرماتے رہتے۔ درسِ حدیث میں آپ کی تقریر جہاں مفصل ہونے کے علاوہ سہل اور دل نشین ہوتی تھی۔ اس لئے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادے کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا۔ اندازِ بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا۔ جس میں آپ کے جمالِ ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ آپ کے درسِ بخاری شریف کو شہرتِ تام اور قبولِ عام حاصل تھی۔

اپنے دور میں یگانۂ روزگار عالم اور درسِ حدیث کے بے مثل استاذ تھے۔ اور طلباء ان سے تلمذ پر فخر محسوس کرتے تھے۔

۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کا انتخاب کیا۔ حضرت مولانا مدنیؒ نے مرضِ وفات میں باصرار آپ کو مرادآباد سے بلا کر اپنی جگہ صحیح بخاری کے درس کے لئے مامور کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے۔ ۱۳۷۷ھ میں پورے تین سو کے قریب طلباء آپ کے درسِ حدیث میں شریک تھے۔ کم و بیش دورۂ حدیث کے طلباء کی یہی تعداد ہر سال رہتی تھی۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی سیاست سے بھی آپ کو تحریکِ خلافت کے زمانے سے تعلق رہا۔ اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ حضرت مولانا مدنیؒ کی

جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے دو مختلف دور میں نائب صدر رہے اور بعد ازاں مسند صدارت پر فائز ہوئے اور تادم واپسیں جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں جب صحت نے جواب دے دیا تو عزیزوں نے علاج و تبدیلی آب و ہوا کے لیے مراد آباد لے جایا گیا مگر وقت موعود آچکا تھا۔ مراد آباد میں کچھ عرصہ علیل رہ کر ۱۸ صفر ۱۳۹۵ھ مطابق ۲ اپریل ۱۹۷۵ء کی تاریخ میں نصف شب کے بعد انتقال فرمایا۔ صبح خبر پھیلی دار العلوم، دہلی سے بہت سے حضرات مراد آباد پہنچ گئے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی بعد دوپہر علم و فضل کا یہ آفتاب جہاں تاب سرزمین مراد آباد میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ

دار العلوم دیوبند میں صحیح بخاری کے درس کا یہ عظیم تعلیمی منصب تقریباً ۸۰ سال سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں مسلسل چلا آ رہا تھا، حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ کی وفات کے بعد یہ تسلسل ختم ہوگیا۔

علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ [1]

۱۳۰۴ھ میں مشرقی یوپی کے شہر بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان پنجاب کے ضلع جھنگ سے یوپی آیا اور پھر کچھ مدت کے بعد جونپور آباد ہوگیا، جونپور میں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی، اور معقولات کی کتابیں مولانا فاروق احمد چریاکوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خاں، مولانا عبد الحق خیرآبادیؒ سے پڑھیں، دینیات کی تعلیم کے لیے مولانا عبد الغفار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، حضرت

---

[1] اگرچہ شیخ الحدیث کی حیثیت سے حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کا تذکرہ ہوچکا ہے مگر صدر المدرسین کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کا تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ۔ ۱۳۲۵ھ کے اواخر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر ابوداؤد، ترمذی اور جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں اور ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے

تعلیم سے فراغت کے بعد اسی سال مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم ہو کر گئے۔ پھر عمری ضلع مراد آباد کے مدرسہ میں کچھ عرصے تک درس و تدریس میں مشغول رہے ۱۳۳۱ھ میں آپ کو دارالعلوم میں بلا لیا گیا ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۴ھ تک مدرسہ دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڑھ اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ (بہار) میں صدارت تدریس کی خدمات انجام دیں، ۱۳۴۴ھ میں آپ کو پھر دارالعلوم دیوبند بلا لیا گیا ۱۳۴۴ھ کی روداد میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے ۔

مولوی محمد ابراہیم صاحب تمام علوم میں کامل الاستعداد ہیں، معقول و فلسفہ کی تمام کتابیں نہایت خوبی سے پڑھاتے ہیں۔ فلسفہ و منطق اور کلام کے ابتدائی اسباق سے صدرا، شمس بازغہ، قاضی مبارک، حمد اللہ، امور عامہ کے علاوہ شرح مطالع، شرح اشارات وغیرہ پڑھاتے ہیں طلباء کا بہت زیادہ میلان ان کی طرف رہتا ہے، نہایت خوش تقریر ہیں غرض یہ ایک نہایت قابل قدر اور شہرت و عزت حاصل کرنے والے مدرس ہیں :

۱۳۶۲ھ میں پھر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی۔ اولاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مسند صدارت کو رونق بخشی۔ وہاں کے بعد کچھ عرصے تک مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدارت تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اور بعد ازاں بنگال میں ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام کے مدرسہ میں صدرالمدرسین رہے۔ بالآخر ۱۳۶۶ھ میں پھر دارالعلوم دیوبند آ گئے ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کی مسند صدارت تدریس پر فائز ہوئے، اور تاحیات درس و تدریس میں مشغول رہے ——— ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے جو برصغیر کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ بلیاوی ہر علم و فن خصوصاً علم کلام و عقائد میں یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے تفسیر و حدیث، عقائد و کلام اور دیگر علوم کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اُنکے درس و تدریس کی مدت ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۳۵ھ تک ۳۵ سال ہوتی ہے۔ طلباء اُن کے درس میں بڑے شوق اور انہماک سے شریک ہوتے اور اُن کے فیضانِ علمیہ سے مستفید ہونے کے متمنی رہتے تھے۔ درس میں اختصار کے ساتھ بڑی جامعیت کی شان تھی جو درس کو نہایت باوقار بنا دیتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ لطائف و ظرافت کے پیرائے میں ادق سے ادق باتیں طلبہ کے ذہن نشین کر دینے اور اہم مسائل کو حل کرنے کا خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ قصص و حکایات کو مسائل پر اس طرح منطبق کر دیتے تھے کہ مسئلے کے تمام پہلو واضح اور منقح ہو جاتے تھے۔ اُن کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تلامذہ میں فن سے گہری مناسبت پیدا ہو جاتی تھی اور اُن پر علم و دانش کی راہیں کھل جاتی تھیں۔ وہ اپنے عہد میں عقائد و کلام و منطق و فلسفہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حدیث میں روایت سے زیادہ درایت سے کام لیتے تھے۔ حضرت نانوتوی کے علوم پر اُن کی گہری نظر تھی۔ حضرت شیخ الہند کے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

علامہ بلیاوی کی تصانیف میں رسالہ مصافحہ اور رسالہ تراویح اُردو میں ہیں۔ ایک رسالہ اُمور عامہ فارسی میں ہے۔ یہ رسالہ منطق و فلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ سلم العلوم پر اُن کا حاشیہ عربی میں "ضیاء النجوم" ہے۔ حمد اللہ، میبذی اور خیالی پر بھی انھوں نے حواشی لکھے تھے جو ضائع ہو گئے ہیں۔ آخر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آ سکی۔

صحت عرصہ سے خراب ہو گئی تھی۔ ۲۳ رمضان ۱۳۳۵ھ کی دوپہر کو ۶۵ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

دیوبند کے رہنے والے تھے ۹ اگست ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ بعد میں [illegible]

مرحوم سے قرآن شریف حفظ کیا، پھر تین سال تک فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بہٹ (ضلع سہارنپور) کے مدرسے میں رہ کر پڑھیں۔ بعد ازاں دارالعلوم میں داخل ہوکر درس نظامی کے نصاب کی تکمیل کی ۱۳۵۰ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوال ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ امداد العلوم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ انہیں جملہ علوم و فنون میں کامل دستگاہ حاصل تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے حدیث اور تصوف سے خاص مناسبت پیدا ہوئی۔ تقریباً ۱۳۶۲ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے صدر المدرسین بنائے گئے، وہاں درس حدیث کے ساتھ اہتمام کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۹ سال کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، وہاں صحیح بخاری اور جامع ترمذی زیر درس رہیں۔

۱۳۸۵ھ میں انہیں دارالعلوم دیوبند میں بلا لیا گیا، علم حدیث سے خاص شغف تھا، حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ کے بعد بخاری شریف کے درس کو سنبھالنا ان کا بڑا علمی کارنامہ ہے، تادم واپسیں یہاں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور علوم دینیہ کے طلبہ کی خدمت میں گزری، ان کا درس علمی مواد سے بھرپور ہوتا تھا، طلبہ حدیث ان کے درس سے مطمئن ہوکر اٹھتے تھے، وفات سے چند گھنٹے قبل تک ان کا علمی فیضان جاری رہا۔

مولانا شریف حسن صاحب علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور فضائل اخلاق و شمائل میں علماء سلف کی یادگار تھے، وہ اپنے علمی تبحر اور علم حدیث سے خصوصی تعلق و شغف اور اپنی پاکیزہ نفسی کے باعث اپنے معاصرین علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے

خصوصاً اشتیاق سے ملتے تھے، ظاہر و باطن دونوں پاک تھے، طبیعت نہایت مرنجاں مرنج پائی تھی۔

۱۵/۱۴ جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ کی درمیانی شب میں تقریباً ۶۵ سال کی عمر میں عارضۂ قلب چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد واصل بحق ہوگئے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ قبرستانِ قاسمی ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

مولانا سید فخر الحسن صاحب

۱۰ رجب ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن قصبہ عمری ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے، منظور حسین تاریخی نام ہے، قرآن شریف اور دینیات اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حافظ نسیم الدین اور حافظ عبدالقادر امروہی سے حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد مدرسہ شاہی مرادآباد میں کتب خانہ کے ناظم تھے، اس لئے تقریباً ۱۳۳۶ھ میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل ہوگئے، یہاں فارسی کی تکمیل کی اور درس نظامی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، پھر مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور متوسطات کی تحصیل کی۔ ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۶ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں سے آپ بہار چلے گئے اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صحاح کی بعض کتابیں پڑھانے پر مامور رہے مگر ڈیڑھ سال کے بعد پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں واپس آگئے، اور آخر میں مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۶۲ھ میں آپ کو دارالعلوم میں بلا کر طبقۂ علیا کا مدرس مقرر کیا گیا اور صحیح مسلم اور ابوداؤد وغیرہ کتابیں دی گئیں۔ دارالعلوم میں آپ کے درس صحیح مسلم اور تفسیر بیضاوی کو خاص شہرت حاصل ہے۔ چنانچہ بیضاوی کی آپ کی درسی تقریر بیضاوی کی جلد اول شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ وعظ و تقریر میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔

اربابِ اہتمام

حاجی سید محمد عابدؒ

حاجی صاحبؒ دیوبند کے نہایت متقی پرہیزگار اور صاحب اثر بزرگ تھے تعویذات و عملیات کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، بانیانِ دارالعلوم کے شریکِ کار تھے، دارالعلوم کا منصب اہتمام اوّلاً آپؒ ہی کے سپرد ہوا تھا، حضرت تھانویؒ اپنی مثنوی زیر و بم میں فرماتے ہیں:

عابدِ کامل، ولی مرتضیٰ — پاک اور دریائے جود و سخا

ہم جمالی ہم جلالی شان دار — کان علم و معدن خلق نکو

نقش و تعویذ ش مثالِ نقش قدر — فیض او بر خاص و عالی شد پدید

حاجی صاحبؒ کا سالِ ولادت ۱۲۵۰ھ ہے، قرآن شریف اور فارسی پڑھ کر علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے دہلی گئے، زمانۂ تعلیم میں تصوّف کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ علوم کی تکمیل نہ کر سکے، متعدد بزرگوں سے خلعتِ خلافت حاصل کیا، میاں جی کریم بخشؒ رامپوری اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے بھی شرفِ خلافت حاصل تھا۔

۱؎ مثنوی زیر و بم بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم نمبر بابت ماہ محرم ۱۳۳۴ھ ص ۹

آپ کو چھپانے کے لئے عامل و امر کر دے۔ وہ طریقۂ چشتیہ صابریہ کے رنگ اور زُہد و ریاضت کا مجسمہ تھے۔

ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ مُریدین میں حاجی محمد عابد دیوبندیؒ نے نفس کُشی کے طور پر کھانا پینا قطعاً ترک کر دیا ہے۔ آپ نے بتاکید اُن کو کھلا کر "یہ امر سُنّت کے خلاف ہے۔ طریق مسنون کھانا پینا ضرور چاہیئے خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔"[1]

انوار قاسمی میں سوانح مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "حاجی صاحبؒ دیوبند میں ایک ذی وجاہت، صاحبِ ثروت، عابد زاہد ہستی تھے، آپ کی بزرگی کا شہرہ دیوبند کے ہر خورد و کلاں مرد و عورت، بچے اور بوڑھے کے دل پر تھا۔ اُن کے روحانی فیض نے دیوبند، اور اطراف و جوانب بلکہ دیگر صوبوں کے لوگوں کے دلوں کو بھی مسخر کر رکھا تھا، عابد و زاہد ہونے کے ساتھ بہت بڑے عامل بھی تھے، آپ کے تعویذوں کا روحانی فیض بیماروں پر تریاق کا کام کرتا تھا۔ آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔"[2]

پابندیٔ وضع، استقلالِ طبع، اُولوالعزمی، خوش تدبیری کہ آپ کی مشہور ہے۔ باوجودیکہ دنیا کو ترک کر دیا ہے۔ مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے تو اس میں ایسی اچھی رائے ہوتی ہے جیسے بڑے کسی ہوشیار دنیادار کی۔"

سوانح قاسمی میں سوانح مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اہلِ دیوبند کو آپ سے کمال درجے عقیدت ہے۔ آپ کی ذات بابرکات سے خلائق کو بہت طرح کا فیض حاصل ہے ہنود جیسے دوسرے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں۔ مگر باہر رہتے۔ باغ جس قدر آپ کی ملک میں تھا سب کا سب راہِ خدا میں دے کر محض خدا پر تکیہ کیا ہے۔"[3]

۱؎ تذکرۃ العابدین ص ۱۰۹ ۲؎ انوار قاسمی مجموعہ اول ص ۲۸۵ ۱۹۶۹ء مطبع [illegible]

۳؎ سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۲۹ ۱۳۷۳ھ مطبوعہ [illegible] پریس دیوبند

مہتمم مقرر ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں حاجی صاحبؒ کے سفرِ حج کے زمانے میں اہتمام کی خدمات انجام دیں۔ پھر تقریباً ۲ سال کے بعد ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں مستقل مہتمم قرار پائے اور ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء کے اواخر تک اس منصب پر فائز رہے۔ آپ کے زمانے میں دارالعلوم نے بڑی ترقی کی جس کو بڑی حد تک آپ کے حسنِ انتظام کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ روحانیت و امانت کے ساتھ، انتظامی سلیقے کا بہت کم اجتماع ہوتا ہے مگر آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کل مدتِ اہتمام تقریباً ۱۹ سال ہے۔

دارالعلوم کی اکثر ابتدائی عمارتیں آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں تعمیر ہوئیں۔ ان کے تعمیری ذوق کا اندازہ اس زمانے کی عمارتوں بالخصوص نودرے وغیرہ کی پختگی، استواری اور حسنِ تعمیر سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمارت دارالعلوم کی عمارتوں میں ایک ممتاز شان اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مشہور ہے کہ ۱۲۹۲ھ میں جب نودرے کی عمارت کی (جو موجودہ عمارتوں میں سب سے پہلی عمارت ہے) بنیاد شروع کی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں اور آپ سے خطاب فرما رہے ہیں کہ "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصا سے خط کھینچ دے، احاطۂ عمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح کو جا کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرا دی گئی۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ (وفات ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) کو مولانا رفیع الدینؒ سے خلافت حاصل تھی۔ ۱۳۰۶ھ میں آپ بقصدِ ہجرت مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اور وہیں دو سال کے بعد ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حاجی سید فضل حق دیوبندیؒ

حاجی صاحبؒ دیوبند کے خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ ابتدا ہی سے دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔

حاجی محمد عابدؒ کے زمانۂ اہتمام میں سرپرست کی حیثیت سے کئی سال تک دارالعلوم کی خدمات
انجام دیں۔ ۱۳۰۳ھ میں حاجی محمد عابد صاحب کے مستعفی ہو جانے پر مہتمم مقرر ہوئے اور آخر تک
یہاں تک اس منصب کو انجام دے کر مستعفی ہو گئے۔

حاجی فضل حق صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی ایک سوانح حیات لکھی تھی جو سوءِ طبع
نہیں ہوئی۔ اس کا نسخہ بھی محفوظ نہیں، مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی کے نام سے
جو کتاب لکھی ہے اس کے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت جامع اور مکمل
سوانح حیات ہوگی۔ تحریر کی صلاحیتوں کے ساتھ ان میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم
پائی جاتی تھی۔ دارالعلوم کے تعلق سے قبل سہارنپور میں سرکاری محکمۂ تعلیم سے مدت
تک وابستہ رہ چکے تھے۔

مولانا محمد منیر نانوتویؒ

مشہور عالم و مصنف مولانا محمد احسن نانوتویؒ اور مولانا محمد مظہرؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۴۷ھ میں نانوتہ میں
پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی، پھر دہلی کالج میں داخل
ہو گئے۔ وہاں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مفتی صدر الدین آزردہ اور حضرت شاہ
عبدالغنی دہلویؒ سے علمی استفادہ کیا۔ مولانا محمد منیرؒ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم
کارکن اور مجاہد تھے۔ شاملی کے معرکے میں وہ اپنے اکابر کے دوش بدوش شریک رہے اور
طویل مدت تک جنگ شاملی کے بعد روپوش ہو گئے تھے۔ معافی عام کے بعد بڑے
بھائی مولانا محمد احسن کے پاس بریلی پہنچے اور ۱۲۷۶ھ میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے
بلکہ ۹۱ تک بریلی میں قیام رہا۔ قیام بریلی کے زمانے میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن کے
مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم بھی رہے۔ مولانا محمد منیر نقشبندی سلسلے میں بیعت تھے۔ انہوں نے
امام غزالی کی کتاب منہاج العابدین کا اردو ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا ہے جو
مطبع صدیقی بریلی میں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں طبع ہوا ہے۔ ان کی دوسری تصنیف تحفۂ عزیزیہ ہے

یہ بھی تصوف کے مسائل پر مشتمل ہے

ایک رسالہ ہے جو "دستِ حقیقت" پر مشتمل ہے۔ دارالعلوم میں خارج اوقات میں طلبہ کو
مولوی صاحب کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

دیانت ... میں مولانا عبداللہ کا جذبہ دیانت جناب قاری طیب صاحب نے ان کے متعلق ایک واقعہ
لکھا ہے کہ مولانا دارالعلوم کی سالانہ روداد چھپوانے کے لیے ذاتی طور سے روپے کر دہلی گئے
اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے۔ مولانا نے اس حادثے کی کسی کو اطلاع کیے بغیر اپنے
وطن نانوتہ آئے۔ اپنی زمین فروخت کر کے روپیہ فراہم کیا اور اس سے روداد چھپوا کر لائے
مجلس شوریٰ کے ارکان کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے
اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ "مہتمم صاحب امین تھے اور روپیہ
چونکہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے اس لیے ان پر تاوان نہیں ہو سکتا" ارکان مجلس نے حضرت گنگوہیؒ
کا فتویٰ دکھا کر مولانا موصوف سے درخواست کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں۔ مولانا نے فرمایا کہ
"فتویٰ کی بات نہیں ہے، اگر خود مولانا رشید احمد صاحب کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی
روپے لے لیتے؟" چنانچہ اصرار کے باوجود روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔[1]

مولانا حافظ محمد احمدؒ

آپ خلف رشید حضرت نانوتوی قدس سرہ کے فرزند رشید
تھے۔ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ
کرنے کے بعد والد ماجد نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) بھیجا
گلاؤٹھی میں حضرت نانوتویؒ کا قائم کیا ہوا مدرسہ منبع العلوم تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ
انبہٹوی اس مدرسہ میں مدرس تھے۔ بعد ازاں مزید تعلیم کے لیے مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں
بھیجے گئے۔ یہاں حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا احمد حسن امروہوی پڑھاتے تھے

---

[1] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۵۰۴، مولانا محمد حسن نانوتوی ص ۱۵۰ - ۱۴

اُن سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھنے کے بعد دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ترمذی شریف کے چند سبق پڑھے، دورۂ حدیث گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں پورا کیا وہ وہیں جلالین اور بیضاوی کتابیں پڑھی

۱۳۰۳ھ میں بحیثیت مدرس دارالعلوم میں تقرر ہوا اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی ۱۳۱۱ھ میں جب حضرت حاجی محمد عابد اہتمام سے مستعفی ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے، حاجی فضل حق دیوبندی اور مولانا محمد منیر نانوتویؒ مگر ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ کر سکے، ہر سال کے تغیرات کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا تو ۱۳۱۳ھ میں حضرت گنگوہیؒ نے اہتمام کے لئے حضرت حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا۔ حافظ صاحب نہایت منتظم اور صاحب اثر و وجاہت تھے، چنانچہ وہ بہت جلد دارالعلوم کے انتظام پر حاوی ہو گئے اور تقرر کے وقت اُن سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں بدرجہ اتم اُن کے اہل ثابت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ جو صدر المدرسین تھے خود اُستاد ہونے کے باوجود حافظ صاحبؒ کے اُستاذزادہ ہونے کی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

حافظ صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی جب مسلمان نے عنانِ اہتمام اپنے ہاتھ میں لی تھی تو دارالعلوم کی آمدنی کا اوسط ۵۰۰۰ ہزار روپیہ سالانہ تھا، آپ کے عہد میں یہ اوسط ۹۰ ہزار تک ترقی کر گیا، اسی طرح طلبہ کا اوسط دو ڈھائی سو سے ترقی کر کے تقریباً ۹۰۰ سو تک پہنچ گیا، اس وقت کتب خانے میں ۵ ہزار کتابیں تھیں، آپ کے زمانے میں کتابوں کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی ۱۳۴۷ھ تک عمارات دارالعلوم کی مالیت ۳۴ ہزار روپے تھی، آپ کے عہد میں یہ مالیت ۴ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

غرض کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے بہت عظیم الشان ترقی کی جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ ہو سکی تھی، آپ کے زمانۂ اہتمام

جس کے سبب سے طلباء حدیث کی تعلیم میں رکاوٹ پڑی ہوئی تھی، پرگنہ سے تالے کے توڑنے کے باعث دارالعلوم کی فضا بد ہوا کی خراب ہو رہی تھی، اکابر دارالعلوم کی سعی کوششوں کے باوجود متعلقہ حکام تالے کے ہٹنے جانے پر آمادہ نہ تھے، حضرت حافظ صاحبؒ نے تدبر کو حرکت دے کر اس مشکل کا حل نکال لیا، چنانچہ صوبائی گورنمنٹ کے حکم سے سرکاری مہر رفع کر کے تالا ہٹا دیا گیا، حافظ صاحبؒ کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ دارالعلوم کی مشکل سے مشکل مہم کو آسانی سے نمٹا دیتے تھے۔

طلباء کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر جہاں ہر وقت نظر رہتی تھی، وہاں ان پر روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ رکھتے، وہیں ان پر بے حد شفیق اور مہربان بھی تھے، طلباء کی ضروری معمولی ضروریات پر مزید نظر رہتی تھی، بیمار طلباء کے علاج پر خاص توجہ فرماتے تھے، طلباء اور مدرسین پر حافظ صاحبؒ کا رعب و دبدبہ ضرب المثل تھا، دسترخوان نہایت وسیع تھا، دارالعلوم کے مہمانوں کا بار بذاتِ خود نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔

شروع سے درس و تدریس کا جو مشغلہ قائم ہو گیا تھا وہ زمانۂ اہتمام میں بھی کبھی بند نہیں ہوا، مشکوٰۃ المصابیح، جلالین شریف، صحیح مسلم، ابن ماجہ، مختصر المعانی، رسالہ میر زاہد وغیرہ کتابیں نہایت شوق سے پڑھاتے تھے، تقریر نہایت صاف، مربوط اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی، اپنے والد ماجد کے عالی علوم اور معارف پر کافی عبور تھا۔

نظام دکن نے حافظ صاحبؒ کو ریاست حیدرآباد میں مفتی اعظم کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا، حکومت آصفیہ کی طرف سے یہ جلیل القدر منصب آپ کو ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء سے ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء تک حاصل رہا ہے، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں آپ نے نظام حیدرآباد کو دارالعلوم میں آنے کی دعوت دی تھی جو منظور کر لی گئی تھی، پروگرام یہ تھا کہ نظام جب دہلی جائیں گے تو دارالعلوم کو بھی دیکھیں گے، ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں نظام کے دہلی آنے کی توقع تھی، دورے کی یاد دہانی کے لئے آپ حیدرآباد تشریف لے گئے جس وقت آپ حیدرآباد کا قصد فرما رہے تھے تو طبیعت ناساز تھی

مولانا حبیب الرحمٰن آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰن کے خلف رشید تھے۔ شروع سے آخر تک دار العلوم ہی میں علوم کی تکمیل کی۔ آپ ایک متبحر عالم اور عربی زبان کے زبردست ادیب تھے۔ اُن کا تدبر اور انتظام دار العلوم کی تاریخ میں بے مثل سمجھا جاتا ہے۔ دار العلوم کی ترقی میں اُن کی خدمات اور صلاحیتوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔

۱۳۲۵ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی مصروفیتوں کے باعث نیز دار العلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور مستقل شخص کی ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حافظ صاحب کا ہاتھ بٹا سکے۔ اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا، چنانچہ انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر کے نیابت اہتمام کا منصب سپرد کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دار العلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی جیسا کام کرنے والا بیدار مغز مستقل مزاج اور مخلص ہاتھ آ گیا۔ اہتمام کے کاموں میں اُن کو اس قدر شغف تھا کہ شب و روز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا۔ اُنھوں نے دار العلوم کے شعبۂ انتظام و انصرام کو اتنا منظم اور مستحکم کر دیا تھا کہ جب حکومت آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دار العلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیوبند آئے، تو اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک پائی تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باقاعدہ فائل میں موجود تھیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو۔ حافظ صاحب کے عہد اہتمام کی ترقی درحقیقت آپ ہی کی دقت نظر کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے۔ آپ ہمیشہ اُن کے دست راست اور معتمد علیہ اور نائب رہے۔

۱۳۴۷ھ میں جب حافظ صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باعث حیدر آباد کے مفتی اعظم کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو اُن کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا لیکن دار العلوم

کے داخلی اختلافات رُونما ہو جانے کے سبب سے آپ کو بہت جلد اس منصب سے دست کش ہو جانا پڑا۔ حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے کچھ اساتذہ اور طلباء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہ ابتلاء کا دور بہت سخت تھا مگر آپ کے عزم و استقلال، ہمت و جرأت اور دانش و تدبیر نے دارالعلوم کی کشتی کو ڈگمگانے سے بچا لیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن، جن کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اسی طرح شغف ہوتا جیسا کہ دارالعلوم کے ساتھ تھا تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت تھی کہ ارکان جمعیۃ علماء کو دو چیزوں کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اسی لئے ابتداءً آپ ہی کا انتخاب کیا گیا۔ آپ جمعیۃ العلماء کے بہترین مشیر ثابت ہوئے۔ ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علماء کا اجلاس گیا (صوبہ بہار) میں ہوا تھا، اس میں آپ کو صدر منتخب کیا گیا۔ آپ کا خطبۂ صدارت نہ صرف عام طور پر پسند کیا گیا بلکہ اس کی سیاسی اہمیت کو ملک کے سیاسی حلقوں میں بھی پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

مطالعے کی کثرت نے آپ کو نہایت وسیع معلومات بنا دیا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے۔

"اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑ سکتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔"

عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا۔ ان علوم میں آپ کی وسیع النظری مشہور زمانہ تھی۔ حسب ذیل تصانیف علمی یادگار ہیں:-

(۱) قصیدہ لامیۃ المعجزات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے، اس میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو معجزے نہایت فصیح و بلیغ انداز میں پیش کئے گئے ہیں، مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہی (وفات ۱۳۷۴ھ)

نے عربی اشعار کی سلیس اُردو میں شرح فرمادی ہے۔

(۲) "اشاعتِ اسلام" دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا؟ اس سوال کے جواب میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ان تمام واقعات کو پیش کیا گیا ہے جو تبلیغی کوششوں کے بعد سے اشاعتِ اسلام کا باعث ہوئے۔

(۳) "تعلیماتِ اسلام" اس کتاب میں اسلام کے طرزِ حکومت کو بیان کیا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشورہ و امیر جماعت کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اس ضمن میں آپ نے بتلایا ہے کہ امیر کی ذات پر اگر کلی اعتماد ہو تو اکثریت و اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر امیر کو یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

(۴) "رحمۃ للعالمین" یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک نہایت گراں قدر تصنیف ہے، افسوس ہے کہ نامکمل ہے مگر جس قدر حصہ لکھا جا چکا ہے وہ سیرتِ نبوی کی تصانیف کی فہرست میں ایک عظیم الشان تصنیف کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک طبع ہو کر منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نہایت نحیف البدن تھے۔ کھانا حیرت انگیز طور پر کم کھاتے تھے مگر ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت کے مالک تھے۔ حضرت مولانا صاحب کے انتقال کے ٹھیک چودہ ماہ کے بعد ۴ رجب ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء کی شب میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا مداح چھوڑ گئے۔ نوراللہ مرقدہ۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب

حضرت نانوتوی کے پوتے ہیں، ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، تاریخی نام مظفرالدین ہے۔ سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کیا گیا۔ اساتذہ کے عظیم الشان اجتماع میں مکتب نشینی کی تقریب عمل میں آئی۔ دو سال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کیا، پانچ سال

سے دیکھے گئے ہیں آپ کی عالمی تقریروں سے ایک خاص حلقہ اثر پیدا ہو گیا ہے۔ بیرون ہند
میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں پہنچ چکے ہیں ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء میں
بسلسلہ سفر حجاز آپ نے ہندوستان کے ایک موقر وفد کے صدر کی حیثیت سے سلطان ابن
سعود کے دربار میں جو تقریر فرمائی اس نے سلطان کو بہت متاثر کیا، سلطان ابن سعود نے شاہی
خلعت اور بیش قیمت کتب کے عطیے سے نوازا تھا۔

۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء میں آپ کا سفر افغانستان علمی معاملات کی ایک مستقل تاریخ ہے، آپ نے
دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے دارالعلوم اور حکومت افغانستان کے درمیان علمی و
عرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا تھا۔ افغانستان کے علمی حلقوں نے شایان
شان آپ کا خیر مقدم کیا۔ حکومت نے اپنی میزبانی کے شرف سے نوازا۔ افغانستان کی علمی و
ادبی سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں اور سوسائٹیوں نے مدعو کیا آپ کی عالمانہ تقریروں
سے وہاں کے علمی و ادبی حلقے بہت متاثر ہوئے۔ اسی طرح بیرونی ممالک میں برما، جنوبی
افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، مڈغاسکر، حبش (ایتھوپیا)، مصر، انگلینڈ، فرانس
اور روس وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی دل کش شخصیت کے بے شمار حسین پہلو ہیں، شرافت و ولایت
سراپا انکسار، پاک باطنی، حسن خطابت و تقریر، اسرار و نکات، متانت، سادگی اور عجز و انکسار، دم گفتگو بجائے
فصاحت و بلاغت، غرض کہ ان کی پرعظمت شخصیت اعمال و کردار، جمال و کمال کا ایک
حسین امتزاج ہے۔

دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی ہے وہ تعلیم و
تدریس اور دعوت و تبلیغ ہیں، ان کمالات کی وجہ سے ملک میں آپ کو امتیازی مقام حاصل
ہے۔ تقریر کی ذوق مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہے۔ آپ کا یہ مشغلہ دارالعلوم کے
انتظامی معاملات اور اوقات حد کے تدریس کے علاوہ ہمیشہ جاری رہتا ہے با الخصوص

سفر کے فارغ اوقات اسی میں صرف ہوتے ہیں، زمانۂ قیام میں عصر سے مغرب تک مولانا کی مجلس رہتا ہے، جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے ہوتے ہیں۔ شاعری سے بھی مناسبت ہے متعدد نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجموعۂ کلام عرفان عارف کے نام سے چھپ گیا ہے۔

خطابت و تقریر کی طرح تحریر و تصنیف پر بھی قدرت حاصل ہے آپ کی تصانیف کی تعداد کافی ہے، چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

التشبہ فی الاسلام، مشاہیر امت، کلمات طیبات، الطیب، اجتہاد فی مسئلۃ القضاء والقدر، سائنس اور اسلام، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، مسئلۂ زبان اردو ہندوستان میں، دین و سیاست، اسباب عروج و زوال اقوام، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، الاجتہاد والتقلید، اصول دعوت اسلام، اسلامی مساوات، تفسیر سورۂ فیل، نظریٔ حکومت وغیرہ۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

حضرت مولانا فضل الرحمن کے فرزند رشید تھے۔ ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے، ۷ سال کی عمر میں قرآن مجید شروع کیا۔ دارالعلوم میں داخلے کی تاریخ ۱۳۱۴ھ، فراغت ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۸ء ہے، جن بزرگوں کی، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور انھیں سے بیعت تھے۔ فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ وہاں سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں آپ کو دارالعلوم میں بلا لیا گیا۔ یہاں عرصے تک درجۂ علیا کی مختلف کتابیں پڑھائیں۔ مولانا عثمانی کے درس صحیح مسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر ان کی خاص نظر تھی۔ ایک عرصے تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے

۱؎ حضرت مولانا حبیب الرحمن کا دور صدارت اہتمام ۱۳۲۵ھ سے شروع ہو کر ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں ختم ہو گیا اس کے بعد سے اس زمانے تک حضرت مولانا محمد طیب صاحب بدستور مہتمم رہے اور بحمد اللہ آج بھی بدستور اسی منصب پر فائز ہیں۔

بعض اختلافات کے سبب سے حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ وغیرہ حضرات کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ ۱۳۵۴ھ میں حضرت تھانویؒ اور بعض دوسرے اکابر کے ارشاد پر دارالعلوم میں تشریف لائے۔ اور ۱۳۶۲ھ تک بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران میں جامعہ ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا۔

اس موقع پر علامہ عثمانیؒ کی وہ تقریر پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا جو آپ نے دارالعلوم کی صدر اہتمام سنبھالنے کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے اپنی تقریر میں ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم سے علیحدگی کے اسباب کی بڑے لطیف انداز میں توجیہ فرمائی ہے۔ چونکہ اس تقریر سے سابقہ تلخی کی بڑی حد تک تلافی ہو جاتی ہے اس لئے ان کی تقریر کے ضروری حصے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ حضرت علامہ عثمانی نے بڑے فصیح و بلیغ انداز میں فرمایا تھا کہ:

"یہ دارالعلوم ہم سب کا مربی ہے، ہم سب یہیں پیدا ہوئے، یہیں کھیلے، یہیں کودے، یہیں پڑھا، یہیں لکھا، یہیں بڑھا یا اور جو کچھ بھی ہمیں آیا اسی سرچشمۂ علم و معرفت کا طفیل ہے۔ ہمارا یہ دارالعلوم بلاشبہ علم کا ایک عظیم الشان سمندر اور حقیقت و معرفت کا ایک دریائے ناپیدا کنار ہے، اس کا فیض نہ صرف ہندوستان تک ہی جاری ہے بلکہ قال حدثنا قال اخبرنا کی چیزیں بھی آج اور روشنی پاتی ہیں، وہ اسی کا پرتو ہے، جس طرح اسی جون کے مہینے میں آفتاب کی حرارت سے سمندر گرم ہو جاتا ہے، اور اس کے گرم بخارات کو ہوا سمندر سے اٹھا کر بصورت ابر زمین پر پھیلا دیتی ہے، اور یہ چھوٹے بڑے بادل کے ٹکڑے خشک جنگلات یا بحر و عرب سے اٹھ کر دور دراز علاقوں میں برس پڑتے ہیں جن سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اور مُردہ کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں

ان کا اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ لہ

علم و فضل، فہم و فراست، تدبر اور اصابت رائے کے لحاظ سے علامہ عثمانی کا شمار ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں ہوتا تھا۔ وہ زبان و قلم دونوں کے یکساں شہسوار تھے۔ اردو کے صاحب طرز ادیب اور بڑی سحر انگیز خطابت کے مالک تھے۔ فصاحت و بلاغت، ایجاز و اطناب، تشبیہات و استعارات اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے ان کی تحریر و تقریر دونوں منفرد تھیں۔ وہ حالات حاضرہ پر بڑی گہری نفسیاتی نظر رکھتے تھے، اس لئے ان کی تحریر و تقریر عوام و خواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ عظیم الشان جلسوں میں ان کی فصیح و بلیغ اور پرجوش تقریروں کی یاد آج بھی اہل ذوق کے دلوں میں موجود ہے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں جامعہ ملیہ کی تاسیس کے وقت جو خطبہ دیا تھا، اس کے لکھنے اور جلسے میں پڑھنے کا شرف مولانا عثمانی ہی کو حاصل ہوا تھا۔

علم الکلام، عقل و نقل، اعجاز القرآن، حجاب شرعی، الشہاب، الرحم، تجلیات وغیرہ ان کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن مجید پر مولانا عثمانی کے تفسیری حواشی کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ علم حدیث میں ان کی گراں قدر تصنیف فتح الملہم شرح صحیح مسلم کی جو شرح فرمائی ہے، ان کا ایک ایسا زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس نے ان کے علم و فضل کو تمام عالم اسلام میں روشناس کرا دیا ہے۔

سیاسیات میں مولانا عثمانی جمعیۃ العلماء ہند کے شریک تھے۔ اس سے قبل وہ خلافت کمیٹی کے ایک اہم رکن رہ چکے تھے۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ مولانا عثمانی سالہا سال تک جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے صف اول

لہ تقریر مجموعہ مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۴ھ ص ۳

دارالعلوم کے مفتیانِ کرام

یہ گزر چکا ہے کہ دارالعلوم جس زمانے میں قائم ہوا اس وقت ہندوستان کے
قدیم دینی مدارس تقریباً قریب ختم ہو چکے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز کے بعد علماء کی
اکثر جماعت قید و بند و دار و رسن کی نذر ہو گئی تھی۔ کچھ علماء کو جنگ آزادی میں شرکت کے جرم میں
حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دے کر کالا پانی "انڈیمان" بھیج دیا گیا تھا کچھ حضرات انگریزوں
کی دار و گیر سے بچ کر دوسرے ملکوں میں ہجرت کر گئے تھے۔ باقی ماندہ علماء کی بڑی حد تک
روپوشی طاری کی تھی۔ ان حالات میں مسئلہ بتانے والے مشکل سے نظر آتے تھے۔
دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو لوگوں کو امید کی کرن نظر آئی۔ عامۂ مسلمین کا دارالعلوم سے
ساتھ ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ ملک میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا اور مسلمانوں نے کوئی
مشکل محسوس کی تو نظریں خود بخود دارالعلوم کی طرف اٹھتی رہی ہیں چنانچہ مسائل مذہب

کرنے والوں کا رجوع ہونے لگا اس لئے دارالعلوم میں درس و تدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ جو دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین تھے، وہی اس کام کو بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۲۸۳ھ سے اپنی وفات سے قبل یعنی ۱۳۰۲ھ تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ان کی وفات کے بعد مختلف اساتذہ سے فتاویٰ کا کام لیا جاتا رہا، اور ۱۳۱۰ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا، لیکن جب استفتاء کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ گئی تو ۱۳۱۰ھ میں باقاعدہ دارالعلوم میں دارالافتاء قائم کیا گیا، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی کو مفتی کے منصب پر مامور کیا گیا۔ دارالافتاء شرعی احکام و مسائل کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور عامۃ المسلمین کے درمیان رابطے کا ایک بڑا اور وسیع ذریعہ ہے۔ دارالعلوم کے فتاویٰ کو ملک اور بیرون ملک میں ہمیشہ وقعت و عظمت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ عوام کے علاوہ ملک کی عدالتیں بھی ان کا احترام کرتی ہیں، اور انھیں فیصلہ کن سمجھتی ہیں۔ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۸۵ھ تک دارالافتاء سے جو فتاوے جاری کئے گئے ان کی مجموعی تعداد ۲۶۹۳۳۹ ہے۔

مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ

سال ولادت ۱۲۷۵ھ ہے۔ تاریخی نام "ظفر الدین" رکھا گیا۔ والد ماجد کا اسم گرامی مولوی فضل الرحمن تھا۔ ۱۲۸۳ھ کے اوائل میں جب دارالعلوم میں درجۂ قرآن شریف جاری کیا گیا تو حضرت مفتی صاحب کو درجۂ حفظ قرآن میں داخل کر دیا گیا۔ شعبان ۱۲۸۳ھ میں انھوں نے نصف قرآن مجید کے حفظ کا امتحان دیا اور ۱۲۸۴ھ میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس وقت درجۂ قرآن شریف کے استاد حافظ نامدار خاں صاحب تھے۔ ۱۲۹۰ھ میں انھوں نے

ۛ۱ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ ص ۴

۲ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۵ھ ص ۱۲

بخاری شریف، مسلم شریف اور شرح عقائد کا امتحان دے کر دارالعلوم سے فراغت حاصل
کی۔ اس وقت دارالعلوم کے اساتذہ یہ تھے حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا
سید محمود دیوبندیؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبدالعلی رحمہم اللہ تعالےٰ۔ ۱۲۹۵ھ کے
جلسۂ دستار بندی میں آپ کو سند و دستار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دستِ
مبارک سے عطا ہوئی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد کچھ عرصے دارالعلوم میں معین مدرس رہے اور اسی کے ساتھ فتویٰ
نویسی کی خدمات بھی حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صدر المدرسین کی نگرانی میں انجام دیتے
رہے۔ پھر آپ کو میرٹھ بھیج دیا گیا، وہاں مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ میں کئی سال تک درس و
تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۳۰۷ھ میں اکابر دارالعلوم نے نائب مہتمم کے عہدے کیلئے
آپ کا انتخاب کیا، پھر ایک سال کے بعد آپ کو مفتی و مدرس مقرر کیا گیا۔ ۱۳۲۲ھ کی روداد
میں لکھا ہے:-

"مولوی عزیز الرحمن صاحب نے فراغت کے بعد بطور معین المدرس دارالعلوم میں
مدرسی کی اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی نگرانی میں افتاء کا کام بھی کیا، اسی زمانے میں آپ کو
داعیۂ طریقت پیدا ہوا اور خاندانِ نقشبندیہ میں حضرت مولانا رفیع الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت
کی، چند سال کی ریاضات و مجاہدات کے بعد اجازت سلسلہ حاصل ہوئی۔ چند سال تک میرٹھ
کے مدرسہ اسلامیہ واقع اندرکوٹ میں مدرس رہے، اسی زمانے میں آپ کو دوبارہ
حج بیت اللہ ہوا، اس سفر میں آپ کا حج کے ساتھ یہ بھی مقصد تھا کہ شیخ المشائخ حضرت حاجی
امداد اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں قیام فرمائیں، چنانچہ ڈیڑھ سال آپ کا اس سفر میں صرف
ہوا۔ اور حضرت حاجی صاحبؒ نے بھی آپ کو مجاز فرمایا، شوال ۱۳۰۹ھ میں تشریف لے گئے
تھے اور صفر ۱۳۱۱ھ میں واپس تشریف لائے۔ ۱۳۱۰ھ میں آپ کو میرٹھ سے دیوبند بلا لیا
اس وقت سے برابر دارالعلوم کی خدمت میں مصروف ہیں، آپ اس وقت مفتی مدرسہ ہیں۔"

لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ کے چند سبق کہ آپ سے متعلق رہے ہیں۔[1]

حضرت مفتی صاحبؒ بڑے بڑے اہم اور معرکۃ الآراء استفتاء کا جواب برجستہ علم بر داشتہ اور مراجعتِ کتب کے بغیر بلاتکلف تحریر فرما دیا کرتے تھے۔ چالیس سال کے قریب آپ نے دارالعلوم کے دارالافتاء کی مسندِ جلیل کو رونق دی، اس عرصہ میں بے شمار ایسے مشکل فتاویٰ بھی لکھے جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآراء تحقیقات میں مقالہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر صرف چند سطروں میں اُن کا جواب تحریر فرما دیتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ دارالافتاء کی ایک ستون رہے تھی، مراجعتِ کتب کے بغیر محض حذاقت و مہارت اور کمالِ استحضار سے بے تکلف فتاویٰ تحریر فرماتے رہتے تھے۔ نصوصِ فقہ اکثر و بیشتر حفظ یاد رہتی تھیں۔ اُن کے فتاویٰ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہوتے ہیں۔ اُن کے فتاویٰ کی زبان سہل اور سلیس ہوتی ہے، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اُن کے فتاویٰ میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔

فتویٰ نویسی علومِ شرعیہ میں بڑا مشکل کام ہے۔ اس کام میں عالمات کے جو مسائل بے حد نزاکتیں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کو صرف اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یوں تو فتاوے ہر زمانے میں لکھے گئے ہیں مگر فتویٰ نویسی کا جو کمال حضرت مفتی صاحب کو حاصل تھا یہ کمال جماعتِ دیوبند میں صرف تین ہی شخصوں کے حصے میں آیا ہے۔ ایک مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دوسرے حضرت مفتی صاحبؒ اور تیسرے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ۔ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک حضرت مفتی صاحب نے جو فتاویٰ تحریر فرمائے ہیں افسوس ہے کہ اُن کا ریکارڈ موجود نہیں ہے، فتویٰ نویسی میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے کبھی صرفِ نظر نہیں کرتے تھے، اس پر اُن کی نظر بہت

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم ۱۳۹۶ھ ص ۱۹

گیری پڑتی تھی۔ اگر کسی مسئلہ کے دو مختلف پہلو ہوتے تو ایسے موقع پر وہ آسان پہلو کو اختیار کرتے اور اسی پر فتویٰ دیتے تھے۔ ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے تھے جو عوام کے لیے مشکلات پیدا کرنے والی ہو۔ اُن کے فتاویٰ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

۱۳۲۹ھ سے ۱۳۴۶ھ تک کے فتاویٰ کی تعداد ۳۴۵۹ ہے۔ اس میں بھی درمیان کے کچھ سالوں کا ریکارڈ ضائع ہو گیا ہے۔ مذکورہ بالا تعداد صرف وہ ہے جس کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے ایک سرسری اندازے کے مطابق حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔[1] اُن کا یہ زبردست کارنامہ عظیم الشان دینی خدمت ہے۔ آپ کے فتاویٰ کی یہ خصوصیت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آپ کے فتاویٰ ہندوستان و بیرونِ ہند میں مسلمانوں کے معاملات و عبادات و اعتقادات میں فیصلہ کن سمجھے جاتے تھے۔

۱۳۲۹ھ سے ۱۳۴۶ھ تک کے فتاویٰ کو فتاویٰ دار العلوم دیوبند کے عنوان سے فقہی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کرا کر دار العلوم کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اب تک دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ آخری جلد کتاب الطلاق کے مسائل پر مشتمل ہے۔ فتاویٰ کا یہ سلسلہ غالباً ۲۰ جلدوں میں پورا ہوگا۔ اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

حضرت مفتی صاحب نہ صرف عالم اور مفتی ہی تھے بلکہ عارف باللہ صاحبِ باطن بزرگ بھی تھے۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی مستقلاً قائم تھا۔ دور دراز سے تشنگانِ معرفت غیر ہندوستان میں آ کر آپ کی باطنی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہو کر بامراد ہوتے تھے۔

نقشبندیت کے مشہور معمولات میں سے ختم خواجگان ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی مسجد

---

[1] مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند مرتبہ مولانا ظفیر الدین جلد اول ص ۸۰

تحقیق یہ ہے غور کیا جائے تو یہ مقام اس علمی خدمت اور عملی بے نفسی کے مقام سے بھی زیادہ بلند اور نازک تر ہے جس تک پہنچنا ہر ایک کا حوصلہ نہیں علمی و قابلیت خود ساز ذہن پیش کرے اور اس ذہن کو کسی کی آگے نہ آنے دیا جائے۔ یہ بے نفسی اور فنا کا نہایت ہی اونچا مقام ہے اور یہ اسی کو میسر آ سکتا ہے جس کے رگ و پے میں تواضع اور کسر نفسی سما گئی ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ بھی دار العلوم سے مستعفی ہو گئے تھے، ۱۳۴۶ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ علالت کے باعث جب دیوبند تشریف لائے تو بخاری شریف کے چودہ پارے باقی تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت مفتی صاحبؒ وسط ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کا درس شروع کر دیا اور صرف ڈیڑھ ماہ کی قلیل ترین مدت میں بخاری شریف کے باقی ماندہ ۱۴ پارے ختم کرا دیئے۔

جمادی الثانی کے اوائل میں آپ دیوبند تشریف لا رہے تھے راستے میں طبیعت علیل ہو گئی دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہو سکا وقت موعود آ چکا تھا، بالآخر ۲ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہا، ۱۰ بجے دن میں حضرت مفتی صاحبؒ کے جنازے کی نماز حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ نے پڑھائی اور بجے آپ دار العلوم کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وجعل الجنۃ مثواہ۔

آپ علم و عمل، اصول و ملکات، معرفت و بصیرت اور تقویٰ و دین کی بے مثل شخصیت تھے، ایک منفرد پایہ شخصیت تھے جن سے دار العلوم دیوبند کے دور اول کو زینت بخشی گئی

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ [۲۷]

دار العلوم دیوبند کے بہت ممتاز فضلاء میں سے تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ پورنیہ ضلع بھاگلپور (بہار)

کے لئے منتخب فرمایا۔ چنانچہ آپ تقریباً سات سال اس علاقے میں درس دیتے رہے پھر آپ شاہجہانپور تشریف لائے اور ایک مسجد میں افضل المدارس کے نام سے مدرسہ قائم کیا، جس میں حسبۃً للہ پڑھاتے رہے یہاں تقریباً تین سال آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا ۱۳۲۲ھ میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ہوا۔ اور پہلے سال آپ کو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ پڑھانے کیلئے دی گئیں اس وقت کی روداد میں حضرت شیخ الادب کی نسبت لکھا ہے۔

" مولوی اعزاز علی صاحب طبقۂ وسطی و آخری کے درمیانی مدرس ہیں اور منتخب حضرات میں سے ہیں۔ چند جگہ مدرس رہے ہیں۔ آپ ایک نوجوان، با استعداد اور صاحب صلاح و تقوی عالم ہیں۔ صورتاً و سیرتاً اپنے سلف کی یادگار ہیں۔ علوم میں استعداد رکھتے ہیں، خصوصاً علم ادب میں خاص مہارت ہے۔ اس لئے آپ نے حماسہ کا محشیٰ کیا ہے، اور کنز الدقائق کا حاشیہ کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے دیوان متنبی کا حاشیہ کرچکے ہیں آپ دارالعلوم کے درجہ وسطیٰ میں درس دیتے ہیں علم ادب کے اکثر اسباق آپ کے پاس رہتے ہیں۔ طلباء کو عربی تحریر کی مشق بھی کرتے ہیں خوش تقریر ہیں، طلباء آپ سے نہایت مانوس ہیں۔"

۱۳۴۴ھ میں جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا حیدرآباد کے مفتی اعظم کے عہدے پر تقرر عمل میں آیا تو اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کو اپنی معیت میں لے گئے، وہاں ایک سال قیام رہا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے ساتھ ہی آپ دیوبند تشریف لائے آپ کو مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کے بعد صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے آخر عمر تک دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کا قیام رہا۔

فن ادب آپ کا خاص فن تھا جس کی مہارت مشہور و معروف ہے۔ آپ جب ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ آپ کو دی گئیں مگر آپ کے درس سے بالآخر وہ مقبولیت حاصل کی کہ "شیخ الادب والفقہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ عمر کے آخری دور میں کئی سال ترمذی جلد ثانی اور تفسیر کی بلند پایہ کتابیں بھی پڑھائیں۔ حضرت مولانا مدنی کی عدم موجودگی میں متعدد مرتبہ بخاری شریف کے پڑھانے کا بھی آپ کو اتفاق پیش آیا۔ غرض کہ علم فقہ، علم حدیث، علم ادب، علم تفسیر وغیرہ ہر فن کی کتابوں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت و نگرانی کا آپ میں خاص ذوق تھا، جس سے طلباء کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ آج تک آپ کے شاگرد آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ کی پابندیٔ اوقات ضرب المثل تھی۔ اور اوقات درس کی پابندی میں آپ خود ہی بے نظیر تھے، حتیٰ کہ بعض اساتذۂ دارالعلوم نے درس میں اوقات کی پابندی کا سبق حضرت شیخ الادب ہی سے سیکھا ہے۔

مدرسی کے ابتدائی دور سے آخر عمر تک منٹوں اور سکنڈوں تک کی پابندی فرماتے رہے۔ بے نفسی اور تواضع میں یہ طریقہ رکھتے تھے، بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں بھی آپ کو عار نہ ہوتا تھا، ترمذی و ہدایہ کا درس بھی دے رہے ہیں، اور بچوں کو میزان الصرف، علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ بھی پڑھا رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب طالب علم وہ ہوتا تھا جو یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں لگا رہے۔ اور سب سے زیادہ مبغوض وہ ہوتا تھا جو غیر تعلیمی مشاغل میں لگ کر پڑھنے میں تساہل کرے، خواہ وہ خود اُن کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت شیخ الادبؒ کو جس طرح عربی نظم و نثر پر قدرت حاصل تھی، اسی طرح وہ اُردو نظم و نثر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اُردو نثر میں اُن کا ایک خاص انداز تھا۔ اُن کا خط اگرچہ پاکیزہ نہ تھا مگر لکھنے کا ڈھنگ ایسا تھا کہ دیکھنے میں خوشنما معلوم ہوتا تھا

انھوں نے عربی ادب میں نفحۃ الیمن کے معیار کے مطابق نفحۃ العرب کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی تھی جس میں تاریخی حکایات و قصص اور اخلاقی مضامین بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب عربی مدارس میں بہت مقبول ہوئی چنانچہ دارالعلوم اور دوسرے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل کی گئی، اس کے علاوہ انھوں نے فقہ میں نورالایضاح شرح نقایہ کنز الدقائق اور ادب عربی میں دیوان حماسہ اور دیوان متنبی پر مفید حواشی تحریر فرمائے ہیں، جو اساتذہ اور طلباء میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

انتظامی امور میں بھی آپ کی قابلیت مسلم تھی، وقتاً فوقتاً ادارہ اہتمام میں آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا، غرض آپ ایک بے نظیر استاد اور متبحر عالم دین اور ایک جامع شخصیت تھے، دارالعلوم میں آپ کی علمی خدمات کا دور چوالیس برس تک ممتد رہا۔

پہلی مرتبہ [illegible] سے [illegible] تک اور دوسری مرتبہ [illegible] سے [illegible] تک دو مرتبہ آپ کو افتاء کا منصب تفویض کیا گیا، آپ کے عہد صدارت افتاء کے دوران ۵۵۹۴۸ فتاویٰ لکھے گئے، [illegible] میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مفتی ریاض الدینؒ

حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے، [illegible] میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، اصل وطن ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن کے مستعفی ہونے کے بعد [illegible] کے اواخر میں ان کو دارالافتاء کی خدمات تفویض کی گئیں، جہاں اوائل [illegible] تک وہ اس منصب پر فائز رہے، کم و بیش دو سال کی اس مدت میں تقریباً ۶ ہزار استفتاءات کے جوابات دارالافتاء سے دیئے گئے، صفر [illegible] میں انھیں شعبۂ تدریس میں منتقل کر دیا گیا، بڑے نیک اور مرنجان مرنج انسان تھے، ۲۲ ربیع الاول [illegible] کو وفات پائی۔

قبرستان ماکی میں آسودۂ خواب ہیں

مولانا مفتی محمد شفیعؒ

۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے حضرت گنگوہیؒ نے محمد شفیع نام تجویز فرمایا۔ اصلاً دیوبند کے رہنے والے تھے، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۳۶ھ میں ۲۲ سال کی عمر میں فراغت پائی۔ بعد ازاں ۱۳۳۷ھ سے دارالعلوم ہی میں ابتدائی درجہ کے مدرس مقرر ہوئے اور بہت جلد تدریسی ترقی کی منزلیں طے کر کے طبقۂ علیاء کے اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ فقہ و ادب سے شروع ہی سے مناسبت رہی۔ ۱۳۵۰ھ میں منصب افتاء پر فائز ہوئے۔ ۱۳۶۷ھ میں پاکستان چلے گئے وہاں دستور ساز اسمبلی کے بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کے رکن کی حیثیت سے اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دی۔ ۱۳۷۰ھ میں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو اس وقت کراچی میں علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

مفتی صاحب کا علم وسیع اور مجتہدانہ تھا۔ تقریباً تمام متداول دینی علوم میں مہارت تامہ کے مالک تھے اور بہت سی دینی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب میں نہایت مفید تصانیف کا ذخیرہ آپ کے قلم سے نکلا ہے۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ آپ کے سیکڑوں شاگرد و تلامذہ برصغیر کے علاوہ مختلف ممالک میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پہلے حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانویؒ سے رجوع کیا اور خلافت حاصل کی۔ ساری عمر دینی علوم کی تدریس و تصنیف کے ساتھ امور باطنی میں بھی معروف رہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں نعت، غزل، مرثیوں اور متعدد نظموں کا مجموعہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ پاکستان میں ان کو مفتی اعظم کی حیثیت حاصل تھی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے اول ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۵۴ھ تک اور پھر ۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۲ھ تک دو مرتبہ دارالافتاء کے فرائض انجام دیئے، ان کے زمانے میں ۲۶ ہزار

کے قریب فتاویٰ لکھے گئے

مفتی محمد شفیع صاحب کے تفصیلی حالات باب چہارم میں گزر چکے ہیں۔

مولانا محمد سہولؒ

پورینی ضلع بھاگلپور (بہار) وطن تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بھاگلپور میں مولانا شرف عالمؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے وہاں سے کانپور پہنچے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی سے تعلیم حاصل کی، مدرسہ فیض عام میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے تحصیل علم کی، کانپور سے طلب علم کا شوق ان کو حیدرآباد لے گیا، حیدرآباد کا سفر پیدل دو ماہ میں پورا کیا، حیدرآباد کے دوران قیام میں حضرت مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب اور اصول فقہ کی تحصیل کی۔ حیدرآباد سے دہلی پہنچ کر مولانا نذیر حسین صاحب کے درس میں شریک ہوئے، آخر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث کی تکمیل کی، بعد فراغت دارالعلوم میں سات، آٹھ سال تک مدرس رہے، پھر مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے، ۱۳۴۷ھ میں پٹنہ کے مدرسہ عالیہ شمس الہدیٰ میں پرنسپل مقرر ہوئے، غرض کہ ۴۶ برس تک یوپی، بہار، بنگال اور آسام کے بڑے بڑے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۳۵۷ھ سے ۱۳۶۷ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، ۲۴ رجب ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء کو وصال ہوا۔ مزار پورینی میں ہے۔

مولانا محمد سہول صاحب ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۵۷ھ تک تقریباً تین سال دارالافتاء میں صدر مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اُن کے زمانے میں ۵۵۰۰ فتاویٰ دارالافتاء سے مدون کیے گئے۔

بڑا اثر تھا۔ فقہ حنفی میں بے نظیر مہارت کے ساتھ حدیث اور اسماء الرجال پر بھی ان کی نظر بڑی گہری تھی ۱۳۶۷ھ میں انھیں دارالعلوم کے دارالافتاء میں صدر مفتی کے منصب پر مامور کیا گیا۔ ۱۳۸۷ھ میں اپنی طویل علالت اور ضعف و کمزوری کی وجہ سے دارالعلوم سے سبکدوش ہو کر وطن مالوف شاہجہانپور چلے گئے۔

اُن کے زمانۂ صدارت میں دارالافتاء دارالعلوم سے ۵۵۳۲۲ فتاویٰ جاری ہوئے مفتی مہدی حسن صاحب زاہد و متقی، متواضع اور نیاز مند طبع تھے اس کے ساتھ صاف گو اور اظہارِ حق میں بیباک تھے۔ شاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور آزاد تخلص تھا حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے مگر اجازت و خلافت حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ مولانا شفیع الدین نگینویؒ سے حاصل ہوئی۔

مفتی مہدی حسن صاحب کئی اہم کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں جن میں حدیث کی شرح معانی الآثار طحاوی کی عربی شرح قلائد الازہار کے نام سے ۶ جلدوں میں ہے، اس کی دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں فقہ میں امام محمدؒ کی کتاب الحجہ ۴ جلدوں میں ہے، اُن کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے اس کی ابتدائی دو جلدیں چھپی ہیں، یہ کتاب بڑی نایاب تھی، اس کا ایک نسخہ استنبول میں موجود تھا، یہ فقہ حنفی کی بنیادی کتابوں میں سے ہے مفتی صاحب نے اس کے مسودے کی تصحیح و تعلیق میں ۲۰ سال صرف کئے ہیں۔ امام محمدؒ کی کتاب الآثار پر ان کی تعلیقات گرانقدر علمی سرمایہ ہیں، عقود الجواہر المنیفہ کی شرح بھی مفتی صاحب نے لکھی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے، یہ سب کتابیں عربی زبان میں ہیں، ان کے علاوہ اردو میں دو درجن سے زائد رسائل انھوں نے لکھے ہیں جو طبع نہیں ہو سکے۔

مفتی مہدی حسن صاحب نے طویل علالت کے بعد اپنے وطن شاہجہاں پور میں ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کو وفات پائی۔

X

مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی

۸ جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ میں گنگوہ میں پیدا ہوئے۔ مظاہر علوم سہارنپور اور دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم سہارنپور سے حدیث کی تکمیل کی اور وہیں تقریباً ۲۰ سال تک افتاء و درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعدہ جامع العلوم کانپور میں ۱۳۶۵ھ سے ۱۳۸۵ھ تک ۲۰ سال کے قریب مسند صدارت و افتاء پر فائز رہے۔ کانپور کے لوگوں پر ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور بزرگی کا بڑا اثر ہے۔

۱۳۸۵ھ میں صدر دار الافتاء دار العلوم دیوبند میں مفتی کے منصب کے لئے منتخب کیا گیا جس پر تا ایندم فائز ہیں۔ فتویٰ نویسی کے علاوہ صحیح بخاری جلد دوم کا درس بھی طلباء کو دیتے ہیں۔

مفتی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ مگر ان کے لکھے ہوئے بعض اہم فتاویٰ مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کانپور کا ماہنامہ "نظام" برابر ان کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ فتاویٰ میں طرز تحریر اختصار پسندانہ ہے۔

مفتی صاحب کو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سے خلافت و اجازت حاصل ہے۔ ان کی قیام گاہ ذاکرین کے ذکر سے معمور رہتی ہے۔ وہ نہایت منکسر المزاج، متواضع، کثیر الاوراد و اذکار و شاغل، فراخ حوصلہ اور نیک چشم بزرگ ہیں۔ ان کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ دار العلوم سے انہیں جو مشاہرہ ملتا ہے اس کو وہ ہر ماہ نہ صرف یہ کہ دار العلوم میں داخل کر دیتے ہیں بلکہ اس میں مزید کچھ اور روپے بھی شامل فرما دیتے ہیں۔ ان کا یہ عمل لگاتار جاری ہے۔

مولانا مفتی نظام الدین

۱۳۲۸ھ میں اپنے وطن موضع [illegible] ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن کے مکاتب میں

ہوئی پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اعظم گڑھ میں پڑھا۔ بعد ازاں مدرسہ عربیہ بہار شریف و مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی میں ہدایہ تک کی درجات تک تحصیل علم کی۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۵ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مئو ضلع اعظم گڑھ اور گورکھپور میں تدریسی خدمت انجام دی۔ پھر مدرسہ دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں صدر مدرس اور افتاء کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طلب پر دارالعلوم میں افتاء کا منصب تفویض ہوا، جس پر اب تک فائز ہیں۔ فتویٰ نویسی کا اچھا ملکہ حاصل ہے۔ فتاویٰ میں ان کے جوابات مفصل ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر اہم فتاویٰ رسالہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہ سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل ہے۔ طبیعت میں سادگی اور وقار نمایاں ہے۔

باب ششم

دارالعلوم کا نظامِ تعلیم

دارالعلوم کا نصابِ تعلیم بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ علومِ عربیہ کے نصاب کی اجمالی تاریخ بیان کر دی جائے تاکہ اسلام کے قرنِ اول سے لے کر موجودہ زمانے تک علمی رجحانات کا فی الجملہ اندازہ کیا جا سکے۔

عہدِ نبوت میں تعلیم کی ابتداء قرآن مجید سے شروع ہوئی، حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حدیث کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس کا بھی خصوصی اہتمام کیا گیا، پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور علمی ضرورتیں بڑھتی رہیں علوم میں بھی حسبِ ضرورت اضافہ ہوتا رہا، دوسری صدی ہجری کے وسط تک علومِ دینیہ قرآن، حدیث، فقہ اور فتاویٰ و سیرت میں منحصر تھے، اس کے بعد چوتھی صدی کے آخر تک عہدِ ابحاث و تدوین کا دور کہلاتا ہے۔ اس میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون کی ایجاد و تدوین کے عمل میں آنے اور حسبِ ضرورت بعض فنون کی تعلیم و تدریس بھی ہونے لگی، چنانچہ حدیث، تفسیر، فقہ، اصول، صرف و نحو، لغات، اشعارِ عرب اور تاریخ، مغازی کے علوم درسیہ شمار کئے جانے لگے، نجوم، ہیئت اور بعض دوسرے عقلی علوم بھی اس میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان میں امام غزالیؒ کے ذریعے علم کلام کی بنیاد پڑی اور اس کی تائید کے لئے مذکورہ علوم کے علاوہ منطق اور فلسفہ وغیرہ علوم معقول بھی اسلامی درس گاہوں کا ضروری جزو بن گئے

اگرچہ یہ علوم کم و بیش تمام اسلامی ملکوں میں متداول تھے تاہم مختلف ممالک میں ملکی حالات اور قومی خصوصیات کا اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ مصر و شام وغیرہ ممالک میں چونکہ کثرت سے عرب خاندان آباد تھے اس لئے ان ممالک میں عربی رجحانات کا غلبہ حاصل ہونے کے باعث تفسیر و حدیث اور اسماء الرجال پر زیادہ اعتبار کیا جاتا تھا۔ اندلس میں ادب و شعر اور تاریخ کو زیادہ فروغ حاصل تھا، ایران میں منطق و فلسفہ کا ذوق غالب تھا۔ اور خراسان و ماوراء النہر میں فقہ، اصول فقہ اور تصوف کا زیادہ رواج تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک ہی ملک میں مختلف زمانوں میں اصحاب اثر و اقتدار اور گردوپیش کے تقاضوں کے باعث بھی اکثر نصاب میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔

ہر چند ہندوستان میں مسلمان پہلی صدی ہجری ہی میں پہنچ گئے تھے جس میں پانچویں صدی کے اوائل یعنی سلطان محمود غزنوی کے عہد میں خاصہ اضافہ ہوا، اور سندھ کے علاوہ پنجاب تک کا علاقہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر ان کے اصلی اثر و رسوخ کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر یعنی سلطان شہاب الدین محمد غوری (۵۶۹ھ - ۶۰۲ھ) کے عہد سے ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ میں تفسیر و حدیث کے ساتھ صرف و نحو لغت، ادب، فقہ، منطق، کلام اور تصوف گرچہ بڑی تعظیم سے پڑھے جاتے تھے مگر فقہ اور اصول فقہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ہندوستان میں آنے والے مسلمان زیادہ تر انہی ممالک سے آئے تھے۔ لہٰذا ان کے ساتھ ان کے رجحانات کا آنا بھی لازمی تھا چنانچہ ہندوستان میں اس دور کے نصاب تعلیم میں یہ سب علوم داخل اور جزو نصاب تھے۔

مولانا حکیم سید عبد الحی لکھنوی نے قدیم ہندوستانی نصاب تعلیم کے حسب ذیل

جو مقرر کر دیے ہیں:

دورِ اوّل

اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور اختتام دسویں صدی پر، اس وقت جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا۔ کم و بیش دو سو برس تک صرف چند ذیل فنون کی تحصیل معیارِ فضیلت سمجھی جاتی تھی: صرف، نحو، ادب، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث۔

علم نحو میں مصباح، کافیہ، لب الالباب مصنفہ قاضی ناصر الدین بیضاوی اور ارشاد مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی۔

فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں منار اس کے شروح، اور اصول بزدوی

تفسیر میں مدارک، بیضاوی اور کشاف۔

تصوف میں عوارف، فصوص الحکم اور ایک زمانے کے بعد نقد النصوص و لمعات بھی ان مدارس میں رائج ہو گئی تھیں جو خانقاہوں سے متعلق تھے۔

حدیث میں مشارق الانوار، مصابیح السنۃ (یعنی مشکوۃ مصابیح کا متن)

ادب میں مقامات حریری۔ یہ بالکل یاد کی جاتی تھی، حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شمس الدین خوارزمی سے مقامات پڑھی تھی اور چالیس مقامے زبانی یاد کیے تھے۔

منطق میں شرح شمسیہ۔

کلام میں شرح صحائف اور بعض مقامات پر تمہید ابو شکور سالمی

اس طبقے کے علما کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں نحو اور اصول فقہ سے فضیلت تھی، حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جب

میں مزید درک و مہارت کے لئے مطالع آخری کتاب تھی۔

اس زمانے کے نصاب تعلیم میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ ماقبل ہند کے مؤثر مذاق کا نتیجہ تھیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا تخت جن لوگوں نے بچھایا وہ غزنی اور غور سے آئے تھے۔ وہ مقامات کے حیاساتھ اور اصول فقہ کا ماہر ہونا علم و فن کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ ان ممالک میں فقہی روایات کا پایہ بہت بلند تھا۔

دور دوم

نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیزاللہ نے ساتویں صدی کی فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لئے قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم نصاب میں داخل کیں۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے ان کے حالات میں بدایونی نے لکھا ہے کہ:

"ایں ہر دو عزیزان بنگام خرابی ملتان بہندوستان آمدہ، علوم معقول را دراں دیار رواج دادند قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہندوستان شائع نبود"[۱]

اس دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول و مختصر المعانی اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ نیز اس زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح جامی داخل نصاب کی گئیں۔

اس دور کے آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ماورا النہر سے علم حدیث کی تکمیل کرکے علم حدیث کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند شیخ نورالحق نے بھی ادب حدیث کی اشاعت کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوسکی۔

---

[۱] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۵

روایتوں کی جن کتابوں کی فہرست درج کی جا چکی ہے ان میں اس دور کی مذکورہ بالا کتابیں یعنی مطالع و مواقف اور ان کی شرحیں، مطول، مختصر، توضیح، شرح عقائد نسفی، شرح وقایہ شرح ملا لکھنوی ذکر لیجیے، دورِ دوم کے نصاب کی فہرست بہ سابق ترتیب ہو جاتی ہے

اس عہد کے علمائے کرام کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے زمانے میں صدرا اور شمس بازغہ درسی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، اسی طرح اس زمانے میں مفتاح العلوم سکاکی اور قاضی عضد کی مطالع اور مواقف منتہیانہ کتابیں تھیں، بدایونی نے جا بجا علماء کے حالات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دورِ سوم

دورِ دوم کے نصاب درس میں جو تغیر ہوا اس سے لوگوں کی امنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیارِ قابلیت کو پہلے سے زیادہ بلند کرنے کے متمنی تھے، میر فتح اللہ شیرازی ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر پذیرائی کی، انھوں نے سابق نصاب درس میں کچھ جدید اضافے کیے جس کو علماء نے فوراً قبول کر لیا، مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:-

تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقۂ درس انداخت و جمِ غفیر را حاشیہ نشین مستفاد کرد و از آن عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو اس دور کے سب سے آخری بزرگ ہیں اپنا رسالہ جزء اللطیف میں اپنی درسیات کو بترتیب لکھا ہے۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۴۸

نحو میں کافیہ، شرح جامی۔

منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالع

فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ۔

کلام میں شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی، شرح مواقف۔

فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ کامل

اصول فقہ میں حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح۔

بلاغت میں مختصر و مطول۔

ہیئت و حساب میں بعض مختصر رسائل

طب میں موجز القانون

حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور کسی قدر صحیح بخاری۔

تفسیر میں مدارک اور بیضاوی۔

تصوف و سلوک میں عوارف، رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔

اس نصاب کی تکمیل کے بعد حضرت شاہ صاحب حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں چودہ ماہ قیام فرما کر شیخ ابو طاہر کردی سے علم حدیث کی تکمیل کی اور ہندوستان آکر اس سرگرمی سے اس کی اشاعت کی جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے اخلاف نے صحاح ستہ کے درس تدریس کو اپنی سعی و کوشش سے جزو نصاب بنا دیا۔

شاہ صاحب نے ایک سا نصاب درس کا مرتب کیا ہے مگر چونکہ اس زمانے میں علم کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا، نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں ایران سے جو تعلق ہو گیا تھا اس نے قدیم ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا

مغل دربار کے ایرانی امراء اور علماء کے نزدیک منطق اور فلسفہ کو جو شرف حاصل ہے یہی ایران میں معیار فضیلت سمجھے جاتے تھے آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت حاصل ہوتی جاتی تھی اس لئے شاہ صاحبؒ کے نصاب کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔

دور چہارم

چوتھا دور بارھویں صدی ہجری سے شروع ہوا اس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی تھے، یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ہم عصر تھے۔ درس نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارس عربیہ میں رائج ہے وہ انہی کی یادگار ہے۔ ملا نظام الدین نے دور سوم کے نصاب میں اضافہ کر کے مندرجہ ذیل نصاب مرتب کیا۔

صرف میں۔ میزان۔ منشعب۔ صرف میر۔ پنج گنج۔ زبدہ۔ فصول اکبری۔ شافیہ

نحو میں۔ نحو میر۔ شرح مائۃ عامل۔ ہدایۃ النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی۔

منطق میں۔ صغریٰ۔ کبریٰ۔ ایساغوجی۔ تہذیب۔ شرح تہذیب۔ قطبی۔ میر قطبی۔ سلم العلوم۔

حکمت میں۔ میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔

ریاضی اور ہیئت میں۔ خلاصۃ الحساب۔ تحریر اقلیدس مقالہ اولیٰ۔ تشریح الافلاک۔ رسالہ قوشجیہ۔ شرح چغمینی باب اول۔

بلاغت میں۔ مختصر المعانی۔ مطول تا ما انا قلت

فقہ میں۔ شرح وقایہ اولین۔ ہدایہ آخرین۔

اصول فقہ میں۔ نور الانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت

کلام میں۔ شرح عقائد نسفی۔ شرح عقائد جلالی۔ میر زاہد۔ شرح مواقف

تفسیر میں۔ جلالین شریف، بیضاوی سورہ بقرہ

حدیث میں۔ مشکوٰۃ مصابیح

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم میں وسعتِ نظر اور قوت مطالعہ پیدا کرنے کا اس میں خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے اور گو اس نصاب کی تکمیل کے بعد کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا، مگر یہ صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ شخص اپنے مطالعہ اور محنت سے جس فن میں چاہے کمال پیدا کرے، حدیث و تفسیر کا معیار اس نصاب میں کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، اور ادب کی تو کوئی کتاب ہے ہی نہیں۔

تیرھویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مرکز قائم تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد۔ گو نصابِ تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطۂ ہائے نظر مختلف تھے۔ دہلی میں تفسیر و حدیث پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا خاندان کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا۔ علوم معقول کی حیثیت ثانوی درجے کی تھی۔ لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل پر دورِ اکبر کا ساتھ ہی صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا۔ فقہ اور اصول فقہ کو ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ المصابیح کافی سمجھی جاتی تھی۔ خیرآباد کے مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا، اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ دیگر علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

دارالعلوم کا نصابِ تعلیم

تیرھویں صدی کے نصف آخر میں دہلی اور خیرآباد کی علمی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، البتہ لکھنؤ میں علم کی کچھ روشنی باقی تھی۔ گو ان مقامات کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی تاہم ان تینوں مرکزوں

کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہندوستان کے مدارس عربیہ میں کم و بیش موجود تھیں۔

دارالعلوم دیوبند نے ان علوم کی عظمت کو دوبارہ زندہ کر کے باقی رکھا ہے۔ مسلمانوں کو ترقی دینے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں ان تینوں نصابوں کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اور ان کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے۔ کم و بیش ایک صدی سے وہی بالعموم مدارس عربیہ ہند میں زیر درس ہے۔ بعض مقامات پر دوسرے جدید نصاب بھی رائج ہیں۔ ایسے مدارس میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کی حیثیت زیادہ ممتاز ہے۔ مگر یہ نصاب زیادہ عام نہیں ہے۔

نصاب دارالعلوم کی مذکورہ بالا جامعیت کے باوجود جس طرح ہر زمانے میں حالات کے تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح دارالعلوم کے نصاب میں بھی وقتاً فوقتاً حالات زمانہ کے تقاضے کے مطابق حذف و اضافہ کیا جاتا رہا ہے جس میں علوم دینیہ کے ساتھ عصری علوم اور معاشی ضرورتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اسے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

موجودہ نصاب چار طبقات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی۔ متوسط۔ اعلیٰ۔ تکمیل

درجہ تکمیل لازمی نہیں ہے۔ اگر طالب علم مزید کسی خاص موضوع یا فن میں مہارت حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ درجہ تکمیل میں داخلہ لے کر مزید اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم حسب تفصیل ذیل علوم و فنون اور کتابوں پر مشتمل ہے۔

سال ہشتم دورۂ حدیث

فن	اسمائے کتب
حدیث	بخاری شریف تمام
	مسلم شریف تمام
	ترمذی شریف تمام
	ابوداؤد شریف تمام
	نسائی شریف
	ابن ماجہ شریف
	طحاوی شریف
	شمائل ترمذی شریف
	موطائین

درجاتِ تکمیل

تکمیل تفسیر

فن	اسمائے کتب
تفسیر	تفسیر مدارک پارہ ۱ تا ۵
	تفسیر مدارک پارہ ۶ تا ۱۰
	تفسیر مظہری پارہ ۱۱ تا ۱۵
	تفسیر مظہری پارہ ۱۶ تا ۲۰
	تفسیر بیضاوی شریف پارہ ۲۱ تا ۲۵
	تفسیر بیضاوی شریف پارہ ۲۶ تا ۳۰
	تلخیص الاتقان

تکمیل دینیات

تفسیر	تفسیر ابن کثیر سورۃ بقرہ و آل عمران
حکمت شرعیہ	حجۃ اللہ البالغہ
مناظرہ	رشیدیہ
فقہ	الاشباہ والنظائر فن اوّل
اصول فقہ	توضیح و تلویح
اصول حدیث	مقدمہ ابن صلاح
حدیث و فقہ	مقدمہ فتح الباری، بدایۃ المجتہد
	تدریب الراوی

زبان میں دینیات کی تعلیم کے علاوہ حساب وغیرہ دوسرے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اس شعبے کا نصاب چار سالوں پر منقسم ہے۔

درجۂ فارسی

(۳) اردو دینیات کے بعد دوسرا تعلیمی شعبہ درجۂ فارسی ہے، جس میں فارسی نثر و نظم، حساب، جغرافیہ، ہندی اور عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں نصاب میں شامل ہیں۔ یہ شعبہ بھی چار درجات پر مشتمل ہے۔

ان درجات کے علاوہ مشق و تعلیم کے شعبہ جات یہ ہیں:

علوم عصریہ

(۱) ایک شعبہ علوم عصریہ کا ہے، جس میں انگریزی اور عصری علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس شعبے کا نصاب ایک سال کا ہے۔

مشق افتاء

دورۂ حدیث سے فارغ شدہ طلباء کے لئے فتاویٰ نویسی کی مشق کا بھی ایک شعبہ ہے۔ اس کی مدت تعلیم بھی ایک سال ہے۔

جامعۂ طبیہ

(۳) دار العلوم کا ایک تعلیمی شعبہ جامعۂ طبیہ بھی ہے، جس میں دورۂ حدیث کے فارغ شدہ طلباء داخلہ لے سکتے ہیں۔ جامعۂ طبیہ کا نصاب تعلیم چار سالوں پر مشتمل ہے۔ اس کے نصاب میں طب یونانی کی کتابوں کے ساتھ طب جدید کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

شعبۂ کتابت

(۴) دورۂ حدیث سے فارغ شدہ شعبۂ کتابت میں بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔ اس کی مدت مشق ایک سال ہے۔ درجات عربی کے دوران تعلیم میں یہ شعبہ طلباء کے خط کی اصلاح کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

دار العلوم کے نصاب کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت یہ نصاب مدون

کیا گیا۔ کہ جن زمانے میں علوم جدیدہ ہندوستان پہنچ چکے تھے تو کیوں ان کو شاملِ نصاب
نہیں کیا گیا۔ حضرت نانوتوی کے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ ملک میں سرکاری مدارس
جگہ جگہ قائم ہو چکے تھے جن میں یہ علوم پڑھائے جاتے تھے اور ہر شخص اُن سے فائدہ
اُٹھا سکتا تھا۔ جبکہ علوم قدیمہ کس مپرسی کے عالم میں تھے اور اُن کی تعلیم کا کوئی اور دلی
بندوبست بھی نہ تھا۔ نیز خود اس نصاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ طالب علم میں
ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ مطالعہ کے ذریعے سے دوسرے علوم سے استفادہ کر سکے۔
یہ سوال دارالعلوم کے آغاز میں ہی ابھر کے سامنے آیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ کے جلسہ تقسیم اسناد کے
موقع پر حضرت نانوتویؒ نے تفصیل سے اس سوال پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جمیع علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم اور اُن کی استعدادوں کے حاصل کرنے
کے لئے یہ مدرسہ اور مدرسہ سہارنپور بالکل عمدہ سامان ہے۔ اور
الحمد للہ تعالیٰ یہاں کے طالب علم شرائط تکمیل باقی علوم قدیمہ و جدیدہ
بوجہ قوتِ استعداد بسہولت بہت جلد حاصل کر سکتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے
کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوتِ استعداد ہے۔ فقط علوم
دینی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنونِ دانشمندی کی تحصیل بھی حسب قاعدہ سابق
کی گئی ہے۔ جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے
عالم بڑی بڑی استعداد اور قوت کے اہلِ اسلام میں بکثرت ہوئے اگلے
ہم اس بات کو یقین سمجھتے ہیں۔ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم فنون
جدیدہ سے کامیاب ہوئے نہ ہوں پر اُن کے حق میں یہ اُن کی استعداد قابل استاد
کا محتاج تعلیم کے لئے کافی ہو۔ اور مدارس میں اگرچہ بعض علوم جدیدہ کی تعلیم کی
کثرت کے باعث طالب علموں کو بہت مشق تازہ اُن علوم کی ایسی ہو جیسا
کہ طالب علم کو نہ ہو۔ پر بوجہ قوتِ استعداد اہلِ انصاف کے نزدیک

ایک دوسرے موقع پر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ دارالعلوم میں علوم جدیدہ شامل نصاب نہیں ہیں فرماتے ہیں :-

"یہاں علوم دنیویہ کی تعلیم کا چونکہ اہتمام نہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہیے جو مرض شدید ہو اس کی دوا کی فکر ضرور ہے۔ دینیات کے رخنہ کو بند کرنا چاہیے مقصد کا پھرنا لازم ہے۔ جو آپ بھی گمراہی شبہات کی فکر بجز نادانی اور کیا ہے علاوہ اس کے اور کس لئے ہیں یہاں اگر علوم دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے۔"[1]

طریق درس

دارالعلوم کے طریق درس کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

ابتدائی ـــــــــ متوسط ـــــــــ اعلیٰ

ابتدائی درجات میں اساتذہ کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ طلبہ میں کتاب کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اس لئے کتاب فہمی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

متوسط درجات میں کتاب فہمی کے ساتھ زیر درس کتاب کے علاوہ اس فن کے ایسے مباحث بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں جو طلبہ کے ذہن میں وسعت پیدا کرنے اور ان کے ذہنی معیار کو بلند کرنے کے لئے ضروری ہوں۔

اعلیٰ درجات میں زیر درس فن کی تعلیم و تفہیم پر مکمل زور دیا جاتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ کتاب فہمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

دارالعلوم کا طریق تعلیم یہ ہے کہ پہلے طالب علم کتاب کی عبارت پڑھتا ہے، استاد کا

---

[1] [illegible] ۱۳۹۲ھ ص ۱۳

طریقہ یہ ہے کہ پڑھی ہوئی عبارت پر فنی حیثیت سے اس جامعیت کے ساتھ تقریر کرے جس میں متعلقہ عبارت کے ہر پہلو اور مسئلہ پر روشنی پڑ جائے۔ استاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بحث میں موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آجائیں۔ اور وہ اپنی تقریر کو عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کر دے۔ طلبہ درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں وہ ہر اس بات کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اور جتنے اعتراضات ہر پہلو کے متعلق ان کے ذہن میں آئیں، ان کا اطمینان بخش جواب استاد سے نہ لیں سبق کو آگے بڑھنے نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو طالب علم پوری محنت کے ساتھ درس میں شریک ہوتے ہیں اور دوسری طرف استاد بھی پوری محنت اور توجہ کے ساتھ پڑھانے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

عموماً زیر درس کتابوں کے اسباق میں اساتذہ کی توجہ اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ طلبہ میں کتاب فہمی کی استعداد پیدا ہو جائے اور انہیں مصنف کے منشا کو سمجھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔

علم الحدیث میں مشکوٰۃ المصابیح کے علاوہ حسب ذیل کتب نصاب میں داخل ہیں۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، موطا امام مالک، موطا امام محمد، شرح معانی الآثار طحاوی، شمائل ترمذی

مذکورہ بالا کتب میں اول مذکر چند کتابوں کو بالاستیعاب ختم کرایا جاتا ہے اور ان کے معلومات پر پوری گفتگو ہوتی ہے بقیہ کتابوں کا استیعاب ضروری نہیں ہے، علاوہ ان کتابوں کے چند مباحث میں اس قسم کی تقریر کر دیتے ہیں جس سے ان کتابوں کا امتیاز معلوم ہو جاتا ہے۔ اول الذکر اور مؤخر الذکر کتابوں میں چونکہ احادیث کا بیشتر حصہ مشترک ہوتا ہے اس لئے ان کے درس میں ہر حدیث پر علٰحدہ بحث کی ضرورت نہیں ہوتی

حدیث کے درس میں روات حدیث پر جرح و تعدیل سے متعلق بقدر ضرورت مختصر

دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات

تعلیم جس قدر سادہ اور مختصر سا لفظ ہے اتنا ہی یہ جسم اور روح کی گہرائی تک کو متاثر کرنے والا ہے۔ تعلیم محض نقوش حروف، خط و املا، بولیوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی ذہنی، دینی، فنی اور عملی تربیت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان کی فطری قوت و صلاحیت کو ابھار کر منظم کرتا ہے، اور انسانی جذبات و حسیات کو ایک حد اور اعلیٰ نصب العین کے تحت لاکر مہذب اور شائستہ بناتا ہے۔ تاکہ نوع انسانی کے لئے مفید ثمرات و نتائج بروئے کار لائے جا سکیں۔ انسان کو اس کی اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے، اور جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر تعلیم صرف مادی اور مادی چیزوں کی واقفیت تک محدود ہے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن اگر اسے عمل کا پابند بنا دیا جائے تو اس کی دشواریاں کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ علم کی قدر دنیا کی ہر قوم کرتی ہے۔ لیکن علم کی نسبت مسلمانوں کا جو نظریہ ہے وہ دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ تحصیل علم اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے دنیا میں قوت و شوکت اور ترقی و برتری حاصل کریں علم کو عام طور پر حصول دولت کے لئے وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو دین کے لئے سب سے مقصد سمجھا ہے ذریعہ معاش نہیں سمجھا۔ مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے۔ انھوں نے علم کو کسی اعلیٰ حاصل

نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معاش حاصل کریں۔ مسلمانوں کے نزدیک حصولِ علم ایک فرض ہے
جس کو پورا کر کے مسلمان علاوہ دنیوی سعادت کے اُخروی نجات بھی حاصل کرتا ہے۔ سرورِ کائنات
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ یعنی ہر مسلمان مرد و عورت پر علم
حاصل کرنا فرض ہے۔

یہ فرضیت کل ہی کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے، اور ہر شخص پر بقدرِ ضرورت
واجب ہے۔ تاریخ کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک سربلند نہیں ہو سکتی جب
تک اس میں علم و عمل کی قوتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت
روحانی اور اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی ترقی ہو سکتی ہے، جو انسانی تخلیق کا مقصدِ اصلی ہے۔
ایسی ترقی کے لئے بطورِ خاص ضروری ہے کہ ہر طالب علم کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں
کی بہتر سے بہتر طریقے پر نشوونما کر سکے۔ بالفاظِ دیگر معاشرے کا فرض اولین یہ ہے کہ
وہ تمام ایسی سہولتیں مہیا کرے جس سے ہر طالب علم اپنے بہتر سے بہتر جوہر دکھا سکے۔ درحقیقت
علم سے قومیں بنتی ہیں اور جہل سے بگڑ جاتی ہیں۔ بنا بریں یہ امر واجب ہے کہ ہر شخص کو تعلیم حاصل
کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اسلام نے علم کو سماج کے مخصوص طبقوں کی اجارہ داری
سے نجات دلا کر انسانیت پر جتنا بڑا احسان کیا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ہر ترقی یافتہ قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم
کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے۔ افسوس اس وقت تک [illegible] جبکہ
تعلیم کا صحت مند استحکام ہو، موجودہ طریقۂ تعلیم میں مصارف کی گرانی ہی نے اکثریت
کو تعلیم کے فائدے سے محروم کر دیا ہے۔ عصرِ حاضر کے تجربے کے بعد [illegible] کے ماہرین
تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہئے اور جب تک یہ طریقہ
اختیار نہ کیا جائے گا تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے۔

ہمارا قدیم نظامِ تعلیم

ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے اسی اصول پر عمل درآمد رہا ہے چنانچہ ان مدارس میں تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا اس میں تعلیمی مصارف کو طلبہ کے بجائے درسگاہوں کے ذمہ رکھا گیا ہے۔ اس تعلیمی نظام میں تعلیم ہر کورس میں مفت تھی اور صرف یہی نہیں کہ طلبہ کے لیے درسی کتابوں کا انتظام بھی مفت ہوتا تھا پھر مدرسہ کی تعلیم مفت تھی اور قیام گاہ یعنی بورڈنگ ہاؤس کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ نادار اور غریب طلبہ کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ مدارس عربیہ کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کی مثال دنیا کے کسی تعلیمی نظام میں نہیں پائی جاتی۔

اس کے علاوہ مدارس عربیہ میں حصول علم پر کبھی کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی جس کے ذریعے قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلم کے دروازے بند کر دیے گئے ہوں، بلکہ ان میں ہر وہ شخص جس کو تحصیل علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا تھا۔ عمر اور پیشے کی قید سے ہمارے مدارس ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ اور ان میں رنگ و نسل، امیر و غریب اور اونچ نیچ کے بیچ کوئی امتیازی فرق روا نہیں رکھا گیا، اس بناء پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو بلا تکلف ان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء و فضلاء ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ درجے کے پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مدارس عربیہ میں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام و مشترک بنانے اور رکھنے کا اصول پیش نظر رکھا گیا ہے

اور یہ چیز ہے مفت تعلیم کی پابندی اقوام عالم نے مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے۔ اور جس چیز کا سہرا آج یورپ کے سر باندھا جا رہا ہے۔ درحقیقت مدارس عربیہ ہی کا پرتو ہے البتہ عمر کی قید اٹھا دینے کا طریقہ ابھی دنیا کو ان مدارس سے سیکھنا باقی ہے۔ چنانچہ

"تعلیم بالقرآن" کی شکل میں اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے[1] اب وہ زمانہ زیادہ دور نہیں معلوم ہوتا جبکہ دنیا کی یونیورسٹیوں سے یہ سنت اٹھ دی جائے گی۔

مفت تعلیم

ہمارے قدیم نظام تعلیم کی یہی روایات دارالعلوم کو ورثہ میں ملی ہیں کسی طالب علم سے فیس نہیں لی جاتی۔ غیر مستطیع اور ضرورت مند طلباء کو دارالعلوم کی جانب سے کھانا، کپڑا اور نقد وظائف دیے جاتے ہیں۔ درسی کتابیں اور قیام کے لئے جگہ ہر مستطیع و غیر مستطیع طالب علم کیلئے مفت مہیا کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم صرف دولت مندوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے۔ بلکہ غریب سے غریب شخص بھی اس کے ذریعے سے اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر سکتا ہے۔ اس کا فیض عام اور بقدر استعداد تام ہے۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں وہ پہلی تعلیم گاہ ہے جو مفت تعلیم (FREE EDUCATION) کی بنیاد پر قائم ہوئی دارالعلوم ایک صدی سے زیادہ مدت سے اس مفت نظام تعلیم کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے

تعلیمی آزادی

برطانوی دور حکومت میں دارالعلوم وہ پہلی درسگاہ ہے جس نے آزاد طریق تعلیم کو پیش کیا اور سیاسی غلامی کی فضا میں فکر و ذہن کی آزادی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کی اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا مگر دارالعلوم نے اس پر عمل کر کے اس مشکل کو آسان بنا دیا دارالعلوم نے حکومت برطانیہ کی پیش کش کے باوجود بھی اس کی امداد قبول نہیں کی اس لئے وہ حکومت کی ایسی پابندیوں سے آزاد

---

[1] تعلیم بالقرآن کے سلسلے میں امریکہ کے معروف ڈیوک یونیورسٹی [illegible] جاری ہے کتاب ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مسلم ماہرین [illegible] ڈیوک کے اسکول سے پیدا ہے [illegible] اسکول ۱۹۶۲ء سے جاری کر رکھا ہے

رہا ہے جو سرکار کی "آزاد امداد" کے ساتھ ساتھ آتی لازمی ہیں۔ بعض لوگوں کی جانب سے
کہا جاتا ہے کہ جب حکومت دارالعلوم کو اس قدر مالی امداد دینے پر آمادہ تھی تو اس کی قبول امداد
میں اعتراض اور انکار مناسب نہ تھا۔ قوم خواہ کتنی ہی بے تکلفی کرے مگر پھر بھی وہ حکومت
کی پیش کردہ امداد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کی نظر غالباً اس امر پر نہیں گئی کہ مدرسہ
عربیہ کو حکومت کے اثر سے اس لئے "آزاد" رکھنا ضروری ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں
ہی کی کیوں نہ ہو جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہ ہو اس کی سیاست
بے لوث اور بے محل و غش نہیں ہو سکتی اور مدارس عربیہ کے لئے ایسی تعلیم درکار ہے جو
ہر قسم کے غیر اسلامی اثر اور خارجی عمل دخل سے بالکل آزاد ہو۔ دارالعلوم دیوبند نے
کبھی حکومت وقت سے امداد حاصل نہیں کی۔ اس کا تمام تر سرمایہ اعتماد علی اللہ ہے۔
دارالعلوم صرف مسلم عوام کے بھروسے پر دین کی خدمت میں منہمک رہا ہے، اور زمانہ
کی تیز و تند گردشوں کے باوجود اپنی قدیم شان اور روایات کے ساتھ قائم ہے

آج ہماری قومی بدقسمتی ہے تعلیم کا مقصد یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے
کوئی اچھی اور پُر منفعت ملازمت حاصل کر کے معقول روزی کمائی جائے۔ گویا تعلیم کا
مفہوم ہی چکر سے بدل ڈالا گیا ہے۔ اور "علم برائے علم" کے بجائے اب صرف حصول
معاش کے دوسرے بہت سے ذرائع کی طرح یہ بھی ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ نفس علم
کا اندرونی تقاضا ہے کہ اس کا نصب العین بلند ہو۔ بے شبہ دنیاوی علوم و فنون اس لئے
حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے دنیاوی ترقی حاصل کی جا سکے۔ لیکن اگر اس نصب العین
کو صرف اپنے ذاتی مفاد تک محدود کر دیا جائے اور یہی ذاتی منفعت سامنے رکھی جائے
تو یہ خود غرضی ہے۔ علم جیسی گرانقدر دولت کو صرف اپنی اغراض پر خرچ کرنا علم کی
عظمت کو نہ پہچاننا ہے۔ دنیاوی علوم و فنون حاصل کرنے کا مقصد بھی یہ ہونا چاہئے
کہ اس کے ذریعے سے پوری قوم کے مسائل کو ترقی دی جا سکے۔ اور یہ نہ صرف اپنے

جو وہ ترقی کا بلکہ ملک و ملت کی ترقی کا ذریعہ بن سکے ۔

مدارس عربیہ کے طلباء کے سامنے حصول علم کا مقصد اور نصب العین، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کی مخلوق کی بہتر سے بہتر خدمت ہے۔ شاگرد استاد کو استاد ہی سمجھتے ہیں، استادی اور شاگردی کی قدیم حدود و مراتب کا پورا لحاظ رکھتے ہیں ۔ شاگرد اپنے استاد کا ویسا ہی ادب کرتے ہیں جیسے اپنے والدین کا ۔ اساتذہ کی خدمت کو ہر طالب علم باعث ازدیاد علم و برکت تصور کرتا ہے !

اسلامی تاریخ کا یہ دلچسپ واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ قائم ہوا، اور اس کے اساتذہ اور طلباء کے لئے گراں قدر مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے، اور حکومت کی جانب سے ہر قسم کا سامان آسائش مہیا کیا گیا تو علماء بغداد نے "زوال علم" کی مجلس ماتم منعقد کی اور اس پر انتہائی افسوس کیا کہ اب علم، علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و ثروت کے لئے حاصل کیا جائے گا، ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے علم کا یہ اعلیٰ مقصد نہ ہوگا، وہ عصری علوم کے بجائے دارالعلوم کا رُخ ہی کیوں کرے گا، جس کی سند کی قیمت حکومت کی نظر میں تقویم پارینہ سے زائد نہیں ہے۔

ایک مرتبہ صوبہ سرحد کے گورنر سر جیمز سٹلن نے دارالعلوم کے معائنہ کے دوران دیوبند کے دورہ حدیث کے ایک طالب سے سوال کیا تھا۔

" آخر دور سے تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے ؟

طالب علم نے بے ساختہ جواب دیا کہ:۔

" میں یہاں اس لئے پڑھنے آیا ہوں۔ تاکہ واپس جاکر اپنے وطن کے لوگوں کی دینی خدمت انجام دے سکوں "

دارالعلوم کے نصاب تعلیم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ "السنہ شرقیہ" کے سرکاری امتحانات "مولوی فاضل" وغیرہ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے۔ اس لئے اگر

دارالعلوم چاہتا تو حکومت سے باسانی اپنی سند کو "مولوی فاضل" کے مساوی تسلیم کرا سکتا تھا مگر اس نے اپنی سند کو سرکاری محکموں کی ملازمت کے لئے "پروانۂ راہداری" بنانے کے بجائے اس امر کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وہ طلباء میں ایسی علمی قابلیت و فضیلت پیدا کرنے کی سعی کرے کہ لوگ اس کے طالب علم اور ان کی سند کو دیکھتے ہوئے یہ یاد کرلیں کہ یہ کوئی کام کی چیز ہے اور یہ شخص دنیا کے جس کام کو اپنے ذمے لے گا اس کو قابلیت اور طرح سے انجام دے سکے گا۔

دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے طالب علم اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم و فنون میں بھی پورے طور پر دست رس اور مہارت حاصل کر سکے تاکہ یہاں سے نکلنے کے بعد ملت کی قائدانہ قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا اہل ہو جائے اور اسلامی دعوت و تبلیغ کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کر سکے۔ دارالعلوم میں طلباء کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی تعلیم کا مقصد ڈگریاں حاصل کرنا یا سرکاری ملازمتوں اور عہدوں کے لئے تیاری کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص دینی تعلیم ہے۔
ہندوستان کے سیاسی اور جغرافی حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت موجود رہنی چاہئے جو اعلائے کلمۃ اللہ اور احیاء سنت کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے اس تعلیمی مقصد میں کامیاب ہے۔ اس درس گاہ سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے علماء، مبلغین و مصنفین اور مدرسین نکلے ہیں جنہوں نے دارالعلوم کے اس مقصد سے کبھی گریز نہیں کیا ہے۔

حدیث نبوی، کتاب اللہ کی شرح و تفسیر اور اسلامی قانون کا دوسرا اہم ماخذ ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے جن جن دینی و دنیوی علوم کی خدمت انجام دی ہے مگر ان میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حدیث کے درس کو حاصل رہی ہے۔ دارالعلوم

کا طریقہ حدیث، درایت و روایت اور تفقہ کے تمام اصولوں کا جامع ہوتا ہے۔ یہاں کوشش
کی جاتی ہے کہ حدیث کی شرح اور اس کے متعلقہ مباحث پوری تفصیل سے طلبہ کے سامنے
آجائے جس سے احادیث نبوی کی جمع و تطبیق، ترجیح و تاویل میں طلبہ کو اپنی آئندہ زندگی
میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس اعتبار سے درس حدیث میں دارالعلوم دیوبند
اپنی ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کا دورۂ حدیث تمام دینی
مدارس میں احترام و عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند اپنے تعلیمی نظام کی وسعت، اتباع سنت میں پختگی اور علوم و
فنون میں کامل رسوخ کی بنا پر برصغیر میں واحد تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتا ہے، خصوصاً
حدیث نبوی کی تعلیم میں ایک منفرد اسلوب کا حامل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی اس
خصوصیت نے اسے دوسری تمام تعلیم گاہوں سے ممتاز بنادیا ہے، اس کے دارالحدیث
میں ہر سال تقریباً نو سو طلبہ حدیث کا اجتماع رہتا ہے جو دنیا کے مختلف حصوں سے
محض حدیث کی تعلیم کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ان طالبان حدیث میں ایک بڑی تعداد
ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو دوسرے مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ صرف
اس لئے یہاں آتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی مخصوص اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند ہوسکیں۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان، پاکستان، برما، بنگلہ دیش، افغانستان
وغیرہ ملکوں کے دینی مدارس کی سرپرستی کرتا ہے اور بہت سے مدارس طریقۂ تعلیم اور
اندرونی نظم و نسق میں دارالعلوم دیوبند کی تقلید کرتے ہیں۔

دارالعلوم کو حکومت کی امداد اور سرکاری مداخلت سے بالکل علیحدہ اور آزاد
رکھا گیا ہے۔ برطانوی حکومت کی جانب سے تعلیم و تربیت کا جو نظام اس زمانے میں جاری
کیا گیا تھا وہ مذہب و اخلاق، اسلامی تہذیب، تمدن اور عقیدے سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا
بلکہ مسلمانوں کے لئے سخت مضر تھا، اگر اس کو قبول کرلیا جاتا تو ہماری موجودہ نسل قطعی

قواعدِ داخلہ

دارالعلوم دیوبند کا دروازہ ہر اس طالب علم کے لئے کھلا ہوا ہے جو دینی علوم حاصل کرنا چاہتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کے مقاصد اور اس کے تعلیمی نصاب سے اتفاق کرتا ہو اور دارالعلوم کے اصول و قوانین کی پابندی کا مکمل عزم لے کر داخلہ کا خواستگار ہو اور اس کی زندگی اسلامی قدروں سے ہم آہنگ ہو، ان شرائط کے ساتھ اس کا داخلہ اس درجے میں ہو سکتا ہے جس کی وہ استعداد اور صلاحیت رکھتا ہے۔

باعموم داخلہ شوال کے دوسرے ہفتے سے شروع ہو کر تیسرے ہفتے کے آخر تک ہوتا ہے لیکن جدید طلباء کا داخلہ اس سے کسی قدر پیشتر بند ہو جاتا ہے۔

داخلے کے وقت جدید امیدوار استعداد کے مطابق جس جماعت کے قابل سمجھا جاتا ہے اسی میں داخل کیا جاتا ہے۔ کسی دوسری درسگاہ کی سند کی بناء پر داخلہ نہیں ہو سکتا، البتہ جو طلباء درجات فارسی سے ترقی پاکر درجۂ عربی میں داخل ہوتے ہیں وہ داخلے کے امتحان سے مستثنیٰ ہیں۔

درجۂ قرآن مجید اور درجۂ فارسی کا میں داخلہ درخواست کے ذریعے اور درجۂ عربی میں مطبوعہ فارم کے ذریعے ہوتا ہے۔ فارم داخلہ کی دو قسمیں ہیں قدیم اور جدید۔ قدیم سے وہ طلباء مراد ہیں جنہوں نے سال گذشتہ میں دارالعلوم ہی میں پڑھا ہو اور نو وارد طلباء کو جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فارم داخلہ کے ذریعے طالب علم اس امر کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہے گا اور دارالعلوم کے مروجہ قوانین کی پوری پابندی کرے گا اور اپنی وضع قطع نشست و برخاست اور گفتگو وغیرہ امور میں طالبعلمانہ

وضع و معاشرت کا پابند رہے گا۔

داخلے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے ماسوا بیرونی کمسن بچوں کو جو بعد لاتا ہے
میں متجاوز ہوں لیکن داخل نہیں کیا جاتا۔ کسی پیشے کی بنا پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں ہے
جس کے سبب سے قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلم کے دروازے بند سمجھے جائیں، بلکہ ہر وہ شخص
جس کو اکتساب علم کا کچھ بھی ذوق ہو وہ بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا ہے۔ عمر اور پیشے
کی قید سے مدارس عربیہ ہمیشہ آزاد رہے ہیں اور ان میں رنگ و نسل امیر و غریب اور اونچ نیچ
کوئی امتیاز کا فرق روا نہیں رہا ہے۔ اس بنا پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو
اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو بلا تکلف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہ ہمیشہ کھلی رہی
ہے۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء و فضلاء ملیں گے جو آبائی طور پر نکلے،
ارذل و ادنیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے لوگ جنہیں ان کے پیشوں کی وجہ سے دنیا میں
نظر انداز کیا جاتا رہا ہے مدارس عربیہ کی بدولت انہوں نے علم حاصل کر کے علمی
اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں اس سے تاریخ
کا ہر طالب علم واقف ہے۔ آج جس چیز کو یورپ کی دین سمجھا جاتا ہے اس کی اولیت
کا شرف درحقیقت ہمارے مدارس عربیہ کو حاصل ہے۔

درجات تعلیم

درجات تعلیم کی تفصیل نصاب کے ساتھ پیش کی جا چکی ہے، اس لئے یہاں ان کے
اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

امتحانات

یہ کہنا تو آسان نہیں ہے کہ مدارس عربیہ میں امتحانات کا طریقہ عموماً مروج تھا تاہم بعض مدارس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن میں طلباء کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا، چنانچہ بیجاپور کی تاریخ "بستان السلاطین" میں مدرسہ [illegible] کے مدرس کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

"امتحان چہاردہ تاریخ ذی الحجہ می شد"[1] یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلباء کا امتحان ہوتا تھا۔

ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں امتحان سالانہ ہونے کی بھی تصریح ہے۔

"ہر سال امتحان می شد"[2]

مگر قیام دارالعلوم کے قریبی زمانے میں یہ رواج متروک ہو چکا تھا، اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد اور محنت و جانفشانی کے اندازہ کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے، مروج نہیں تھا۔ طالب علم جب استاد سے ایک کتاب پڑھ چکتا تو اس سے اوپر کی دوسری کتاب بغیر امتحان کے شروع کر دی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد کے جانچنے، پرکھنے کا کوئی موقع نہ تھا اور بسا اوقات نااہل طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا۔ دارالعلوم نے اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقے کو ختم کر کے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کو لازمی قرار دیا۔

دارالعلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں وہ کسی کالج کی سنت بلکہ یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ بھی ہے۔

ہندوستان کے مدارس میں غالباً یہ پہلی خصوصیت تھی کہ سالانہ

---

[1] و [2] ہندوستان مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ص ۳۰۳

امتحان ہوتا تھا مدرسۂ دیوبند کے متعلق تاریخ میں سالانہ امتحان کا کوئی ذکر نہیں
ملتا اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے متصل زمانے میں ہندوستان میں سالانہ
امتحان کا تصور نادر تھا۔

قوانینِ امتحانات

امتحان جو طلبہ کی تعلیمی استعداد اور اساتذہ کی محنت و جانفشانی کے اندازے
کا معیار ہے اور جس پر ترقی درجات کا انحصار ہے بہت ضروری چیز ہے۔ لیکن دارالعلوم
کو جس طرح حکومت کے اثر سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے اسی طرح امتحانات میں کسی قسم کی
بیرونی مداخلت کو بھی پسند نہیں کیا گیا، نصاب تعلیم خود اس کا اپنا بنایا ہوا ہے، اور امتحانات بھی
وہ خود اپنی نگرانی میں لیتا ہے۔

امتحانات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک امتحان داخلہ، یہ ان طلبہ کا ہوتا ہے جو کسی
دوسرے مدرسے سے آکر دارالعلوم میں داخل ہونا چاہتے ہیں، یہ امتحان عموماً شوال میں ہوتا ہے،
اس امتحان میں مناسب سختی برتی جاتی ہے، اور بسا اوقات نصف سے زائد طلبہ ایسے
ہوتے ہیں جن کو امتحان داخلہ میں ناکام ہونے کے باعث واپس ہو جانا پڑتا ہے۔ دوسرا
امتحان خواندگی ہوتا ہے۔ یہ سال میں تین مرتبہ لیا جاتا ہے، سہ ماہی صفر المظفر میں،
ششماہی جمادی الاولیٰ میں اور سالانہ رجب کے آخری ہفتہ سے شروع ہو کر شعبان
کے عشرۂ دوم میں ختم ہوتا ہے۔

امتحانات میں انتہائی احتیاط اور کڑی نگرانی کی جاتی ہے، پہلے اور دوسرے
سال کے تمام اور تیسرے سال کی چند کتابوں تک امتحان زبانی سوال و جواب کے ذریعے
لیا جاتا ہے، اور باقی جماعتوں کا امتحان تحریری ہوتا ہے، سوالات کے پرچے نہایت احتیاط

اور ردوکد کے ساتھ پوچھے جاتے ہیں۔

امتحان میں ہر جوابات کے لیے چار گھنٹے وقت دیا جاتا ہے۔ نشستیں تقسیم کی جاتی ہیں اور اس میں خاص کر اہتمام کیا جاتا ہے کہ طالب علم ایک دوسرے سے بات چیت نہ کرنے پائیں خلاف ورزی کی صورت میں امتحان سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

امتحان کے مجموعی نمبر ۵۰ مقرر ہیں، درجات امتحان کی تفصیل یہ ہے ۳۳ سے ۴۰ تک درجۂ ادنیٰ۔ ۴۰ سے ۴۴ تک درجۂ متوسط، ۴۴ سے ۵۰ تک درجۂ اعلیٰ۔

اس موقع پر یہ معلوم رہنا چاہیے کہ دارالعلوم سے پہلے ہندوستان میں جتنے تعلیمی مرکز تھے ان کی حیثیت بالعموم شخصی درسگاہوں کی تھی اور یہ درس میں جملہ تقریباً مشترک کے متحد کر ان میں جماعت بندی تھی، نہ حاضری کے رجسٹر ہوتے تھے، نہ طلباء کو مجبور کیا جاتا تھا کہ فلاں کتاب اور فن کے ساتھ فلاں کتاب اور فن کا لینا ضروری ہے مطلق آزادی تھی جس کا جو جی چاہتا تھا پڑھتا تھا اور جب تک چاہتا پڑھتا تعلیم کی کوئی مدت معین نہ تھی اور امتحان کا بھی کوئی عام دستور نہ تھا، جماعت بندی مدت تعلیم، حاضری اور امتحان کے اہتمام اور تناسب معاملات وغیرہ امور کے اجراء کی اولیت دارالعلوم ہی کو حاصل ہے اور یہیں سے مدارس عربیہ میں یہ امور ہندوستان میں رائج پذیر ہوئے ہیں۔

تعلیمی وظائف

مدارس عربیہ میں تعلیم پانے والے طلباء اکثر و بیشتر غریب اور نادار ہوتے ہیں، کے سرپرستوں میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں روپیہ خرچ کر کے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کر سکیں۔

ہر ترقی کرنے والی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اسی قوم

کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک
تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو۔ چنانچہ صدہا برس کے تجربے کے بعد بیسویں صدی کے بڑے
بڑے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہیئے اور
جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے۔ جدید تعلیم کا سب سے
بڑا نقص یہ ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے جو اس کے اخراجات کے
خود متحمل ہو سکیں گویا عصری تعلیم کے حصول میں غریب ہونے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں تعلیمی مصارف کو طلباء کے بجائے درسگاہوں
کے ذمے رکھا گیا ہے۔ اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ ورنہ صرف یہ
بلکہ طلباء کے لئے زیر درس کتابوں کا انتظام بھی مفت کیا جاتا ہے۔ بلکہ نادار اور غریب
طلباء کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف
بھی دیئے جاتے ہیں۔ دارالعلوم میں شروع ہی سے اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ غریب
اور نادار طلباء کے قیام و طعام، لباس، مصارف علاج اور دوسری لازمی ضروریات کے
تکفل کا بار طلباء کے بجائے دارالعلوم کی جانب سے برداشت کیا جائے۔ الا یہ کہ جو طلباء
خود اپنے تکفل پر قدرت رکھتے ہوں۔

مگر وظائف دینے میں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ طلباء میں تعلیمی امور سے بے توجہی
اور مفت خوری کی عادت پیدا نہ ہونے پائے، اور وہ برابر تعلیمی مشاغل میں منہمک رہیں۔
اس لئے تمام وظائف ایک سال کے لئے جاری کئے جاتے ہیں۔ سال آئندہ میں ان کی
از سر نو تجدید کرلی جاتی ہے۔ جو طالب علم کسی وقت بھی امتحان میں ناکامیاب ہوتا ہے
تو وظیفہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اور جب تک وہ نمبرات کے قانون کے مطابق اوسط
درجے کی کامیابی امتحانات میں حاصل نہ کر لے وظیفہ جاری نہیں ہوتا۔ اسی طرح دارالاقامہ میں قیام
کے لئے جگہ اور کتب خانہ سے سال متعلقہ کی زیر درس کتابیں بلا تخصیص مستحق و غیر مستحق

پانی کی قلت اور موسم سرما میں مسجد دارالعلوم میں گرم پانی کا انتظام اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم میں داخل تمام طلباء کو کتب خانے سے زیر درس کتابیں کسی معاوضے کے بغیر ایک سال کے لئے مستعار دی جاتی ہیں۔ طالب علم کو مالی امداد ملتی ہو یا نہ ملتی ہو دونوں صورتوں میں اس سے دارالاقامہ کے کمرے کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔

تقسیم انعام

طلباء میں تعلیمی مشاغل کی نسبت ترغیب و تحریص اور باہم دگر مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے سالانہ امتحانات میں کامیابی پر طلباء کو مستحق انعام سمجھا جاتا ہے، جو طالب علم اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا ہے اُسے خصوصی انعام دیا جاتا ہے۔ انعام میں طالب علم کی استعداد کے مطابق درسی و غیر درسی کتب ہی دی جاتی ہیں۔

دارالعلوم میں بعض دوسرے مدارس کی طرح شروع ہی سے تقسیم انعام کا بھی رواج ہے۔ تقسیم انعام کے عنوان سے ہر سال جو جلسہ منعقد کیا جاتا ہے اس میں مقامی لوگوں کے علاوہ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی دعوت شرکت دی جاتی رہی ہے۔ اس اجتماع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان عموماً اور چندہ دہندگان خصوصاً اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انہوں نے اپنی جس نوخیز نسل کو دارالعلوم کے سپرد کیا تھا اس کے کیسے نتائج برآمد ہوئے، نیز یہ۔ قوم نے جو مدد چندہ دارالعلوم کو دیا ہے اس کے مصرف کا منظر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

تصدیق نامہ اور سند و دستار

جو طلبا ر نصاب دارالعلوم کی تکمیل کرکے سالانہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں ان کو فراغتِ تعلیم کے بعد سند دی جاتی ہے، سند میں ہر پڑھی ہوئی کتاب کے نام کے اندراج کا التزام رکھا جاتا ہے، اگر جس کتاب کے امتحان میں نمبر کم ہوں وہ داخل سند نہیں کی جاتی۔

درجہ فارسی، درجہ تجوید و درجۂ طب کی علیحدہ علیحدہ اسناد ہیں، جو طلبہ تکمیل سے قبل درمیان میں دارالعلوم چھوڑ دیتے ہیں ان کو امتحان میں کامیاب کتب کا تصدیق نامہ بھی دے دیا جاتا ہے، درجہ چہارم پاس کر لینے پر "عالم" کی سند اور درجہ ہشتم کی تعلیم ختم کرنے کے بعد "فاضل" کی سند دی جاتی ہے۔

سند میں ان کتابوں کے ناموں کے علاوہ جن کا امتحان دیا جا چکا ہے، طالب علم کی علمی ذہنی استعداد اور حسن قابلیت کا ذکر ہوتا ہے اور اس بات کی شہادت دی جاتی کہ اس نے دار العلوم میں تعلیم پائی ہے، علوم و فنون میں مہارت رکھتا ہے، درس و تدریس اور افتاء کا اس کو حق حاصل ہے، اس کے علاوہ اس کے اخلاق، چال چلن کے متعلق بھی اظہار رائے کیا جاتا ہے، سند مطبوعہ ہوتی ہے، جو مہتمم اور اساتذہ کے دستخط اور دارالعلوم کی مہر سے مزین ہوتی ہے۔

جو طلبا علوم و فنون میں امتیازی استعداد کے مالک ہوتے ہیں ان کو سند دینے کے علاوہ قدیم درسگاہوں کے دستور کے مطابق مجمع عام میں اساتذہ کے ہاتھوں سے ان کے سروں پر دستار باندھی جاتی ہے جو طلبہ کی اصطلاح میں "دستارِ فضیلت" سے موسوم ہے۔

انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کا اجتناب

ہندوستان کے علماء اور بالخصوص علمائے دارالعلوم کے خلاف یہ الزام شہرت پا گیا ہے کہ انہوں نے انگریزی تعلیم کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے باز رکھا، جس کی وجہ سے مسلمان دنیوی ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے، یہ الزام صحیح نہیں ہے۔ علمائے کرام صرف ایسے نصاب تعلیم کے مخالف تھے جو مسلمانوں کو الحاد اور بے دینی کی طرف لے جانے والا ہو، جیسا کہ علی گڑھ سے اس کا خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا، چنانچہ اس کے سد باب کے لئے وہاں دینیات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا، اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو طلب کیا گیا تو دیوبند کی جانب سے بطیب خاطر اس پیشکش کو قبول کر لیا گیا، مولانا عبداللہ انصاری تاحیات اس منصب پر فائز رہے، بعد ازاں ان کے فرزند مولانا حامد میاں انصاری اس منصب پر مامور کئے گئے، یہ بھی دارالعلوم کے فاضل تھے، ظاہر ہے کہ مخالفت کی صورت میں یہ بات ممکن نہ تھی۔

حضرت مولانا نانوتوی نے تو طلباء کی نسبت جو مدرسہ عربی سے فارغ ہو کر سرکاری اسکولوں میں داخل ہونا چاہیں، ۱۲۹۰ھ کے جلسہ انعام کی تقریر میں ایسے طلباء کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی ہے:

"اگر طلباء مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہوگی۔"[1]

بعض لوگوں کے اس اعتراض کا جواب جیسے کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ ص ۱۲

علوم جدیدہ کو کیوں شامل نہیں رکھا گیا؟

فرماتے ہیں:-

> "اگر یہ خیال ہو کہ ہے کہ یہاں علوم دنیوی کی تعلیم کا چنداں اہتمام
> نہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہیے، جو مرض
> نہ ہو اس کی دوا کی ضرورت ہے۔ دیوار کے رخنے کو بند کرنا چاہیے
> نہ کہ بھرنا لازم ہے۔ بدمعاشی بھی کری نہیں، اس کا فکر بجز بطالت
> کے کیا ہے۔ مدارس سرکاری اور کس لیے ہیں؟ اور ان میں علوم دینی
> نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے؛ یہ مدارس اگر قدر ضرورت سے
> کم ہوتے تو بنانا لازم تھا مگر سب جانتے ہیں کہ سرکار کی توجہ سے
> شہر شہر گاؤں گاؤں میں بھی مدارس جاری ہو گئے ہیں، ان کے
> ہوتے اور مدارس علوم دینیہ کا اہتمام کرنا اور علوم دنیا سے غفلت
> کا شغل بداندیشی نہیں۔"

درحقیقت ہمارے اسلاف نے دوسری قوموں کے علوم و فنون کو اپنانے میں اس وقت بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی جب وہ نصف دنیا پر اپنی عظمت و اقتدار کا پرچم لہرا رہے تھے، مسلمانوں نے ماضی میں نہ صرف ارسطو، افلاطون اور دوسرے یونانی حکماء کے فلسفے کو اپنا لیا تھا، بلکہ بڑا او رعرب یونانیوں کے علمی ذخیروں کے مالک بھی بن گئے تھے، اقلیدس اور بطلیموس کی تحقیقات ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گئی تھی، ہندوستان کی ریاضی بھی عربی سانچے میں ڈھل گئی تھی، اسی طرح عربی زبان میں ایک نئے ادب، تاریخ، فلسفہ و حکمت، طب، ریاضی، ہیئت، نجوم، کیمیا اور طبعیات وغیرہ فنون کی مبادیات پڑیں، جو آج تہذیب جدید کا مایہ ناز سرمایہ ہے، ان علوم کو مسلمانوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ آج اجنبی محسوس ہونے کے بجائے اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں، علوم و فنون کے حاصل کرنے

[illegible]

میں مسلمان اور ہندو (راسخ) و مصروف رہے ہیں۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مسلمانوں نے یونانی اور ہندوستان کے علوم و فنون کو نہ صرف سیکھا بلکہ انہیں ترقی بھی دی ہے علماء کی نسبت یہ ایک شدید غلط فہمی ہے انگریزی کی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا، علاوہ وہ تہذیب اور کلچر جو انگریزی کی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور انکی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا۔ مناسب ہوگا کہ یہاں اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کر کے دیکھا جائے کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ ٹھیک اسی زمانے میں جبکہ سر سید احمد خاں مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز فرنگی محل لکھنؤ کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحی لکھنوی نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتویٰ دیا تھا کہ:۔

> "انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ واسطہ تشبہ کے ہو تو ممنوع ہے، اور اگر اس لئے ہو کہ جو انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں، مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لئے حکم فرمایا اور انہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں سیکھ لیا۔"[1]

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفتاء کے جواب میں تحریر ہے کہ:۔

> "انگریزی کا زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا

---

[1] مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ باب العلم والعلماء جلد دوم ص

مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے [1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ
کہ یہ بھی شائع ہوا کہ انگریزی پڑھنا جائز ہے۔ علماء کے گروہ نے کسی زمانے میں بھی
محض تعلیم انگریزی سے کسی اختلاف نہیں کیا بلکہ حصول معاش اور علم و آگہی کے لیے
صراحتاً اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جیسا کہ عہد نبوت میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مثال
سے صاف واضح ہے، البتہ جس صورت میں مختلف اسباب سے متعلم کے اعتقاد و ایمان
پر اس کا اثر پڑتا ہو اور غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق اور خلاف اسلام معتقدات
کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتا ہو، صرف اس کو ناجائز بتلایا گیا تھا۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ انگریزی زبان سے مسلمانوں کے اجتناب کے متعدد
اسباب تھے۔ سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں ملک
اور انگریزوں کے خلاف جنہوں نے انہیں حکومت و سلطنت سے محروم کر دیا تھا شدید
غیظ تھا، وہ ان کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریزوں کے علوم و تہذیب
و تمدن کی نسبت مسلمانوں میں معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔ انہوں
نے اصل سلطنت کا چراغ اپنی آنکھوں کے سامنے گل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاہی خاندان
کے خاک و خون میں تڑپنے کا منظر دو آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے معمولی معمولی
شبہات پر ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہزاروں مسلمان گھرانے
اپنے سرپرستوں کے محتاج ہو گئے تھے اور ہزاروں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم
میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ انہوں نے وہ سب کچھ لٹتے ہوئے دیکھا تھا جس کو
وہ اخلاق اور تہذیب انسانیت کا حاصل سمجھتے تھے، اور جس کے بغیر ان کی زندگی بے لطف

---

[1] حیات رشید، [illegible]

ہو گئی تھی ان کی عظمت اور عزت جاتی رہی تھی ان کو ہرگز ہرگز گوارہ نہ تھا کہ وہ اپنے
نوجوانوں کو انگریزی تعلیم دلائیں۔ اور انگریزوں سے سروکار رکھیں۔ اس زمانے میں
غدر کے سنگین نتائج اور اس کے رد عمل کو نفسیاتی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا
اسلام اور عیسائیت میں جو کشمکش یورپ اور مشرق وسطیٰ میں صدیوں سے چلی آ رہی
تھی اب وہ اُن کے خیال میں ہندوستان تک پہنچ گئی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کے
دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ عیسائیت اور عیسائی حکومت کو گوارا کرنا اسلام
اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس لئے انھوں نے نئی تہذیب و تمدن
سے مکمل بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ہر اس چیز کو جو انگریزوں سے وابستہ تھی اسلام اور
مسلمانوں کے لئے خطرے کا نشان سمجھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اُن کا ایسا سمجھنا حالات کا قدرتی
رد عمل تھا۔ جس کے لئے ان کو معذور سمجھنا چاہیئے

دوسری طرف انگریز بھی اپنا اصل سیاسی حریف مسلمانوں ہی کو سمجھتے تھے۔ اگر
چہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے افراد شامل تھے اور
دونوں قوموں نے مل کر بڑے جوش سے اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ مگر انگریزوں کی نظر میں اس کا اصل ذمہ دار مسلمان ہی
تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے تاجپوشی کے بعد ان ہی کو اصل باغی سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے ظلم و استبداد کا
نشانہ بنایا۔ ملک کی سربلندی اور آسودہ حالی سے مسلمانوں کو محروم رکھنے کی پالیسی اختیار
کی گئی۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کو پست اور ناکارہ بنا دیا جائے
تاکہ حکومت اور سربلندی کا خواب ان کے دماغوں سے نکل جائے۔ یہ زخم ایسا گہرا لگایا
گیا تھا جو چند روز میں مندمل ہونے والا نہ تھا

اسی کے ساتھ ہندوستان میں پادریوں کو تبلیغ عیسائیت کی نہ صرف اجازت
تھی بلکہ حکام کی پشت پناہی بھی اُن کو حاصل تھی۔ اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً
پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس لازمی تھا۔ اس چیز سے نہ صرف طلباء کو اختلاف تھا بلکہ

کوئی ماں سے مالی مسلمان بھی ایسی حالت میں اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں 'کالے پانی' کی سزا دی گئی تھی لکھتے ہیں کہ:۔

> انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی، ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا، اس لئے اختیار و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کر دیا۔ انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔[1]

پچھلی حکومت ایک محدود دائرہ ہوتی تھی جس کا تعلق زیادہ تر ملک کے نظم و نسق لگان پولیس اور محاصل و مالیات سے ہوتا تھا۔ زندگی کے بہت سے شعبے اس کے دائرۂ عمل اور حلقۂ اثر سے خارج تھے۔ اہلِ ملک اپنے نظامِ تعلیم، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت میں آزاد ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انقلابِ سلطنت سے ضروری نہ تھا کہ تعلیم و تہذیب میں بھی انقلاب آ سکے، لیکن برطانوی نظامِ حکومت کا ڈھانچہ

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۲۵۶، ۲۵۷ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔

ں سے مختلف ساداس کا دائرہ عمل ملک و قوم کی پوری زندگی پر محیط اور اس کے حدود و اعتبارات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھے۔ انگریزی تہذیب و کلچر انگریزی تعلیم کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھے گئے تھے اور انہیں کو ذریعۂ ترقی و تہذیب سمجھا جاتا تھا علماء مسلمین اسی چیز کے خلاف تھے۔

جدید تعلیم سے مسلمانوں کے اجتناب میں کچھ تو انگریزی سیاست کے تعمد و ارادے کو دخل رہا ہے تاکہ مسلمان علم و ترقی کے قابل نہ رہ سکیں، اور کچھ خود مسلمانوں نے بھی اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے اسکولوں میں داخل کرنے میں پس و پیش سے کام لیا ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لئے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے میں مانع ہوئے۔ چنانچہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامیوں نے سرد کر دیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کر دی گئی ادھر اسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، رفتہ رفتہ قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے خلاف نفرت کم ہو گئی، اور مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے۔

یہ ہے اس الزام کی حقیقت جس نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے دور رکھا۔ درحقیقت انگریزی تعلیم سے نفرت مسلمانوں کی قومی غیرت اور نفسیاتی رد عمل کا نتیجہ تھی اور علماء بھی اسی میں شامل تھے مگر اس کے باوجود علماء نے وقت کے تقاضے کو پہچانا اور پوری بصیرت اور دور اندیشی کے ساتھ انگریزی تعلیم کے جواز کا فتویٰ دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

بابِ ہفتم

نظم و نسق

مجلس شوریٰ

دارالعلوم کا نظم و نسق شروع ہی سے وَاَمْرُھُمْ شُورٰی بَیْنَھُمْ کے شورائی اصول پر قائم ہے اس کے لئے ایک بااختیار مجلس، بنی ہے جس کی تشکیل قیام دارالعلوم کے ساتھ ہی عمل میں آگئی تھی، یہ جماعت مجلس شوریٰ کے نام سے موسوم ہے۔ مجلس شوریٰ کی یہ ذمہ داری ہے کہ دارالعلوم کے تمام کاموں کی نگرانی و رہنمائی کرے۔

یہاں یہ بتادینا بے محل نہ ہوگا کہ دارالعلوم کا آغاز جن معمولی حالات و بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اس کو دیکھتے ہوئے دارالعلوم کے نظم و نسق کا مشاورت کے اصول پر مبنی ہونا عجیب تر معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں اس وقت جمہوری نظام سے لوگ عام طور پر آشنا اور مانوس نہ تھے، دارالعلوم نے اسلامی طرز پر مجلس شوریٰ

کی بنیاد رکھی اور اس نظام کو کامیابی کے ساتھ چلا کر قوم کے سامنے ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔ اس طرزِ فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ انتظامات میں بڑی وسعت کے ساتھ جمہوری نظام قائم ہو گیا۔ ارباب مشورہ کے لئے جن صفات سے متصف ہونا ضروری ہے اس کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ مرقدہٗ نے اپنے تحریر فرمودہ دستور العمل کی تیسری دفعہ میں یہ ہدایت فرمائی ہے۔

مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آ جائے گا۔

القصہ تہِ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

جمہوری نظام کے یہ وہ عمدہ اصول ہیں جن سے بہتر کوئی دوسرا طریق کار نہیں
ہو سکتا۔ اس تجویز سے تعمیری نکتہ چینی کی راہ کھل گئی جو کسی ادارے کی ترقی کے لئے
بڑی ضروری ہے۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ ایک طرف تو چندہ دہندگان کی نمائندگی کرتی ہے
اسے چندہ دہندگان کے شرعی وکیل کی حیثیت حاصل ہے اور دوسری جانب دارالعلوم
کے آمد و صرف اور اہم انتظامی امور کے متعلق کثرت رائے سے اپنے فیصلے صادر کرتی
ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا ایک دستور اساسی ہے۔ دارالعلوم کی تمام کارروائیاں اور تمام
ضروری فیصلے اس دستور کی روشنی میں طے پاتے ہیں۔

مجلس شوریٰ انتظامی آئین و ضوابط وضع کرتی ہے۔ دارالعلوم کے جملہ اوقاف اور
جائدادیں اس کی تولیت و نگرانی میں ہیں، اور یہی مجلس دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت
اور ملازمین کے عزل و نصب کی ذمہ دار ہے۔ مجلس شوریٰ کا اجلاس سال بھر میں کم از کم
دو مرتبہ لازمی ہے۔

مجلسِ شوریٰ کے ابتدائی ارکان

مجلس ابتداءً یعنی قیام کے وقت حسب ذیل
سات اراکین پر مشتمل تھی

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (۲) حضرت حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ
(۳) حضرت مولانا مہتاب علی صاحبؒ (۴) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ
(۵) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ (۶) حاجی سید فضل حق صاحب (۷) شیخ نہال
احمد صاحبؒ

مذکورہ تعداد میں حسب ضرورت اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس وقت مجلس شوریٰ کے اراکین
کی تعداد [illegible] ہے۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کا انتخاب ملک کے ممتاز اور بزرگ علماء میں
سے کیا جاتا ہے۔ دستور کی رو سے مجلس شوریٰ میں کم از کم گیارہ اراکین کا عالم ہونا

۸۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں جونپور

۹۔ حضرت مولانا محمد سعید صاحب رنگ سملک ڈابھیل ضلع سورت

مجلس عاملہ

مجلس شوریٰ کے ماتحت ۱۳۹۳ھ سے ایک مستقل مجلس عاملہ کے نام سے قائم ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد ۹ ہے۔ ہر تیسرے مہینے اس کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس مجلس کا کام مجلس شوریٰ کے کاموں میں اعانت و امداد کرنا اور مجلس شوریٰ کے تفویض کردہ اختیارات کے مطابق دارالعلوم کے انتظامی امور کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ گو فیصلے کے لئے کثرت رائے کا ضابطہ مقرر کیا گیا ہے، مگر ان کے فیصلے کثرت رائے کے بجائے بالعموم اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں۔ کسی مسئلے میں اتفاق رائے نہ ہو سکنے کے واقعات اتنے کم ہیں کہ ان کو نہ ہونے کے برابر سمجھا جانا چاہیئے

باب ہشتم

شعبہ جات

دارالعلوم کا وسیع تعلیمی اور دفتری نظم ۲۲ شعبوں پر منقسم ہے۔ ہر ایک شعبہ جو ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتا ہے کا ذمہ دار ناظم شعبہ ہوتا ہے۔ جو اپنے حدود اختیارات کے دائرے میں اور اہتمام دارالعلوم کی نگرانی میں اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ شعبے جو کہ نوعیت تین حصوں میں تقسیم ہیں تعلیمی شعبہ جات۔ مالی شعبہ جات اور انتظامی شعبہ جات۔

(الف) تعلیمات، دارالافتاء، معارف القرآن، جامعہ طبیہ، تنظیم صنعت و حرفت، کتابت
و درزی، نشریات کل دس تعلیمی شعبے ہیں۔

(ب) محاسبی، تنظیم و ترقی، اوقاف، مالیات کے شعبے ہیں
محاسبی کا تعلق آمد و خرچ سے ہے۔ تنظیم و ترقی اور اوقاف آمدنی کے شعبے ہیں

(ج) انتظامیات سے تعلق رکھنے والے شعبے یہ ہیں۔
اہتمام، محافظ خانہ، کتب خانہ، دارالطلبہ، مطبخ، تعمیرات، جلسہ صد سالہ

برقیات، صفائی، روشنی، آب رسانی، امور خارجہ، دار الاقامہ، پریس

شعبۂ تعلیمات

ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت سے دار العلوم کا بنیادی خط و خال اور اس کا اساسی مقصد تعلیم و تدریس ہے۔ اس لئے دار العلوم کی تاسیس کے ساتھ اس شعبہ کا آغاز بھی سمجھنا چاہئے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے شعبہ تعلیمات کی ابتدا صرف ایک استاد اور ایک شاگرد سے ہوئی تھی۔ مگر دار العلوم کا ہر قدم پچھلے قدم کے مقابلہ میں ترقی پذیر رہا ہے۔ اب یہ شعبہ متعدد ذیلی شعبوں پر منقسم ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) شعبہ عربی۔ عربی کے مکمل نصاب تعلیم کے لئے ہے۔

(۲) شعبہ فارسی۔ یہ شعبہ فارسی ادب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور ہندی وغیرہ کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) شعبہ تجوید و قرأت۔ اس شعبہ میں قرأت و تجوید کی مکمل تعلیم کے علاوہ عربی جماعتوں کے تمام طلبہ کو لازمی طور پر پارۂ عم کی مشق تجوید کے ساتھ کرائی جاتی ہے۔

(۴) شعبہ قرآن شریف۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ شعبہ چھوٹے بچوں کو ناظرہ اور حفظ قرآن شریف کی تعلیم دیتا ہے

(۵) شعبہ اردو دینیات۔ اس شعبہ کے نصاب میں اردو زبان میں دینیات کی تعلیم کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حساب اور ہندی وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

(۶) جامعہ طبیہ۔ طب کی تعلیم کے لئے ہے۔

(۹) تعلیم القرآن ۔ قرآن پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرانا اس شعبہ کا کام ہے۔

(۱۰) شعبۂ خوشنویسی ۔ یہ شعبہ خط کی صفائی کے ساتھ کتابت کی مشق بھی کراتا ہے۔

(۱۱) شعبۂ صنعت و حرفت ۔ یہ شعبہ طلبہ کو ملکی صنعتیں سکھانے کے لئے ہے۔

ان شعبہ جات میں ۷۰ اساتذہ و ملازمین، طلبہ کی تعداد ہر سال کم و بیش ڈیڑھ ہزار سے زائد
ہزار کے لگ بھگ رہتی ہے۔

طلبہ میں تقریر و تحریر کا ملکہ، خطابت، طرز ادا کی مشق اور معلومات علمی کی ترقی اصول
تبلیغ اور پیغام حق و صداقت کی اشاعت کا اہم ذریعہ ہیں۔ اس لئے دارالعلوم میں درس و
تدریس اور تعلیم و تعلم کی طرح تحریر و تقریر کو بھی ہم نصابی سرگرمی کا جزو قرار دیا گیا ہے۔
علاوہ ازیں زمانے کے احوال و مقتضیات کے پیش نظر ضروری ہے کہ طلبہ میں مجالس
و محافل کے نظم و نسق کا خاص سلیقہ ہو تاکہ وہ اپنے فرائض دعوت و ارشاد کو خوش اسلوبی
کے ساتھ موجودہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے اہل ثابت ہو سکیں۔ اس سلسلے میں طلبہ کی
متعدد انجمنیں قائم ہیں۔ ان انجمنوں کے تحت چار شعبے ہوتے ہیں۔

(۱) شعبۂ تقریر عربی و اردو و دیگر السنہ

(۲) شعبۂ تحریر عربی و اردو و دیگر السنہ

(۳) شعبۂ مذاکرہ

(۴) شعبۂ مطالعہ

لیکن یہ نظام اس حد تک محدود رکھا گیا ہے کہ اصل مقصد تعلیم میں کوئی فرق نہ پڑنے
پائے۔ ہر پنجشنبہ کو شب میں طلبہ کے جلسے ہوتے ہیں جن میں دینی و اصلاحی مسائل کے
علاوہ ملی، تاریخی، سیاسی اور موجودہ حالات پر بحث میں علمی و تحقیقی انداز میں طلبہ حصہ لیتے ہیں
اور تقریر و تحریر کی مشق کرتے ہیں۔ ماہانہ علمی رسائل نکالتے ہیں۔ یہ رسائل اردو، فارسی،
عربی، گجراتی، انگریزی، بنگلہ، تمل وغیرہ زبانوں کے ہوتے ہیں جن کو شعبے کے زیر

کرنے والوں کو پوری تحقیق اور صحت کے ساتھ مسائل شرعیہ بتلائے۔ عوام کے علاوہ علماء بھی اکثر مسائل میں اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اس اہمیت و نزاکت سے دارالعلوم کے دارالافتاء کا کام عام اداروں کی مصلحتوں میں ہمیشہ احتیاط اور وقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۸۵ھ تک جو فتاویٰ دارالافتاء سے جاری ہوئے ان کی تعداد [illegible] ہے

ان فتاویٰ کی اب تک ۔ جلدیں فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے شائع ہو چکی ہیں اور متعدد جلدیں ابھی زیر ترتیب ہیں۔ فتاویٰ پر کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ دارالافتاء کی عمارت جو متعدد درسی کمروں پر مشتمل ہے مسجد کی مشرقی جانب بالائی منزل پر واقع ہے یہ عمارت ۱۳۹۹ھ کی تعمیر ہے

مجلس معارف القرآن

ایک شعبہ مجلس معارف القرآن کے نام سے ہے، اس شعبہ کا کام علوم قرآنی پر مقالات کتابیں شائع کرنا ہے۔

جامعہ طبیہ

عربی زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے العلم علمان، علم الادیان و علم الابدان، یعنی علم دو ہیں، ایک مذاہب کا علم جس کا تعلق روح اور تزکیہ اخلاق سے ہے، دوسرا انسانی جسم کا علم جو صحت و مرض سے تعلق رکھتا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں علم اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں، پھر ان میں بھی علم طب ایک باعزت ذریعہ معاش اور نفع رسانی خلق کی صورت ہے۔ دارالعلوم میں عربی علوم و فنون کی طرح طب کی تعلیم کا بھی مستقل انتظام ہے

اس شعبے سے دو کام متعلق ہیں: طلبہ کو طبی کتابوں کی تعلیم، دوسرے بعض طلبہ کا معالجہ۔ تعلیم کے لئے جامعہ طبیہ کے نام سے مستقل طور پر طب کی تعلیم کا انتظام ہے جس میں چھ حاذق طبیب طب کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کا چار سالہ نصاب ہے۔ طبی امداد کے لئے جامعہ طبیہ کا

شفاخانہ ہے، جو طلبہ و غیر طلبار سب کی مفت طبی خدمات انجام دیتا ہے۔

شعبۂ تبلیغ

۱۳۴۴ھ/۱۹۲۴ء میں جب شدھی اور سنگھٹن کی منظم تحریکیں ملک میں جاری ہوئیں تو مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے شعبۂ تبلیغ قائم کیا گیا چنانچہ اس شعبے کی اس وقت تک جدوجہد سے لاکھوں مسلمانوں کے ارتداد سے محفوظ ہو جانے کے علاوہ مسلمانوں میں دینی روح بیدار کرنے اور اسلامی احکام پر پابند کرنے میں اس وقت بڑی مدد ملی۔ مبلغین نے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا آج ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں دارالعلوم کے مبلغین نے پہنچ کر لوگوں کو کلمۂ حق نہ سنایا ہو۔ لاہور کے مشہور مؤقر روزنامہ "سیاست" کا بیان اوپر گذر چکا ہے جس میں لکھا تھا کہ "جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے دارالعلوم دیوبند کے مدرسین اور مبلغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے"۔[1]

غرض کہ جس طرح دینی علوم کی تعلیم کی تاریخ میں دارالعلوم کی ہندوستان میں مثال نہیں ہے، اسی طرح تبلیغی خدمات کی وسعت و کثرت میں بھی اس کی مثال اس ملک کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ملک میں جہاں کہیں جلسے ہوتے ہیں ان میں عموماً دارالعلوم کے مبلغین کو خصوصیت سے بلایا جاتا ہے۔ شعبۂ تبلیغ ملک کے مختلف علاقوں میں وہاں کے باشندوں کی دعوت پر مبلغین کو بھیجنے کا انتظام کرتا ہے۔ مبلغین حضرات جلسوں اور اجتماعات میں مختلف دینی موضوعات پر تقریریں کرتے اور وعظ کہتے ہیں۔

شعبۂ کتابت

کتابت یعنی خوش نویسی درحقیقت صنعت و حرفت کی ایک صنف ہے دارالعلوم میں یہ دو درجوں میں تقسیم ہے، جسے ایک علیحدہ شعبہ کہا جاتا ہے۔ پہلا درجہ اُن طلبار کے لئے ہے جو بدخطی اور تحریری نقائص کو تحسینِ خط سے تبدیل کرنا چاہیں۔ دوسرے درجے میں فنِ خوش نویسی کی باقاعدہ

---

[1] ضمیمہ روزنامہ سیاست لاہور مجریہ [illegible]

تعلیم دی جاتی ہے۔

ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں خط کی درستگی کو خاص اہمیت حاصل تھی " الخط نصف العلم " ایک مشہور مقولہ ہے جس میں " خط " کو نصف علم سے تعبیر کیا گیا ہے پڑھنے کے ساتھ ساتھ خط کی عمدگی کی مشق بھی نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی عام لکھے پڑھے لوگوں سے لیکر سلاطین تک اس میں کمال حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ خود ہندوستان میں سلطان ناصرالدین محمود اور اورنگ زیب عالمگیرؒ نہایت باکمال خطاط تھے۔ مگر اب کچھ عرصے سے جس طرح اور بہت سے قدیم تصورات معدوم ہوتے جارہے ہیں، خط کی عمدگی اور پاکیزگی کی جانب سے بھی روز بروز بے اعتنائی بڑھتی جارہی ہے، خصوصاً مدارس عربیہ میں تو تقریباً مفقود ہی ہوگئی ہے۔

دارالعلوم میں اس ضرورت کی اہمیت کے پیش نظر نستعلیق اور نسخ دونوں خطوط کی اصلاح اور تعلیم دی جاتی ہے، طلبہ کو مشق خط کا سالانہ امتحان دینا ہوتا ہے۔

صنعت وحرفت

درسگاہوں کے لئے طلباء کے معاشی اور اقتصادی مستقبل کا حل کرنا اب دور حاضر میں از بس ضروری ہوگیا ہے اس سلسلے میں دارالعلوم نے کئی صنعتوں کو حصول معاش کے لئے جاری کیا ہے، طب کے علاوہ کتابت اور جلد سازی وغیرہ ہلکی پھلکی صنعتوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

زمانے کے مقتضیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دارالعلوم میں صنعت وحرفت کے جاری کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ فضلائے دارالعلوم صنعت و حرفت کو ذریعہ معاش بناکر اسلاف کے ظاہری کے ساتھ دین کی خدمت آزادی اور بے فکری سے انجام دے سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جن صنعتوں کی تعلیم دی جائے وہ ایسی ہوں جو اپنی نفسیہ طلباء و علماء کے شایان شان ہوں اور

فن کے سیکھنے میں جسمانی اعضاء کی حرکت کے ساتھ دماغی اور ذہنی غور و تربیت بھی شامل ہو، نیز ان صنعتوں سے روزمرہ کی انسانی ضروریات کی تکمیل بھی ہوتی ہو، اور اس کے ساتھ ان میں زیادہ سے زیادہ افادیت کا پہلو موجود ہو۔

صحیح دینی تعلیم کے ساتھ دارالعلوم میں یہ ماحول پیدا کیا گیا ہے جس میں مضبوط اسلامی سیرت طلباء میں پیدا کی جا سکے اور چونکہ اس زمانے میں روزی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ طلباء کو تعلیم کے ساتھ ایسی صنعتیں بھی سکھائی جائیں جن سے ان پر کسب رزق کی راہیں کھل سکیں تاکہ وہ وقت کے سیلاب میں نہ تو خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور نہ دین کو کسب رزق کا ذریعہ بنانے والوں کی طرح لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو جائیں بلکہ اپنے اخلاقی وزن کو قائم رکھتے ہوئے دین کی خدمت کر سکیں اور قوم کے کام آ سکیں۔

چنانچہ [illegible] سے جلد سازی کے کام سے صنعت و حرفت کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس شعبے میں جلد سازی اور خیاطی اور بوٹ ڈبے اور سوٹ کیس وغیرہ بنانے کی ہلکی پھلکی صنعتیں سکھائی جاتی ہیں۔

امید ہے کہ مستقبل میں یہ شعبہ اپنی افادیت کے باعث طلبہ کے معاشی مستقبل کا باعزت ذریعہ بن سکے گا۔

یہ دارالعلوم کے تعلیمی شعبے ہیں

شعبہ نشریات

اس شعبے سے دارالعلوم کا ماہنامہ "اردو ترجمان" "دارالعلوم" دیوبند اور پندرہ روزہ اخبار "الداعی" عربی میں شائع ہوتا ہے۔ مجلہ "دارالعلوم" اور "الداعی" کے علمی اور دینی حلقوں میں ملک اور بیرون ملک میں مقبول ہیں۔ ان پرچوں کے ذریعے سے دارالعلوم کا موقف پیش کیا جاتا ہے، اور اہل قلم علماء کے مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادارہ نشر و اشاعت

کے ذریعے سے دار العلوم کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں کی اشاعت کی جاتی ہے۔

شعبۂ ورزش اس شعبے میں مختلف قسم کی ورزش سکھانے کا انتظام ہے۔

شعبۂ محاسبی یہ شعبہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ قیام دار العلوم کے دوسرے ہی سال اس کی تشکیل عمل میں آگئی تھی۔ مالی دارومدار کے لحاظ سے اس شعبے سے دار العلوم کا ہر شعبہ وابستہ ہے۔ ہر قسم کے آمد و صرف کی شعبہ وار، در مد وار تفصیلات رکھنا اس کے فرائض میں ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ رقم اور معمولی سے معمولی چیز بغیر رسید کے داخل نہیں کی جاتی، اسی طرح کوئی صرف بھی بغیر واؤچر کے نہیں کیا جاتا۔ دار العلوم کا خزانہ اسی شعبے کے واسطے سے مہتمم صاحب کی تحویل میں رہتا ہے۔ حسابات کے اندراجات مروجہ حسابی طریق کے مطابق نہایت واضح اور صاف رکھے جاتے ہیں اور جانچ پڑتال کے لئے اس کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا ہے اس کے باوجود مزید احتیاط کے طور پر رجسٹرڈ آڈیٹروں سے سالانہ حسابات چیک کرائے جاتے ہیں۔ طلبہ کے وظائف کی تقسیم کا کام بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔ دوسرے شعبوں کے ذریعے سے جو مصارف ہوتے ہیں ان کی جانچ پڑتال بھی محاسبی کے فرائض میں داخل ہے۔

شعبۂ محاسبی کے حسابات کی عمدگی کو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ کانپور کے مشہور تاجر حافظ محمد حلیم صاحب نے اپنے معائنہ میں لکھا تھا کہ:

"مدرسے کا حساب نہایت اطمینان بخش ہے۔ اندراج صحیح خرچ باقاعدہ ہوتا ہے۔ مدرسے کی خوبی یہ ہے کہ معطیین کا عطیہ اس کے حسب منشا مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے۔"

شعبۂ تنظیم و ترقی

اس شعبے کا کام دارالعلوم کے لئے مالیہ فراہم کرنا ہے مالیات وصول کرنے کے لئے متعدد سفیر مامور ہیں، جنہیں ملک کے مختلف حصوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سفراء ملک کے گوشے گوشے میں دورے کرتے ہیں اور کم و بیش ہر جگہ سے انہیں مالی اور نقدی امداد ملتی ہے یہ شعبہ ۱۳۴۵ھ سے قائم ہے۔ طلباء کے لئے غلے کی فراہمی کا کام بھی یہی شعبہ انجام دیتا ہے

شعبۂ اوقاف

اوقاف کا سلسلہ دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، وقتاً فوقتاً اہل خیر یہاں اپنی چھوٹی چھوٹی جائدادیں دارالعلوم کے لئے وقف کرتے رہے ہیں البتہ کوئی ایسی جائداد جس کے ذریعے سے دارالعلوم کے مصارف پورے ہو سکیں اوقاف دارالعلوم میں نہیں ہے یہ اوقاف ہندوستان کے مختلف مقامات میں واقع ہیں۔

ادارۂ اہتمام

ادارۂ اہتمام دارالعلوم کا آئینی طور پر مرکزی نقطہ ہے تمام شعبوں کا نظم و نسق، ان کی نگرانی اور حسابات کی جانچ پڑتال اسی ادارے سے متعلق ہے۔ مجلس شوریٰ اور عاملہ کی تجاویز اور فیصلے ادارۂ اہتمام ہی کے ذریعے سے نافذ کئے جاتے ہیں شعبوں کی داخلی نگرانی کے علاوہ دارالعلوم کے ملک سے خارجی تعلقات بھی اسی ادارے کے واسطے سے قائم ہیں اس لئے ادارۂ اہتمام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، اہتمام کے عہدۂ منصب کے لئے ہمیشہ یہ اصول مدنظر رہا ہے کہ اس کے لئے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو علم و فضل و دیانت و تقویٰ اور انتظامی امور میں خاص صلاحیتوں کی مالک ہونے کے علاوہ ملک میں عوامی اثر و وجاہت بھی رکھتی ہوں۔

ادارۂ اہتمام کی عمارت صدر دروازہ کے اوپر واقع ہے یہ عمارت ۱۳۳۹ھ میں تعمیر ہوئی ہے۔

محافظ خانہ

دفتری حیثیت سے محافظ خانہ کو روداد دارالعلوم میں "استحکام کی روح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس شعبے میں دارالعلوم کا تمام تاریخی سرمایہ محفوظ ہے۔ محافظ خانہ دارالاہتمام سے متصل ایک مستقر کمرے میں واقع ہے۔ دارالعلوم کے تمام شعبہ جات کے کاغذات اور دستاویزات اسی شعبے میں محفوظ رکھے جاتے ہیں، ہر شعبے کے کاغذات کے لئے ایک رنگ مخصوص کر دیا گیا ہے، مختلف رنگوں کی وجہ سے ہر شعبے کے کاغذات باسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔

کتب خانہ

اکابر دارالعلوم کے سامنے تعلیم کا جو بلند معیار تھا اور طلباء کے سلسلہ میں تحقیق اور تصنیف و تالیف کی جو اہم ذمہ داریاں تھیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ موجود ہو، کیونکہ ایسے کتب خانے کے بغیر تدریس و تحقیق کا اعلیٰ معیار برقرار نہیں رکھا جا سکتا، اس غرض سے کتب خانے کے لئے دارالعلوم کے قیام کے ساتھ ہی کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں قائم ہوا، ہندوستان کا یہ سب سے پہلا قومی اور تعلیمی ادارہ ہے جس نے حکومت پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے مصارف کی بنیاد عوام کے چندے اور عطیات پر رکھی، طلباء کی سب سے بڑی ضرورت کتابوں کا بہم پہنچانا ہے، جس کے بغیر علم کی تکمیل ناممکن ہے، چنانچہ شروع ہی میں ارباب دارالعلوم نے عام چندے کے ساتھ ہی فراہمی کتب کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ دور وہ تھا کہ ہندوستان میں ابھی پریس چلا ہی چلا تھا، کتابیں کمیاب اور ان کی قیمتیں گراں تھیں، اس لئے ابتداءً یہ صورت اختیار کی گئی کہ مقامی اور گرد و پیش کے علم دوست حضرات سے طلبا کے پڑھنے کے لئے کتابیں کچھ عرصے کے لئے مستعار لے لی گئیں، ان میں درسی کتب بھی تھیں اور غیر درسی بھی، اساتذہ اور طلباء کی ترقی علم اور معلومات عامہ کے لئے عام غیر درسی کتب کی فراہمی بھی اسی قدر ضروری

ہے جتنی کو درسی کتب کی، چنانچہ ارباب دارالعلوم نے ملک سے اپیل کی، ملک نے
دارالعلوم کی اس آواز پر لبیک کہا اور کتب کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جن لوگوں
کے پاس کتابوں کا قلمی یا مطبوعہ ذخیرہ موجود تھا انہوں نے کتابیں دیں اور جن کے
پاس کتابیں نہیں تھیں اور وہ کتب خانہ کی مدد کرنا چاہتے تھے انہوں نے خریداری
اور فراہمی کتب کے لیے نقد روپے سے امداد کی۔ اور الحمدللہ یہ سلسلہ ایک سو چھ سال
سے اسی طرح جاری ہے، کتب خانے میں ایک عظیم تعداد ان کتب کی بھی ہے جو ترکی کے
سلطان رشاد خان، نظام دکن، سعود ابن سعود، جمال عبدالناصر صدر عرب جمہوریہ
اور حکومت افغانستان نے کتب خانے کو مدد کی ہیں۔ کتب خانہ میں زیادہ تعداد ایسی
ہی کتابوں کی ہے جو دارالعلوم کو عطیے میں ملی ہیں۔

غرض اسی طرح سے کتب خانہ دارالعلوم میں کتابوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع
ہو گیا ہے، جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے، ہندوستان کے بہت سے علمی خانوادوں
کے علمی ذخائر کتب خانہ دارالعلوم میں منتقل ہو چکے ہیں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد
ہے۔ ان میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں غیر درسی ہیں اور بقیہ کتابیں درسیات پر مشتمل
ہیں، یہ تعداد ان کتابوں کے علاوہ ہے جو ہر سال جلسہ تقسیم انعام کے موقع پر ہزارہا کی تعداد
میں بصیغہ انعام طلباء، ہمدردان دارالعلوم کی جانب سے موصول ہوتی رہتی ہیں غرض کہ
کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ہندوستان کے کم ہی کتب خانے دارالعلوم کے کتب خانے
کی برابری کر سکتے ہیں کتابوں کی ندرت و کثرت کے باعث یہ کتب خانہ ہندوستان کے
کتب خانوں میں اپنا امتیازی مقام رکھتا ہے اس لئے بعد و بیرون ہند کے اہل علم اور مصنفین
ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

دارالعلوم کے کتب خانے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بہت سی قلمی کتابیں بھی
ہیں۔ ان میں کم یاب بھی ہیں اور نادر الوجود بھی ہیں۔ بعض کتابیں خوش خطی کے لحاظ سے

قابل تعریف ہیں تو بعض اپنی قدامت تحریر کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں۔ بعض کتابیں خود مصنفین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں اور بعض خوشخطی اور مصوری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں بعض شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکی ہیں اس لئے تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو مصنف کے اصل نسخے سے منقول ہیں یا مشہور علماء کے ہاتھوں میں رہ چکی ہیں۔ چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کوئی دوسرا نسخہ آج دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ دنیا کی مختلف لائبریریوں نے کتب خانہ دارالعلوم کی متعدد مخطوطات کی مائیکرو فلمیں حاصل کی ہیں۔ غرض کہ یہ کتب خانہ ہندوستان کے ممتاز کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

کتب خانہ دارالعلوم دو شعبوں پر منقسم ہے۔ ایک شعبہ درسی کتابوں کا ہے دوسرے میں غیر درسی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ دونوں شعبوں کے انتظامات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ درسی کتابیں اور ان کی شروح وحواشی کی داد و ستد کا سالانہ اوسط پندرہ ہزار کے لگ بھگ رہتا ہے۔

کتابوں کی ترتیب و تقسیم میں زبان اور فن کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی جو کتابیں جس فن سے تعلق رکھتی ہیں وہ تمام کتابیں اس فن کے تحت رکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح کتابوں کی تقسیم زبان وار بھی ہے۔ ان میں ذخیرہ عربی کا سب سے بڑا ہے، اس کے بعد اردو کی کتابیں ہیں، پھر ان سے کچھ کم فارسی کی ہیں۔ دیگر زبانوں کی کتابیں زیادہ نہیں۔ یہ کتابیں ترتیب و تقسیم کے لحاظ سے ۹۹ عنوانات پر تقسیم ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱ قرآن مجید	۴ تفسیر
۲ تجوید	۵ شروح وحواشی تفسیر
۳ اصول تفسیر	۶ احکام قرآن

۷ غریب القرآن
۸ اعراب القرآن
۹ الناسخ و المنسوخ
۱۰ اسباب نزول
۱۱ متعلقات قرآن
۱۲ استخراج الآیات
۱۳ مضامین القرآن
۱۴ تراجم قرآن اردو
۱۵ تراجم قرآن فارسی
۱۶ اصول حدیث
۱۷ حدیث صحاح ستہ مع شروح و حواشی
۱۸ مسانید و سنن
۱۹ دیگر مجموعہ احادیث
۲۰ موضوعات حدیث
۲۱ غریب الحدیث
۲۲ استخراج الحدیث
۲۳ اسماء الرجال
۲۴ اصول فقہ حنفی
۲۵ اصول فقہ مالکی
۲۶ اصول فقہ شافعی
۲۷ اصول فقہ حنبلی

۲۸ اصول فقہ اہل حدیث
۲۹ فقہ حنفی
۳۰ فتاویٰ حنفی
۳۱ فقہ مالکی
۳۲ فقہ شافعی
۳۳ فقہ حنبلی
۳۴ فقہ مذاہب ظاہر
۳۵ فقہ اہل حدیث
۳۶ فقہ شیعہ
۳۷ علم عقائد و کلام
۳۸ حکمت شرعیہ
۳۹ علم تصوف (نثر میں)
۴۰ علم تصوف (نظم میں)
۴۱ علم تصوف (مکتوبات)
۴۲ علم تصوف (ملفوظات)
۴۳ اوراد و وظائف اور عملیات
۴۴ مواعظ و اخلاق
۴۵ عربی ادب (نثر)
۴۶ عربی ادب (نظم)
۴۷ علم معانی
۴۸ علم نحو

۴۹ علم الحشر
۵۰ تاریخ عام
۵۱ تاریخ تہذیب و تمدن
۵۲ تاریخ العلوم و المذاہب
۵۳ سیرۃ النبی
۵۴ تراجم صحابہ
۵۵ تراجم فقہاء و محدثین و دیگر علماء
۵۶ تذکرہ علماء دیوبند
۵۷ تراجم اولیاء کرام
۵۸ تذکرۃ الشعراء
۵۹ دائرۃ المعارف
۶۰ سفرنامے
۶۱ کوائف دارالعلوم دیوبند
۶۲ انساب
۶۳ فہرس الکتب
۶۴ مجامیع
۶۵ متفرقات
۶۶ علم طبقات الارض
۶۷ علم الکیمیاء
۶۸ علم الزراعت
۶۹ علم الاصوات و الحیوانات
۷۰ کتب عملیات، کہانت و سحر
۷۱ سیاسیات
۷۲ فلسفہ
۷۳ منطق
۷۴ ہیئت
۷۵ معاشیات و اجتماعیات
۷۶ مجلہ و رسائل
۷۷ غرائبات و معلومات عامہ
۷۸ جغرافیہ
۷۹ طب
۸۰ تعبیر الرؤیا
۸۱ کتب اہل کتاب
۸۲ کتب دھرم شاستر
۸۳ اصول مناظرہ
۸۴ کتب مختلف مذاہب
۸۵ ردّ عیسائیت
۸۶ کتب عیسائیت
۸۷ ردّ قادیانیت
۸۸ کتب مذہب قادیانی
۸۹ ردّ بدعت
۹۰ کتب مبتدعین

۹۱ ردِّ روافض
۹۲ کتبِ اہلِ تشیع
۹۳ ردِّ نیچریت
۹۴ ردِّ خاکساریت
۹۵ کتبِ خاکساریت
۹۶ ردِّ وہابیہ
۹۷ کتبِ فرقۂ جدیدیہ
۹۸ کتبِ فرقۂ بہائیہ
۹۹ ردِّ فرقۂ سائیہ

تمام فہرستی کتابوں کی مفصل فہرستیں موجود ہیں جن میں کتاب کا نام، نمبر مسلسل، زبان، مصنف کا نام، مطبع، سنِ طباعت، اگر کتاب قلمی ہے تو کاتب کا نام اور سنِ کتابت لکھا ہوا ہے۔ فہرست کے آخری خانے میں کتاب کے صفحات درج کئے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ کتاب نکالنے کے لئے جدید طریقہ پر کارڈ سسٹم سے کام لیا جاتا ہے جو لائبریریوں کے مروجہ طریقے کے مطابق حروفِ تہجی کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔

کتب خانہ دار العلوم میں عربی و فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، روسی، یونانی، ترکی، انڈونیشی، سنسکرت، ہندی، تمیل، بنگلہ، گجراتی، گورمکھی، مرہٹی، کشمیری، پشتو، پنجابی وغیرہ زبانوں کی کتابیں بھی کم و بیش مختلف موضوعات پر موجود ہیں۔

مطبوعات کے علاوہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، مخطوطات کا بھی خاص ذخیرہ موجود ہے۔ مخطوطات کی تعارفی فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ اس کی دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں، پہلی جلد صرف تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد و کلام وغیرہ علوم کی مخطوطات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں تصوف، تاریخ، مناقب، ادبِ عربی، لغت، فلسفہ، منطق، ہیئت، صرف، نحو، مناظرہ، سیاسی، طب، متفرقات، ادبِ فارسی، ادبِ اردو کی مخطوطات کا تعارف ہے۔

تحقیقی کام اور ریسرچ کرنے والے اہلِ علم کتب خانہ دار العلوم کے نایاب و نادر علمی ذخیرے سے استفادہ کرنے کے لئے اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں۔

گذشتہ چند سالوں میں ہندوستان کے علاوہ انگلستان، روس، امریکہ اور جاپان

کے علاوہ اختلافِ رنگ کے ذریعہ بھی ان کو ممیز کر دیا گیا ہے ٹکٹوں پر تحریر کردہ ہوتے ہیں اور ہر ٹکٹ پر صبح و شام کے لئے دو ٹکٹ ہوتے ہیں۔ کھانا پانے والے طلبہ کے نمبر ہیں جس نمبر پر طالب علم کا نام درج ہوتا ہے وہی نمبر اس طالب علم کے ٹکٹ کا ہوتا ہے، اس طرح طلبہ بہ ترتیب سہولت کے ساتھ کھانا حاصل کر لیتے ہیں

ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں جن کے مشترک آٹے کا وزن ۵ تولہ ہوتا ہے شام کے کھانے میں گوشت پکتا ہے اور دوپہر کو دال دی جاتی ہے ہفتہ میں ایک مرتبہ بریانی دی جاتی ہے۔ مطبخ میں پختہ کھانا پکنے کا بھی انتظام ہے جس میں مذکورہ بالا کھانے کے علاوہ ہر قسم کا کھانا بوقتِ ضرورت پکتا ہے بیمار طلبہ کے لئے پرہیزی کھانا بھی پکایا جاتا ہے مطبخ کی عمارت احاطۂ دار العلوم کے جنوبی گوشے میں واقع ہے یہ عمارت کئی حصوں پر مشتمل ہے۔

شعبۂ تعمیرات

دار العلوم میں تعمیر عمارت کی نوعیت جیسی رہی ہے کہ وقتاً فوقتاً اہلِ خیر حضرات اس کی تعمیری ضروریات کی جانب توجہ فرماتے رہے اور بقدرِ آمدنی عمارتیں تیار ہوتی رہیں، یہ صورت نہیں ہوئی کہ وقت سے قبل عمارت کی تکمیل کر لی جائے، جیسا کہ عموماً دستور ہے کہ پورے نقشے کے مطابق پہلے عمارت تیار کرا لی جاتی ہے، اس کے بعد تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جوں جوں ضرورت پیش آتی رہی اور اللہ کے مخلص بندے اس کی تیاری پر آمادہ ہوتے رہے، متعدد عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں۔ بالعموم ہر سال تعمیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک دار العلوم کی تعمیرات پر جو رقم صرف ہوئی اس کی مجموعی مقدار ۱۱ لاکھ ... روپے ہے۔

شعبۂ دار الاقامہ

دار الاقامہ تقریباً دس عمارتوں اور ۲۰۱ کمروں پر مشتمل ہے جس میں کم و بیش ایک ہزار طلبہ کا قیام رہتا ہے، طلبہ کے لئے کمروں کی تجویز، ... ان کی اخلاقی نگرانی اور نظم خصوصاً دار الاقامہ سے متعلق رہتے ہیں

کو اساتذہ کے ذریعے انجام دیئے جاتے ہیں۔ ملازمین کا احترام اکابر کی اطاعت، باہمی محبت و اخلاص اور رواداری طلبائے دارالعلوم کے اخلاقی نظام کے خصوصی عناصر ہیں۔ طلبا کے نظم کی استواری اور اصلاح کو دیکھ کر ایک مرتبہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمایا تھا کہ "دارالعلوم میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ طلبہ کا ڈسپلن ہے، کاش یہ ڈسپلن علی گڑھ کو بھی نصیب ہو" تاہم مختلف الطبائع افراد کے ایسے غیر معمولی مجمع میں خلاف طبع امور کا پیش آنا ایک طبعی بات ہے جس سے دنیا کا کوئی اجتماع مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، اور پھر ملکوں اور دور دست قریوں کے نوجوانوں کا اجتماع ہوتا ہے، جن کی زندگی الشباب شعبۃ من الجنون کی منزل میں ہوتی ہے، جس سے بعض اوقات معمولی معمولی باتوں پر تناؤ اور فکر بھی پیدا ہو کر جنون آمیز حرکات کا صدور ہو جانا ناگزیر ہے، ایسا موقع پیش آ جانے پر دارالاقامہ کا فرض ہے کہ فوری کارروائی کرے اور فریقین کے بیانات اور شہادتوں کی روشنی میں شرعی فیصلہ صادر کرے۔

شعبۂ اجلاس صد سالہ

اس شعبہ کا مقصد فضلائے دارالعلوم سے رابطہ قائم رکھنا ہے، فضلائے دارالعلوم کی دینی، علمی، معاشرتی، سیاسی اور مدرسی خدمات جو وہ مختلف دائروں میں انجام دے رہے ہیں اس شعبے کے ذریعے سے ان کا ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے، اس شعبہ کی جانب سے دارالعلوم کے ایسے نقشے اور گراف تیار کئے گئے ہیں جن سے ایک نظر میں دارالعلوم کی کارکردگی معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس شعبے کے ذریعے سے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجتماع کی عظیم پیمانے پر تیاری کی جا رہی ہے، مولانا حامد الانصاری غازی اس شعبے کے سربراہ ہیں۔

شعبۂ صفائی

صحت و تندرستی بڑی حد تک صفائی پر موقوف ہے، اس لئے دارالعلوم میں صفائی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے، صفائی کے لئے کم و بیش دس

ماکروب اور دو بہشتی مستقل طور پر ملازم رکھے ہیں۔

شعبہ برقیات (روشنی اور پانی)

دارالعلوم میں بجلی کی روشنی کا انتظام ہے درس گاہوں دفاتر اور مسجد میں برقی پنکھے آویزاں ہیں ٹیوب لگا ہوا ہے۔ برقی قمقمے لگے ہوئے ہیں۔ شب میں طلبہ کے مطالعے اور اسباق کی تکرار کے لئے چند درس گاہیں مخصوص ہیں جن میں مقررہ اوقات میں روشنی کا انتظام رہتا ہے۔

پانی کے لئے متعدد کنویں ہیں نیز دارالاقامہ کے احاطوں میں جا بجا پمپنگ کے نل اور پائپ لگے ہوئے ہیں مسجد کے حوض کو بھرنے کے لئے برقی موٹر لگایا ہوا ہے۔ آب رسانی کے لئے ایک ٹیوب ویل لگا ہے۔

شعبہ امور خارجہ

اس شعبہ میں بیرونی طلبہ کے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کے سلسلے میں ضروری تحفظات اور عام طلباء کے لئے ریلوے کنسیشن فراہم کرانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

شعبہ جات میں تدریجی اضافہ

دارالعلوم کا آغاز اولاً شعبہ تعلیمات اور دارالاہتمام سے ہوا تھا۔ اہتمام کا فریضہ دارالعلوم کے لئے مالیہ فراہم کرنا اور انتظامی امور تھے۔ رفتہ رفتہ حسب ضرورت شعبہ جات کا اضافہ مسلسل ہوتا رہا۔ آمد و خرچ کے حسابات کے لئے شعبہ محاسبی، وہ کتابوں کے متعدد ذخیرہ میں جمع ہو جانے پر کتب خانہ کا شعبہ بڑھایا گیا۔ استفتاءات کی کثرت کے بعد دارالافتاء کھولا گیا۔ حفاظت کے لئے دربانوں کا شعبہ مقرر کیا گیا۔ طلباء کے معالجے و مستقبل میں طلباء کی معاشی سہولت کے لئے شعبہ طب کا قیام عمل میں آیا۔ عام مسلمانوں تک دینی معلومات اور مسائل پہنچانے کے لئے شعبہ تبلیغ قائم کیا گیا۔ دارالعلوم کے مسلک کی اشاعت کے لئے رسالے جاری کئے گئے۔ طلباء کی غذا کی سہولت کے لئے مطبخ

قائم کیا گیا۔ جدید عمارتوں کی تعمیر اور سابقہ عمارتوں کی مرمت کے لئے تعمیرات کا شعبہ کھولا گیا۔ اسی طرح جائداد اوقاف دارالعلوم کی حفاظت کیلئے شعبۂ اوقاف۔ خدا کی زندگی اور طلباء کی معاشی ضرورت کے پیش نظر شعبۂ کتابت۔ صفائی کے لئے شعبۂ صفائی۔ کاغذات کی حفاظت و ترتیب کے لئے محافظ خانہ۔ ملک سے مالیہ فراہم کرنے کے لئے شعبۂ تنظیم و ترقی۔ دارالاقامہ میں مقیم طلباء کے انتظامات کے لئے شعبۂ دارالاقامہ۔ شعبۂ روشنی و آب رسانی۔ طلباء میں صنعتی میلان پیدا کرنے کے لئے دارالصنائع۔ غیر ملکی طلباء کے انتظام کے لئے شعبۂ امور خارجہ۔ فضلائے دارالعلوم کی تنظیم کے لئے شعبۂ تنظیم ابنائے قدیم۔ علمی زندگی کے لئے مجلس معارف القرآن قائم ہے جس سے اسلامی اور تاریخی موضوعات پر اب تک متعدد کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ یہ شعبہ جات وقتاً فوقتاً عالم وجود میں آتے رہے ہیں۔

٭

باب نہم

دارالعلوم کی عمارتیں

دارالعلوم کی عمارتیں دیوبند کے شمال مغرب میں ایک طویل چہار دیواری سے گھری ہوئی ہیں۔ کچھ عمارتیں جو ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہیں حدود دارالعلوم میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے احاطے سے باہر بھی بنائی گئی ہیں۔ ان سب عمارتوں کا مجموعی رقبہ ۴۴ ہزار مربع میٹر ہے۔ دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر کی تفصیل باب دوم میں حالات سنین کے ضمن میں بیان کی جا چکی ہے، مگر چونکہ ان کا ذکر متفرق طور پر ہوا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ یہاں اجمالی طور پر ان سب عمارتوں کا یکجا ذکر کر دیا جائے، تاکہ ناظرین کرام دارالعلوم کی عمارتوں کی وسعت و عظمت اور حیثیت کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ اگرچہ عمارتیں کسی درسگاہ کا ضروری جزو نہیں، پچھلے زمانے میں اساتذہ مسجدوں اور درختوں کے سائے میں بیٹھ کر درس دیتے تھے، لیکن کسی درسگاہ سے دلچسپی رکھنے والے فطری طور پر یہ جاننے کے ضرور مشتاق ہوتے ہیں کہ اس تعلیم گاہ کا نقشہ کیا ہے اور اس کا جغرافیہ کس طرح واقع ہوا ہے
ودہ دارالحدیث، دارالتفسیر، کتب خانہ، اہتمام، دارالافتاء، دار جدید کا وسیع

مسجد، باب الظاہر، مہمان خانہ، جامعہ طبیہ اور مطبخ۔ یہ دارالعلوم کی خاص عمارتیں ہیں۔

دارالحدیث: دارالعلوم کی عمارتوں کا نقطۂ آغاز ہونے کے علاوہ دارالعلوم کی جملہ عمارتوں میں یہی بلندی، وسعت اور شان وشکوہ کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۲۹۳ھ میں اولاً "نودرے" کے نام سے اس کا آغاز ہوا۔ نودرے کی دو منزلہ عمارت مشرق رویہ ہے، اس کے نیچے والی منزل میں ۲۴×۲۴ مربع فٹ کے تین ہال ہیں، جن کے سامنے نودروں کا ایک طویل دالان ہے۔ اوپر والی منزل میں ایک وسیع ہال ہے جس کا رقبہ ۲۰×۸۰ مربع فٹ ہے، یہاں دورۂ حدیث کے اسباق ہوتے ہیں اس لئے یہ نو تعمیر دارالحدیث کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی بالائی منزل کی تعمیر ۱۳۰۸ھ میں ہوئی ہے۔

نودرے کی پشت پر بجانب مغرب دارالحدیث کی عظیم الشان اور پرشکوہ عمارت ہے۔ برصغیر کی سرزمین پر دارالحدیث کے نام کی یہ پہلی عمارت ہے، دارالحدیث کے ہال کا طول ۹۰ فٹ ہے اور عرض ۴۰ فٹ ہے۔ اس کے گرد وپیش ۱۲ کمرے ہیں جو درس گاہوں کے طور پر کام میں آتے ہیں۔ نودرے کا رخ مشرق کی جانب اور دارالحدیث کا مغربی جانب ہے۔ اس رخ پر پتھر کے ستونوں کا دالان ہے، دارالحدیث کے سامنے ایک وسیع میدان ہے جس میں چمن بندی کی گئی ہے۔ اس عمارت کی تکمیل ۱۳۲۷ھ میں ہوئی ہے۔

دارالحدیث کے اوپر دارالتفسیر کا ۳۰×۳۰ مربع فٹ کا ہال ہے، اس کا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے۔ یہ عمارت ۱۳۵۳ھ کی تعمیر ہے۔

نودرے کے سامنے ایک مستطیل صحن ہے، جو احاطہ مولسری کہلاتا ہے۔ دارالعلوم

مشہور تاریخی کنواں اسی احاطے میں ہے۔ یہیں شعبۂ تبلیغ کا دفتر ہے۔ نودرے کے صحن کے دو اطراف میں چند درسگاہیں اور طلباء کے لئے چند رہائشی کمرے ہیں۔ صحن کے آخیر میں جانب مشرق دروازہ ہے جو باب قاسم کے نام سے موسوم ہے۔ دروازے کے اوپر دارالاہتمام کی عمارت واقع ہے۔ اس لحاظ سے دارالاہتمام دارالعلوم کا مرکزی دفتر ہے۔ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے اجلاس بھی یہیں منعقد ہوتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۳۲۸ھ میں تعمیر ہوئی ہے۔ اس کا مادۂ تاریخ ہے: "جائے عجیب و غریب" (۱۳۲۸ھ)

دارالاہتمام کے مشرق میں دفتر اہتمام کی عمارت ہے، اور اس کے شمال میں تنظیم و ترقی دارالعلوم کا دفتر ہے اور یہیں دفتر دارالقاسم ہے۔ جنوب میں محافظ خانہ ہے جس میں دارالعلوم کا ایک صدی سے زائد مدت کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ ۱۳۵۵ھ میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔

مہمان خانے کی مشرقی جانب یعنی دفتر اہتمام کے بالمقابل جنوبی سمت میں دفتر محاسبی واقع ہے۔ یہ عمارت ۱۳۴۸ھ کی تعمیر ہے۔ یہ دفتر دارالعلوم کے جملہ آمد و خرچ کے حسابات کا ذمہ دار ہے، اسی کے ایک کمرہ میں دارالعلوم کا خزانہ رہتا ہے۔ دفتر محاسبی اور دفتر اہتمام کے درمیان ایک کشادہ صحن ہے جس کا دروازہ سڑک پر کھلتا ہے۔ دونوں دفتروں کے بیچ کی منزل میں شعبۂ دینیات اور شعبۂ تعمیرات کے دفاتر ہیں اور اوپر مہتمم صاحب کا دفتر ہے۔ اسی کے قریب مجلس معارف القرآن کا دفتر ایک کشادہ ہال میں ہے۔

دفتر اہتمام کے شمال و مشرق میں دارالعلوم کی حسین اور خوشنما دو منزلہ مسجد ہے جس کی زرنگار محرابیں اور مینار بادامی رنگ کے پتھر سے بنائے گئے ہیں، جن پر حسین اور خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ یہ مسجد ۱۳۴۷ھ کی تعمیر ہے اور سنگتراشی کی بہترین صنعت کی شاہکار ہے۔ صحن مسجد کے آخر میں حوض ہے۔ اندرون مسجد کا رقبہ

دارالاقامہ کے شمال جنوب اور مغرب میں تین بڑے دروازے ہیں۔ مغربی دروازہ باب الظاہر کے نام سے موسوم ہے۔ باب الظاہر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفر افغانستان اور سابق شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ کے ملنے کی یادگار ہے۔ اس کی تعمیر ۱۳۵۹ھ میں ہوئی ہے۔ باب الظاہر کا رقبہ ۲۲۴۴ء۵۴ مربع فٹ ہے۔ اس میں تین درس گاہیں شعبہ خوش خطی کی ہیں۔ باب الظاہر کے سامنے سیمنٹ کی پختہ سڑک ہے جس پر دیوبند کے میونسپل بورڈ نے دارالعلوم روڈ کے نام کا بورڈ لگا دیا ہے۔ یہ سڑک دارالعلوم کو ریلوے اسٹیشن سے ملاتی ہے۔

دارالحدیث کے کچھ فاصلے پر جنوب مشرق کی جانب دارالقرآن کی پانچ درسگاہیں واقع ہیں جو ۱۳۷۲ھ میں تعمیر ہوئی ہیں ان میں ہر ایک کا رقبہ ۲۱۰۰۵ مربع فٹ ہے۔ دارالقرآن کے قریب مطبخ کی عمارت ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ دالان، اجناس کا گودام، ... کا گودام، کھانا پکانے کے باورچی خانے، کھانا تقسیم کرنے کا دالان۔ ان سب عمارتوں کے مجموعے کا نام مطبخ ہے۔ مطبخ میں روزانہ دونوں وقت ایک ہزار طلبہ کے لئے کھانا پکایا جاتا ہے۔ مطبخ کے قریب دارِ جدید کی دوسری منزل پر دو جدید درس گاہیں بنائی گئی ہیں۔

مشرقی دروازے سے احاطۂ دارالعلوم میں داخلے کے وقت بائیں جانب نیچے کی منزل میں شعبہ برقیات کا دفتر ہے۔ دفتر اہتمام جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اسی کے اوپر ہے۔ دفتر برقیات کے برابر سے ایک راستہ جانب کتب خانہ نکلتا ہے۔ یہاں نیچے کی منزل میں دارالصنائع کے علاوہ اوقاف کا دفتر ہے۔ اوپر کی منزل میں کتب خانے کی طویل عمارت کا سلسلہ ہے۔ کتب خانے میں تین بڑے ہال اور کمرے ہیں جن میں ایک لاکھ سے زائد کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کی تفصیل باب ہشتم میں گزر چکی ہے۔ کتب خانے کی عمارت کا آغاز ۱۳۲۲ھ میں ہوا، اس کا تیسرا ہال ابھی ۱۳۲۱ھ میں

تعمیر ہوا ہے

یہ کتب خانہ دارالعلوم کی عمارت اور بزرگوں کے مسلمانوں کی فیاضی کا بے نظیر سرمایہ ہے۔ اس میں درسی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ شاید ہی کسی دوسری جگہ ہو۔

کتب خانے ہی کے نیچے کی سرنگ نما جانب دفتر تنظیم و ترقی کا دفتر ہے۔ یہ شعبہ دارالعلوم کے لئے مالیات فراہم کرتا ہے۔ اس کے صحن میں ایک پُر فضا چمن ہے۔ اوپر کی منزل کا تعلق کتب خانے سے ہے۔

دفتر تنظیم و ترقی کی پشت پر مسجد چھتہ ہے۔ یہ وہی قدیم مسجد ہے جس کے صحن میں انار کے درخت کے نیچے دارالعلوم کا افتتاح ۱۲۸۳ھ میں ہوا تھا۔ اس مسجد کا رقبہ ۳۴۰۰ مربع فٹ ہے۔

اگر آپ دارالعلوم میں اس کے مشرقی دروازے سے داخل ہوں تو احاطہ دار جدید سے باہر مسجد دارالعلوم کے بالمقابل شارع عام کی شرقی جانب آپ کو ایک پرشکوہ دو منزلہ عمارت نظر آئے گی۔ یہ دارالعلوم کا مہمان خانہ ہے جو ۱۳۶۲ھ میں تعمیر ہوا ہے۔ نیچے کی منزل میں مدرسین کے لئے رہائشی مکانات ہیں اور اوپر مہمان خانے کی وسیع عمارت ہے جو متعدد کمروں اور کئی دالانوں پر مشتمل ہے۔ رقبہ ۱۲۰۰۰ مربع فٹ ہے۔ مہمان خانے کے پہلو میں جانب مشرق ایک شاندار دو منزلہ عمارت ہے جس میں چھ مکان ہیں۔ اس کے ایک حصے میں اجلاس صد سالہ کا دفتر ہے۔

دارالطلبہ (دار الاقامہ) باب الظاہر کے شمال میں کسی قدر فاصلے پر جامعہ طبیہ دارالعلوم کی عمارتیں ہیں۔ جامعہ طبیہ میں متعدد ہال اور دالان ہیں اور مریضوں کے لئے دو جنرل وارڈ ہیں

جامعہ طبیہ کی پشت پر ایک سہ منزلی عمارت ہے۔ جو ابھی زیر تعمیر ہے مکمل ہونے پر یہ عمارت دارالعلوم کی عمدہ عمارتوں میں سے ہوگی۔

مطبخ کی پشت پر بھی طلباء کے لئے ایک نیا دارالاقامہ بنایا گیا ہے

دارالعلوم کی عمارتوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یہ عمارتیں پہلے سے تیار کردہ نقشے کے مطابق ایک ساتھ تعمیر نہیں ہوئی ہیں جیسا کہ ان کے سنین تعمیر سے واضح ہے۔ بلکہ جوں جوں دارالعلوم ترقی کرتا رہا اس کی عمارتوں میں بھی حسب ضرورت اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہنے کی توقع ہے۔ ؎

ہے کوشش کرام سے امید فتح باب
اور فضل ایزدی سے یقین کشود کار

———— ✕ ————

واردین وزائرین کے اسمائے گرامی

عبدالماجد منصف دربھنگہ

محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ

سید رشید، محمد شاہ رام پور سی

ایل. سی. پگاٹ مجسٹریٹ سہارنپور

آر. ایل. ڈیوہرسٹ جج سہارنپور

جے. ڈی. لاٹوش لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ

نواب احمد حسن خاں رئیس حسن پور

نیاز الدین خاں اکسٹرا کمشنر پنجاب

مولانا فتح محمد لکھنوی

مولانا انوار اللہ خاں حیدرآباد

سید محمد ابراہیم جیلر لکھنؤ

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں

کمشنر میرٹھ ڈویژن

احمد حسن، ڈپٹی کلکٹر سہارنپور

سید ضمیر الدین چیف سکریٹری ریاست بھوپال

مولانا شوکت علی

نواب لطیف یار جنگ بہادر حیدرآباد

نواب محمد اسماعیل خاں میرٹھ

سلیمان یوسف ملاں ڈربن

ضیاء الاسلام مجسٹریٹ کاندھلہ

ڈاکٹر جرمینس جولیس عبدالکریم بوڈاپسٹ یونیورسٹی

محمد یوسف خاں تاجر وکیل منصف دیوبند

فضل الٰہی میئر کلکتہ

سید محی الدین پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

کرنل وینٹ پروفیسر آکسفورڈ یونیورسٹی

ایم. آئی. شاہ کیمرج صدر جمیل متعلم منطق جامعہ ازہر

محمد جلیل خاں سکریٹری ریکاری شملہ

نواب بہادر یار جنگ، حیدرآباد

فتح الدین ایڈووکیٹ

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

ابراہیم خلیل، افغانستان

کے. ٹکسن شاستری

عمر ابو ریشہ، سفیر مملکت شام

انس یوسف یٰسین، سفیر سعودی عرب

یٰسین سراج الدین، سفیر مملکت مصر

مولوی محمد فاروق، کشمیر

بی. گوپالا ریڈی، گورنر یوپی

جگرٹ اے جیس، دہرہ دون

بے وی پرشاد چیف وہپ مرکزی حکومت

رام چندر وکل، ممبر پارلیمنٹ

ولیم ڈی کریس ولف، پروفیسر تاریخ کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ)

جے. ای. ایس. او. بی. سنہ پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

ناظم عمومی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

ڈاکٹر محمد اسحاق، پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

اکبر علی خاں، گورنر اڑیسہ

سوفیہ وان، مغربی جرمنی

عبدالخالق جیلانی، ممبر کشمیر گورنمنٹ

ڈاکٹر محمد ایوب علی، استنبول

شہباز حسین، ترقی اردو بورڈ دہلی

رابطہ علماء عراق، بغداد

شیخ عبدالحکیم، مفتی حسبہ (شام)

تان سری حاجی عبدالحق، ہائی کمشنر ملیشیا

شیخ عبدالحلیم محمود، شیخ الازہر

علی سید محمد غزالی، متحدہ امارات

شیخ محمد الفحام، شیخ الازہر

یوسف اسمٰعیل ہاشم رناتی

عبدالعزیز عبدالستار، قطر

منظور عالم قریشی، سفیر حکومت ہند

حسام الدین

باسدیو سنگھ، اسپیکر ہریانہ اسمبلی

فخرالدین علی احمد، صدر جمہوریہ ہند

مفتی عبدالمجید، تنظیم آزادی فلسطین

مہندر پرتاپ سنگھ

حکیم عبدالحمید، متولی ہمدرد دواخانہ دہلی

مقبول عبدالکافی، مدرسہ تحفیظ القرآن مکہ مکرمہ

دو منظوم معلقے

حاجی ضیاء الاسلام ضیاء، ہرنی کا بحلہ

مولانا ظفر علی خاں، ایڈیٹر اخبار "زمیندار" لاہور

—٭—

بابِ دہم

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

واردین و زائرین کے مشاہدات و تاثرات

دارالعلوم دیوبند جس طرح اپنی تعلیمی، تربیتی، تہذیبی اور سیاسی خدمات کی وجہ سے عالمی شہرت و عظمت اور مقبولیت کا حامل ہے، اسی طرح یہ دنیا کے مشاہیر علم و فضل اور سیاسی قائدین بالخصوص دفود وارباب حکومتِ ہند کی توجہات اور آمد و رفت کا بھی مرکز رہا ہے۔

دارالعلوم کے حالات اس کے سوانح نگار کی زبان و قلم سے سننے کے بجائے مشاہیرِ عالم کی زبانوں سے سننا زیادہ دلچسپی کا موجب ہوگا جنھوں نے دارالعلوم کو بچشمِ خود دیکھ کر اس کی مرکزیت، ہمہ گیر افادیت، دینی خدمت، اساتذہ کی علمی پختگی اور اخلاص و ایثار، پاکیزہ اخلاق اور سادہ اسلامی زندگی، طلباء کا تعلیمی ذوق اور بلند کردار، کارکنوں کا فرض شناسی اور محنت و دیانت، حسابات کی عمدگی صفائی کا التزام اور کتابوں کی

فراق وغیرہ نے ان ضروری تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے ان میں اکثر عالم اسلام کی مشہور شخصیتیں اور حضرات علماء، مبلغات اور دین وصادرین میں ہندو بیرون ہند کے مسافروں کے علاوہ مختلف مذاہب اور مختلف خیال کے سبھی لوگ شامل ہیں . یہیں قدیم وجدید علمی امور کے ماہرین بھی ہیں اور شماریات کے ماہر بھی، حکام بھی ہیں اور ارباب ثروت بھی، تاجر بھی اور عالم بھی، صحافت پیشہ بھی ہیں اور قانون داں بھی، دانشمند بھی ہیں اور لیڈران قوم بھی، اور انجنیر بھی ہیں طبیب بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی، مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، ہندو، سکھ بھی ہیں اور یورپین بھی، عیسائی بھی ہیں اور چینی و افریقی بھی، غرض کہ دارالعلوم کا معائنہ کرنے والوں میں مختلف ممالک، مختلف اقوام اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ موجود ہیں اور ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ مختلف اوقات میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دارالعلوم کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور اپنے تاثرات اور خیالات کا آزادانہ اظہار کیا ہے .

مندرجات کی عبارت میں لفظی بندش اور فقروں کی ترتیب کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا گیا ہے، اس کی وجہ یہ خیال ہے کہ قاری کے ذہن کو اصل عبارت اور اس کے طرز ادا سے بہر حال قریب تر رہنا چاہیے تاکہ وہ ہر شخص کے اسلوب نگارش اور جذبات کے انداز فکر کو جان سکے . ان میں بہت سے معائنے اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ہندی، چینی اور دوسری مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں . ایسے متنوں کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے

ان معائنوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کے اہل الرائے دارالعلوم کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں . یہ معائنہ جات کئی ضخیم جلدوں میں لکھے ہوئے ہیں اور اکثر سالانہ رودادوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں، اس لئے ان سب کا پیش کرنا ناخوشگوار طوالت کا باعث ہوگا، یہاں ان کا انتخاب و اقتباس پیش کرنا ہی مناسب

ہوگا۔ معائنہ جات ملاحظہ ہوں:-

"مجھ کو اتفاق تیرے مدرسہ دیوبند میں آیا۔ یہ ایک نہایت عمدہ مدرسہ ہے۔ عمارت مدرسہ اور صفائی اور طریقۂ تعلیم اور معروفیت مدرسین اور کوشش طالب علمان جماعات عربی و فارسی وغیرہ جو میں نے دیکھی ہے اس کی جس قدر تحسین کی جائے کم ہے دفتر نہایت تہذیب اور ترتیب کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ کتب ہر قسم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول وغیرہ جو کم دستیاب ہو سکتی ہیں اس مدرسہ میں موجود ہیں اور بہت جلد برآمد ہو جاتی ہیں۔ میں نے بات کو دیکھا ہے کہ اپنے دلی شوق سے تھوڑی سی بات سے طالب علم معروف تعلیم ہو جاتے ہیں۔ میں نے مدرسہ جات اسلامیہ پنجاب اور دہلی اور یورپ میں دیکھے، یہ عمدہ طریقہ جس میں ہر ایک امر کا لحاظ عمدہ طور پر کیا گیا ہے دیکھنے میں نہیں آیا۔ خدائے تعالیٰ یہ ماثر ما اس کی فضیلت و برکات اور اوقات میں ترقی فرماوے۔"

محمد عبدالواحد

منصف سرو جنگ ۳ محرم ۱۳۰۰ھ

"آج میں نے مدرسہ اسلامیہ دیوبند کو دیکھا۔ اس بات کے معلوم کرنے سے کہ اب مدرسہ ترقی پر ہے طالب علم ہیں طبیعت بہت مسرور ہوئی۔ عمارت مدرسہ مضبوط اور خوشنما ہے۔ صفائی بہت اچھی ہے۔ آج طلبہ امتحان تحریری کے دینے میں مصروف تھے۔ اس مدرسہ کو شروع ہوئے اٹھائیسواں سال ہے۔ جو امر خلوص نیت اور عزم درست سے کیا جاوے خداوند تعالیٰ اس میں ہمیشہ برکت دیتا ہے۔ اس مدرسہ کا وجود ان کے نامور علماء مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولوی محمد یعقوب صاحب

لے افسوس ہے کہ ۱۳۰۰ھ سے قبل کے معائنوں کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

اور ان کے اعتقاد کی درستی نیت اور عزم و استقلال کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں ایسا بنانے
طریقہ تعلیم قدیمہ کا اگر کوئی مصرف ہے تو یہی ہے۔ جدید طرز زمانہ حال کی تعلیم کا ذریعہ معاش
کے حاصل کرنے کی غرض سے۔ مسلمان اپنے مذہب اور اپنے بزرگوں کے طریقۂ تعلیم سے
واقف رہنے کے جو فوائد ہیں بے شک کم لوگ سمجھ کر بہت فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں
تحصیل علوم متعلقہ معاش کے لیے جبکہ بے شمار مدرسے اور اسکول ہیں ایسے خاص قوم
کی درس گاہ اور ایسے صاحب شوق و طالب علم کا وجود مستحقات سے ہیں۔ میری دلی دعا ہے
کہ خداوند تعالیٰ اس ادارہ کو جو شاد صحیح ترقی اہل اسلام کو سر سبز و کامیاب رکھے اور جن امور
سے کہ مذہب اسلام اور امور خاص ترقی اہل اسلام کا ایک امر مراد ہے ان کی تکمیل و منصوبہ
ان میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

سید احمد حسین

وزیر ریاست پٹیالہ ۵ شعبان ۱۳۲۳ھ

میں نے اس مدرسہ عالیہ دیوبند کو دیکھا۔ میرے نزدیک اکثر مدارس اسلامیہ سے
یہ بہتر اور افضل ہے۔ اس کی عمارت میں استحکام۔ مدرسین و علماء کا ادب زیادہ تر ملحوظ
ہے۔ اس کے علماء و طلباء متدین صاحب اخلاق حمیدہ اور صاحب کمال پائے۔ درس کا
نصاب ایسا رکھا گیا ہے کہ علوم مشہورہ متداولہ میں سے کسی علم میں اس کا پڑھنے والا
عاری نہ رہے گا۔ یہ بھی حالات دیکھنے سے ظاہر ہوا کہ قوانین و ضوابط سنت کا بھی لحاظ رکھا
مطلوب ہے۔ ہاں تمنا میں کہتا ہوں کہ فارسی کی کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں ان میں سے
مضامین مخل اور دقائق صوفیہ اور جو مضمون کہ اطفال و نوجوانوں کے حق میں مضر ہے
جائیں دور کر دیے جائیں۔

مسند محمد شاہ ابن سید حسن شاہ محدث رامپوری

۴ شوال ۱۳۲۳ھ

"مجھ کو آج مدرسہ عربیہ دیوبند کے معائنہ کرنے سے غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جو شخص اس مدرسہ کے دروازے سے گذر کر اس کے کشادہ صحن میں قدم رکھے اور وہاں اس کے بیل بوٹے اور پھول وغیرہ ملاحظہ کرے بعد ازاں اُس کی نہایت وسیع درسگاہوں میں داخل ہو جہاں کہ گروہ در گروہ طالبانِ علم دینیہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں اس کو ضرور بالضرور یقین ہو جائے گا کہ میں جیسے کسی قصبہ دیوبند میں نہیں ہوں بلکہ اس سے ہزاروں میل دور ہوں۔ میں مدرسہ کی عمارت کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عمارت ہندوستان میں عرب کی عمارتوں کا ایک عمدہ نمونہ معلوم ہوتی ہے طرزِ تعلیم کے حق میں، میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا مگر طالبانِ علم کا ایسے دور دراز مقامات سے جیسے سورت، کابل، بلخ وغیرہ یہاں موجود ہونا کالج کی شہرت کی کافی شہادت ہے۔ کالج کے بارے میں پورے طور سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ ملک کی ضروریات میں سے ایک بڑی ضرورت کو بخوبی پورا کر سکتا ہے۔ میں نہایت خوشی سے اپنا نام لسٹ چندہ دہندگان میں شامل کرتا ہوں۔"

پی۔ سی۔ پیگاٹ جوائنٹ مجسٹریٹ سہارنپور

۲۱ اپریل ۱۹۱۱ء

"میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۱۲ء کو مدرسہ عربیہ دیوبند کی سیر کی اور یہاں جو کچھ دیکھا اس سے بہت ہی مسرور ہوا۔ یہ ایک عدیم المثال درسگاہ ہے جو مسلمانوں کو نہ صرف ہندوستان کے اطراف و جوانب سے بلکہ کابل جیسے دور دراز مقامات سے اور کبھی کبھی خاص عجم سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اگرچہ مدرسہ کا نصب العین اسلامی دینیات کی تعلیم محض ہے مگر میں یہ دیکھ کر از حد محظوظ ہوا کہ عربی ادب کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اکثر طلبہ اس درجہ میں آسانی نظم و نثر میں طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ بعض کو مقامات حریری کے چیدہ چیدہ مقامات حفظ یاد ہیں۔ مجھ کو بذات خود ان بزرگوں

کی رائے سے اتفاق ہے جو مدرسے کے موجودہ نصاب تعلیم میں اصلاح وغیرہ کی تجویز پیش
کرتے ہیں۔ اگر ان کی رائے کے موجب جدید علوم بھی داخل نصاب کر دیے گئے تو مدرسہ
یہ کہ مدرسہ اس امتیازی حالت پر نہ رہے گا۔ اس قسم کی اصلاح کی کوشش کا نتیجہ
اگر کچھ ہوگا تو یہ ہوگا کہ مدرسے کے چہرہ کے وہ سب خدوخال مٹ جائیں گے جنکی بدولت
آج یہ مدرسہ ممتاز اور مشہور ہے۔ طالب علم یا ان کے والدین اگر علوم مروجہ زمانہ حال
کی تعلیم مغربی اصول پر پانے کے خواہش مند ہوں تو ان کو دیوبند آنے کی بجائے بے شمار
جگہ اس قسم کی تعلیم مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک جماعت منتظمہ کا یہ فرض منصبی ہے
چاہیے کہ مدرسہ کی اس تخصیصی اور امتیازی حیثیت کو قائم رکھیں گویا یہ ایک درسگاہ
ہے جس میں فقط عربی دینیات، منطق، معانی اور ادب وغیرہ کی تعلیم پر خصوصیت کے
ساتھ توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

اس بات کے دیکھنے سے بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ مدرسہ کے طلباء نے مدرسہ میں تعلیم
دینے کے خلوص و لگن سے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

ڈپٹی مجسٹریٹ۔ ضلع سہارنپور
۲۰ مارچ ۱۹۱۰ء

ہمارے اس مدرسہ دیوبند کو دیکھ کر وہ کثیر طلبہ کا ہندوستان کے تمام
حصوں سے آکر مدرسے میں داخل ہونا اس کی اعلیٰ وقعت اور قدر کا ثبوت کرتا ہے جو کہ مسلمان
اس مدرسہ کی نسبت اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ مجھ کو اس امر کا یقین دلایا گیا ہے کہ جس
طالب علم نے اس مدرسے کے نصاب تعلیم پر عبور حاصل کر لیا ہے وہ اپنی زندگی میں کوئی معزز
مرتبہ حاصل کرنے میں کبھی نامراد نہ رہے گا درآں حالیکہ یہ مقرر دیا گیا ہے کہ یہ مدرسہ
ایک بلند اخلاقی تعلیم کے قابل طالبان کا درس مہیا کرتا ہے میں اس آزاد
مستقل اور سرگرم سعی و کوشش کے حق میں جو مسلمانوں کی ترقی کے واسطے عمل

میں اس کی ہر قسم کی کامیابی کی خواہش کرتا ہوں ۔

جے ۔ ڈی ۔ لاٹوش لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ

۲ جنوری [illegible]

آج ۳ رجب [illegible]ھ کو مدرسہ میں آنے کا اتفاق ہوا ۔ چونکہ حسن پور ضلع مراد آباد
میں ایک اسلامی مدرسہ میرے زیر اہتمام ہے اس کی صلاح کے خیال سے میں نے سارے
رجسٹر اور حساب و کتاب مدرسہ خوب غور سے دیکھے اور ان کی جانچ کی ۔ مدرسہ کی مجموعی حالت
دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا ۔ کوئی امر ایسا نہیں دیکھا کہ جس میں کسی قسم کی فروگذاشت ہو
جملہ انتظام مناسب اور اعلیٰ درجہ کا ، سارے حساب و کتاب نہایت صحیح و درست کل
متعلقین مدرسہ اپنے کام میں مستعد و خیر خواہ ۔ سارے طلبہ متقی و جفاکش ۔ انتظام
نہایت صفائی کے ساتھ باقرینہ ۔ غرضکہ ہر آئینہ مدرسہ کی حالت ہندوستان کے
سوا دیگر ممالک سے بھی زیادہ بہتر ہے ۔ چنانچہ میں نے مصر کا جامع ازہر جو دنیا میں مشہور
ہے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ۔ جس میں سترہ ہزار طلباء پڑھتے ہیں ۔ اس سے بھی اس
مدرسہ کو بہت سے امور میں ترجیح حاصل ہے ۔ خداوند کریم بطفیل حبیب پاک اس
سے زیادہ ترقی دے ۔ اور اس گلزار محمدی کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے اور ترقی
عطا فرمائے ۔

نواب حاجی محمد احمد حسن خاں
رئیس حسن پور

میں نے مدرسہ دیوبند کی مقتدر جماعت علماء سے [illegible] حاصل کیا ۔ میں نے ان کو
نہایت متواضع ، حلیم ، بے تکلف ، منکسر المزاج بزرگ پایا ۔ میں اگرچہ بوجہ اپنی بے علمی کے ان کے
اعلیٰ علمی خیالات اور تحقیق کتب حاضرہ سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا مگر یہ مقام شکر ہے کہ ہمارے
یہ علماء زمانہ کی ضروریات سے واقف اور وسیع النظر اور موجودہ مذہبی سوالات اور

حالات سے پوری آگاہی رکھنے والے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ بزرگ اپنی قدیم مذہبی وضع کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ملک میں مذہبی ضعف عام ہے۔ اس لئے اس مدرسے کا وجود مسلمانوں کے لئے بلا شبہ رحمت الٰہی ہے۔ تغیر پسند لوگوں کے عام افلاس کی موجودگی میں نہایت شاندار اور مضبوط ہے۔

محمد ضیاء اللہ خان

اکسٹرا کمشنر پنجاب ستمبر ۲۳ء

میں نے ۵، ۶ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ کو مدرسے کی درسگاہیں اور تمام عمارت دیکھیں۔ عمارات بہت صاف اور مکمل پائے جس پر زیادتی تقریباً ناممکن ہے۔ کتب خانہ بہت بڑا اور باترتیب دیکھا۔ فارسی خواں بچوں کی تعلیم نہایت قابل اطمینان ہے۔ قرآن مجید کا بھی بہت اچھا انتظام ہے۔ قرأت کا جداگانہ اہتمام ہے۔ حدیث کے درس میں پچاس طالب علم صرف ترمذی شریف کے درس میں شریک تھے۔ یہ جماعت ہر نیک مسلمان کی نظر میں نہایت عظمت و شان کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ معقول کی جماعت بھی بہت بڑی اور اچھی نظر آئی۔ عموماً مدرسین و طلباء اپنے اپنے کام میں مشغول پائے گئے۔ طلبہ کے رہنے، کھانے، پانی اور دوا کا عمدہ انتظام ہے۔ سب سے بڑی بات جو اس مدرسے کو روز افزوں ترقی کی خوشخبری سناتی ہے وہ اس کے مدرسین و منتظمین کا اتفاق و سنت پر عمل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مدرسہ دیوبند آج ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ اگر عالی ہمت مسلمان ایسے مدرسے کی اعانت و خدمت میں تساہل کریں تو خود ان کی بدقسمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے مدرسے کو اسی اسلامی روش پر قائم، اور اس کے طلبہ کو دولت علم و عمل سے کامیاب، اور مدرسین کو اپنی رضا و رحمت سے مسرور رکھے۔ آمین۔

مولانا فتح محمد، مہتمم مدرسہ دارالمبلغین لکھنؤ

"مجھ کو مدرسہ کی کمال شہرت کی بنا پر اس کے دیکھنے کا شوق تھا۔ بحمد اللہ آج ۳ اپریل کو میں مدرسہ میں پہونچ گیا۔ مدرسہ کی عمارت خوشنما اور مضبوط بنائی گئی ہے۔ مدرسہ عمدگی کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ میں نے اپنی ذاتی واقفیت سے جو کچھ مجھ کو تعمیرات کے متعلق حاصل ہے، زیر تعمیر عمارت کو حاوی و معیار سے اچھے پایہ کا پایا۔ مدرسہ خالص اسلامی اور مذہبی ہونے کی حیثیت سے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ۵۰۰ طلباء میں سے ۲۰۰ مدرسہ کے دار الاقامہ میں رہتے ہیں۔ طلباء کے جملہ مصارف کھانا کپڑا وغیرہ ان کی صحت کے لئے یونانی طبیب اور دوا وغیرہ کا انتظام بھی مدرسہ سے کیا جاتا ہے۔ صفائی کا بھی اچھا انتظام ہے۔ کتب خانہ، دفتر اور اس کے رجسٹر اور حساب کاروبار باقاعدہ ہیں۔"

سید محمد ابراہیم
انجینیر، لکھنؤ ۱۳۲۲ھ

"میں نے آج اس مدرسہ کو دیکھا۔ طریقۂ تعلیم درست پایا۔ اساتذہ اپنے فرائض منصبی میں نہایت مستعد، طلباء نہایت جفاکش اور سرگرم تحصیل دیکھے۔ خصوصاً مناظرہ کی تعلیم بھی عمدہ اصول پر ہوتی ہے۔ قرآن مجید فن تجوید کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، جس کے سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ غرض کہ تحصیل و تکمیل علوم کے لئے جس قدر لوازم و ذرائع ہیں بفضلہ تعالیٰ سب مہیا ہیں۔ حق تعالیٰ جملہ اہل اسلام کو توفیق عطا فرمائے کہ اس کی تائید کرکے مستحق اجر عظیم ہوں۔"

مولانا انوار اللہ خاں استاذ نظام دکن

۱۳ رجب ۱۳۲۶ھ

"۴۶ سال کے بعد میں نے اس مدرسے کی زیارت کی جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، پہلی مرتبہ میں نے مدرسے کی اس وقت زیارت کی تھی جب کہ شیخ العالم مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے مدرس اعلیٰ تھے۔

یہ مدرسہ اس وقت غیر معمولی حد تک ترقی کر چکا ہے۔ اس کے وجود کا مسلمانوں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کی عمارتیں بہت کافی بڑھ گئی ہیں۔ مدرسے کے ذمہ داروں نے اس کی شان کے مطابق علماء اور اساتذہ کے جمع کرنے میں بڑی توجہ صرف کی ہے۔ خدا کی ذات سے مجھے امید ہے کہ یہ مدرسہ مزید ترقی حاصل کرے گا۔

میں جمعیۃ الارشاد کے جلسے میں حاضر ہوا جس میں طلباء کی دو جماعتیں جمع ہوئی تھیں۔ اور آپس میں وجود باری کے مسئلہ پر بحث کر رہی تھیں۔ میں اس لطیف بحث کو سن کر بہت محظوظ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس طریقہ پر ممارست کی جائے تو اس سے طلباء اور مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچے گا۔

حضرت مہتمم صاحب کے توجہ دلانے پر میں نے مدرسے کی صفائی کو دیکھا۔ وقت کی تنگی کا بڑا افسوس ہے ورنہ میں اپنے خیالات کو بسط و تفصیل سے بیان کرتا۔"

(مسیح الملک) محمد اجمل خاں

"میں نے پیشتر بھی اس مدرسے کی بابت بہت سنا تھا مگر میں اتنی بڑی اور ایسی سرسبز تعلیم گاہ کے دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجھ کو یہ خیال تھا کہ میری ملاقات ان طلباء سے ہوگی جو یورپین روس وایشیائی روس وغیرہ اقطاع بعیدہ متصلہ خود مختار ممالک سے تحصیل علم کے لئے آئے ہیں۔ یہ امر نہایت قابل اطمینان ہے کہ مسلمان اس

مدرسہ کی پوری امداد کر رہے ہیں جس کی وجہ سے بیرونی امداد کی ضرورت نہیں رہی۔ اس مدرسے کے ہر قسم کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

کمشنر میرٹھ ڈویژن

۱۸ دسمبر ۱۹۰۲ء
۱۳۲۰ھ

"آج میرا گذر دیوبند میں ہوا اور میں نے مشہور مدرسہ دیوبند کو نہایت شوق سے جا کر دیکھا۔ جس امر نے مجھ کو بحر حیرت میں فرو رفتہ کیا وہ یہ ہے کہ چند بوریہ نشین علماء کی مساعی جمیلہ نے عام مسلمانوں کے چندے سے ایک معمولی مکتب کو عظیم الشان عربی کالج کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ اس دارالعلوم نے اپنے تئیں ایشیا کا ویسا ہی مرجع علوم بنا رکھا ہے جیسا کہ مصر سمجھا جاتا تھا (ازہر)۔ ان خیالات نے میرے دماغ میں دنیائے اسلام میں سلف کے مدارس قرطبہ، بغداد، بخارا، سمرقند اور نظامیہ وغیرہ کا نقشہ کھینچ دیا جن کا ذکر میں نے تاریخوں اور سفرناموں میں پڑھا ہے۔ یہ ایسے ہی مدارس کا فیض اور ایسے ہی علماء کی تصانیف کی برکت ہے کہ اسلامی سلطنتیں اور موجودہ حکومتیں جب کہ معرض تنزل میں ہیں مگر اسلام بحیثیت ایک حقانی مذہب کے اپنی خاص وحدانیت کے ساتھ اسی طرح قائم ہے جیسا کہ ابتدا میں تھا اور انشاء اللہ تا قیام قیامت قائم و برقرار رہے گا۔"

اسید حسن

ڈپٹی کلکٹر سہارنپور ۲۳ ستمبر

خوش قسمتی سے مجھ کو مدرسہ دیوبند کے دیکھنے اور اس کے طلبہ کو قرآن مجید پڑھتے ہوئے اور عربی میں تقریریں کرتے ہوئے سننے کا موقع ملا۔ انھوں نے نہایت قابل تعریف پیرایے میں اپنی تقریروں کو انجام تک پہونچایا۔ وہ ہندوستان میں مشرقی تعلیم کا ایک بے نظیر سماں دکھلا دیا۔ ان قلیل التعداد مدارس عربیہ کے

متعلق جو ہندوستان میں موجود ہیں، بالعموم یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ان میں تعلیم پائے ہوئے اشخاص اپنے خیالات کا عربی میں اظہار نہیں کر سکتے لیکن اس مدرسہ کے طلبہ نے اس عام خیال کی پورے طور پر تکذیب کر دی، اور اپنی عربی تقریروں کے ذریعہ سے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ وہ نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ میں اس تعلیم گاہ کے اساتذہ اور منتظمین کو مبارکباد دیتا ہوں۔

حسابات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ تعلیم گاہ انتہائی کفایت شعاری کے اصول پر چلائی جا رہی ہے۔"

سید ظہیر الدین

چیف سکریٹری ریاست بھوپال [illegible]

"مجھ پر میرے قلب پر دیوبند کو دیکھ کر جو اثر ہوا وہ نہایت دل خوش کن تھا۔ میں دیوبند میں وہ اثرات پاتا ہوں جن سے کسی قوم کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔"

(مولانا) شوکت علی

۸؍ جنوری ۱۹۱۹ء

"میں نے جتنے قومی اور سرکاری ادارے دیکھے ہیں قریب قریب مشترک طور پر سب کا حال یہ ہے کہ ان کی شہرت واقعیت سے زیادہ ہے، جس قدر ان کے کارنامے شائع کئے جاتے ہیں وہ اندرونی حالات کے اعتبار سے زائد ہوتے ہیں۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کی واقعی شہرت اس کی اشاعت سے بہت زیادہ ہے۔"

مولانا عبدالباری فرنگی محلی

له ماخوذ از رپورٹ مرتبہ حضرت مولانا [illegible]

میں نے باوقات متعدد و متفرق جماعتوں اور ان کی ٹکڑیوں میں ٹھہر ٹھہر کر ان کے
بحث و مباحثہ کو سنا اور دیکھا دل بہت خوش ہوا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا فیضان
خاص اس درسگاہ پر ہے، دین کی تعلیم فرشتوں کو ہو رہی ہے اس وقت تقریباً
پانچ سو سے زائد طلبہ ہیں، اور اکثر کا قیام مدرسہ میں ہے، اور سب مسجد مدرسہ
میں نماز کے لئے آتے ہیں، زندگی بالکل ساکت وصامت ہے، راتوں کو ۱۲ بجے تک
عام طلبہ امتحان کے بعد بھی بعض علم مطالعہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کوئی شخص
خواہ کسی درجہ کا ہو ان کے سامنے آ نکلے تو ادب سے سلام کرتے ہیں اور باحیا طریقہ
پر جھک کر پیش آتے ہیں یہ اسلامی اور ایمانی سماں دوسرے مقام پر ہندوستان میں تو
مفقود ہے کہیں مقامات مقدسہ میں ہو تو ہو۔

تقسیم خوراک کے وقت میں نے دیکھا کہ ایک منظم طریقہ پر خوراک اور اس کے
لوازم بغیر کسی شور و شر کے تقسیم ہو جاتے ہیں، روٹی اور سالن کو چکھ کر دیکھا اچھا
تھا اور مزے دار تھا، تعمیر کو بھی دیکھا نہایت عمدہ سلیقہ پر کرائی گئی ہے، صفائی ستھری
بے لوث سرکاری اداروں میں جو خرچ اور روپیہ صرف ہوتا ہے اس سے کسی طرح کم نہیں
ہے، بہرحال میری توقع اور امید سے بہت ہی زیادہ مجھے یہ درسگاہ نظر آئی اساتذہ
خاص خاص فن میں یکتا ہیں، میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خداوند عالم کارکنان
مدرسہ کی عمر اور ایمان میں برکت دے افسوس ہے کہ جو میں نے دیکھا اس کے
اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں "

جناب لطیف یار جنگ بہادر حیدرآباد دکن
۶، ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ

"میں آج بہمراہی قاضی مسعود حسن صاحب دیوبند آیا۔ ہم لوگوں کو مدرسے کے حسابات دکھلائے گئے اور ہم نے تفصیل سے اس کی جانچ کی کہ ہم یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ حسابات رکھنے میں بہت محنت سے کام لیا گیا اور بہت مفصل حساب کی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ ہماری رائے میں حسابات میں مشکل سے اس سے زیادہ ترقی ہو سکتی ہے۔ ہم یہ دیکھ کر بھی بہت مسرور ہوئے کہ نئی عمارات کے بنانے میں ترقی کی جا رہی ہے۔ کتب خانہ بہت اچھی حالت میں پایا گیا، اور اس میں بیش قیمت قلمی نسخے موجود ہیں۔"

(نواب) محمد اسمٰعیل خاں، قاضی مسعود حسن گنگوہی

ایڈووکیٹ میرٹھ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء

"دارالعلوم کے جملہ شعبوں کو بغور دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنے سفر و سیاحت میں کسی جگہ ایسی عظیم الشان مذہبی درسگاہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک مرکزی دینی درسگاہ کہلانے کی مستحق ہو نہیں دیکھی، اور یہ موجودہ تاریخ کی ظاہر اور ثبوت بہم پہنچا سکتی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز اور نیز معقول کارنامہ جو اس درسگاہ میں میری آنکھوں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے جملہ اکابر مدرسین نے جن میں ہر ایک اپنی نوعیت اور اپنے اپنے فن میں اعلیٰ و ارفع شان کے مالک ہیں نہایت ہی معمولی معمولی تنخواہوں پر اپنی عزیز زندگی کو اسلامی خدمات کے لئے وقف کر رکھا ہے، اور نہایت خوش دلی، جوش اور امنگ کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہیں، حالانکہ ہندوستان کی دوسری درسگاہوں کے تناسب سے ان کی تنخواہیں چوتھائی بھی نہیں ہیں۔ اس سے ان حضرات کی بزرگی، تقدس، ایثار اور للہیت کا پتہ چلتا ہے۔"

سلیمان یوسف ملان ڈربن جنوبی افریقہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

"دارالعلوم کے معائنہ کا شرف حاصل ہوا، حسابات تفصیل سے دیکھے مجھے تعجب ہے کہ اس قدر کم عملہ اس صفائی کے ساتھ حسابات کو رکھنے پر کس طرح قادر ہے، دیگر دفاتر کے عملہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے عملہ اس قدر کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے، حسابات صاف اور خوشنما ہیں، باوجود کوشش کے مجھے کوئی رقم یا عبارت کٹی ہوئی یا مشکوک نہیں ملی، ہر رقم کے لئے دفتر کی رپورٹ اور مہتمم کی منظوری ہوتی ہے، حسابات کو اس عمدگی کی حالت میں دیکھنے کا مجھے کوئی گمان بھی نہ تھا ہر شعبہ میں جداگانہ مسلیں مرتب رکھی جاتی ہیں، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے دفتر کا بڑے سے بڑا عملہ حسابات کو جتنا شاندار اور صحیح رکھ سکتا ہے اسی قدر میں یہاں دیکھ رہا ہوں، مجھے اس سے بہتر حسابات دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، یہ حیرت ہے کہ اس قدر کام اتنے کم اصحاب کس طرح انجام دیتے ہیں۔

طلبہ کی تعداد بہ تفصیل ذیل ۵۰۰ ہے:

بیرون ہند	مدینہ طیبہ	بہار و آسام	بنگال	بہار	صوبہ متحدہ	پنجاب	سرحد
۴۴	۲	۵۰	۲۱۴	۴۳	۲۲۶	۱۰۲	۱۱

ریاست ہائے ہند	بمبئی	مدراس
۲۰	۵	۳

کتب خانہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ آراستہ ہے، ہر فن کی چیدہ چیدہ اور مستند کتابیں ہیں، چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں، باقاعدگی اور صفائی قابل تعریف ہے۔"

ضیاء الاسلام

مجسٹریٹ درجہ اول کاندھلہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۹ء

قابل تعریف صفائی دیکھ کر مجھے بہت ہی مسرت ہوئی۔ مکھیاں باوجودیکہ ایک بڑی
جمعیت ہیں مطبخ میں بالکل مفقود ہیں۔ مختلف اوقات میں میں نے طلبہ کا کھانا چکھا ہے۔
کھانا برا نہیں ہوتا، اس میں صفائی کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور کافی مقدار میں ملتا ہے کہ
ایک آدمی سیر ہو کر کھا سکتا ہے۔

کتب خانہ اس تعلیم گاہ کی جان ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس کی
طرف کافی توجہ کی جاتی ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں کے مقابلہ میں اس
کتب خانہ کی کچھ حقیقت نہیں، لیکن یہاں کے معلمین و متعلمین کی ضروریات کے واسطے
کافی ہے۔ تاہم مختلف علوم کی کتابوں کے اضافہ کی بہت ضرورت ہے۔ کتابیں
الماریوں میں صفائی اور ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور علوم پر منقسم ہیں۔

میں نے حسابات کے دیکھنے اور جانچ کرنے میں کامل وقت صرف کیا۔ حسابات
اس طریقہ سے رکھے جاتے ہیں جو آج کل مروج ہے۔ میں نے ادھر ادھر سے مسلیں نکلوا کر
دیکھیں۔ حساب کا رجسٹر رسیدوں سے مقابلہ کیا۔ تمام مسلوں میں رسیدات شامل تھیں،
اور سب میں مختلف اہلکاروں کے نوٹ اور مہتمم صاحب کے آخری احکام تھے۔
روزنامچہ اور کھاتہ باقاعدہ رکھا جاتا ہے اور مہتمم صاحب کے سامنے برابر
پیش کیا جاتا ہے۔

طلبہ سادہ اور تقشف کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ عموماً نہایت خلیق اور نہایت
شائستہ ہیں۔ مجھ پر اس تعلیم گاہ کی موجودہ صفائی اور طلبہ کی عمدہ تربیت کو دیکھ کر بڑا
اثر ہوا۔ مجھے اس تعلیم گاہ کے عملہ سے ملنے کا اکثر موقع ملتا ہے اور میں کسی بھی مختلف
مضمون پر ان سے گفتگو بھی کرتا ہوں۔ ان میں غیر معمولی قوت مناظرہ ہوتی ہے، اور
ہندوستان کی دیگر تعلیم گاہوں کے معمولی گریجویٹوں کی قوت مناظرہ سے کہیں زیادہ
ہوتی ہے۔

لیکن اس تاریخی تعلیم گاہ کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے میں اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کروں گا اگر میں یہ ظاہر نہ کروں کہ اس درسگاہ کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی سخت ضرورت ہے۔ آج کل علماء کو عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کا اس قدر مقابلہ نہیں کرنا پڑتا جتنا ملحدین کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے وقت آگیا ہے کہ موجودہ زمانہ کے علماء کو فلسفۂ جدید اور سائنس سے آشنا کرایا جائے میں نے یہ خیال دارالعلوم کے کارکنوں کے سامنے پیش کیا وہ خود اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں مگر دارالعلوم کی مالیات کسی جدید انتظام کے راستے میں حائل ہے اگر کوئی صاحب اس تعلیم گاہ کو اس بارہ میں امداد پہنچائیں تو وہ اسلام کی بڑی خدمت کریں گے۔"

محمد یوسف الزماں فاروقی

منصف دیوبند ۷ جون ۱۹۳۳ء

جس قدر خوشی مجھے یہاں کے حضرات اساتذہ اور طالب علموں کو دیکھ کر ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی بات جو میں نے دیکھی وہ یہاں کے لوگوں کی سادگی اور اسلامی صورت ہے۔ یہاں کا ایک ایک فرد سادگی میں رنگا ہوا ہے یہاں کے لوگوں میں جو اسلامی روح دیکھی اس کی مثال کم از کم ہندوستان میں تو ملنی مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ اس عالی شان درسگاہ اور یہاں کے لوگوں کی تعریف میری طاقت سے باہر ہے۔

فضل الٰہی

سابق میئر کلکتہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء

۱۹۵۸ء میں جامعۃ الازہر مصر کی جانب سے ایک وفد جو وہاں کے مختلف علماء پر مشتمل تھا، ہندوستان آیا تھا۔ اکابر دارالعلوم کی خواہش پر ارکان وفد دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر ذیل کے تاثرات کا اظہار کیا۔

الحمد لله حق حمده و صلى الله على سيدنا محمد رسوله ونبيه وعلى آله وصحبه وحزبه وجنده وبعد فقد سعدنا بزيارة جامعة دار العلوم الديوبندية وكنا على دروسها في مختلف الطبقات واجتمعنا بمديرها فضيلة الاستاذ الشيخ محمد طيب وحضرات اساتذتها الاكرمين فشهدنا ما ملأ قلوبنا سروراً ولمسنا النشاط والجد فيهم سروراً بما لمسنا حتى رفعتهم حيويتهم لخدمة علوم الدين من تفسير القرآن والحديث والفقه والاصول والادب وما الى ذلك من وسائل العلوم الشرعية كعلوم اللغة العربية والمنطق والفلسفة وما اليها، ومما نرجو ان يعود به النفع للامة الاسلامية ولقد سرنا كثيراً ما بعض رجال هذه الجامعة المباركة فشهدنا منهم في خدمة العلم ما يطمئن بهم بعلو في الدين وسمو الاخلاق ورأينا اقبال الطلاب على الدروس وادابهم العالية والمحافظة على السنة فنشكر الله وله الحمد بما وهبهم من نعم الاخوة الصادقة والمحبة فنسأل الله لنا ولهم توفيقاً وقبولاً وان يجعل عملنا خالصاً لوجه الله الكريم والله المستعان وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم ٣ ذي القعدة ١٣٧٧ھ

رئيس الوفد : عبد الوهاب النجار مدرس التاريخ الإسلامي بكلية
أصول الدين وعضو البعثة، محمد أحمد العدوي عضو البعثة
ومدرس التفسير بكلية أصول الدين بالأزهر، محمد إبراهيم
العدوي عضو البعثة الأزهرية علي مسعود (ترجمہ)

دارالعلوم دیوبند کی زیارت سے ہم نے سعادت حاصل کی اور مختلف جماعتوں
کے اسباق کا معائنہ کیا اور حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی نیز اساتذہ کرام
کے ساتھ مجالست نصیب ہوئی ہم نے یہاں ان چیزوں کو دیکھا جنہوں نے ہمارے قلب
کو مسرت سے بھر دیا ہم نے ان حضرات کے چہروں پر علمی نور دیکھا۔ ہم نے یہاں وہ جماعت
دیکھی جس نے تفسیر حدیث فقہ اصول فقہ وغیرہ علوم دینیہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگیوں
کو وقف کر دیا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وسائل علوم یعنی لغت عربیہ منطق فلسفہ ہیئت
کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ ہم کو یقین ہے کہ تمام امت اسلامیہ کو اس سے فائدہ پہونچے گا
اس مبارک جامعہ کے اساتذہ کے ساتھ ہماری گفتگو ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ علمی خدمات
میں ان کو کامل دسترس اور زبردست مہارت ہے اور ہم نے طلبہ کی توجہ اپنے اسباق
اور اپنے دینی اور اخلاقی آداب پر اس قدر دیکھی کہ ہماری زبانوں نے خدا کا شکر کیا اور دعا کی
کہ ان جیسے علماء ہی اور ان جیسے طلبہ ہمارے وطن کے لئے زیادہ ہوتے رہیں ہم اپنے اور
ان کے لئے توفیق اور قبول کی دعا کرتے ہیں کہ ہمارے اعمال میں اخلاص ہو۔

عبد الوہاب النجار محمد احمد العدوی، محمد ابراہیم رئیس الوفد

بعض جماعتوں کی تعلیم کا معائنہ کیا، ماشاء اللہ دارالعلوم کو ترقی
کی حالت میں دیکھ کر مجھے نہایت مسرت ہوئی۔ اللہ کے فضل وکرم سے دارالعلوم نے ہر شعبہ
میں ترقی کی ہے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے الحمد للہ علی ذلک۔ شعبۂ تجوید کی ابتدائی
کی جماعتوں کو خاص طور پر دیکھا۔ ابتدائی جماعتوں کی تعلیم بھی مثل اعلیٰ جماعتوں کے نہایت عمدہ

حسابی شعبہ نہایت باقاعدگی سے کام کر رہا ہے۔

میں نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سے اس مسئلہ پر گفتگو کی کہ اس درسگاہ میں بعض جدید علوم اور مغربی زبانوں کی تعلیم کے انتظام کی کس قدر ضرورت ہے مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ اس سے قبل اس طرف توجہ کی گئی ہے کہ بعض انگریزی کے فارغ التحصیل طلبہ کو علوم دینیہ کی تعلیم دی گئی اور بعض یہاں کے فارغ طلبہ کو انگریزی کے لئے آمادہ کیا گیا۔ میری رائے میں کم از کم اس کی شدید ضرورت ہے کہ انگریزی زبان جو کرۂ ارض کے اکثر حصہ پر بولی جاتی ہے اور جس میں علوم جدیدہ کا ذخیرہ موجود ہے بطور زبان کے ہر طالب علم کو پڑھائی جائے تاکہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے وہ باخبر ہو کر اسلام کی زیادہ خدمت انجام دے سکیں۔

مدرسہ میں ایک شعبہ ترقی و تنظیم بھی ہے جو ایک طرف مدرسہ کی ترقی کے اسباب و وسائل پر غور کرتا رہتا ہے تو دوسری طرف مدرسہ کے طلبہ قدیم اور بہی خواہوں کی تنظیم کرتا ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے آج اس کے بہی خواہوں کی فہرست میں نام درج کرانے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مدرسہ میں طلبہ کی ورزش کے لئے ایک میدان تو ہے لیکن طلبہ پر ورزش لازمی نہیں ہے۔ میری گزارش پر حضرت مولانا عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ غور اس کے پیش نظر ہے اور یہ ہے کہ طلبہ پر ورزش کو لازمی قرار دیا جائے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی طرف سے سو روپے کا ایک حقیر ہدیہ پیش کروں گا۔ میری تمنا ہے کہ اس دارالعلوم کے طلبہ روحانی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے دوسروں کے لئے نمونہ بنیں۔

بہادر یار جنگ حیدرآباد دکن ۱۲ رمضان المبارک

• جیسا کہ میں نے سنا تھا درست پایا، یہاں براہ راست ہی ملک سے طلبہ تعلیم کیلئے آتے ہیں جن کے لئے تعلیم اور رہائش کا دارالعلوم کی طرف سے ہر ممکن طریقہ سے انتظام کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر دینی تعلیم کا یہ مرکز نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی دنیا کے لئے ایک واحد مرکز ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی

شیخ لطیف، ایڈوائزر حکومت پنجاب

۲۰ شوال ۱۳۸۵ھ

• دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تعلیمات اسلام کا مرکز ہے، کتب خانہ کا انتظام نہایت بہتر ہے۔ تعمیری سلسلہ کی روز افزوں ترقی اس امر کی شاہد ہے کہ دارالعلوم کو مسلمانوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے، اس ادارہ کے عمدہ نظم و ضبط کے کافی شواہد موجود ہیں۔

(ڈاکٹر) شجاعت احمد خاں

• ایک مدت کے بعد دارالعلوم آنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ عمارتوں کو دیکھا، اساتذہ سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا۔ الحمدللہ رنگ قدیم قائم ہے اور ہر پہلو پر ترقی ہے۔ عمارتوں میں کثیر اضافہ ہوا ہے۔ دار التفسیر نے گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھ دیا ہے۔ عمارتوں میں پرانی خصوصیتیں مفقود نہیں ہوئیں اور وسعت قائم ہے۔ مقصود پرانی عمارتیں وسیع ہو رہی ہیں۔ بہت سی جدید بنی ہیں۔ طلبہ کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا ہے۔ ان کی تعداد اب ڈیڑھ ہزار ہے۔ مہتمم و اساتذہ اپنے فرائض میں

مستعد ہیں۔ کاش اہل حیدرآباد بھی مستعدی میں حصہ لیں :

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ

الحمد للہ کہ آج مجھے اس شاندار اسلامی درسگاہ کے دیکھنے کا جو آپ اپنی نظیر ہے موقع نصیب ہوا۔ میں جوں جوں شعبہ جات کو دیکھتا تھا میرے دل میں اس درسگاہ کی قدر بڑھتی جاتی تھی، چونکہ میں نے صرف نام ہی سنا تھا دیکھا نہ تھا۔ آج بچشم خود اس کے انتظام کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ رب العالمین کس طرح اس مدرسہ کے ذریعہ نوازش فرما رہا ہے۔ مدرسہ کی وسعت، دارالاقامہ کے وسیع و عریض کمرے اور میدان کسی طرح کالج کے بورڈنگ سے جن میں انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے اور جو موڈرن لائن یعنی آج کل کے موجودہ طریقہ پر چلائے جاتے ہیں کم نہیں ہے۔ مجھے اس مدرسہ کی تعلیمی جدت کے ہمراہ سادگی کا پہلو بہ پہلو رہنا بہت ہی قابل ستائش نظر آیا۔

میں نے کتب خانہ کا انتظام بھی دیکھا۔ کتابیں رکھنے کا طریقہ اس قدر اچھا ہے کہ شاید پنجاب کی لائبریریوں میں بھی موجود نہ ہو۔

اساتذہ کا خلق اور ان کا طرز تعلیم لائق تحسین ہے اور دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

لیکن مجھے افسوس ہے کہ مسلمانان ہند اس بے مثال تعلیمی ادارہ کی جانب کچھ کم ملتفت نظر آتے ہیں اور اس کثیر خرچ کا جو اس ادارہ کے متعلق ہے ادارہ کے چندہ دہندے احساس نہیں کرتے۔ اس مدرسہ کے متعلق بہت سے لوگوں کے دلوں میں جو کچھ شکوک ہیں وہ غالباً اس سبب سے ہیں کہ انہوں نے اس مدرسہ کو بچشم خود نہیں دیکھا۔ ہر ایک شک کا ازالہ صرف ایک معائنہ سے ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں جو حضرات اس ادارہ کو دیکھیں گے ان کا

ہے۔ میں نے سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ دیکھنے والے کے لئے اُن کے درمیان کا فرق معلوم کرنا دشوار ہے۔ یہ سب اس ادارہ پر ست فقہ میں خوش و خرم نظر آتے ہیں۔"

بشیر احمد کرجی ایم اے

ڈویژنل اکونٹینٹ محکمہ زراعت یو پی ۱۹۴۹-۳-۱۲

"مجھے آج دارالعلوم کے معائنہ کا اتفاق ہوا۔ حسابات باقاعدہ رکھے گئے ہیں اور ہر ایک چیز کی تفصیل موجود ہے۔ محافظ خانہ میں سال وار ریکارڈ سلسلہ وار رکھا ہوا ہے۔ جس سے کسی چیز کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ جس طرح سرکاری دفاتر میں ریکارڈ کو ترتیب دیا جاتا ہے وہی طریقہ یہاں بھی ہے۔ بلحاظ صفائی ہر ایک چیز اپنی جگہ پر سلیقہ سے رکھی جاتی ہے۔ منتظمین مدرسہ نے اپنے حسن انتظام سے ہر ایک شعبہ میں ایسی خوبی پیدا کر دی ہے اور کام کی تقسیم اس طرح سے کی ہے کہ ہر ایک شخص اپنے فرائض منصبی کو باحسن وجوہ انجام دے رہا ہے۔"

محمد محسن، انکم ٹیکس انسپکٹر دہلی

۲۰۔۷۔۱۹۴۹

"یہ میرے لئے ایک اعزاز ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مجھے دارالعلوم کی سیر کرائی جس کے لئے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ادارہ خالص مذہبی ادارہ ہے، جس کو مشرق کا ازہر کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان و بیرونِ ہند کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ

میں نے دارالعلوم کی سیر کی۔ مدرسین روزانہ مصروفِ کار تھے۔ طلبہ جن کی تعداد ۱۳۳۰ ہے اور جن میں سے ۸۰ بیرونی ممالک کے رہنے والے ہیں۔ بچے اپنے درجوں میں لیکچر سننے میں محو تھے۔ اس میں ۳۴ پروفیسر ہیں

حساب و کتاب کا طریقہ بہترین ہے۔ گذشتہ سال آمدنی ۲۰۴۳۲۸ روپے تھی اور خرچ ۱۸۰۹۵۵۰۵ روپیہ ۱۰ آنہ ۱۰ پائی تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ امسال رواں کی آمدنی کا تخمینہ ۱۰،۰۰۰ سو روپے ہے۔

تاریخ داں اصحاب کے لئے دارالعلوم کا وسیع کتب خانہ مطالعہ اور حوالہ جات کے لئے نہایت بیش قیمت ہے۔ اس میں ۴۰۰،۲۰۰ کتابیں ہیں جن میں مغل شہنشاہوں کے عہد حکمرانی سے قبل کے بیش قیمت جواہر پارے ہیں۔"

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سہارنپور

۹ فروری [illegible]

"یہ یونیورسٹی اسلامی دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں مذہبی حیثیت سے بڑی مانی جاتی ہے۔ اس میں نو سو طالب علم دنیا کے الگ الگ حصوں سے آکر تعلیم پا رہے ہیں اور لگ بھگ پڑھنے والے ۱۲۰۰ سے اوپر ہیں۔ اس کی عمارت بڑی شاندار اور مضبوط ہے۔ حالانکہ آج ۹۰ سال سے کم ہی ہوئی ہے۔ مدرسے کی لائبریری میں ۵۵ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ زیادہ پڑھنے والوں کو کھانا اور کتابیں مفت دی جاتی ہیں۔

مجھے ایک عرصے سے یونیورسٹی دیکھنے کی تمنا تھی۔ اس سال موقع ہاتھ آیا۔ اس کی سب چیزیں دیکھ کر میں حیران و دنگ رہ گئی۔ عجیب کی بات ہے کہ ایسی جگہ جو کیمیا کے جیسی ہے شروع ہی شروع میں پہنچ تا ثیر سے عظیم جوہر پیدا کئے

پارس کی پتھر کی خاصیت رکھتی ہے کہ جو کوئی چیز اس سے چھوتی ہے وہ سونا بنجاتی ہے

ایک زمانے میں دارالعلوم دیوبند سے نہ صرف ہندوستان کی سیاست کی تحریک میں زبردست حصہ لیا تھا بلکہ دنیا کی سیاست کی تحریک میں بھی پایا نگ جمایا تھا، جیسا کہ افغانستان، روس، چین، ترکستان وغیرہ میں"

مسز کلثوم سایانی

ایڈیٹر رہبر بمبئی یکم اپریل ۱۹۴۵ء

"دارالعلوم افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک مذہبی علمی اور اسلامی درسگاہ ہے مگر میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک درسگاہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے۔

دارالعلوم نے اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان سے اسلامی حکومت رخصت ہو چکی تھی مذہبی اور دینی علوم کی حفاظت کی مجھے یقین ہے کہ دارالعلوم آئندہ بھی اسی طرح علوم و فنون کی خدمت میں مشغول رہے گا۔

افغانستان کے عوام علما اور علم دوست لوگ اس کے قدردان ہی نہیں بلکہ اس کے بہی خواہ اور مددگار بھی ہیں۔

دارالعلوم ثقافت اسلامی کا ایک ممتاز ترین ادارہ ہے اور آپ اپنی نظیر ہے ثقافت اسلامی کی بنیاد سچائی، محبت، مساوات، اخوت اور حقیقت شناسی پر

ماخوذ صباح بمبئی یکم اپریل ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۰

اور مولانا مبارک علی صاحب کا کہ ان حضرات نے روحانی تعلیم میں بڑی عنایت و عزت
افزائی فرمائی ۔

ایم اے ایس ڈپٹی ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو

۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء مطابق ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ

یہ امر واقعہ ہے کہ یہیں سے دار العلوم اسلامیہ کا ایک قطعہ پایہ ایمان اور یقین نبوی
کی ایک چنگاری پیدا ہوئی اور یہاں تربیت سے معلوم ہو گیا کہ دین، دنیا اور آخرت دونوں کیسے
کس قدر صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ آج سلف صالح کی وہ تعلیمات جنکی بڑے بڑے
بزرگوں نے حفاظت کی اور جن سے عزم و عمل اکتساب کرتے ہیں ۔
یہ بڑی قیمتی میراث ہے جس کے ساتھ تمسک کرنا ہمارے لئے ضروری ہے اور یہ بھی
ضروری ہے کہ ہم مستقبل کی تعمیر کے لئے عماد اور ستون بنائیں اور یقیناً ہندوستان
کی آزادی میں بڑے بڑے بزرگوں کی کوشش اور آزادی وطن کے راستے میں استاذی
شیخ مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں ان بزرگوں کے چہرے کی روشنی ہندوستان
میں مسلمانوں کو اور اسلام کو ایسی دینی اور دنیاوی عظیم قوت پیدا کر دے گی جس
سے آزادی اور ایمان کے بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے جا سکیں ۔

محمد سعادت محمود ناظم نشریات عربی

دہلی ریڈیو

یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے حقیقی اسلام کی عظمت اور قدرت کا احساس
کیا ۔ یہیں دور جدید کا ایک اسلامی مکتب جاری ہے جہاں ذی ہیں اور ہر ایک آگے بڑھنے اور
دوسرے کی جگہ لینے کی کوشش کرتا ہے آخر کار ایک دن آئے گا کہ اسلام کے

دارالعلوم کے کتب خانے پر فوقیت نہیں رکھتیں مسائل کے متعلقات دیکھ کر تعجب ہوتا
ہے کہ یہ مفکر کسی مستقل بانی شدہ بنیاد کی نگرانی میں ہے۔ ایک بہت ہی وسیع مسجد
پانچوں وقت کی نمازوں سے زیادہ کم از کم پانچ سو طلبہ جس میں شرکت کرتے ہیں ایک
ایسا منظر پیش کر رہی ہے کہ جس کی مثال ہندوستان بھر میں ملنا مشکل ہے۔ یہ سب
کچھ حقیقت میں ان سعادت مند بزرگان دین کے طفیل میں ہیں جو بیدار رہے ہیں جن کی انتھک
کوششوں اور جد و جہد سے دارالعلوم قائم ہوا۔ اور آج بھی ان کا فیض جاری ہے۔ انشاءاللہ
ایسے مقدس علوم کے ذریعے۔ تمام مدارس ہی جو اسی درسگاہوں کے فارغ التحصیل
ہیں۔ اور ان میں سے اکثر و بیشتر سلف صالحین کا نمونہ ہیں۔ اور ان کی یادگار ہیں۔ اور
قابل مبارکباد ہیں یہ حضرت محمد طیب قابل معاونت ہیں جو کہ کتنا کر کے اس درسگاہ کا انتظام
کام انجام دے رہے ہیں نیز وہ لوگ بھی قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے لاکھوں روپیہ صرف
کر کے تعمیرات بنوائی ہیں۔ اور تقریباً تین لاکھ سالانہ کا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے
کہ جس طرح ان سلف صالحین کے ذریعہ ہر طالب علم اس درسگاہ سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان کے
کے صاحبزادگان بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ خداتعالیٰ کارکنان کی چشم بصیرت میں
فراوانی عطا فرمائے

آخر میں مہتمم صاحب اور ان کے رفقائے کار کا مشکور ہوں کہ جن کے باعث مجھے دوران
قیام میں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوئی اور میری معلومات متعلق مدرسہ میں
اضافہ ہوا۔

حاجی شیخ محمد مسعود اللہ ... لکھنؤ

۲۳ نومبر ۱۹۵۵ء

اپنی گزشتہ حاضری کے طویل وقفہ کے بعد دارالعلوم میں دوبارہ حاضر ہوا اور اس مدت میں دارالعلوم نے جو ترقی کی ہے اس کو دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی۔ ہندوستان کے اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ادارے میں نہ صرف ہندوستان کے حصوں سے طلبہ کھنچے چلے آتے ہیں بلکہ ملایا، جنوبی افریقہ، افغانستان، وسط ایشیا اور چین جیسے دور دراز ممالک سے بھی یہاں طلبہ آتے ہیں۔ اس قدر وسیع رقبے میں دارالعلوم کی ہردلعزیزی اس کی عظمت کا ثبوت ہے یہ ادارہ صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔

میں نے گزشتہ مرتبہ ۱۹۴۸ء میں اس ادارے کا معائنہ کیا تھا۔ درمیانی مدت سختیوں اور تکالیف کا زمانہ تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان تمام سالوں میں دارالعلوم نے ترقی کی ہے۔ جدید عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور تعلیمی سہولتوں میں بہت زیادہ توسیع عمل میں آئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ادارے کو چلانے والی عملہ کی لائق جماعت اس کے معیار کو بڑھانے اور سہولتوں کے اضافے میں مزید ترقی کرے گی۔

مجھے یہ معلوم ہو کر بھی خوشی ہوئی کہ گورنمنٹ ہمارے ادارے کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی یہ عمل جاری رہے گا اور مقامی حکام ادارے کی ضروریات اور مفاد کا خیال رکھیں گے۔

ابوالکلام آزاد   وزیر تعلیم حکومت ہند

۸ جنوری ۱۹۵۲ء

"آج مجھے دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کا موقع حاصل ہوا۔ میں نے مدرسے کے ہر شعبے کا معائنہ کیا جس سے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ امر ہے کہ یہ علم کا لازوال سرچشمہ ہے۔ غالباً یہ ادارہ ہمارے ملک میں لاثانی ہے۔ اس کی ترقی کا معیار بلحاظ مشرقی اسٹینڈرڈ (تحقیق مذہب) ہے جس کے تحت اس کا اسٹاف کام کرتا ہے۔ غالباً پورے ہندوستان میں طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کو تعلیم، رہائش، پوشش، خوراک اور کتب کا بالکل مفت انتظام اور کہیں نہیں ہے، ان سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی ہے۔ دوسری دلچسپ خصوصیت اس ادارے کی یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی جائداد نہیں ہے جو مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو۔ دارالعلوم صرف عوام کے چندے اور عطیات سے چلایا جاتا ہے، جو ہر سال وصول کیا جاتا ہے۔ سالانہ خرچ تقریباً [illegible] روپیہ ہے۔ اس سے اُن عالی ترین عقیدت کا ثبوت ہے، جو اُن تمام معاونین کو دارالعلوم کے ساتھ ہے جو سال بسال اسے امداد دیتے ہیں۔ اس ادارہ نے جس اعلیٰ معیار کو قائم کیا ہے اس کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ہر سال چندہ وصول کرنے کے موقع پر لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ اس ادارے میں ایشیا اور افریقہ کے طلبا کی بہت بڑی تعداد کھنچ کر آرہی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ شاید اس سال اُن طلبہ کو سند دینے کے لیے جو گزشتہ برسوں میں یہاں سے فارغ ہو چکے ہیں ایک جلسہ کیا جانے والا ہے، ایسا ہی ایک جلسہ اب سے ۳۰ سال قبل ہو چکا ہے۔ میں اس موقع کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ میں دارالعلوم کے اسٹاف کا، در خصوص پرنسپل صاحب اور سکریٹری صاحب کا ممنون ہوں۔"

ایل۔ ایس بشٹ۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس سہارنپور ۵-۳-۱۹۵۲ء

"میں اس عظیم ادارے کی شہرت سنا کرتا تھا، اور اب مجھے اس کو خود دیکھنے کا موقع ملا۔ میں علماء دار العلوم کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں اور ہر طرح مہمان نوازی کی۔ لائبریری دیکھی، اس کی بیش قیمت قلمی کتابوں کے ذخیرے سے مجھے خاص طور پر مسرت ہوئی۔ میں نے یہاں جو خلوص دیکھا اور اپنی ممنونیت کے اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا۔ بے شک اس عمدہ کام پر جو یہاں کا عملہ اور مدرسین انجام دے رہے ہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مستقبل میں انہیں ہر طرح کی کامیابی نصیب ہو۔

میں نے ابھی ایک ایسا رسالہ دیکھا جو ترکی کے مکرم مترجم نے بطور تحفہ اس چندے کے صلے میں بھیجا تھا جو دیوبند نے جنگ بلقان کے وقت ترکی کی امداد کے لئے بھیجا تھا یہ رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جبہ مبارک پر چھپا ہوا تھا جو ترکی میں "خرقۂ سعادت" کے خزانہ میں محفوظ ہے، میں نے ان کتابوں کو بھی دیکھا جو سلطان عبد الحمید خاں کے دور میں عبد الحق حامد کی معرفت جو ترکی کے مشہور شاعر اور بمبئی میں ترکی کے قونصل تھے دیوبند بھیجی گئی تھیں۔"

نیاز برکلینر، ترکی

۸ مارچ ۱۹۵۹ء

"یہ دار العلوم دنیائے اسلام میں ایک بے مثال جامعہ ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں ایسی عظیم درسگاہ ہوگی اور اسلامی اخلاق کی ایسی اعلیٰ تربیت گاہ موجود ہوگی۔"

شیخ سعد شیخ علی شیخ حسین حجازی

"اس اسلامی ادارے کو دیکھ کر میرے دل میں جو گہرا اور وسیع اثر ہوا ہے میں اسے احساسات ہندوستانی
تا ترجمیں ظاہر کر دوں گا۔"

سی۔ بیل، ماسٹر اسسٹنٹ رپورٹر

روزنامہ ہندوستان ٹائمز دہلی ۶ جنوری ۱۹۵۵ء

"میں نے اس ادارے کا معائنہ کیا اور دیکھ کر بہت خوشی ہوئی جو تعلیم باقاعدہ
درس گاہوں میں دی جاتی ہے، اور طلبہ اور رہنے والوں کے لئے جو دنیا کے ہر حصے سے
آتے ہیں مناسب انتظام کیا گیا ہے۔

دارالعلوم ان لوگوں کے لئے تعلیم کا مفت انتظام کرتا ہے جو اپنے اخراجات خود
نہیں برداشت کر سکتے ایسے لوگوں کو کھانا، کپڑا، کتابیں اور دوسری ضروری چیزیں
مفت دیا جاتا ہے، طلبہ اپنے فرائض میں تندہی سے مصروف ہیں جن کا معاوضہ انھیں
بہت قلیل ملتا ہے، اسی وجہ سے یہ ادارہ باآسانی چل رہا ہے جیسا کہ علم ہوا یہ تنہا ادارہ
ہے جو اسلام کی مکمل تعلیم دیتا ہے۔ اور ایسے علماء تیار کرتا ہے جو بعد میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کا صحیح نمونہ ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مدرسے، یہاں کے تمام علماء، پروفیسروں، طلباء
اور ہمی خواہوں پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ خدا کرے یہ مدرسہ قیامت تک اسی جوش
کے ساتھ جاری رہے۔"

سالومن ایم کورنش شہر ڈربن، جنوبی افریقہ

۸ ستمبر ۱۹۵۵ء

میں ہندوستان میں یہ توقع اور مقصد لے کر آیا کہ یہاں مجھے اسلام کے سلسلے میں تحقیقی مواد فراہم ہوسکے گا۔ چنانچہ یہاں آنے کے بعد میں نے دارالعلوم دیوبند آنے کا ارادہ کیا کہ یہاں سے اپنا مقصد حاصل کرسکوں۔ یہاں آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ میری توقعات پوری ہوئیں بلکہ یہاں کے بہترین اخلاق اور خلوص اور مہمان داری نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہاں کے فاضل علماء نے میری رہنمائی کی جن میں بالخصوص حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے میرے مقصد کے سلسلے میں میری بہترین رہنمائی فرمائی۔

میں نہ صرف اپنے یہاں کے اچھوتی تجربات اور ایام کے دوران کی بہترین یادیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ بلکہ انشاء اللہ اس بات کی کوشش کروں گا کہ مجھے ایک بار پھر یہاں آنے کی اجازت دی جائے۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری یہاں کی آمد کو کامیاب بنایا۔

ڈاکٹر اے۔ پی۔ ہارڈی لیکچرار تاریخ اسلام

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز

یونیورسٹی آف لندن، انگلینڈ ۱۴ دسمبر ۱۹۶۰ء

دارالعلوم دیوبند کو جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور سنا تھا دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوئی مجھے اس کے بارے میں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر بڑا ہوگا جتنا میں نے اسے پایا۔ میں یہاں کی تواضع، مدارات، اور خوش اخلاقی سے بیحد متاثر ہوا اور سب حضرات کا بیحد ممنون ہوں۔

خاص طور پر اسلامی قانون کے نکات پر مختلف علماء سے گفتگو کرنے کا جو موقع ملا اس سے

بہت خوش ہوا ۔

جے۔ ڈی۔ کا، ایڈورس، ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ایڈمنسٹریشن

لیگل اسٹڈیز اینڈ ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف لا

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز یونیورسٹی آف لندن انگلینڈ

مجھے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آج جبکہ دنیا بھر کی یونیورسٹیاں کروڑوں روپے
خرچ کرتی ہیں، یہ دار العلوم بہت ہی کم خرچ سے اس قدر بڑی اور کار آمد خدمات انجام
دے رہا ہے، یہ واقعہ ہے کہ اگر اس کے بانیوں اور کارکنوں میں خدا ترسی اور خدمت خلق
کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ اس پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتے، مگر ان کے ایثار اور خلوص کا یہ
عالم ہے کہ انہوں نے کبھی حکومت سے امداد کے لئے ایک پیسہ نہیں مانگا اور صرف خدا کے
بھروسے اور غریب مسلمانوں کی امداد پر اسے چلاتے رہے اور آج تک چلا رہے ہیں، اگر
ایسے دار العلوم کو کوئی مغربی سوسائٹی چلاتی تو اس کا سالانہ بجٹ کسی ریاستی بجٹ
سے کم نہ ہوتا، مگر دنیا یہ تسلیم کرے گی کہ دار العلوم ایک سو سال سے کم سے کم مصارف
کے ساتھ اعلیٰ علمی خدمات انجام دے رہا ہے، اس کے علماء جو کسی سرکاری یونیورسٹی میں
پروفیسر بن کر بڑا معاوضہ یا مشاہرہ پاتے، دار العلوم میں انتہائی قلیل تنخواہ لے کر کام کرتے ہیں،
اور پوری فرض شناسی کے ساتھ وہ کام سرانجام دیتے ہیں جو انڈر گریجویٹ کورسوں اور کورسیوں پر
کسی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دار العلوم دوسری یونیورسٹیوں کے لئے ایک مثالی یونیورسٹی
ہے، اس کی سادگی اور اس کے ارباب کار کا خلوص و ایثار اور مقصد کی لگن دوسروں
کے لئے نمونہ بن سکتا ہے ۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملّا اور مذہبی، مدرسے فرقہ پرستی کا قائل بناتا ہے وہ سمجھے ہوئے
سورما کی کروں کا انکار کرتے ہیں، نہ صرف یہ اور وہ بلکہ اس کے تعلقات اور معاملات سے بھی

فرقہ پرستی کے پرجوش مخالف، یہ میں فرقہ پرستی کی مخالفت سے معمور پاتا ہے۔ یہ ایک منطقی چیز ہے۔ اس ادارے نے تو سارے ملک میں حریت وطن کی شمع روشن کی اور قوم کو آزادی کے لئے بیدار کیا۔ اگر اس کے اکابر اس وقت آزادی کا نعرہ نہ لگاتے جب کہ کانگریس کا وجود تک نہ تھا تو آج ہندوستان کی تاریخ یہ نہ ہوتی جو آج نظر آرہی ہے۔ یہ ادارہ وہ آزادی کا علم اور مستقبل وطن کا شمع بردار رہا ہے۔ آزادی کا جو تخم اس نے بویا تھا آج ہم اسکا پھل کھا رہے ہیں۔

۱۲ دسمبر ہمایوں کبیر

وزیر سائنسی تحقیقات و ثقافتی امور حکومت ہند

(روزنامہ الجمیعۃ دہلی ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۱ء)

" دارالعلوم میں آکر اور اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ہندوستان میں ایک امتیازی دلکش اسلامی ادارہ ہے۔ میں اس تعلیم گاہ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا جو اسلام کی اس قدر خدمت کر چکی ہے۔ اس ادارے میں جو تقریباً ایک صدی قبل قائم کیا گیا ایک شاندار و عجیب اور عظیم لائبریری ہے جس میں بیش بہا اسلامی مواد موجود ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ادارہ بغیر حکومت سے کوئی امداد حاصل کئے ہوئے اتنے طویل عرصے سے بہت کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس ادارے پر ہمیشہ حق تعالیٰ کے احسان و کرم کی بارش ہوتی رہے گی اور یہ ہمیشہ اس ملک کے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات دینے کی کوشش میں کامیاب رہے گا۔"

محمد یوسف درانی

۱۵ لیور پول اسٹریٹ پورٹ آف اسپین ٹرینیڈاڈ ویسٹ انڈیز

وارد ساؤتھ امریکہ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۲ء

آج مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو دارالعلوم دیوبند کے طبی شعبہ کا معائنہ کیا۔ میں نے دارالعلوم دیوبند کے اس تمام آلات و اسباب کو دیکھا جو طلبہ کے استعمال کے لئے حال میں خرید کر کے منگائے گئے ہیں۔ آلات و اسباب کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ خصوصاً یہ معلوم کر کے کہ تمام سامان بلا معاوضہ حاصل کیا گیا ہے۔ اسکی عمارت جو سب سے آپ کا محبوب بیان کی جاتی ہے جہاں پانچ سالہ کورس چلایا جا رہا ہے۔ اب طبی کتب کی تعداد دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت حد سے زیادہ۔ شعبہ طب کے لئے دارالعلوم کے باہر اسپتال کے لئے علیحدہ عمارت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ عمارت جلد از جلد تیار ہو جائے گی تب طبی شعبہ کو چار چاند لگا دے گی اور یہ صوبہ کے عمدہ اداروں میں شمار کیا جا سکے گا۔

باسدیو سنگھ

رجسٹرار بورڈ آف انڈین میڈیسن اترپردیش لکھنؤ

۶ مارچ ۱۹۶۲ء

"جذبات عقیدت لئے ہوئے میں نے دارالعلوم کی سیر کی۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو میں نے سنا تھا۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس پر ہر ہندوستانی کو فخر کرنا چاہیے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ ادارہ ساری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے بلکہ یہ علم کا ایک بہت بڑا مرکز ہے جو گرد و پیش کے اندھیرے میں ایک روشن چراغ رہا ہے۔ یہ ادارہ ہر قسم کی امداد اور اعانت کا مستحق ہے۔"

جگدیش سہائے

جسٹس الٰہ آباد ۱۲ مئی ۱۹۶۲ء

ہم ممبران لیجسلیٹو کونسل یو پی اور ممبران مشاورتی کمیٹی کو آج دارالعلوم میں حاضر ہو کر بہت خوشی ہوئی یہ ادارہ جو ہندوستان کی جنگ آزادی کا سینٹر اور ملک کے افکار کا مظہر رہا ہے۔ اور جس کی تعریف راشٹر پتا باپو گاندھی جیسی ہستی نے کی ہے حقیقت یہ کہ اس میں حاضری اور اس کو دیکھنا ہمارے لئے قابل فخر ہے ۔

ہم کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت اور بہت خوشی ہوئی کہ یہ دارالعلوم بزرگوں کی روایات کے مطابق مفت تعلیم صرف عوامی چندے پر دے رہا ہے۔ اور کسی مستقل آمدنی یا کسی بڑی شخصیت کا محتاج نہیں ہے

یہ وہی دارالعلوم ہے جس نے مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے رہنما پیدا کئے۔ دارالعلوم کے رہنما تمام ملک میں اتحاد اور امن کا کام کر رہے ہیں ہم کو امید ہے اور یقین ہے کہ دارالعلوم اپنے رہنما مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی رہنمائی میں اپنی روایات جاری رکھتے ہوئے مزید ترقی اور مستقبل روشن رہے گا

ساوتری شیام ، شبیر علی صدیقی ، سید الحسن ، اسحاق سنبھلی

ایم۔ ایل۔ سی ، ایم۔ ایل۔ سی ، ایم۔ ایل۔ سی ، ایم۔ ایل۔ سی

راقم سطور کے لئے یہ انتہائی مسرت کا بہت بڑا مشغلہ اور انعام ہے کہ اس سفر ہندوستان کے شہروں کی سیاحت و زیارت کا موقع میسر ہو سکا۔ بالخصوص ان شہروں میں سر فہرست دیوبند اور اس کی دینی درسگاہ "دارالعلوم" کا اسم ہے جو درحقیقت ہندوستان کا صدیوں قدیم سے مرجع رہا ہے، جو طلب علم اور تحقیق کا مرکز اور دنیائے اسلام کے طلبہ کی آماجگاہ ہے۔ اس مرکز علم کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور دلی خواہشات کے خوابوں میں سے ایک خواب و تمنا تھی خدا کا شکر ہے کہ آج دارالعلوم دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

قائم رکھے، اور ان بزرگوں کے فیض بخش روحانی اور انفاس طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

نیز وہ چیز جس کے لئے آج ہم سب اس ادارے کے مرہون منت اور احسان مند ہیں وہ یہ ادارہ ہے جو تمام اساتذہ و تلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت علم و تقویٰ کا مرکز اور جسم اسلامی کی بقا کا سرچشمہ وہ میٹھا چشمہ ہے جس میں حیات روحانی کے آثار موجود ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقا و ترقی اور اس کے علماء کو طول حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے

واللہ مجیب ولا یخیب رجاء امر یبتغی فضلاً منہ وکرماً۔

علم و تقویٰ کے اساطین سے آباد اس عظیم الشان ادارے کے علماء عظام کی خدمات جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک ایسا حق ہے جس کا مطالبہ میں کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان علماء کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متنوع عقول کے نتائج فکر اور بیش بہا علمی تحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے استفادے کا موقع فراہم کریں۔ یہ فریضہ ان حضرات پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علماء محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اس میں اس کو وہ نئی جدید تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ و صلاح اور روحانیت ہوتی ہے اور چونکہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کرام نیکی و صلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی صفات سے پورے طور پر متصف ہیں بلکہ سلف صالحین کے صحیح وارث اور ان کے نمونے ہیں اس لئے ان کی کتابیں حق اور کار آمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں۔ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر

متقدمین و متاخرین اور علماء کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہو سکیں، لیکن افسوس و دکھ کے
ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان اہم تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اردو زبان میں لکھی
گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان ہے لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور
علوم اسلام کی حامل زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے ظاہر ہے کہ وہ اردو کو حاصل
نہیں، لہٰذا یہ علوم و بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادران علماء ہند کا خصوصی
حصہ اور کارنامہ ہیں، اگر اردو ہی کے قالب میں محبوس رہیں تو ہم عربی زبان بولنے
والوں سے مخفی و پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی، جس طرح نہ صرف یہ
ہمارے ساتھ بھی زبردست ناانصافی ہوگی بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا
نقصان ہوگا۔

اس لئے فریضۂ معرفت اور امانت علم کی ادائیگی کے لئے یہ بات اولین واجبات
میں سے ہے کہ ان نفیس شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ ان
سے وہ لوگ بھی روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لئے بیتاب تشنہ اور مشتاق ہیں،
اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضے کی ادائیگی کا کام اسی ادارہ
ندوہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علماء کرام اور طلباء عظیم کا گہوارہ اور سرچشمہ ہے۔

اس موقع پر جبکہ ہم ذمہ داران ادارہ کے مشفقانہ طرز عمل، قرار تعارف، بزرگانہ اور
طلباء عزیز کے جذبات محبت و اخوت کے لئے کلمات شکر جمیلہ تحریر پیش کر رہا ہوں اپنے
مذکورہ بالا حق و مطالبہ کو دہرانے کی ایک بار پھر اس امید پر جرأت کرنا ضروری
سمجھتا ہوں اس لئے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضے کی ادائیگی کی طرف توجہ مبذول
فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے ساتھ ہی ساتھ یہ
دین و ثقافت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابل ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دنیا
کے مسلمانوں ہی کی ملک نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مساوی طور پر ان سے استفادہ

اور حضرت بھولی میں شدت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارے کو چلانے والوں کی حفاظت فرمائے اور ان کو ہر اس کام کی توفیق دے جس میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود ہو۔

عبدالسمیع رافعی، سفیر متحدہ عرب جمہوریہ

۳ جمادی الثانی [illegible]

"ہمیں اس بات کا احساس ہوا بلکہ یقین ہو گیا کہ یہ عظیم ادارہ، جو مرکز ہے ان حضرات کا جنہوں نے اس عظیم ملک اور دوسرے ممالک میں تعلیم دینیہ کی نشر و اشاعت کو اپنا مقصد بنایا ہے۔

ہم مدرسے کے ذمہ داران کا ان کی عالی ہمتی پر اور تعلیم کو عام کرنے اور یہاں پر اسلام کے ستونوں کو رسوخ و ثبات بخشنے کی راہ میں یہ حضرات جو کوشش صرف کر رہے ہیں ان پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

الشناوی، سفارتخانہ متحدہ عرب جمہوریہ

۲۳ جمادی الثانی

میں نے دار العلوم کی خدمت انجام دینے میں بڑی خوشی محسوس کی ہے۔ چنانچہ جب میں وزیر خوراک تھا تو مجھے دار العلوم کی خدمت کا موقع ملا تھا۔ دار العلوم کے مشفقانہ اصول کا جو نظریہ حضرت بانی کا ہے وہ ایک بے نظیر اصول ہے۔ کانگریس کے متعلق گاندھی جی کا بھی یہی نظریہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کانگریس کو غریب ہی رہنا چاہئے اگر کانگریس دولت مند ہو گئی تو اس میں کھوٹ آ جائے گی۔ جو کانگریس کو ختم کر دے گی۔

اس ادارے کی تاریخ بڑی شاندار ہے۔ آج کل تعلیم کے لئے جن چیزوں اور عظیم سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے آپ نے اس کو چھوڑ کر بڑی سادگی اختیار کی ہے اور اس ادارے میں غریب طالب علموں کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آپ نے دارالعلوم میں سادگی کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کو ہم اصل سوشلزم کہتے ہیں۔ لوگ سوشلزم کا نام لیتے ہیں مگر اس کے اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ مگر آپ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے، اور ایک بڑی اچھی مثال پیش کی ہے۔ آپ نے دارالعلوم کے ذریعے ملک کی عزت بڑھائی ہے اور اس طرح آپ نے ہندوستان کی جو شاندار خدمت انجام دی ہے میں اس پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اسلامی ممالک میں جب ہندوستان کا ذکر آتا ہے تو دارالعلوم دیوبند کا نام بھی ضرور لیا جاتا ہے مصر کے جامعۃ ازہر کے شیخ جب ہم سے ملے اپنے آپ کو دیوبند کے قریب کا رہنے والا بتایا اور وہاں کے علماء نے بڑی خوشی کا اظہار کیا جس سے میں نے اپنی عزت افزائی محسوس کی۔

میں امریکہ اور یورپ کے ممالک میں بھی گیا ہوں۔ وہاں کی یونیورسٹیاں اور دوسرے تعلیمی ادارے دیکھے ہیں جو اچھے کام کر رہے ہیں مگر وہاں کے لوگوں نے ان کی برتری بیان کرنے کے سلسلے میں ان کی شاندار عمارتوں اور ان کے سرمایہ و دولت کا کافی تذکرہ کیا لیکن یہاں آکر میں نے اس کے بالکل برعکس پایا، یہاں کے مہتمم صاحب اور کی زبان سے اس ادارے کی خصوصیات میں غربت اور فقیری کا تذکرہ سنا جس سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ہم صحیح انسانیت کا جوہر دولت و مال نہیں بلکہ کمال ہے، جو خدا نے آپ کو دیا ہے۔

آپ صرف خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں اور یہی سب سے بڑا بھروسہ ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ دارالعلوم ترقی کرے، اچھے مسلمان پیدا کرے اور ملک کی خدمت

بہبود کی خدمت انجام دے گا۔

اجیت پرشاد جین، گورنر کیرالہ

۸ ستمبر ۱۹۶۶ء

دارالعلوم دیوبند میں ہم لوگوں کو علمائے حقانی سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس خدا رسیدہ ادارہ کو ایسے صاحب فضل و کمال اور لائق احترام علماء سے نوازا ہے جو علم دین کے احیاء اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ درحقیقت دارالعلوم دیوبند ایک ایسا روشن چراغ ہے جو پوری دنیا کی رہنمائی کر رہا ہے۔

جناب ابراہیم خلیل شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خطاط بھی ہیں، آنموصوف نے شعبۂ خوشنویسی میں طلباء کی کتابت کے نمونوں کو دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار فرمایا، موصوف نے دارالعلوم کی نسبت برجستہ جو شعر موزوں فرمائے وہ درج ذیل ہیں:-

سپہر زخندہ دارالعلوم دیوبند
از گشتہ است در آفاق چو شمس و قمر

علمائے را پیرو مسند علم دینی ساختہ
فیض بخشائے حقیقت گشتہ بر نوع بشر

تا جہاں باقی ست باقی ماند ایں دارالعلوم
تا ابد آباد ماند ایں چشمہ فیض و ہنر

ابراہیم خلیل

(افغانستان)

جناب دربار ی لال شرما چیئرمین یوپی لیجسلیٹو کونسل لکھنؤ نے لکھنؤ واپس پہونچ کر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے نام جو مکتوب ارسال فرمایا ہے اس میں

مجھے بھی بہت دنوں سے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کی خواہش تھی۔
دارالعلوم کی عمارت وطلبا اور مختلف شعبوں کو دیکھا، کتب خانہ کا معائنہ کیا۔
سچائی اور امن کا جیسا ماحول یہاں ہے وہ دوسری جگہ نہیں ہے
دیوبند دارالعلوم کا قیام ہی وطن پرستی سے شروع ہوا ہے۔ تقریباً سو سال سے
دارالعلوم نے ملک کے سامنے اپنی وطن پرستی کا ریکارڈ رکھا ہے۔
اس ادارے نے ملک اور ملک سے باہر غیر ملکی طالب علموں کے ذریعے ہندوستان
کی جمہوریت کا پروپیگنڈا کیا ہے۔
یہ ادارہ سچائی، امن اور وطن پرستی کی تعلیم دینے والا ہے۔ اسی جذبے سے
میں یہاں سے گیا اور بہت ہی اچھا اثر لے کر جا رہا ہوں!

رام چندر روکل شنکت جنگ، ملکی راج ممبر آف پارلیمنٹ
۱۲ دسمبر ۱۹۸۱ء

جنوب مشرقی ایشیا کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے دارالعلوم دیوبند
میں چوبیس گھنٹے گزارنے پر بے انتہا خوشی ہوئی، مسعود نہیں، کیونکہ میرے اور میرے
ساتھیوں کے ساتھ نہایت فیاضانہ اور مہربانی کا سلوک کیا گیا۔ میں دارالعلوم کی متعدد
چیزوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی عمدہ لائبریری، اس کی خوبصورت عمارات،
دنیائے اسلام کے ہر گوشے سے آنے والے طلبہ اور ہر دل میں اسلام کو زندہ
رکھنے کا عزم، بزرگوں کے مقرر کردہ حصول علم کے اصول۔
میں یہاں سے بے غرضانہ خدمت علم، تحصیل کی سختی سے پابندی اور مسلمان
وغیر مسلموں کے ساتھ اعلیٰ رواداری کے جذبات کی ایک ایسی یادگار لے کر جا رہا ہوں جو

ہمیشہ مستحکم رہے گی۔

ولیم آر۔ رافی پروفیسر تاریخ کولمبیا یونیورسٹی
نیویارک، امریکہ
۲۰ محرم ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء

"میں مدت سے یہ جذبہ رکھتا تھا کہ دارالعلوم کی زیارت کروں کیونکہ میں اسلامک اسٹڈیز کا طالب علم ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں ایسے پنجابی خاندان سے متعلق ہوں جسے بہت عرصے تک اسلام سے دلچسپی رہی ہے۔ میں نے افغانستان میں سوشیالوجی (علم معاشرت) پر جو ریسرچ کی اس سے مجھے معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے اثرات وسط ایشیا میں کہاں تک وسیع ہیں۔ مجھے اس کا شرف حاصل ہوا کہ میں اس عجیب و غریب ادارے کو دیکھوں اور اس کے فرد فرد سے خدمت اور ان روایات کو دیکھوں جنہوں نے ایک صدی سے دنیائے علم میں دارالعلوم کو بے نظیر پوزیشن دے رکھی ہے۔ اگر وہ جذبہ جو یہاں کارفرما ہے ہماری کچھ یونیورسٹیوں میں بھی پیدا ہو جائے تو استادوں اور طلبہ کے طبقے مالا مال ہو جائیں۔"

جے۔ پی۔ ایس۔ اوبرائے پروفیسر سوشیالوجی
دلی یونیورسٹی
۲۰ رمضان ۱۳۸۰ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۶۱ء

الحمد للہ والصلوٰۃ علی نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ہمارا حسن
یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آج ہم اس عظیم الشان ادارے کو دیکھنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں جو علم و معرفت کا منارہ و سرچشمہ کہا جاتا ہے۔ اور جہاں سے وقتاً

پڑھتا تھا تو مجھے دوراستہ دکھاتی دیوبند ہی کھینچ جاتے تھے۔ حالانکہ میں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی تعلیم پائی اور وہاں بہت عرصہ رہ کر ایک اعلیٰ ڈگری حاصل کی لیکن دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ خدا نے اب ایک ایسا سبب بنادیا کہ گورنمنٹ جموں و کشمیر نے ایک دینی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مجھے یہاں بھیجا۔ اس قلیل عرصہ میں میری بڑے بڑے علماء دین سے ملاقات ہوئی۔ اور میں نے سارا دارالعلوم دیکھا خاص طور سے بخاری شریف کے درس میں بیٹھا ہوں یہاں آکر میرا ایمان سدھر گیا خاص طور سے یہاں پر اصلی دین اسلام ہے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہو گئی کہ کشمیر میں اس دارالعلوم کی ضرور نقل کی جائے اور مدرسہ قائم ہو کہ یہاں کے انتظام سے وابستہ ہو۔ میں نے ہر ایک شعبہ کا معائنہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جو مجھے یہاں لایا اور خدا کے فضل سے لطف اندوز و مسرور ہو کر جا رہا ہوں۔ بہرحال یہاں سے صحیح دین اسلام لیکر جا رہا ہوں "

عبدالخالق ہمدانی ڈپٹی سیکرٹری محکمہ قانون
جموں و کشمیر گورنمنٹ
۲۲ راگست ۱۹۶۲ء

" ہم نے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی اور ہمیں بے حد خوشی ہے کہ اس کو خیال و تصور سے بلند تر پایا۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ دارالعلوم کے لئے خدمت علوم کی سعادت برقرار رکھے اور دارالعلوم اسی طرح اپنی کامیاب زندگی گزارتا رہے عزّ جل شانہٗ سے ہماری یہ بھی التجا ہے کہ وہ ہمیں اہل السنت والجماعت کے عقیدے سے ہمیشہ وابستہ رکھے اور گمراہ فرقوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ دنیا میں ہم اس جیسے مدارس کو وجود بخشے اور سارے عالم کے لئے اس کے نفع کو عام کر دے۔

جس سے توقع ہے کہ انشاء اللہ دوسرے دشمن پر اسلام کا اقبال پھر سے واپس
آجائے گا:

ڈاکٹر محمد علی سول انجینئر، استانبول
زکی جلب، ۵ رشعبان المعظم ۱۳۹۳ھ

"دارالعلوم دیوبند ایک ایسا قومی ادارہ ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں
آکر بے حد خوشی ہوئی، یہاں کا طریقۂ تعلیم، طلباء کو حاصل سہولتیں اور اساتذہ کا علم و
فضل غالباً سارے ملک میں منفرد ہے۔ اس ادارے نے بڑی ہی قابلِ قدر خدمات انجام
دی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس سے قوم و ملک کو بیش بہا فائدے
پہنچیں گے:

شہباز حسین، ترقی اردو بورڈ
وزارتِ تعلیم حکومت ہند

"عامل ادمصطفیٰ

آج ہمیں اس مرکز علم "دارالعلوم دیوبند" کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔
جو اپنے مخلص ذمہ داروں اور کارکنوں کے ساتھ دین کی خدمت میں سرگرم عمل
ہے۔ دیوبند کی اس اسلامی یونیورسٹی میں حاضری فی الواقع ہماری خوش نصیبی ہے۔
ایک حقیر رقم (جو اس عظیم ادارے کے شایانِ شان تو نہیں تاہم وہ اسلامی اخوت
و محبت اور اس کے ساتھ ہمارے مخلصانہ تعلق کی آئینہ دار ضرور ہے) سے اس کی خدمت
میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ہم نے یہاں علماء ہند کی مساعی
کے طفیل وہ چیزیں یہاں دیکھیں جو ہمارے تصور سے بالاتر تھیں۔ خدا نے سلامت رکھے ان حضرات علماء

"میں نے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی اور یہاں کچھ وقت گزارنے کی سعادت حاصل کی۔ میں نے طلبہ کو دیکھا کہ وہ محنت اور جانفشانی کے ساتھ طلب علم میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اساتذہ کے بارے میں بھی اندازہ ہوا کہ خلوص قلب کے ساتھ افادۂ علمی کی خاطر ہر جد و جہد کر رہے ہیں۔

دارالعلوم میں جو نظام چل رہا ہے اس کے تحت طلبہ نہایت سہولت و آسانی کے ساتھ قیام و طعام اور تعلیم و تدریس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

یہ بات اعتراف کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دارالعلوم کے مہتمم صاحب کے زہد و تقویٰ اور رفعت علمی اور اخلاص و للہیت ہی کے یہ آثار ہیں جو اس ادارہ میں مشاہد ہوتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ فضلائے دارالعلوم تمام شہروں اور ملکوں میں پہنچ کر اشاعت علم دین میں کامیابی کے ساتھ مشغول ہیں۔

ہم سب کی یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں اور اساتذہ و طلباء اور بہی خواہوں کو بے مثال اجر و ثواب سے نوازے۔"

عبدالحلیم محمود شیخ الازہر

۲۶ر اپریل ۱۹۷۵ء

"ہمیں دارالعلوم کی زیارت کی اور اس کی علمی سرگرمیاں معلوم کرنے کا شرف حاصل ہوا خصوصاً احادیث و تفسیر کے سلسلہ میں اس کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ مجھے بڑی خوشی محسوس ہوئی جب ان حضرات کے کلمات عالیہ عربی زبان میں سننے کا موقع ملا۔

دعا ہے کہ اللہ جل شانہ اس ادارے کو تا دیر قائم رکھے اور اس کے بانی کو معرفت سے نوازے اور اسی طرح جو بھی اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اور مسلمانوں کو اس بات کی توفیق دے کہ اس عوامی ادارے کی خوب مدد کریں۔

اللہ گواہ ہے کہ جو کچھ ہم نے خیال ظاہر کیا ہے وہ قلب کی نیک تمنا میں ہیں۔ اور دارالعلوم کی یہ نیک زیارت یکشنبہ کے دن ۲۹ شعبان ۱۳۹۵ھ واقع ۷ ستمبر ۱۹۷۵ء کو ہوئی۔

والسلام

علی سید محمد غزالی [illegible] وزارت التربیۃ

مدت سے دارالعلوم دیوبند کی شہرت سن رکھی تھی اور میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ اس کے اساتذہ عربی زبان کو اطراف ہند میں مکمل جد وجہد کے ساتھ پھیلا رہے ہیں تو یہ بات میرے لئے بڑی خوشی کا سبب بنی تھی۔

ایک زمانے سے اس کی زیارت کا اور علماء دارالعلوم کی زیارت کا مشتاق تھا اور جب میں نے یہ سنا کہ وہاں کے طلبہ عربی میں بڑی جانفشانی سے لگے ہوئے ہیں حتیٰ کہ اس کے اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے مضامین اور کتابیں بھی عربی میں لکھنے لگے ہیں تو میرا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا، حتیٰ کہ میری یہ خواہش دن بدن ترقی کرتا رہا اور اس حد تک بڑھ گیا کہ میں نے دعا کی کہ میری موت اس وقت تک نہ آئے جب تک کہ میں دارالعلوم کی زیارت نہ کرلوں، اس کے علماء اور طلباء سے ملاقات نہ کرلوں۔

الحمد للہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی اور میں نے اپنی مراد پالی اور اس کی زیارت یکسوئی نصیب ہوئی جس کو تا قیامت بھی نہیں بھول سکتا، اور وہ دن ۲۰ اپریل یکشنبہ ۱۹۷۵ء کا دن تھا اور میں نے اپنی آنکھ سے جو کچھ یہاں دیکھا وہ کانوں کے سنے ہوئے سے بہت زیادہ تھا۔ ایک طرف طلباء اپنے اسباق میں محو ہیں تو دوسری طرف اساتذہ

ذمہ داری کے احساس میں فرق ہیں ، اور عربی زبان جو کہ قرآن و حدیث کی زبان ہے اسکو
اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں
ادارہ کے عظیم کتب خانہ کو بھی دیکھنے کا موقع ملا تو وہاں شعر لغت اور تاریخ کی بہت سی
کتابیں پائیں ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند اور اسکے علماء کو ہر قسم کی توفیق اور ترقی
سے نوازے اور اس کو قائم رکھے کیونکہ یہ اسلام کے قلعوں میں سے ایک مضبوط قلعہ ہے ۔
اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مکمل اعانت فرمائے جو اس کے مددگار ہیں تاکہ دین اسلام کی خوب
خوب خدمت کریں ۔ واللہ ولی التوفیق ۔

محمد الفحام شیخ الازہر السابق

" اللہ تعالیٰ نے مجھے اور میرے ساتھی استاذ عبد الرحمن کو جو کہ عربی دینی پرچے
"البلاغ" کے ایڈیٹر ہیں جو کویت سے نکلتا ہے اس اسلامی عظیم قلعہ کی زیارت
کی توفیق بخشی ۔ جسے ہم دارالعلوم دیوبند انڈیا سے یاد کرتے ہیں ۔
یہ زیارت بروز جمعہ ۲۰ ذی القعدہ ۱۳۹۵ھ موافق ۲۳ نومبر ۱۹۷۵ء کو اس وقت ہوئی
جبکہ ہم سب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیمی جشن کے سلسلہ میں اسلامی وفد کی صورت
میں حاضر ہوئے تھے ۔
بحمد اللہ ہم نے اس ادارہ کو خوب پایا ، دل بھر کر دیکھا ۔ مسرور ہوئے بہت پہلے ہی پہنچ گئے حضرت
مہتمم صاحب اور بعض طلبہ سے بھی ملاقات کا موقع ملا ۔ اس جلسہ میں جو جب ہم لوگوں کی تنظیم میں
منعقد کیا گیا تھا ۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اسلامی ادارے کو دین حنیف کی
خدمت اور اسلامی دعوت کی خوب خوب توفیق دے ، اللہ ہی توفیق کا

میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت خیال کرتا ہوں کہ خدا کے فضل و کرم سے آج میری بہت دنوں کی دیرینہ تمنا اس مشہور ادارے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی پوری ہوئی۔ یہ ادارہ اسلام، عربی زبان اور ملکی زبانوں کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ تعلیم و رہائش و خوراک کا انتظام قابل تعریف ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ طلبہ کو خوراک اور دوسری نعمت دیئے جاتے ہیں۔ یہ ادارہ ۱۸۶۶ء میں تقریباً سات سو روپے سالانہ آمدنی سے شروع ہوا تھا۔ اس سال کا بجٹ ۹ لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہے اور یہ سب اخراجات صوبائی یا مرکزی حکومت کی کسی امداد کے بغیر مخلص عوامی چندہ کے ذریعہ پورے ہوتے ہیں۔ میں خاص طور سے مولانا محمد طیب مہتمم اور ان کے اسٹاف کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے معائنے کے سلسلہ میں تکلیف اٹھائی۔

لائبریری کو دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی حاصل ہوئی جس میں عربی، فارسی اور اردو کے نایاب مخطوطات ہیں، قرآن شریف کے کچھ مخطوطات قدیم آرٹ کے بیش بہا نمونے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ترقی عطا فرمائے۔

منظور عالم قریشی

سفیر ہند برائے سعودی عرب ۵ مارچ ۱۹۶۷ء

دارالعلوم دیوبند جو ایک عظیم مسجد بھی ہے اس کی زیارت سے مشرف ہوا اور قلب کو اطمینان محسوس ہوا کہ جب تک ان جیسے حضرات جو دارالعلوم دیوبند میں لگے ہوئے ہیں اور اس کے علمی کارنامے اسلام دوست رہے ہیں موجود ہیں۔ اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عظیم کارنامے جو یہ حضرات اسلام دوست رہے ہیں یعنی مسلمانوں کی دینی امور کی رہنمائی اور تعلیم و تربیت یہ اسلام کے راستے میں ایک عظیم جہاد ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو توفیق سے نوازے اور آپ کی مدد فرمائے۔ اور اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی ہر صلاحیت سے نوازے اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی مدد کریگا۔

حسام الدین

۱۱ مارچ ۱۹۶۳ء

آج میں نے دارالعلوم کو دیکھا۔ یہاں علم کے تعلق سے جو کام ہو رہا ہے اسکی مکمل کامیابی کا میں خواہاں ہوں۔ مجھے نہایت مسرت حاصل ہوئی یہ ادارہ عوام کی اصلی خدمت انجام دیتا ہے یہ میری دلی خواہش ہے۔

باسدیو سنگھ اسپیکر اترپردیش اسمبلی

۱۶ مئی ۱۹۶۳ء

مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ اس درسگاہ نے علم و عرفان کی روشنی سے دنیا اور ملک کے دلوں کو منور کیا اور اس کی مایہ ناز ہستیوں نے ملکی سیاست میں نمایاں کارنامے انجام دے کر اپنی عظمت کا پرچم بلند کیا ہے۔ اس سے بھی میں بخوبی واقف ہوں کہ یہ ادارہ ملک میں اپنی علمی ملی اور سیاسی خدمات میں ممتاز رہا ہے۔

میں اس کے کتب خانہ عامرہ کا بڑا عظیم ذخیرہ دیکھ کر متاثر ہوں۔ مجھے مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم کے گزار کا ساتھ اور طلبہ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کو نئی روشنی کے ساتھ اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ملک و ملت کی خدمت میں ہمیشہ اسکو نمایاں مقام حاصل ہو۔ آمین۔

فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند
۱۳ اپریل ۱۹۷۵ء

میں اس بات پر فخر اور عزت محسوس کرتا ہوں کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے اور یہاں کے علماء، اساتذہ اور دوسرے کارکنوں اور طلبہ سے ملنے کا موقع ملا جہاں علماء سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس ملاقات سے ہمارے لئے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے اور تنظیم آزادی فلسطین کی طرف سے اس درسگاہ کے علماء اساتذہ اور اس ادارے کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں اپنے اچھے جذبات کا اظہار کریں۔

نیز ہندوستانی عوام کا اس بات پر بھی شکریہ ادا کریں کہ انہوں نے ہمیشہ فلسطینی اور عرب عوام کی تائید کی ہے۔ ہندوستانی عوام کا یہ رویہ دنیا کے دوسرے ممالک کے عوام کے لئے بھی قابل تقلید ہے۔ ہندوستانی عوام کا موقف ان اعلیٰ اصول اور اقدار پر مبنی ہے جو ہندوستانی عوام اور اپنی آزادی اور اپنی عزت کے لئے لڑنے والے فلسطینی عوام کے درمیان مشترک ہیں۔

اپنے تاثرات اور شکریہ کے الفاظ کو ختم کرنے سے پہلے ہم سب سمجھتے ہیں کہ اپنی طرف سے اس خواہش اور امید کا اظہار کریں کہ "تنظیم آزادی فلسطین" آپ کے صد سالہ جشن میں شرکت کرے گی، اور اس وقت تک عرب فلسطینی عوام اپنی آزادی کو حاصل کرنے اور اپنے وطن کی مقبوضہ سرزمین کو واپس لینے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ان امیدوں کو بر لائے۔

شفیق عبدالحمید [illegible] تنظیم آزادی فلسطین دہلی

۱۱ جولائی [illegible]ء

"ہم گورنمنٹ انٹر کالج دیوبند کے پرنسپل اور طلبا اس ادارے کی واقفیت حاصل کرنے کے لئے آج تاریخ ۱۳ رجولائی ۱۹۶۷ء یہاں حاضر ہوئے۔ مہتمم صاحب اور وائس چانسلر صاحب سے اس ادارے کی تاریخ اور اخراجات کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ جس پیار اور عقیدت سے دونوں حضرات ملے اور تمام اساتذہ سے کافی وقت لگا کر صرف اس ادارہ کی صرف ہی واقفیت ہی نہیں دی بلکہ اسلام اور سیکولرزم کے قریبی رشتے اور اصول ایکتا کی بات بڑے زور سے ذہن نشین کرائی۔ ہمیں اپنے ادارے کو چلانے کے لئے ان حضرات سے کافی روشنی اور رہنمائی ملی ہے جس کے لئے ہم ان کے تہ دل سے مشکور ہیں۔ خدا تعالیٰ ایسے دن لائے کہ ہم میں باہمی اتفاق اور عقیدت بڑھے اور مل جل کر ایک دوسرے کے کام آسکیں۔

مہندر پرتاپ سنگھ

۱۳ رجولائی ۱۹۶۷ء

"دارالعلوم میں حاضری ایک طویل مدت کے بعد ہوئی۔ اس دوران یہاں کے کئی نئے شعبوں اور نئی تعمیروں کے دیکھنے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کے اہتمام اور نگرانی میں ہندوستان کا یہ علمی اور روحانی ادارہ علم دین کی خدمت میں مصروف ہے۔ اپنی ۱۰۰ سالہ زندگی میں اس نے اسلامی علوم کے بہت سے شعبوں میں ہزاروں ایسے اصحاب فضل و کمال پیدا کئے جن کے اثرات اس برصغیر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں محسوس ہوتے ہیں اور اب بھی یہ موجود ہیں۔ گزشتہ دس سال میں کتب خانہ میں کتابوں کا بہت اضافہ ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے وہ زیادہ مرتب حالت میں نہیں [illegible] کے لئے واقعی ایسے ہی کسی عمارت کی ضرورت ہے۔ دارالعلوم کی صد سالہ تقریب کا بڑے پیمانہ پر

آخر میں دو منظوم مقالے پیش ہیں:-

حاجی ضیاء الاسلام صاحب ضیا رئیس کاندھلہ ضلع مظفر نگر ایک نغز گو شاعر، علم دوست بزرگ، جدید تعلیم سے آراستہ اور قدیم مشرقی تہذیب کی دلدادہ شخصیت تھے۔ اول طبقے کے مجسٹریٹ، ادب فہم اور ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ موصوف ۱۹۲۹ء میں تشریف لائے۔ دارالعلوم کو دیکھ کر آپ کے شاعرانہ قلب میں جو تاثر پیدا ہوا، ذیل کی نظم اُن ہی تاثرات کا نتیجہ ہے:-

خوشا دارالعلوم دلنشین ست — خجستہ مرکزِ تعلیمِ دین ست

مثالِ قرطبہ در عہدِ ایمن ست — بفیضِ مصدرِ انہر ایں چنیں ست

بہر سو جلوۂ دینِ مبین ست — زخوانِ علم ہر کس خوشہ چین ست

حدیث و حکمت و فقہ امین ست — مقالِ اشہد زبانہا پر انگبین ست

زہے خم خانۂ مسلم و یقین ست — پر از آبِ بقا ہر سو نگین ست

بہر دل نورِ عرفان جاگزین ست — سبیلِ نورِ ایمان ہر جبین ست

بکارِ خویش ہر دل کش رنگین ست — ز نغزِ حق دو در از رحمت قرین ست

بقائے دینِ احمد را امین ست — کہ ہم روشن ضمیر و ہم یقین ست

عجب شانِ مکانِ رحم گزین ست — نزولِ فضلِ رب العالمین ست

"اگر فردوس بر روئے زمین ست
ہمین ست و ہمین ست و ہمین ست"

ضیاء الاسلام مجسٹریٹ درجۂ اوّل کاندھلہ

۱۲ نومبر ۱۹۲۹ء
۱۳۴۸ھ

مثنوی فروغ

مثنوی فروغ دارالعلوم دیوبند کی ایک قدیم منظوم تاریخ ہے۔ یہ مثنوی دارالعلوم دیوبند اور اکابر دارالعلوم کے ابتدائی حالات کا دلچسپ مرقع ہے۔ اور چشم دید شہادت ہونے کی وجہ سے مستند ماخذ اور ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثنوی فروغ اس وقت لکھی گئی تھی جب دارالعلوم دیوبند اپنی عمر کی دوسری دہائی سے گزر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند "مدرسہ اسلامی عربی دیوبند" کے نام سے موسوم تھا۔ مگر اس "عالم طفلی" ہی میں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت و عظمت سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ نوخیز پودا بہت جلد ایک تناور درخت بننے والا ہے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی

معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مثنوی نے ان آثار کو پوری فراست اور دوربینی سے محسوس کر لیا تھا۔ مصنف نے اس کی پیش گوئی اس طرح کی ہے ؎

مدرسہ دیں کا ہے گو اب بھی یہ — دور اس کا آیا نہیں ہے شباب
عالم طفلی میں ہے یہ گو ابھی — دیکھنا اس کو جوانی میں کبھی
مٹ گئیں سب جہل و بدعت کی رسوم — دیوبند اب ہو گیا دارالعلوم

؎ مثنوی روحانی میں دیوبن اور دیوبند دونوں طرح نظم کیا گیا ہے۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

گو نہیں ہے کو سخن میں کچھ شعور — شاعری سے ہوں میں اعدا کو کھڑا

اس کو لکھا ہے مگر ... قریب — نظم ہے جس کا ہو یا لاجواب

مثنوی فروغ میں دارالعلوم دیوبند کے حالات کے علاوہ مؤلف کتاب دارالعلوم میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، سید الطائفہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت حاجی محمد عابد دیوبندی، حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی اور حضرت مولانا سید محمد دہلوی، رحمہم اللہ اور دوسرے اراکین دارالعلوم کے حالات و مناقب بیان کئے گئے ہیں۔ مناقب کے ضمن میں کچھ ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن سے ان حضرات کے ایسے حالات معلوم ہوتے ہیں جن کا اب تک علم نہ تھا۔

یہ مثنوی دارالعلوم دیوبند کی سب سے زیادہ قدیم منظوم تاریخ ہے، سالانہ روداد کے علاوہ اس زمانے کی اور کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ مثنوی فروغ ۱۲۹۴ھ میں مطبع نظامی کانپور[1] میں چھپی ہے، مگر مطبوعہ ہونے کے باوجود نایاب ہے۔ اس کا نسخہ شاذ و نادر ہی کہیں ملتا ہے۔ دارالعلوم کے کتب خانے میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو بہت ہی بوسیدہ ہو چکا ہے، ادب اردو کی فہرست میں یہ نسخہ نمبر ۳۰، ۷۹/ ۸۸۵ پر درج ہے۔

مثنوی فروغ کے آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ تصنیف کے کئی سال کے بعد چھپنے کی نوبت آئی ہے۔

---

[1] ہندوستان میں ابتداءً جو مطابع قائم ہوئے تھے ان میں سے مطبع نظامی کانپور بھی تھا۔ یہ مطبع ۱۲۷۱ھ میں حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے قائم کیا تھا۔ مطبع نظامی نے اپنے دور میں کتابوں کے چھاپنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مطبع نظامی کا تعلق دارالعلوم سے ... دارالعلوم کی روداد چھپتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی روداد میں تفصیل سے اس کا ذکر ملتا ہے (روداد ... صفحہ ...)۔

ان کے لطف و توجہ سے وہ بھی | خود کرتا ہوں واسطے احباب کی

دارالعلوم دیوبند کے علاوہ جامع مسجد کی تعمیر کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مثنوی کم و بیش ۵۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔

مثنوی فروغ کے مصنف

مولانا عبدالکریم فروغ دیوبند کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی عبدالرحیم تھا۔ دیوبند کے قریب جانب جنوب تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ علیاوا واقع ہے۔ یہاں صدیقی شیوخ کا ایک معزز خاندان بارہویں صدی ہجری کے اواخر سے آباد ہے۔ مولوی عبدالرحیم اسی علیاوا کے رہنے والے بزرگ تھے۔ ان کے دو فرزند تھے، مولوی عبدالکریم فروغ اور مولوی فضل عظیم۔ ان دونوں حضرات نے دیوبند کے محلہ دیوان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مولوی عبدالکریم فروغ نے [illegible] میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے لئے اپنے نفس کو اس طرح متوجہ کیا ہے ؎

مدرسے میں علم دین تحصیل کر | خدمت حضرت میں روشن ہو گھر
دیکھ مجمع ہے وہاں کیسا عجیب | جمع ہیں واں کیسے کیسے خوش نصیب
فکر قرآن کی صحبت میں گزار | تو بھی تا بن جاوے کامل دیندار

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عبدالکریم فروغ جودھپور چلے گئے اور اسی ریاست میں ملازم ہو گئے۔ ریاست جودھپور میں آپ کا قیام قصبہ پالی[1] میں رہا اور وہیں رہتے ہوئے انہوں نے مثنوی فروغ لکھی جو پالی کا بیان ہے ؎

میں نے پالی میں لکھ کر مثنوی | شوق دل سے آرزو سے تھی کی

---

[1] پالی ریاست جودھپور کا پہلے ایک قصبہ تھا مگر اب ضلع بن گیا ہے۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے۔ بہ فرقہ حال مسلمانوں کی بستی ہے۔ یہاں کپڑے کے کئی کارخانے ہیں۔ پالی میں ایک بڑا مشاعرہ بھی ہے، پالی والوں سے واقف ہو رہا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

مشتعل ہے آتشِ شوق اس قدر — دل جلا جاتا ہے جس سے در جگر

خستہ طائر ہوں میں اسیرِ قفس — اڑ تو جاؤں پر نہیں کچھ اپنا بس

بخت بد نے کر دیا ایسا تباہ — ہو گئیں بند مجھ بے سروساماں کی راہ

مولانا عبد الکریم فروغ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حقیقی نانا تھے، وہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے بیعت تھے۔ خود لکھتے ہیں ؎

تھا عجب کچھ ذکر وہ رفعت فزا — پیر و مرشد مولوی یعقوب کا

افسوس ہے کہ مثنوی فروغ کے علاوہ ان کا دوسرا کلام دست یاب نہیں ہے۔ مولانا عبد الکریم فروغ کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی مگر یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی عمر زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ [illegible] کے لگ بھگ انھوں نے متھرا میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

تاریخی واقعات کو نظم کا جامہ پہنانا آسان نہیں ہے۔ مثنوی فروغ کا ہر شعر رواں دواں ہے، جس سے فروغ کے قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے کلام میں شگفتگی روانی بے ساختگی، چستگی اور قوت بیان پائی جاتی ہے۔ قوافی میں آمد اور برجستگی ہے۔ یہ مثنوی مصنف کے دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے ساتھ والہانہ عقیدت و تعلق کی آئینہ دار ہے۔

مثنوی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس میں کوئی داستان نظم کی جائے۔ حمد، مناجات، نعت، منقبت، مدح اور وجہ تصنیف وغیرہ مضامین مثنوی کے ضروری اجزاء ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی میں عشق و رزم، تصوف و اخلاق وغیرہ مضامین بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔ مثنوی کے لئے پوری نظم کا ایک ہی بحر میں ہونا ضروری ہے۔ مثنوی فروغ میں یہ سب اجزاء موجود ہیں۔ واقعہ نگاری میں تسلسل اور روانی ہے۔

پیر و مرشد سے والہانہ تعلق

انھیں اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اولین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۶۳	۱۳۴۵ھ	۱۹۲۶ء	۲۶	۳۱	۵۹۹	۱۰۴	۔	حضرت مولانا حافظ [illegible]	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی	
۶۴	۱۳۴۶ھ	۱۹۲۷ء	۲۹	۳۹	۵۱۴	۴۴	۔	۔	۔	
۶۵	۱۳۴۷ھ	۱۹۲۸ء	۳۳	۲۲	۶۹۰	۵۸	۔	۔	۔	
۶۶	۱۳۴۸ھ	۱۹۲۹ء	۱۸	۳۳	۸۴۰	۶۵	۔	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن	۔	
۶۷	۱۳۴۹ھ	۱۹۳۰ء	۲۲	۳۳	۹۰۲	۸۸	۔	حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ	۔	
۶۸	۱۳۵۰ھ	۱۹۳۱ء	۲۹	۳۹	۱۰۰۳	۹۱	۔	۔	۔	
۶۹	۱۳۵۱ھ	۱۹۳۲ء	۳۳	۲۸	۱۱۲۸	۱۲۴	۔	۔	۔	
۷۰	۱۳۵۲ھ	۱۹۳۳ء	۲۵	۳۰	۱۱۰۴	۱۰۴	۔	۔	۔	
۷۱	۱۳۵۳ھ	۱۹۳۴ء	۲۷	۳۵	۱۱۱۲	۱۳۰	۔			
۷۲	۱۳۵۴ھ	۱۹۳۵ء	۲۶	۳۹	۱۱۹۶	۱۸۹	۔	۔	۔	
۷۳	۱۳۵۵ھ	۱۹۳۶ء	۲۵	۳۹	۱۱۹۹	۱۰۴	۔	۔	۔	
۷۴	۱۳۵۶ھ	۱۹۳۷ء	۲۵	۴۲	۱۲۸۹	۱۶۸	۔	۔		
۷۵	۱۳۵۷ھ	۱۹۳۸ء	۲۹	۴۴	۱۴۴۶	۱۸۵	۔	۔		

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلبہ	تعداد فضلاء	زیر سرپرست	اجتماع	صدارت تقسیم	کیفیت
۷۶	۱۳۵۸ھ	۱۹۳۹ء	۳۷	۸۸	۱۴۱۲	۱۸۰	-	حضرت مولانا [illegible]	-	
۷۷	۱۳۵۹ھ	۱۹۴۰ء	۳۸	۱۱۱	۱۵۰۲	۱۴۴	-	-	-	
۷۸	۱۳۶۰ھ	۱۹۴۱ء	۳۳	۸۴	۱۵۰۰	۱۹۱	-	-	-	
۷۹	۱۳۶۱ھ	۱۹۴۲ء	۳۳	۷۶	۱۳۴۵	۲۰۵		-		
۸۰	۱۳۶۲ھ	۱۹۴۳ء	۴۰	۷۸	۱۱۹۴	۱۹۴	-	-		
۸۱	۱۳۶۳ھ	۱۹۴۳ء	۳۷	۸۹	۱۳۲۲	۱۸۶	-	-	-	
۸۲	۱۳۶۴ھ	۱۹۴۴ء	۳۵	۹۳	۱۵۶۹	۱۵۹	-	-	-	
۸۳	۱۳۶۵ھ	۱۹۴۵ء	۳۶	۹۸	۱۱۴۲	۱۹۹	-	-	-	
۸۴	۱۳۶۶ھ	۱۹۴۶ء	۳۵	۱۱۵	۱۱۴۳	۲۰۸	-	-	-	
۸۵	۱۳۶۷ھ	۱۹۴۷ء	۳۹	۱۰۹	۱۱۹۳	۲۱۶	-	-	-	
۸۶	۱۳۶۸ھ	۱۹۴۸ء	۳۳	۱۰۰	۱۱۰۳	۱۶۴	-	-	-	
۸۷	۱۳۶۹ھ	۱۹۴۹ء	۳۵	۹۳	۱۰۸۱	۱۵۶	-	-	-	
۸۸	۱۳۷۰ھ	۱۹۵۰ء	۳۰	۹۶	۱۲۰۲	۱۱۹	-	-	-	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدر مدرسین	کیفیت
۸۹	۱۳۷۱ھ	۱۹۵۱ء	۳۳	۱۱۶	۱۲۰۳	۱۲۶	-	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب		
۹۰	۱۳۷۲ھ	۱۹۵۲ء	۳۳	۱۱۱	۱۲۵۳	۱۲۱	-	-	-	
۹۱	۱۳۷۳ھ	۱۹۵۳ء	۴۱	۱۱۳	۱۱۹۱	۱۲۱	-	-		
۹۲	۱۳۷۴ھ	۱۹۵۴ء	۴۳	۱۲۹	۱۳۹۲	۱۵۰	-	-	-	
۹۳	۱۳۷۵ھ	۱۹۵۵ء	۴۳	۱۲۹	۱۳۲۸	۱۴۳	-	-	-	
۹۴	۱۳۷۶ھ	۱۹۵۶ء	۴۳	۱۲۹	۱۳۰۹	۱۴۸	-	-	-	
۹۵	۱۳۷۷ھ	۱۹۵۷ء	۴۵	۱۴۳	۱۳۰۹	۱۴۵	-	-	مولانا محمد ابراہیم	
۹۶	۱۳۷۸ھ	۱۹۵۸ء	۴۴	۱۵۱	۱۳۳۳	۱۲۶	-		-	
۹۷	۱۳۷۹ھ	۱۹۵۹ء	۴۱	۱۹۰	۱۳۸۰	۱۴۹	-		-	
۹۸	۱۳۸۰ھ	۱۹۶۰ء	۴	۱۹۵	۱۵۳۶	۱۹		-	-	
۹۹	۱۳۸۱ھ	۱۹۶۱ء	۴۱	۱۹۶	۱۵۳۳	۲۳۳		-		
۱۰۰	۱۳۸۲ھ	۱۹۶۲ء	۴۱	۲۰۰	۱۵۳۲	۲۱۸	-		-	
۱۰۱	۱۳۸۳ھ	۱۹۶۳ء	۵۳	۱۷۰	۱۵۲۹	۱۵۸	-	-	-	

شہداء اور صالحین کے رستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم **ترجمہ** اے اللہ چلا ہمیں سیدھی راہ پر، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا

اس مسلک اعتدال کی وجہ سے علمائے دیوبند کی بے خبری اور خود رائی سے بھی محفوظ ہے اور شرک و بدعت کے اندھیرے سے بھی نہیں بہکے جا سکتے۔ کھینچ کے، وجہ کے اعمال و افکار سے اسلام کا تسلسل بھی واضح ہوا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ و عمل دین کے نام سے اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا۔ یہ حضرت علم دین کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ پر دید پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی یا۔ زندہ دین ہے۔ جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد سعادت عہد تک مسلسل ہے۔

اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی رو سے امت کے لئے دل بیار روح کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے۔ اس لئے علمائے دیوبند ان کی محبت و عقیدت کو تقاضائے ایمان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر غلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے۔ ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ ہمیں ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف و نذر منت و قربانی کا محل بنا لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ، حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ، حضرت شیخ علی ہجویریؒ، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صحیح جانشین اور ان کے فیوض سے زندگی کے خاکوں میں اتباع سنت کا رنگ بھرنے والے یہی بزرگان کرام ہیں۔ ان حضرات کا فیض روحانی اعمال سیرے جیسے اعمال سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی سہروردی، نقشبندی اور قادری رستوں سے انتساب رکھتے ہیں۔ علاوہ اگر انصاف سے دیکھا

ملت تو حکمت اور تحریک سعودی کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے یہ حضرات علم و عمل ہر دو پہلو میں اساسی پہلو قائم رکھتے ہیں۔ بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات اسی سے پیش پیش رہے کہ ان کے اعمال کا اساسی پہلو کہیں موجود تھا اور یہ تردید بھی حق تھی بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے ہیں۔

"اجتناب از التزام رسم بدعت تا از بدعت حسنہ در رنگ بدعت سیئہ احتراز ننماید بوئے ازیں دولت بمشام جان او نرسد و ایں معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلمات بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و باحیائے سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہائے بدعت اند و محو کنندہائے سنت بدعتہائے پہن شدہ را تعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آں فتوے مے دہند و مردم را بہ بدعت دلالت می نمایند" (مکتوب ۵۴ دفتر دوم حصہ ہشتم)

ترجمہ: بدعت کے نام اور عمل سے بھی پرہیز لازم ہے جب تک بدعت حسنہ کو بھی اسی طرح پرہیز کرے جس طرح بدعت سیئہ سے پرہیز کیا جاتا ہے اس سعادت کی خوشبو اس کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج بہت مشکل ہو گئی ہے کیونکہ جہان بدعت کے دریا میں ڈوبا ہوا ہے اور لوگ بدعت کے اندھیروں میں آرام کر رہے ہیں کس کی مجال ہے کہ بدعت کے خلاف دم مارے اور احیائے سنت کیلئے زبان کھولے اس وقت کے اکثر علماء بدعت کو رواج دے رہے ہیں اور سنتوں کو مٹا رہے ہیں۔ رواج یافتہ بدعتوں کو تعامل قرار دے کر ان کے جواز بلکہ ان کے مستحسن ہونیکا فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی نے جن علماء ربانی کی تمنا کی تھی کہ احیائے سنت کے لئے زبان کھولنے والے اور بدعات کے خلاف دم مارنے والے کب ہیں؟ ان کی یہ تمنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان اور اسی تحریک کی شاخ ثانیہ حضرات اکابر دیوبند سے پوری ہوئی۔ فللّٰہ الحمد۔

مآخذ و مراجع

۱ الثورۃ الہندیہ ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، مطبوعہ مدینہ پریس بجنور

۲ ارواحِ ثلاثہ ۔ مجموعہ روایات امیر شاہ خاں، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند

۳ اشرف السوانح ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی

۴ انوارِ قاسمی ۔ مولانا انوار الحسن شیرکوٹی، مطبوعہ لاہور

۵ ایضاح البخاری ۔ مرتبہ مولانا ریاست علی، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند [illegible]

۶ پروفیسر ہمایوں کبیر دارالعلوم دیوبند میں از سید محبوب رضوی
شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

۷ تاریخ دیوبند ۔ سید محبوب رضوی ۔ طبع دوم آزاد پریس دیوبند ۱۹۷۲ء

۸ تاریخ مظاہر علوم سہارنپور ۔ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، کتب خانہ
اشاعت العلوم سہارنپور

۹ تحریک شیخ الہندؒ ۔ مرتبہ مولانا محمد میاں دیوبندی ۔ شائع کردہ الجمعیۃ بکڈپو
دہلی ۱۹۷۵ء

۱۰ تذکرہ ساداتِ رضویہ دیوبند ۔ سید محبوب رضوی ۔ مطبوعہ محبوب پریس دیوبند

۱۱ تذکرۃ العابدین - مولوی نذیر احمد دیوبندی۔ مطبوعہ مدنی پرنٹنگ پریس دہلی [illegible]
۱۲ تذکرہ مولانا فضل رحمٰن۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی مطبوعہ لکھنؤ
۱۳ تقریر مبارک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مرتبہ مولانا محمد طاہر قاسمی مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۵۳ھ
۱۴ جامع المجددین۔ مولانا عبدالباری ندوی۔ تاج پریس لکھنؤ
۱۵ حیات شیخ الہند۔ مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندی۔ شائع کردہ کتب خانہ اصغریہ دیوبند ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء
۱۶ دارالعلوم کی سو سالہ زندگی۔ از حضرت مولانا محمد طیب صاحب۔ شائع کردہ دارالعلوم دیوبند
۱۷ دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم۔ شائع کردہ دارالعلوم دیوبند مطبوعہ ۱۳۹۶ھ
۱۸ ذاتی ڈائری۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور
۱۹ رجسٹر نقول اسناد۔ دارالعلوم دیوبند۔ غیر مطبوعہ
۲۰ روداد ہائے دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ لغایت ۱۳۳۶ھ و ۱۳۸۳ھ لغایت ۱۳۹۰ھ
۲۱ روداد دارالعلوم دیوبند۔ تحصیل ظفر ۱۳۳۳ھ و ۱۳۴۰ھ
۲۲ روداد عمل دارالعلوم دیوبند۔ ۱۳۸۳ھ تا ۱۳۹۶ھ
۲۳ سرگزشت مجاہدین۔ مولانا غلام رسول مہر۔ مطبوعہ علمی پریس لاہور ۱۹۵۶ء
۲۴ سوانح قاسمی۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند
۲۵ سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری۔ مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء
۲۶ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرکنٹائل پریس لاہور ۱۹۴۴ء
۲۷ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ مرتبہ مولانا ظفیر الدین صدیقی شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

۲۸ فتاویٰ رشیدیہ ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مکتبہ رحیمیہ دہلی

۲۹ فہرست مطبوعات و مخطوطات، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، مرتبہ مولانا ظہیر الدین صدیقی سنہ ۱۹۶۳ء

۳۰ کاغذات محفوظ محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند

۳۱ کتاب معائنہ، دارالعلوم دیوبند (غیر مطبوعہ)

۳۲ مآثر صدیقی ۔ نواب علی حسن خاں، نول کشور پریس لکھنؤ

۳۳ مآثر الکرام ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ سنہ ۱۳۲۸ھ

۳۴ مثنوی فروغ ۔ مولانا عبدالکریم فردؔ دیوبندی، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور سنہ ۱۳۱۲ھ

۳۵ مجموعہ فتاویٰ ۔ مولانا عبدالحئی (فرنگی محلیؒ) مطبوعہ علوی پریس لکھنؤ

۳۶ مجموعہ مکاشفات استدراک الامیر من اسرار اللطیف الخبیر، مولانا امیر باز خاں مطبوعہ بالالتزام نسیم پریس سادھورہ

۳۷ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی

۳۸ مکتوبات نبوی، سید محبوب رضوی، مطبوعہ محبوب پریس دیوبند

۳۹ مکتوبات یعقوبی ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۳۹ء

۴۰ منتخب التواریخ ۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۔ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ

۴۱ مولانا محمد احسن نانوتوی ۔ محمد ایوب قادری، مطبوعہ جدید پریس کراچی سنہ ۱۹۶۶ء

۴۲ میری داستانِ حیات ۔ مصنفہ راجہ مہندر پرتاپ

۴۳ نزہۃ الخواطر ۔ مولانا حکیم عبدالحئیؒ —— مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن

۴۴ نقش حیات۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی سنہ ۱۹۵۰ء و سنہ ۱۳۷۲ھ

۴۵ معدت الجود والشہود۔ ترجمہ شاہ راحق دیوبندی، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی

۴۶ ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات۔ مولانا حکیم سید عبدالحی مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ

رسائل واخبارات

---

۱ الجمعیۃ روزنامہ دہلی۔ نومبر ۱۹۶۱ء

۲ العلم (ماہنامہ) کراچی جنوری تا مارچ ۱۹۶۵ء

۳ القاسم (ماہنامہ) ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

۴ دارالعلوم دیوبند ماہنامہ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ، سید محمد ازہر شاہ قیصر

۵ رہبر (اخبار) بمبئی یکم اپریل ۱۹۶۴ء، ایڈیٹر مسز کلثوم سایانی

۶ مدینہ (اخبار) بجنور ۱۹۳۹ء